دل گداز تحریریں • زندگی کی تصویریں

ماہنامہ

کراچی

سچی کہانیاں

پراسرار نمبر

August
2014

عید مبارک

ماہنامہ سچی کہانیاں کراچی

E-mail:pearlpublications@hotmail.com

بانی سہام مرزا



خط و کتابت کا پتا: 110' آدم آرکیڈ
شہید ملت روڈ/ بہادر شاہ ظفر روڈ۔ کراچی

قیمت فی شمارہ: 60 روپے ✻ جلد: 31 - شمارہ: 08 ✻ اگست: 2014ء

ایڈیٹر، پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔





فون: 34930470 - 021-34939823 / پرنٹر: حسام محی الدین عباسی، سٹی پریس، OB-7 تالپور روڈ، کراچی



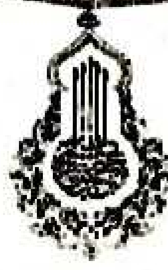


زر سالانہ بذریعہ رجسٹری پاکستان 720 روپے افریقہ 55 ڈالر کینیڈا آسٹریلیا 65 ڈالر ایشیا یورپ 55 ڈالر قانونی مشیر ایم بھٹو ایڈووکیٹ ہائی کورٹ

ایکشن، سسپنس، خوف و دہشت
سے بھرپور کہانیوں کے خالق
"ایم اے راحت"
کا ایک اور لافانی سلسلہ
"ہم شکل"



بہت جلد ماہنامہ "سچی کہانیاں" کی زینت بن رہا ہے۔



عید مبارک

ماہِ رمضان تمام تر برکتوں کے ساتھ تمام ہوا، خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہیں یہ ماہِ مبارک پوری تندرستی میں ملا اور انہوں نے اس میں اللہ تبارک تعالیٰ سے اپنے لیے مغفرت طلب کرلی۔ پورے رمضان، بہت ساری دعاؤں کے ساتھ یقیناً ہر شخص نے اپنے وطن کی سلامتی کی دعا ضرور کی ہوگی...... میں نے بھی دل سے دعا کی کہ یارب میرے وطن کو تا قیامت قائم رکھنا۔ ہمیں ایسی بے شمار عیدیں اپنے وطن میں، اپنے ہم وطنوں کے ساتھ دیکھنا نصیب فرمانا جس میں سب کے چہرے خوشیوں سے چمک رہے ہوں، ہر شخص مطمئن ہو، آسودہ ہو، اپنے پیاروں کے ساتھ ہو۔ لیکن جن کی وجہ سے آج ہم خود کو بہت محفوظ اور مطمئن محسوس کرتے ہیں، ہمارے فوجی جوان...... ہمیں اپنی فوج کی قربانیوں کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ وہ عید کے دن بھی دشمنوں سے ہماری خاطر برسرِ پیکار ہیں...... ہمیں ان مہاجرین کو بھی نہیں بھولنا چاہیے جو آپریشن ضرب عضب کی وجہ سے اپنے گھروں سے دور ہوئے، جنہوں نے رمضان سخت مشکل میں گزارا لیکن وطن کی خاطر پاک فوج کے شانہ بشانہ کھڑے رہے۔ گھر بار چھوڑنا، بہت مشکل کام ہے۔ ہمیں اپنے ہی کام سے کچھ دن اگر گھر سے دور رہنا پڑے تو وہ دن اعصاب شکن ہوتے ہیں اور گھر واپسی پر ہم سکھ کا سانس لیتے ہیں لیکن مہاجرین جو یہ عید اپنے علاقوں سے دور گزار رہے ہیں ہمیں ان کو بالکل نہیں بھولنا چاہیے اور ان کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ عید کا اصل نام شکرانہ ہی تو ہے۔

منزہ سہام

دلوں کو دہلانے والی اسرار میں ڈوبی پُر اسرار کہانیاں



نادیدہ روح......ملک صفدر عباس اعوان

جہانیاں سے دہشت پھیلاتی، جگر کو دہلاتی حیرت انگیز کہانی



خان زادہ......محمد سلیم اختر

سلیم اختر کے قلم سے ناگوں کے بادشاہ کی اسرار میں ڈوبی خوف ناک کہانی



سفید آنکھیں......ریاض حسین شاہد

ایک لڑکی کی ناقابلِ فراموش کہانی جس نے سفید آنکھوں سے دہشت پھیلادی



عشقِ ہوش رُبا......صفدر علی حیدری

اُچ شریف سے ایک نوجوان کی چونکا دینے والی حیرت انگیز داستان



راج نرتکی......آصفہ ضیاء احمد

راجہ ہربنس رائے کی راج نرتکی کی خون میں ڈوبی، خوف ناک کہانی



انار کا درخت......مسز نوید ہاشمی

انار کے ایک درخت کی دل دہلاتی، ایک پُر اسرار کہانی



ناجاں......زیبا مصطفیٰ

لاہور سے ایک لڑکی کی ناقابلِ فہم کہانی جس نے نادیدہ مخلوق سے شادی کرلی

کچھ اپنی باتیں

کہتے ہیں انسان کی سب سے بڑی اور سب سے پہلی ایجاد پہیہ ہے۔ یہ تو معلوم نہیں کہ پہلا پہیہ لکڑی سے بنا تھا یا پتھر سے ، مگر یہ بات طے ہے کہ انسان کا بنایا ہوا پہلا پہیہ آج تک گھوم رہا ہے اور ہزاروں سال سے گھومتے گھومتے اس پہیے نے سب کچھ ہی گھما دیا ہے اور اس شدت سے گھمیریاں دی ہیں، ایسے چکر گھمائے ہیں کہ دنیا کو سیدھی سادھی دنیا سے چکر باز دنیا بنا دیا ہے۔ سائنسدان اور فلسفی اس سوچ میں گم ہیں کہ آخر انسان کو پہیہ بنانے کا خیال کیسے آیا؟ حالانکہ سیدھی سی بات ہے کہ دو دو گردشوں میں گھومتی ہوئی زمین پر رہنے والے کو سوائے گھومنے گھمانے کے اور کیا خیال آ سکتا تھا؟

بہر حال حضرت انسان نے پہیے کی ایجاد کے بعد اس دنیا کو نہ صرف چکر باز بلکہ گھن چکر دنیا بنا دیا ہے۔ یہاں سب کے سب کام گھما پھرا کر کیے جاتے ہیں۔ سارے انجن ، ساری موٹریں ، سارے طاقتی پرزے گھوم گھوم کر ہی طاقت بناتے اور فراہم کرتے ہیں۔ مشینوں کو چھوڑیں انسانوں کے دماغ بھی ہزاروں میل فی گھنٹا کی رفتار سے گھومے ہوئے ہیں۔ کسی سرکاری دفتر میں چلے جاؤ پھر دیکھو کہ وہاں کیسے یہ اہلکار آنکھیں گھمانے لگتے ہیں۔

ایک دن ہمارے نصیب کا سیارہ گھومتے گھومتے ذرا سست پڑ گیا اور ہم ایک سرکاری اسپتال جا پہنچے، یقین جانیے ڈاکٹر صاحبان نے اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر کے وہ چکر کٹوائے کہ تیماردار خود بیمار پڑ گئے۔ مطلوبہ ڈاکٹر تک پہنچنے کے لیے تین منزلہ عمارت میں ان کم بختوں نے اتنا گھمایا پھرایا کہ وہ عمارت ہمیں تین سو منزلہ دکھائی دینے لگی۔ خدا خدا کر کے ڈاکٹر تک پہنچے اور اس سے شکایت کر بیٹھے کہ ڈاکٹر صاحب آپ تک پہنچنے کے لیے ہمیں سیکڑوں میل کے چکر لگوا دیے گئے ہیں ، ڈاکٹر صاحب مسکرائے اور معصومیت سے عرض کیا کہ اسپتال میں کولیسٹرول ٹیسٹ مشین خراب پڑی ہے اس لیے احتیاطاً ہر مریض کو کولیسٹرول کش چکروں سے گزارا جاتا ہے۔ یہ مفت علاج فراہم کرنے کی جدید ٹیکنالوجی ہے جو کہ ابتدائی طور پر صرف پاکستان کے سرکاری اسپتالوں میں تجرباتی مرحلے سے گزاری جا رہی ہے۔ اب تک آنے والے نتائج بہت شاندار ہیں، لہٰذا ہم سوچ رہے ہیں کہ عالمی ادارہ صحت کو ان کولیسٹرول کش چکروں کی افادیت سے آگاہ کیا جانا چاہیے تا کہ پوری دنیا کے انسانوں کا مفت میں بھلا ہو۔

خیر ان چکروں کو چھوڑیں ، یہ تو دکھ بھری چھچھوندریں ہیں جو ہمارے حلق میں پھنسی ہوئی چوں چوں چیں چیں کر رہی ہیں۔ آج کل فٹ بال کا چکر خوب چل رہا ہے ، کیا نصیبا ہے اس فٹبال کا کہ پیروں تلے روندے جانے پر بھی شہرت و عزت کی حقدار ٹھہرتی ہے۔ یہ تو معلوم نہ ہو سکا کہ پہیہ کس نے ایجاد کیا لیکن ہمیں یہ ضرور معلوم ہے کہ فٹ بال کس نے ایجاد کی اور کیوں ایجاد کی؟ وہ ہماری طرح یونان کا ایک سر پھرا ، گھن چکر ، جلا بھنا سڑیل دماغ انسان تھا، اُسے چکر باز دنیا پر شدید غصہ تھا کہ خود تو مزے مزے سے اپنے محور میں ، اپنے مدار میں ، دو دو گردشوں میں گھوم رہی ہے لیکن ساتھ ساتھ ہمیں کیوں گھما رہی ہے ، نہ ہمارا کوئی محور نہ ہمارا کوئی مدار؟ لہٰذا اس سر پھرے انسان کو اور کچھ تو سوجھی نہیں اس نے دنیا کی شبیہہ بنائی اور لاتوں ٹھوکروں پر رکھ لی۔ وہ دن ہے اور آج کا دن ہر پھرے گھن چکرے انسان لات پر لات مار کر علامتی دنیا کو گھما رہے ہیں۔ اور یار لوگ سمجھ رہے ہیں کہ یہ فٹ بال کھیل رہے ہیں۔ ہمیں بڑی حیرت ہوتی ہے کہ گھماؤ پھراؤ میں نمبر ون" ہماری قوم" فٹبال میں اتنی پیچھے کیوں ہے۔ ہمارے حساب سے تو فٹ بال کھیلنے کی بے بہا فطری صلاحیت ہماری قوم میں موجود ہے ، لات مارنے میں تو انہیں ملکہ حاصل ہے۔ اپنے امن و امان ، اپنے خوشحالی ، اپنی علم و ہنر کو ایسی لات ماری ہوئی ہے کہ یہ سب کام کی چیزیں فٹ بال بنی لڑھک رہی ہیں۔ اگر یہاں دیو ہیکل چیزوں کی بجائے بالشت بھر کی فٹ بال پر بھی لاتیں مارتے تو ورلڈ کپ جیت ہی لاتے۔ خیر چھوڑیں ہماری ان جلی کٹی باتوں کو۔ یہ مزاح مزاح میں بھی آگ لگا دیتی ہیں۔ ہنساتے ہنساتے بھی لوگوں کو رلا دیتی ہیں...... آپ فٹ بال ورلڈ کپ کی فکر کریں۔ ان سطور کی شائع ہونے تک ورلڈ کپ کا رزلٹ آ چکا ہوگا۔ دنیا نے جرمنی کو فیورٹ قرار دیا ہوا ہے ، بات دنیا صحیح کہتی ہے مگر ہمارا دل کہتا ہے کہ...... فٹ بال ورلڈ کپ کوئی بھی جیتے وہ فٹ بال ورلڈ کپ کا غیر حقیقی فاتح ہوگا۔ ورنہ سچ تو یہ ہے کہ فٹ بال ورلڈ کپ کی حقیقی فاتح پاکستانی قوم ہے۔ کیوں کہ پاکستان کے بنائے ہوئے فٹبال سے دنیا نے یہ ٹورنامنٹ کھیلا ہے۔ اب ذرا دل پر ہاتھ رکھیں اور ایمانداری سے بتائیں کہ اگر پاکستان فٹ بال ہی نا بناتا تو ورلڈ کپ ہوتا؟

آپ کا اپنا

کاشی چوہان

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

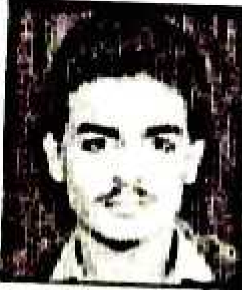
پیارے ساتھیو!

اگست کا شمارہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ذرا دھیان سے، بڑے خیال اور احتیاط سے...... اسے دن کے اُجالے میں پڑھیے گا، کہیں ایسا نہ ہو کہ...... یہ پراسرار نمبر ہے، جس میں لکھاری دوستو نے چیختی چنگھاڑتی، خوف دلاتی اور دل دہلاتی تحریریں بھیجی ہیں۔ ساتھیو! احوال کا آغاز کریں گے ہم قبولہ شریف سے ایم حسن نظامی کے خط سے، عرض کرتے ہیں اپنے منفرد انداز میں۔ قابلِ قدر بھائی، خلوص بیکراں۔ سلام عقیدت! جانے کب سے آپ کے پرچے کا فین ہوں، میں آپ کے لیے اجنبی ہوں شاید، مگر آپ میرے لیے بے حد شناسا ہیں، منزہ سہام صاحبہ اور آپ کا نہ صرف اداریہ بلکہ پرچے کی بائنڈنگ، پروف ریڈنگ اور ایڈیٹنگ بھی کچھ ایک کامیاب و کامران ایڈیٹر کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ کچھ اپنی باتیں اور سب سے بڑھ کر احوال آپ ہی کے مرہون منت ہے۔ آپ اور قارئین و رائٹرز کی میٹھی اور محبتوں سے لبریز باتیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ایک ہی مقام، ایک ہی گھر اور ایک ہی پھلواری میں کھلے رنگ برنگے پھول اپنی اپنی خوشبو سے سبھی کو سرشار کر رہے تھے۔ اور سب سے بڑھ کر جس نقطے نے لکھنے پر مجبور کیا وہ تھا مئی کا شمارہ ”روحانی نمبر“ اور پھر اس کی خاص تحریر ”صنم کدہ ہے جہاں“ اپنی نوعیت کی انمول تحریر تھی جو مدتوں یاد رہے گی۔ عاشق حسین ساجد، سلیم فاروقی، مجید احمد جائی، حنا بشریٰ، مبشر حسن، صفدر علی حیدری کے قلم میں بے پناہ جادو پایا۔ جون کے پرچے میں کرن بشیر نے اچھا لکھا، ام منابل کی تحریر دکھوں اور حسرتوں کے گرد گھومتی لازوال کہانی تھی، خواہشوں کا اسیر کے لکھاری کے قلم میں بھی پختگی پائی، ”ہیر ربی“ غلام مصطفیٰ خان نے منظر نگاری اور ظلم و ستم پر اچھا اور جامع قلم چلایا، نفیسہ فضل جیسے لمحوں پر طبع آزمائی کر رہی تھیں، لفاظی میں بلاشبہ پختگی تھی۔ ”آتش جنوں“ خوب صورتی اور چابکدستی سے دھیرے دھیرے محوِ سفر ہے۔ سلونی! سبق آموز تھی۔ ایم اشفاق بٹ، نسیم سحر، ڈاکٹر طارق محمود آکاش اور عادل حسین بھی رائٹرز دوست بلاشبہ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کے لفظوں، فقروں اور کرداروں میں بلا کی پختگی ہوا کرتی ہے۔ ”سخن آباد“ بہت ہی منفرد اور پیارا سلسلہ ہے۔ اس سے پرچے میں اور بھی نکھار پیدا ہوا، ڈاکٹر شاہ محمد، عادل حسین، اسلم جاوید، شائستہ جمال، آصف ریاض، مہر نسیم، ریحان آفاق، شاہد فراق، عمران فائق، ملک عاشق حسین کی غزلیں ردیف قافیے کے اعتبار سے معیاری اور منفرد تھیں۔ پہلی بار لرزتے قلم اور لڑکھڑاتے ہاتھوں آپ کی طرف محبت نامہ ارسال کر رہا ہوں، حوصلہ افزائی ہوئی اور ”جی آیاں نوں“ کہا گیا تو گاہے بگاہے حاضری ہوتی رہے گی ورنہ......

یاد رکھو تو دل کے پاس ہیں ہم
بھول جاؤ تو فاصلے ہیں بہت

☆☆ نظامی بھائی! آپ کی احوال میں شرکت، زہے نصیب۔ اس قدر خوش کن، جامع تحریر، چشم بددور۔ ہمت افزائی کا شکریہ، حوصلہ افزائی پر ایک بار پھر شکریہ۔ آپ کا محبت نامہ سر آنکھوں پر، فاصلے مٹ ہی جائیں تو بہتر ہے۔ آپ کی آمد پہ دل یوں کہتا ہے۔

سچی کہانیاں میں آپ کو عزیز رکھتے ہیں
آپ کے آنے کی کل بھی امید رکھتے ہیں
اس لیے جناب عالی!
آپ آئے ہیں تو اب آتے رہیے گا
دل کی باتیں قلم کے ذریعے کہتے رہیے گا
حسن نظامی سجی رہے گی آپ کی خاطر محفل بھی
سچی کہانیاں میں اپنا حال لکھتے رہیے گا



✉ سائیں پیر نوید شاہ صاحب ٹنڈو جام سے احوال میں شریک ہیں۔ شمارہ جون کسی دوست کے توسط سے ملا تو احوال میں ذکر راقم سے اندازہ ہوا کہ گزشتہ شمارے میں تبصرہ شامل اشاعت ہو چکا ہے، گو کہ درشن سے محروم رہے مگر پھر بھی شکر گزار ہیں آپ کے جو اشاعت کے قابل جانا۔ ''حلالہ'' بلاشبہ شمارے کی جان ثابت ہوئی۔ عورت کے فریب کو م۔ س۔ ایمن نے خوب قلم بند کیا ہے۔ ''خارزار بے زندگی'' اس شمارے کی ایک اور قابلِ ذکر کہانی تھی، آغاز بہت اچھا تھا، قبائلی علاقوں کے رہن سہن، رسم ورواج کی معلوماتی وضاحت پسند آئی۔ نفیسہ فضل کی ''شریک سفر'' روحوں کی کارستانیوں پرمبنی دلچسپ تحریر رہی۔ ''خواہشات نا آسودہ'' زبردست کہانی تھی۔ شائستہ میرا رزو کی ''سلونی'' دولت پر سنگدل باپ کی غفلت اور باہمت بیٹی کی مظلومیت پر بے مثال کہانی رہی۔ ''پانچ پریاں'' عیب جوئی کے موضوع پر مختصر سبق آموز کہانی رہی۔ خواہشوں کے اسیر، کہاں آ کے لٹے کارواں، سنگ ملامت، ایک ہی راستہ، انتقام، بھرم ٹوٹ گیا، معصوم بچیاں، ادھوری بارش، نصیب کی بارش، بیٹی بھی جلتی ہے، اپنا بویا کاٹ رہی ہوں، امانت اور دیگر کہانیاں گوارا رہیں، کوئی خاص تاثر چھوڑنے میں ناکام ثابت ہوئیں، ناپختہ قلم کاری صاف نظر آئی، مصنفین کو ابھی سیکھنے کی ضرورت ہے۔ ''احوال'' میں رانا محمد شاہد، ادیب سمیع چمن، ڈاکٹر صغیر، مور شاہد، سدرہ انور علی، منشی عزیز متے، ایم اشفاق بٹ چھائے رہے۔ محفل پر۔ سخن آباد میں ڈاکٹر تبریزی، ثمینہ ناز، نوید سہیل لاکھو، ملک عاشق اور مور شاہد کے کلام دل میں اتر گئے، سلسلہ وار کہانیوں کی تعداد کم ہونی چاہیے۔ طبی مشوروں کا سلسلہ بھی شامل کیا جائے تو پرچہ کو مزید دلکش ہونے کا موقع مل سکتا ہے۔ کہانی حاضر ہے۔

☆ سائیں بھلی کری آہی۔ میرے پاس روزی کی نوکری نہیں ہے، بابا سائیں قلم اور کاغذ کا احترام میرا مذہب مجھے سکھاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اچھا سا روزگار دے۔ پرچے پر تبصرہ بہت اچھا رہا۔ سائیں آپ کی کہانی ضرور شامل ہوگی، آپ کا قلمی تعاون جاری وساری رہا تو ضرور پرچے کو چار چاند لگ جائیں گے اور آپ کو آٹھ چاند۔ سائیں ہمارے حق میں بہتری کی دعا کرتے رہیں، یہ خاص التماس ہے بابا ہم تو خادم سادات ہیں۔ شکریہ

✉ نادیہ امین، قصور سے احوال میں شامل ہیں۔ جناب کاشی چوہان صاحب آپ آسرا دے کر اور سبز باغ دکھا کر پیروں کے نیچے سے دری کھینچ لیتے ہیں اور بندہ دونوں شانے چت۔ آپ نے کئی ماہ پہلے ہمارے ہردل عزیز رائٹر ایم اے راحت کی کہانی شروع کرنے کی نوید سنائی تھی اس کے بعد کوئی خیر خبر نہیں کہ یہ سلسلہ کب شروع ہوگا، بھائی جتنا جلد ہو، ایم اے راحت کی کہانیاں شروع کر دیں، ہمیں شدت سے انتظار ہے۔ تو پھر کب شائع کر رہے ہیں آپ، تاریخ ضرور بتایئے گا۔

☆ نادیہ جی! ایم اے راحت کا سلسلہ بہت جلد شروع کیا جا رہا ہے۔



✉ کراچی سے عصمت پروین عظیمی احوال میں حاضر ہیں: باجی اور منزہ باجی السلام علیکم، جو ملک کے حالات ہیں ان کو دیکھ کر تو آنسو بہانے کا دل کرتا ہے۔ بس دعا کر سکتے ہیں کہ اللہ پاک ہمارے پاکستان کو امن وسکون کا گہوارہ بنائے اور دوشیزہ کا شہر پھر سے روشن ہو جائے آمین۔ مجھے آپ کے لکھنے کا انداز اور اس کے موضوع بہت پسند ہیں۔ روحانی نمبر بہت اچھا رہا اور ساری کہانیاں بہت اچھی تھیں، ''جلوہ جنوں'' نوناں والی سرکار اچھی تھی۔

چشمۂ فیض، ملک عاشق حسین کی بھی اچھی رہی۔ آتشِ جنوں سلیم فاروقی کی بھی اچھی جا رہی ہے جو کہ سلسلہ وار ہے۔ "دعا" صفدر علی کے قلم سے، ثناء مولا صدف آصف کی بھی بہت اچھی تھی۔ بھرڑے جھولی، نور کا ہالہ، صنم کدہ اور روحانی نمبر کی خاص کہانی بھی بہت اچھی ہیں۔ مکمل رسالہ میں دلچسپی تھی، آپ کے لکھنے کا احوال بیان بھی بہت اچھا ہے۔ اللہ حافظ، امید کرتی ہوں میری کہانی بھی جلد ہی ان رسالوں کی زینت بنے گی، نیک دعاؤں کے ساتھ۔

☆ روحانی نمبر کی پسندیدگی کا شکریہ، آپ کی کہانیاں جلد شائع ہوں گی، امید کا دامن نہ چھوڑیں۔

✉ کراچی سے ہی ہماری ایک اور لکھاری نجیل میتلو لکھتی ہیں، جون کا سچی کہانیاں ملا، پڑھا۔ ممتا پڑھ کر سوچا یہ کیسی مائیں ہیں، انہیں ماں کہنا ہی ماؤں کی شان میں گستاخی ہے۔ اللہ معصوم بچوں کو ایسی ماؤں سے پناہ دے آمین، پھر کاشی جی کی باتیں پڑھیں اُداسی اور گہری ہوگئی، آپ معصوم گلہریوں کی بات کر رہے ہیں، آپ عالم اسلام کو دیکھ لیں، کیسے مسلمان مسلمان کو مار رہے ہیں، قتل کر رہے ہیں۔ آپ اپنے پاکستان کو دیکھ لیں جہاں انسان کو تحفظ نہیں ہے کیوں؟ کس بات پر جھگڑا ہے؟ کون سوچے؟ پھر احوال کی طرف آئی، دل کو خوشی کا احساس ہوا کہ نہیں کچھ لوگ ہیں دل والے جو ایک دوسرے کا خیال و حال و احوال معلوم کرتے ہیں۔ وہ ہیں لکھاری جو کہ میرے خیال میں پُر خلوص لوگ ہیں، کہانیاں پڑھیں سب اچھی تھیں مگر مجھے جو پسند آئیں وہ ہیں۔ حلالہ، اچھوتی سی کہانی لگی، اُم مناہل کی خار زار ہے زندگی، معصوم بچیاں، اثر انگیز تھیں، دلاسر فراز کا نام بھی بہت پیارا ہے، کیوں مالا جی...... شریکِ سفر، پانچ پریاں، نصیب کی بارش، اپنا بویا کاٹ رہی ہوں، جنت نظیر میرا کشمیر، کہاں آ کے لٹے کارواں، خواہشات نا آسودہ، سب لکھاریوں کو ویلڈن اچھا لکھنے پر۔ میری چھوٹی سی کہانی رتی اللہ والی، بہت سے لکھاریوں کو پسند آئی ہے، یہ میری توقع سے زیادہ ہے اور ان سب بھائیوں کا دلی شکریہ۔ مور شاہد جی، غلام رسول جی، فیصل ندیم بھٹی جی، ممتاز احمد، پرویز احمد دولو جی، منشی محمد عزیز مے جی، صفدر علی حیدری، اسامہ ندیم، عامر زمان عامر، بہن عظمیٰ شکور جی، ارم خان جی اور اوی تحسین جونیجو جی خوش بجو شال، بہت نوازش میری کہانی پسند کر کے میرا حوصلہ بڑھانے کا۔ سب سلسلے اور قسط وار ناول اچھے جا رہے ہیں، ویسے آتشِ جنوں مجھے بہت پسند ہے، تخت آباد میں ہمیں بھی یاد کریں نا، اور رابطہ کب دے رہے ہیں، رسالہ دن بدن نکھرتا جا رہا ہے۔

☆ نجیل جی، احوال کی محفل آپ جیسی سنجیدہ لوگوں کے قلم سے آباد ہے۔ اسے قائم رکھنا آپ قلم کاروں کا ہی کام ہے۔ کہانیوں کی پسندیدگی کا شکریہ۔

✉ فوزیہ فرید احمد نامعلوم مقام سے لکھتی ہیں السلام علیکم! گذشتہ تحریر کا تو مجھے نہیں معلوم کہ اس قابل تھی کہ نہیں جو شائع ہو سکتی، لیکن اسی تحریر کا مجھے یقین ہے کہ آپ کو ضرور پسند آئے گی اور امید کرتی ہوں کہ آپ کے رسالے کی زینت بنے گی، مجھے لکھنا نہیں آتا لیکن کوشش کر رہی ہوں اور انشاء اللہ آئندہ آنے والے دنوں میں میں اس میں ضرور شامل ہوں گی اور آپ کی شکر گزار ہوں گی اگر آپ میری تحریر کو اس رسالے (سچی کہانیاں) میں جگہ دے دیں، شکریہ۔

☆ فوزیہ فرید جی! آپ دل چھوٹا نہ کریں، مایوسی کفر ہے، آپ کو لکھاری سچی کہانیاں ضرور بنائے گا آپ مستقل مزاجی سے لکھتی رہیے، آپ کی تحریر ہمارے پاس محفوظ ہے، انشاء اللہ جلد اشاعت پذیر ہوگی۔

✉ نبیلہ شاہین، کھاریاں سے لکھتی ہیں۔ جناب ایڈیٹر صاحب، سچی کہانیاں مارچ 2014ء کے سچی کہانیاں میں معروف افسانہ نگار، ہمارے دلوں کی دھڑکن، رائٹر ایم اے راحت کی سلسلہ وار کہانی "ہم شکل" کا اشتہار نظر سے گزرا تھا، اس کے بعد نہ جانے کیا ہوا کہ چار ماہ گزر جانے کے باوجود بھی نہ تو کہانیاں شائع ہوئیں اور نہ ہی پھر کوئی اشتہار۔ جناب عالی! وہ ہمارے پسندیدہ رائٹر ہیں اور ادیبوں کی سرزمین، پنجاب کے نامور قلم کار ہیں۔ ہمیں ان کی کہانیوں کا شدت سے انتظار ہے، پلیز ایم اے راحت کی کہانی سلسلے وار جلد شائع کریں۔

☆ نبیلہ جی! بہت جلد "ہم شکل" رسالے کی زینت بنے گا۔



✉ ایم اشفاق بٹ لالہ موسیٰ سے شامل احوال ہیں۔ جون کا شمارہ ڈرامے کی اداکارہ کے ساتھ ملا، سرورق بڑا ہی کمال کا اور پرکشش ہوتا ہے۔ منزہ سہام کا ممتا کے بارے میں ایک ایک لفظ ماں کی محبت میں ڈوبا ہوا تھا۔ آپ کی کچھ اپنی باتیں بہت اچھی بہت پیاری تھیں اور رلا دینے والی بھی، ہمیں واقعی کسی کی زندگی کی کوئی پروا نہیں ہے، احوال کی محفل دن بدن نکھرتی جا رہی ہے۔ سچ بیانیاں میں م۔ص ایمن کی حلالہ، عورت کی چالاکیوں سے بھرپور تھی۔ کرن بشیر کے قلم سے لکھی کتھا خواہشات کا ناآسودہ غریبی اور امیری اور لالچ کے گرد گھومتی کتھا تھی۔ مریم شاہ بخاری کی تحریر ایک ہی راستہ انتقام کی آگ کا راستہ تھا۔ اُم منابل کی خارزار ہے زندگی، کس کو قصوروار ٹھہرائیں، شکیل احمد احمدانی کی واقعی عبرت خیز داستان تھی۔ اس کی پانچ بیٹیاں ایب نارمل ہوئیں پھر بھی ان سے کتنا پیار ہوتا ہے، دستگیر شہزادی کی تحریر اسد کی چالاکیوں اور مکاریوں سے بھرپور ایک انوکھی تحریر تھی، سویرا فلک کی بھرم ٹوٹ گیا، واقعی عورت کی جب زبان چلتی ہے تو مرد کا ہاتھ بھی اُٹھتا ہے۔ شائستہ میر آرزو کی کتھا واہ واہ کیا بات ہے آخر تک کہانی کا تسلسل قائم رہے۔ ویلڈن اور مبارکباد شائستہ جی۔ نسیم سحر کی ادھوری محبت، اگر وہ لڑکی محمود سے شادی کر لیتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ ڈاکٹر محمود آکاش کا پہلا شعلہ نصیب کی بارش، نصرت سرفراز کی امانت، شازیہ گل کی بکھرا موتی چمن لیا زبردست تحریر تھی، کبھی کبھی رانگ کال بھی اچھی ثابت ہو جاتی ہے۔ مسئلہ یہ ہے خلقِ خدا کی بھلائی کے لیے بہت اچھا سلسلہ ہے۔ سخن آباد کی محفل اس دفعہ ثمینہ ناز، شائستہ جمال، آصف ریاض، ڈاکٹر صغیر احمد نے سجائی ہوئی تھی، اس ماہ کی خاص تحریر سنگ ملامت میر (ر) امتیاز حسین ملک کی اچھی تحریر تھی، سچی کہانیاں بہت ہی زبردست رسالہ ہے، دعا ہے کہ یہ دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرے آمین۔

☆ بھائی اشفاق بٹ، احوال میں قدم بذریعہ قلم جما کر رکھیے، ہمیں یقین ہے کہ آپ لوگوں کے تعاون سے انشاء اللہ پرچہ ضرور ترقی کرے گا، بس ہم قدم رہیے گا۔



✉ کنول عمران خان، کراچی سے احوال میں حاضر ہیں، جولائی کا شمارہ ملا، بہت اچھا لگا، کاشی بھائی میں نے آپ کو ایک SMS بھی کیا تھا۔ بھائی سچ پوچھیے تو اس بار سرورق ذرا بھی اچھا نہ لگا، عجیب سی لپ اسٹک لگی ماڈل تھی۔ کوئی اپنا نہ رہا، اچھی تحریر تھی۔ کسے الزام دوں، کلموہی، اچھی لگی۔ میراں بھی اچھی تھی۔ اپنے ہی دام میں، زبردست انجام کے ساتھ زبردست رہی۔ میں کون ہوں، سدرہ انور علی کی تحریر سبق آموز تھی۔ کھلاڑی، آنکھیں کھولنے والی تحریر تھی۔ بٹوارہ، گریٹ اسلم بھائی، اس کے علاوہ مکافاتِ عمل، حسد کی آگ، ایک حقیقت ایک کہانی سب دلچسپ تھیں۔ باقی سلسلے وار کہانیاں ابھی تک نہیں پڑھیں۔ کل ملا کر بات یہ ہے کہ شمارہ زبردست تھا ہمیشہ کی طرح، اچھا اب اجازت، تمام اسٹاف کو رمضان کی مبارکباد۔ خدا حافظ

☆ کنول عمران جی! آپ کی احوال میں آمد، شمارے کی پسندیدگی کا شکریہ۔

✉ ریحانہ نعیم، جھنگ سے شامل احوال ہیں۔ جناب ایڈیٹر سچی کہانیاں میں آپ کے پرچے کی پرانی قاری ہوں، کالج سے یونیورسٹی اور اب عملی زندگی میں بھی میرا رشتہ اس پرچے سے ویسے ہی جڑا ہوا ہے۔ میں احوال کا سلسلہ بڑے غور سے پڑھتی ہوں، مجھے سمجھ نہیں آتی کہ کئی لوگ اس محفل میں ملکہ احوال، سلطان احوال اور شہزادہ احوال بن گئے۔ جسے دیکھو ایک دوسرے کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتا نظر آتا ہے۔ سچی اور حقیقی بات تو کوئی کرتا ہی نہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ہر شخص محض خط اور تصویر چھپوانے کے چکر میں جھوٹی تعریفیں کرنے میں لگا ہوا ہے۔ ارے بھئی سچ بولو، جہاں تنقید کرنی ہے وہاں تنقید کرو، تعریف کی جگہ تعریف تو ٹھیک ہے، مگر جبری جھوٹی تعریف...... اللہ توبہ، کیسے لوگ کر لیتے ہیں۔ بھیا مجھے تو یہ سب سراب ہی لگتا ہے۔ سچ پوچھو تو احوال میں تنقید کسی کو برداشت ہے ہی نہیں آخر کیوں؟ لوگوں سچ بولو اور سچ سننے کا حوصلہ رکھو، پرچے میں چھپنے والی کہانیوں کو ذرا تنقیدی نظر سے بھی دیکھ لیا کرو۔ اگر تنقید برائے

اصلاح کرو گے تو جب بھی تمہارا خط اور تصویر چھپے گی، اس لئے خدارا محنت ذرا کم لگایا کرو۔

☆ ریحانہ نعیم جی! آپ کی کھری کھری باتیں پڑھ کر تو مزا آ گیا۔

✉ مقصود احمد بلوچ، میاں چنوں سے احوال میں حاضر ہیں۔ کاشی چوہان صاحب سدا خوش رہو، سچی کہانیاں میں میرا یہ پہلا خط ہے سچی کہانیاں سے میرے بہت ہی ہردلعزیز دوست ایم اشفاق بٹ نے مجھے متعارف کروایا۔ سچی کہانیاں واقعی بہت ہی اچھا رسالہ ہے اور اس کا معیار بھی بہت اچھا ہے۔ اگر سچی کہانیاں میں مجھے حوصلہ افزائی ملی تو انشاء اللہ سچی کہانیاں کے لیے بہت کچھ لکھوں گا اور لکھتا رہوں گا۔ میں اس دفعہ ایک چھوٹی سی اسٹوری آپ کو ارسال کر رہا ہوں، اگر آپ کے معیار پر پوری اترے تو اسے جلد کسی قریبی اشاعت میں شامل کر کے شکریے کا موقع فراہم کرنا۔ میں نے اس اسٹوری کا نام درد کا صحرا رکھا ہے۔ میری طرف سے مجید احمد جائی کو بہت بہت سلام۔ جائی صاحب آپ پریشان نہ ہونا ہم آپ کے ساتھ ہیں، کہاں جاؤ گے بھاگ کر، آپ چپ چاپ سچی کہانیوں کی طرف آ گئے ہو اور ہمیں صلا تک نہیں ماری، مرضی ہے جناب کی، چلو خیر کوئی بات نہیں۔ آخر میں تمام قارئین، لکھاریوں اور سچی کہانیاں کے تمام اسٹاف کو میرا محبت بھرا سلام، اللہ نگہبان۔

☆ مقصود بھائی، رسالہ آپ کو پسند آیا، شکریہ۔ آپ کی کہانی ضرور شائع ہوگی، سچی کہانیاں ہمیشہ سے ہی لکھاریوں کی قدر کرتا ہے خواہ وہ نئے لکھنے والے ہوں یا پرانے۔ آپ کی حوصلہ افزائی سچی کہانیاں کے پلیٹ فارم سے ضرور کی جائے گی، آپ اس سے جڑے رہیں اور قلمی تعاون جاری رکھیں۔ جائی بھائی سے آپ کا شکوہ بجا ہے۔ اشفاق بھائی اچھے دوستوں سے تعارف کراتے رہیں۔ شکریہ



✉ کراچی سے فریدہ عالم لکھتے ہیں کاشی چوہان صاحب اور سچی کہانیاں کے متوالو، آپ سب کو میرا سلام اور ماہ رمضان کی مبارک قبول ہو۔ جولائی کا شمارہ گرمی کی شدت اور بے پناہ تڑپ میں سچی کہانیاں دل کو ٹھنڈک اور راحت دے گیا۔ دوستو میرا رابطہ سچی کہانیاں سے 17 سال پرانا ہے، یہ ایک بہت عظیم درس گاہ ہے۔ احوال میں تمام دوستوں کے خط دلچسپ اور مزے دار تھے، خاص طور پر نانی اماں کے خط میں بڑا مزہ آیا، کاشی بھائی اور تمام ساتھی ایک زوردار نعرہ لگائیں کہ تمام غیر حاضر ساتھی حاضر ہو جائیں، نہیں تو ایف آئی آر درج کرا دیں؟ جولائی کے تمام کہانی نگار اور آپ سب نے اپنی اپنی ذہانت، علم، لیاقت، محنت و لگن سے کامیابیوں کے جھنڈے لہرا دیے، کاشی بھائی آپ نے ایس ایم ایس کے کالم میں ہمیں فریدہ عالم بنا دیا، کیوں بھئی کیوں؟ آپ ایس ایم ایس کے ذریعے ہمارے تبصرے غائب نہیں بلکہ شائع کیا کریں، یہ ہمارا حق ہے نا؟ اور سچی کہانیاں رائٹر ایوارڈ کب آ رہا کوئی اعلان شلان نہیں ہوا۔

☆ بھائی فرید عالم بڑے شہروں میں کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے، ایس ایم ایس چیز ہی ایسی ہے مست مست۔ غیر حاضر احوال ساتھیو ہوشیار باش۔ فوراً واپس آ جاؤ، ورنہ...... فرید بھائی تمہاری ایف آئی آر...... جناب سچی کہانیاں رائٹرز انعامی کہانی کا سلسلہ شروع کیا جا چکا ہے، غالباً آپ نے جولائی کا شمارہ نہیں پڑھا، پڑھیے اور پھر تبصرہ بھیجیں، سترہ برس تو یوں گزر گئے جیسے سترہ لمحے، کیا خیال ہے آپ کا......؟



✉ ریحان آفاق، حیدر آباد سے شامل احوال ہیں۔ کاشی جی امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے، جولائی کے شمارے کا سرورق پہلے سے زیادہ اچھا تھا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ شمارے کو ہر لحاظ سے بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کر رہے ہیں، بلاشبہ آپ کے آنے سے ایک نکھار سا آ گیا ہے، اس کو قائم رکھیے گا۔ میری جانب سے محترمہ منزہ سہام اور آپ کو، بلکہ آپ کی پوری ٹیم اور سچی کہانیاں کے تمام لکھنے والوں کو بہت بہت عید مبارک۔

☆ بھائی ریحان آفاق! ہمت افزائی کا بہت شکریہ، احوال میں آپ کی آمد بہار کا جھونکا ہے۔ اسی طرح آتے

خوش خبری

میرے قاری دوستو اور لکھاری ساتھیو! جیسا کہ آپ لوگ جانتے ہیں کہ ماہنامہ سچی کہانیاں قاری اور لکھاری کے لیے ایسا ہر دل عزیز پرچہ ہے، جس میں ان کے دل کی عرضیاں اور من کی سچائیاں اشاعت پذیر ہوتی ہیں اور لکھنے اور پڑھنے والوں کے دلوں کی تسکین کا سبب بنتی ہیں۔ اس بات سے انکار تو ناممکن ہے کہ سچی کہانیاں لکھاریوں کے لیے حوصلہ افزا پرچہ ہے کہ جس میں بد سے بدتر تحریر بھی سجا سنوار کر پرچے کی زینت بنا دی جاتی ہے۔ سچی کہانیوں کو یہ اعزاز بھی سچی کہانیاں کو حاصل ہے کہ اس نے بے شمار لوگوں کو گوشۂ گم نامی سے نکال کر میدانِ نام وری میں لا کھڑا کیا ہے اور آج وہ صف اول کے لکھاری کہلاتے ہیں، یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔ سچی کہانیاں کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ وہ اپنے لکھاریوں اور قارئین کی حوصلہ افزائی کے لیے کوئی نہ کوئی سلسلہ جاری کرتا رہتا ہے۔ اب سچی کہانیاں کی جانب سے آپ تمام لوگوں کو یہ خوش خبری دی جاتی ہے کہ ادارہ کی جانب سے لوگوں کے بے حد اصرار پر دوبارہ سے انعامی سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے، جس میں پہلی کہانی کو 1500 سو روپے، دوسری کہانی کو ایک ہزار اور تیسرے نمبر پر آنے والی کہانی کو 700 روپے دیے جائیں گے۔ لیکن اس کے لیے ادارے نے ایک کوپن پالیسی وضع کی ہے، جس کے تحت کہانی چھپوانے کے لیے کوپن منسلک کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح جس کہانی کے بیے قارئین اپنی آراء اور پسندیدگی کے ساتھ سب سے زیادہ کوپن بھیجیں گے، وہ کہانی پہلے انعام کی مستحق ٹھہرے گی۔ اسی طرح آپ کو احوال میں اپنے خطوط چھپوانے کے لیے بھی خط کے ساتھ کوپن بھیجنا لازمی ہوگا۔ یاد رکھیے، ایسی کوئی کہانی یا خط ہرگز ہرگز قابل اشاعت نہ ہوگا جس کے ساتھ کوپن منسلک نہ ہوگا اور وہی کہانیاں انعام کی حق دار ہوں گی جن پر کوپن کے ذریعے پسندیدگی کا اظہار کیا گیا ہوگا۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے قاری و لکھاری حضرات اس ضابطہ کو ضرور اپنائیں گے اور اس سلسلے کو مزید آگے بڑھانے میں تعاون کریں گے۔

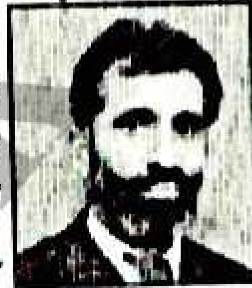
رہیں اور اپنے قلم کی خوشبو بکھیرتے رہیں۔

✉ مانسہرہ سے شازیہ گل شامل احوال ہیں۔ کاشی بھائی آداب، منزہ آپی کو خصوصی سلام۔ اُن کا بہت شکریہ جو انہوں نے اتنے عرصے بعد مجھ ناچیز پر نظر کرم کی۔ مجھے جب ڈاکیے کے ہاتھ ماہنامہ سچی کہانیاں ملا تو مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ میں اتنی خوش نصیب ہوں۔ 20 جون کو ہماری شادی کی سالگرہ ہے، تھینکس آپ نے اتنا انمول تحفہ بھیجا، بہت افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ اگست 20013 سے اب تک کوئی شمارہ نہیں پڑھ سکی۔ یہاں سے ملتے ہی نہیں، پہلے ملتے تھے مگر اب آنے بند ہو گئے ہیں۔ آج جب آپ کی طرف سے شمارہ ملا تو دل خوشی سے جھوم اٹھا، آپ نے میری کہانی شائع کی، مجھے بہت اچھا لگا اور حوصلہ افزائی بھی ہوئی، بہت جلد آپ کو اور بھی سچی کہانیاں بھجواؤں گی۔ سچی کہانیاں کے سرورق کی معصوم سی ماڈل بہت بھلی لگی۔ لگتا ہے شمارے میں بہت سی تبدیلیاں آئی ہیں، مگر میں نے ابھی تک سب سے پہلے اپنی لکھی کہانی کو دیکھا، یقین نہیں آ رہا تھا، بار بار دیکھا، پھر ملکہ پڑھی، ہمیشہ کی طرح بہت اچھی لگی۔ زندگی رہی تو انشاء اللہ دوسری بار تفصیلی تبصرہ کروں گی، بہر حال سچی کہانیاں کی ہر کہانی لاجواب ہوتی ہے اور کوشش کروں گی کہ سچی کہانیاں کی مستقل لکھاری بن سکوں۔ مجھے اچھی رائٹر اور شاعرہ بننے کا بہت شوق بھی ہے اور میرا خواب بھی، اُمید کرتی ہوں آپ میرے لیے اچھے رہنما ثابت ہوں گے۔

☆ شازیہ گل جی! انشاء اللہ آپ کا شوق بھی پورا ہوگا اور خواب بھی، بس آپ سچی کہانیاں سے جڑی رہیں اور اپنے قلم کو رواں رکھیں، آئندہ احوال میں جان دار تبصرہ بھیجیں۔ بھیرکنڈ میں رسالہ مانسہرہ شہر سے سپلائی ہوتا ہے۔ اگر آپ شہر تک رسائی کر لیں تو......

⊠ فیصل آباد سے فرحت صدیقی لکھتی ہیں، پیاری منزہ جی۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ، سچی کہانیاں 2 تاریخ کو اخبار والا دے جاتا ہے، بے حد دلکش شمارہ۔ "ممتا" پڑھ کر دل بے حد دُکھی ہوا۔ ہم کس دور میں زندہ ہیں۔ کچھ پتا نہیں؟ بیٹی تو اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔ کاشی چوہان کی کچھ اپنی باتیں پڑھ کر دل دُکھی ہو گیا تھا۔ ابھی اس دُکھ میں ہی تھے، کہ احوال میں محمد اسماعیل کے خط نے رُلا دیا۔ واقعی رشتے نبھانا ہر کسی کے بس میں نہیں۔ سچی کہانیاں کی ساری کہانیوں نے خاص طور پر حلالہ، شریک حیات، سلونی نے بہت متاثر کیا۔ "بیٹی بھی جلتی ہے۔" بہت تکلیف دہ، ساری کہانیاں اچھی تھیں۔ "منکشف" کی ہر قسط مزے کی ہوتی ہے، اگلی قسط کا انتظار ہے۔ اس میں جو ہسٹری ہوتی ہے وہ بہت متاثر کرتی ہے۔ "شریک سفر" نے بھی متاثر کیا، آپ بتائیں رخسانہ کیسی ہیں؟ ان کی باتیں بہت یاد آتی ہیں، اُن سے کہیے گا کہ اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھیے گا۔

☆ رخسانہ آپی خیریت سے ہیں، آپ کے لیے دعا گو ہیں، پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ۔



⊠ عبدالعزیز جی آ چکوال سے لکھتے ہیں۔ اچھے کاشی چوہان! 3 جولائی کو فریش پرچہ ملا، بتائیے کیا پڑھوں۔ دعا کرو عبدالعزیز جی آ مر جائے اور سچی کہانیاں ایوارڈ کا رولا مک جائے۔ میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو غم کے دریا بھی پی جائیں تو ہونٹوں پر احتجاج کی صدا بلند نہیں کرتے۔ اندر ہی شمع کی مانند پگھلتے رہتے ہیں اور حرف شکایت زبان پر نہیں لاتے۔ ذرا سوچو بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے جہاں نا انصافی ہو رہی ہو، میں پھٹ پڑتا ہوں، مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ میں حق کی آواز بلند کر کے خوشیوں کا جھولا نہیں جھول رہا، اذیت میں ہوں؟ مجھے افسوس ہے کہ بہت بے دردی کے ساتھ آپ میرے خطوط پر قینچی پھیرتے ہیں۔ کاشی یہ کام تو سابقہ ایڈیٹرز بھی کرتے رہے، آپ کچھ تو خیال کرتے؟ لیکن میں سمجھتا ہوں اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں۔ آپ نے مجھے بھی راضی رکھنا ہے اور اپنی نوکری بھی بچانی ہے۔ آپ نے لکھا کہ "چند ایک کو چھوڑ کر باقی تمام رائٹرز کی کہانیوں پر، ہم بڑی محنت سے نوک پلک سنوار کر سچی کہانیاں کے صفحات کی زینت بناتے ہیں۔ تو میرے بھائی یہ آپ کی ڈیوٹی ہے، آپ اسی کام کی تنخواہ لیتے ہیں اور (وہ جو چند ایک رائٹر ہیں) اُن کا تو حق نہ ماریں، اُن کی بددعائیں نہ لو۔ انہیں تو ایوارڈ دو...... پلیز۔ یوں بھی سچی کہانیاں سے اَب میں مستعفی ہونے والا ہوں جھوٹ فریب اور دھوکے باز دنیا کو آخری سلام کہنے والا ہوں۔ بہت ہو چکی اب میں تھک گیا ہوں میں نے اپنی زندگی کے خوب صورت ترین 20 سال جوانی کی عمر اس رسالے کی نذر کی، بتاؤ کاشی مجھے کیا ملا؟ مایوسی، محرومی، دھکے، ٹھڈے، تھپڑ...... یہ عزت ہے ہماری؟ خدا کی قسم اگر اتنی محنت اور لگن سے اپنے رب کی عبادت کرتے تو آج ہم اللہ کا ولی ہوتا۔ میدانِ حشر میں ان بے انصافوں کے میں گریبان پکڑوں گا۔ چھوڑوں گا نہیں، ان کو اللہ کی عدالت میں گھسیٹوں گا۔ عرصہ دراز سے کچھ لوگ مجھے بدنام کرنے پر کمر بستہ ہیں۔ اُن سے پوچھوں تو سہی میں نے کیا کیا ہے؟ کاش میری ملاقات اُن سے ہو جائے لیکن میں قیامت کے دن اُن کو چھوڑوں گا نہیں، منافق پرلے درجے کے۔ میں اُن دوستوں کو کبھی نہ بھولوں گا، جو اپنی محبتوں میں مجھے یاد رکھتے ہیں، اشفاق شاہین، طارق محمود آ کاش، شاہد فراز، فیصل ندیم بھٹی، ظفر اللہ رند، مور شاہد، ممتاز شفقت حسین، غلام رسول، جمیل میتلو، عظمیٰ شکور، عزیز مئے اور کاشی چوہان سب جیتے رہو۔ آئندہ انٹری میری آخری خط کے ساتھ ہوگی۔ خدا حافظ

☆ برادرم جی آ جی! تُساں کیوں مریے، مریں تہاڈے دشمن۔ ایوارڈ دا رولا مک گیا جی، سچی کہانیاں دا انعامی سلسلہ جاری ہو گیا ہے، تُساں اس بارے وچ کچھ نہ دسیا۔ میرے کول کوئی ایسی قینچی نہیں جو تہاڈے خطاں اُتے چلے۔ تُساں حق دی آواز ہو، اس گل وچ کوئی شک نہیں۔ پر اے وی تو سوچو، جس ویلے تسی نا ہوگے تو اے تہاڈے نکے نکے بچے بچیاں، شاگرد، جی آ استاد نو کتھے لبھیں گے، اس وقت ان کی رہنمائی کون کرے گا، بھائی جی آ جی! غصہ تھوکو، استعفیٰ واپس لو، آپ کی 20 سال کی زندگی نے جو 20 ہزار لوگوں کو جینے، سیکھنے، کچھ کر گزرنے، لکھنے پڑھنے اور عملی زندگی میں قدم رکھنے کا جو حوصلہ دیا ہے۔ یہی

آپ کی وہ عمر بھر کی کمائی ہے جن کی دعائیں آپ کو دونوں جہاں میں جنت کی بہاریں اور معطر فضائیں بخشنے کا وسیلہ بنیں گی، بلاشبہ آپ اس عمل سے اللہ کے ولی ٹھہرے کہ آپ کی ذات سے ایک دنیا نے فیض پایا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ کا رابطہ احوالیوں سے اسی طرح بحال و برقرار رہے گا۔ ہماری تمام احوالی ساتھیوں سے درخواست ہے کہ وہ ہمارے سینئر دوست، لکھاری اور قاری کا استعفیٰ نامنظور کردیں، کیوں کہ جب نگراں نہ رہے تو بھیڑیں راہ بھٹک جاتی ہیں، امید کہ جی آ جی اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں گے۔ شکریہ۔

✉ ڈیرہ غازی خان سے، ارم خان لکھتی ہیں اچھے بھائی ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ ایک بار پھر حاضر ہوں، میں جانتی ہوں اس بار خط کافی لیٹ ہے، لیکن پھر بھی بھیج رہی ہوں اگر ہو سکے تو مہربانی کر کے جگہ دے دیجیے گا۔ اس بار رسالہ کافی لیٹ ملا ہے 7 تاریخ کو، اتنا لیٹ کیوں، اگر ہو سکے تو بتا دیجیے گا، کچھ ماہ پہلے ایک تحریر بھیجی تھی، لیکن لگتا ہے ردی کی ٹوکری جی ہماری محنت کا نوالہ بنا کر نگل گئی ہے، کیا واقعی، اگر ایسا ہے تو پلیز ایک کہانی بھیج رہی ہوں، اسے اس بھوکی ردی کی ٹوکری سے بچالینا پلیز اور اس بار تو مجھے کہانیوں میں ضرور جگہ چاہیے۔

☆ ارم جی، حوصلہ رکھیں، ردی کی ٹوکری کا روزہ ہے آج کل، اس لیے...... آپ کی کہانیاں ہمارے پاس محفوظ ہیں، کوئی چیز لکھاری کی ضائع نہیں ہوتی، اگر وہ بروقت ملے اور معیار پر پورا اترے، دیگر کہانیاں بھی بھیج دیجیے، ہمیں سلیکشن میں سہولت رہے گی۔

✉ کھاریاں سے، چوہدری مدثر حسین شامل احوال ہیں، محترم ایڈیٹر سچی کہانیاں، السلام علیکم! اُمید واثق کہ آپ خیریت سے ہوں گے، سچی کہانیاں سے میرا تعارف معروف لکھاری عروبہ عدنان کے توسط سے ہوا۔ انہوں نے بتایا کہ آپ کا ڈائجسٹ مسلسل 31 برس سے اشاعت پذیر ہے اور اس کا شمار پاکستان کے پرانے ڈائجسٹوں میں ہوتا ہے۔ اپنے شوق مطالعہ کی وجہ سے اسے پڑھنے کا تجسس ہوا، لیکن بہت کوشش کے باوجود اپنے تین قریبی شہروں کھاریاں، ڈنگہ اور لالہ موسیٰ کے کسی بھی بک اسٹال، نیوز ایجنسی سے یہ ڈائجسٹ نہ ملا، جون کے آخر پر لاہور جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں تین چار جگہ سے پتا کرنے کے بعد ایک جگہ سے بالآخر سچی کہانیاں مل ہی گیا! سب سے پہلے فہرست پر نظر دوڑائی تو دو نام جانے پہچانے نظر آئے ارشد علی ارشد اور عروبہ عدنان۔ "جنت نظیر میرا کشمیر" عروبہ عدنان کی کہانی کشمیریوں کی جدوجہد آزادی کو نمایاں کرنے کی ایک عمدہ کوشش ہے، سلیم فاروقی کے ناول "آتش جنوں" کی قسط پڑھی، تجسس سے بھرپور ناول ہے۔ باقی میں سے کئی کہانیاں مجھے بے مقصد لگیں مثلاً بکھرا موتی چن لیا، ناگن، ادھوری محبت وغیرہ۔ کہاں آکے لٹے کارواں، پڑھ کر میں الجھن میں ہی رہا کہ رائٹر اس میں کیا پیغام دینا چاہ رہے ہیں، زیادہ تر کہانیاں صرف رپورٹنگ کے انداز میں ہوتی ہیں جنہیں پڑھ کر کوئی نئی سوچ، کوئی جذبہ اور کوئی تحریک جنم نہیں لیتی۔ کہانی اس انداز میں ہونی چاہیے کہ پڑھنے والے پر اپنا سحر طاری کردے اور اُسے کوئی مثبت تبدیلی پیدا کرنے پر اُکسائے، امید ہے کہ آپ اس طرف توجہ دیں گے اگر کوئی بات ناگوار گزری تو معذرت خواں ہوں، انشاء اللہ کوشش ہوگی کہ آئندہ بھی سچی کہانیاں پڑھتا رہوں، دعاؤں میں یاد رکھیے۔

☆ چوہدری مدثر حسین صاحب! آپ کا خط شاملِ احوال ہے۔ تبصرہ خوب ہے۔ آپ نے پرچہ نہ ملنے کی شکایت کی ہے تو وہ تمام احوالی جنہیں پرچہ نہ ملنے کی شکایت ہوتی ہے، وہ صرف شہر کا نام لکھتے ہیں۔ اگر وہ بک اسٹال کا نام، سیل فون نمبر، پوری معلومات فراہم کریں تو متعلقہ شعبہ فی الفور ان کی شکایت رفع کرے گا۔ آپ بھی بک اسٹال سے متعلق مکمل معلومات فراہم کریں۔ دوسری بات یہ کہ جب شکایت کنندہ سے متعلقہ شعبہ رابطہ کرتا ہے تو لوگ بات کرنے سے کتراتے ہیں، ایسا کیوں؟ جب آپ کی شکایت جائز ہے تو مکمل رابطے میں رہیں تاکہ شکایت کا ازالہ ہو سکے۔

✉ نسرین اختر لاہور سے لکھتی ہیں، بھائی کاشی چوہان السلام علیکم! یقیناً آپ، منزہ، آنٹی رخسانہ سہام مرزا صاحب اور دوسرے سب ساتھی رائٹرز بخیریت ہوں گے آپ سب کو رمضان المبارک مبارک ہو۔ میں ایک غزل اور نظم بھیج رہی

ہوں۔ اگر مناسب لگیں تو شائع کر دیں، میں نے ایک کہانی ''شفق القلب'' ارسال کی تھی، یقیناً وہ مل چکی ہوگی، اب ایک اور کہانی بھیج رہی ہوں، تاکہ پھر انشاء اللہ عید کے بعد لکھنے کا سلسلہ شروع کر سکوں۔ جون کا سچی کہانیاں پڑھ تو لیا تھا، مگر اب تبصرہ تو بہت پرانا ہو جائے گا، کیوں کہ یہ خط تو اب اگست کے شمارے ہی میں آجائے گا، اس لیے تبصرہ گول کر رہی ہوں، اور اب اجازت چاہتی ہوں۔

☆ نسرین اختر جی! جون کا تبصرہ اگر اگست میں لگے تو پرانا نہیں ہوتا، آپ نے تبصرہ نہ بھیجنے کا خوب بہانہ ڈھونڈا، حالاں کہ مثال تو ''دیر آید درست آید'' ہی دی جاتی ہے، بہر حال جان بوجھ کر تبصرہ لیٹ نہ کرنا احوالیوں، خیال رہے۔ آپ کو بھی رمضان کی تمام خوشیاں مبارک ہوں۔

✉ راولپنڈی سے محمد رضوان قیوم شامل احوال ہیں۔ محترم کاشی چوہان صاحب السلام علیکم، سب سے پہلے تو معذرت میں آپ کو خط TCS کے غلافہ میں تحریر کر رہا ہوں، وہ دراصل آج اتوار کا روز تھا، میں نے ٹائم کی شارٹیج کی وجہ سے اپنی کہانیوں کی کمپوز شدہ سی ڈی بھیجنی تھی، اس CD میں پر اسرار موڈ کی دو کہانیاں ہیں، سدرا۔ طویل کہانی ہے، ذرا سی غلطی، یہ دونوں سچی کہانیاں ہیں۔ میں نے راویوں سے سن کر لکھی ہیں۔ سدرا کہانی آج پڑھ کر ٹھیک کر لیں، یہ جلدی میں کمپوز کروائی ہے جبکہ ذرا سی غلطی کچھ تیار ہے، اس میں کوئی سقم ہو تو آپ بے شک قلم چلا لیں۔ (ذرا سی غلطی کا اصل مسودہ مل نہیں رہا ہے لیکن CD میں ہے) آپ کی خدمت میں اپنی تحریر شدہ کتاب کرب ماضی بھیج رہا ہوں، یہ ساری انعام یافتہ کہانیاں ہیں، جن پر انڈین اکیڈمی آف لیٹرز نے انعام دیا، جبکہ عبرت کسی ڈائجسٹ میں شائع نہیں ہوئی ہے۔

☆ بھائی رضوان قیوم! TCS کے غلافے پر لکھا گیا خط آپ کی سچی کہانیاں سے، سچی محبت کی دلیل ہے۔ آپ کی کہانی سدرہ کا پرنٹ تو مل گیا اور دوسری کہانی نہیں مل سکی، کیوں کہ آپ کی ارسال کردہ سی ڈی بالکل بلینک ہے، اس میں کوئی کہانی نہیں ہے، لہٰذا آپ ہمیں ''ذرا سی غلطی'' کا پرنٹ بھیج دیں۔ شکریہ



✉ سدرہ انور علی، جھنگ صدر سے شامل احوال ہیں بھیا کاشی چوہان، ڈیئر ریڈرز، رائٹرز اینڈ آل اسٹاف السلام وعلیکم! سچی کہانیاں ماہ جولائی کا پرچہ آپ کی جانب سے ملا۔ آپ نے میری کہانی شائع کر کے مجھے اچانک جو خوشی دی، وہ بیان نہیں کر سکتی اس کے لیے میں فون پہ آپ کا شکریہ ادا کر چکی ہوں۔ ایک بار میں پھر آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا۔ انسان کی تحریر میں اس کی شخصیت کا عکس نظر آتا ہے۔ آپ کی کچھ اپنی باتیں پڑھ کر بھی یہی احساس ہوتا ہے۔ میری طرف سے تمام اہلیان وطن اور سچی کہانیاں کو آزادی کی خوشیاں اور عید الفطر مبارک ہو، احوال میں تمام لکھنے والوں کے خطوط پسند آئے۔ رانا محمد شاہد بھیا، منشی محمد عزیز بھیا، خیریت غیر حاضری کی وجہ؟ زرینہ جونیجو آپی جان میں آپ کو بہت اونچی آواز میں پکار رہی ہوں، پلیز اب آجایئے یقیناً میری آواز آپ کی سماعتوں تک ضرور آئی ہوگی، ملکۂ احوال تحسین جونیجو جی آپ سے تو میں بہت ناراض ہوں، تصویر والی بات آپ ایسے گول کر گئیں جیسے زمین گول ہے۔ lam fit and u? سور شاہد حسین بھیا، غلام رسول گل، شفقت حسین بھیا، عمران بھیا، ندیم فیصل میں اللہ کرم سے ٹھیک ہوں آپ سب کیسے ہیں؟ عامر زمان عامر وعلیکم السلام، کیسے ہیں آپ ویریا؟ خط پسند کرنے کا شکریہ۔ عزیز انکل بے شک آپ سفید داڑھی والے بابا ہوں گے، لیکن میری دعا ہے کہ اللہ آپ کو میری زندگی میں ہمیشہ سلامت رکھے۔ آمین۔ جیجل معتلو، تحفظی شکور، بشریٰ سعید، ڈیئر سسٹرز السلام وعلیکم! منزہ آنٹی کا اداریہ، زندگی روٹھ گئی پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ کاشی بھیا کو پن اور انعام والی آپ کی وضع کی گئی پالیسی بہت پسند آئی، کوئی اپنا نہ رہا، وقاص حسین کی تحریر پسند آئی۔ کے الزام دوں زرینہ آپی بہت عرصے بعد ان کی تحریر پڑھی دل کو چھو گئی، غزل قریشی کی کلموہی، کشور وسیم کی مہراں، اپنے ہی دام میں کیسا مزہ چکھایا قدرت نے، عزل صدیقی کی پردہ، محمد عزیز بھیا کی زخموں کا مداوا، عبدالغفار کی سب جائز ہے، محمد علی سدوزئی کی حیات جاوداں، ممتاز احمد بھیا کی کھلاڑی، بہت سبق آموز تحریریں تھیں۔



پاکستان کی شان، قومی پہچان

سمیع اللہ خان

فتوحات کے قصے، سُنہری یادوں کے چمکتے حروف اور

آج کی کارگزاریاں۔

وہ محبوب کھلاڑی، جنہیں بین الاقوامی طور پر ''فلائنگ

ہارس'' اور ''ڈینجر مین'' کے خطابات سے نوازا گیا۔



بہت جلد:

دوشیزہ کے صفحات پر ایک یادگار ملاقات کی صورت ملاحظہ فرمائیے۔

اگست 2014ء

کوپن برائے احوال

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر مختصر تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کر رہا ر کر رہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کر لیں۔

نام: ________________

مکمل پتا: ________________

____

اگست 2014ء

کوپن برائے اشاعت کہانی

میں سچی کہانیاں میں اپنی کہانی اپنی تصویر کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیج رہا ر بھیج رہی ہوں۔ اسے کسی شمارے میں شاملِ اشاعت کر لیں۔

عنوان کہانی: ________________ تعداد صفحات: ________________

نام: ________________

مکمل پتا: ________________

____

فون ر سیل نمبر: ________________

اگست 2014ء

کوپن برائے پسندیدہ کہانی

میں سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی کہانی پر پسندیدگی کا اظہار کرتا ر کرتی ہوں۔ میری رائے میں

اوّل، عنوان: ________________ مصنف: ________________

دوم، عنوان: ________________ مصنف: ________________

سوم، عنوان: ________________ مصنف: ________________

نام: ________________ شہر: ________________

امجد جاوید کی فیض عشق پسند آئی۔ سخن آباد میں نثار احمد ظفر اللہ رند، ثانیہ بھٹی، فریدہ فری کی شاعری پسند آئی۔ کاشی بھیا میری تصویر چینج کردیں۔ اپنی نئی تازہ تصویر ارسال کردی ہے، میری تصویر دیکھ کر کچھ بہن بھائی طرح طرح کے اندازے لگاتے ہیں۔ کسی کو کھلاڑی تو کسی کو ننھی منی بچی لگتی ہوں۔ شاید کیپ کی وجہ سے ایسا لگتا ہے۔ تعریف اور تنقید سب کا حق، لیکن خیر چھوڑیں مجھے کسی سے کوئی گلہ نہیں۔ جانے انجانے میں میری کسی بات نے کسی کو ہرٹ کیا ہو تو معذرت۔ اس شعر کے ساتھ اجازت چاہوں گی۔

بستی چھوٹی ہے مگر آباد رہے گی — دل میں ہر دم تری یاد رہے گی
"احوال" کی محفل مجھے یاد رہے گی — میں بھول جاؤں گی سب کچھ مگر

☆ سدرہ جی آپ کا احوالیوں سے بھرپور خطاب، تصویر پر گلہ شکوہ، ساتھیوں سے ملاقات کی آرزو، خوب ہے۔ تصویر بدل دی گئی ہے، یہ تصویر آپ کی ماشاء اللہ چشم بددور، اب ہوں گے احوالیوں کے تبصرے بھرپور، انعامی پالیسی پسند کرنے کا شکریہ۔



✉ کراچی سے مسز نوید ہاشمی احوال میں شامل ہیں۔ بہت پیارے ساتھیوں السلام علیکم، رمضان کا بابرکت مہینہ آپ سب کو مبارک ہو۔ مجھے سچی کہانی کی ہر کہانی بے حد پسند آئی ہے، تمام اسٹاف اس ڈائجسٹ میں بہت کام کررہا ہے جو نظر آتا ہے۔ کہانی ہم لکھتے ہیں نوک پلک درست کرکے جان آپ لوگ ڈال دیتے ہیں۔ اپنے ہی دام میں، صفدر عباس اعوان کی اول لگی۔ تایا، خلیل احمد انجم کی دوم ہے۔ سوم نمبر پر بنوار اسلم قریشی کی کے الزام دوں۔ زرینہ جونیجو، کلموہی۔ غزل قریشی، مہراں، زخموں کا مداوا حمید عزیز مٹے، میں کون ہوں۔ سدرہ انور علی، کھلاڑی۔ ممتاز احمد، مکافات عمل۔ تاشفین خان تاشی، مقدر کی آگ۔ عاصمہ الیاس کی پسند آئی، ناگن۔ اعجاز احمد نواب کی بے حد شاندار جارہی ہے جون کی قسط نے ناگن میں چار چاند لگادیے۔ سخن آباد میں نذیر خان اور حکیم خان حکیم اینڈ صبا جرال کی پسند آئی۔ ثمیلہ تمہاری چوڑیوں نے کمال کردیا، تمہاری شاعری مجھے ہمیشہ پسند آتی ہے۔ ممتاز احمد سرگودھا کو عمرے کی بہت بہت مبارکباد پیش کرتی ہوں۔

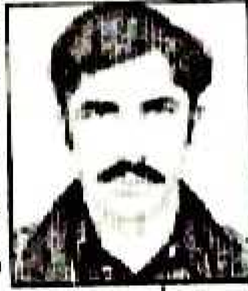
☆ مسز نوید ہاشمی صاحبہ! احوال میں آپ کی شرکت، کہانیوں کی پسندیدگی اور اسٹاف کی حوصلہ افزائی کا شکریہ۔ یہ اچھی بات ہے آپ نے کھلے دل سے اس بات کو تسلیم کیا کہ آپ لوگوں کی کہانیوں پر سچی کہانیاں کا اسٹاف نہ صرف اس کی نوک پلک درست کرکے اسے قابل اشاعت بناتا ہے، بلکہ بعض مرتبہ تو مکمل کہانی کو ری رائٹ بھی کرتا ہے جو کہ یقیناً رائٹرز کو نظر بھی آتا ہے لیکن وہ اسے اپنے دل کی سچائی سے نوک قلم پر نہیں لاتا، آخر کیوں؟ سچ تو سچ ہے احوالیو، بولنے میں کیا حرج ہے۔



✉ سرگودھا سے عظمیٰ شکور لکھتی ہیں، جناب ایڈیٹر صاحب آداب! آخر کار "سچی کہانیاں" بک اسٹالز پر نمودار ہوا، ایسے ہی جیسے رمضان کا چاند افق پر چمکا، سرورق پر خاتون زبردستی کی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے ملیں، صفحات پلٹنے پر اشتہارات نے سواگت کیا پھر "سچی کہانیاں" کے بانی سہام مرزا کی تصویر دیکھنے کو ملی، کاشی چوہان صاحب کی باتیں اپنی طرف متوجہ کرگئیں، سہام مرزا کی خدمات کو سراہتے بہت بولے اور خوب بولے، عامر زمان عامر صاحب کے خط میں ہمارا ذکر بہت شکریہ جی۔ ممتاز احمد صاحب کی لکھی تحریر "کھلاڑی" زبردست تحریر، آپ کو عمرہ کی مبارکباد، عبدالغفار عابد کی "سب جائز ہے" متاثر کن تھی، غزل قریشی صاحبہ کی کلموہی، محمد عزیز صاحب کی "زخموں کا مداوا" اچھی تحریر تھی۔ ایسی سبق آموز کہانیاں معاشرے کی بہت سی برائیوں کا خاتمہ کرسکتی ہیں۔ "ایک حقیقت ایک کہانی" ہائے عائشہ جی، اُس بے چاری کو

زندہ جلا ڈالا، کشور وسیم کی "مہراں" نے دل دکھا دیا۔ تخت آباد میں نثار احمد صاحب کا کلام خوب تھا۔ ریحان آفاق کی معصوم سی غزل بھی اچھی تھی، عمران فائق بھی اچھا بول گئے، احوال کے سب ساتھیوں کو میری طرف سے عید مبارک۔

☆ عظمٰی جی، احوال میں تبصرے کے ساتھ شرکت، بہت شکریہ۔



✉ لڈن ضلع وہاڑی سے منشی محمد عزیز مئے لکھتے ہیں، ڈیئر کاشی چوہان جی! سلام محبت 26 تاریخ کا بھیجا ہوا سچی کہانیاں سوموار 30 جون کو ملا۔ سب سے پہلے تو آپ سب کو ماہ رمضان اور ایڈوانس عید کی مبارکباد۔ سرورق والی محترمہ کی ہنسی باچھوں سے باہر چھلک رہی تھی۔ زخموں کا مداوا شائع کرنے کا بہت شکریہ۔ جی ہاں، سہام مرزا زندہ تھے اور زندہ رہیں گے جب تک دوشیزہ اور سچی کہانیاں ہیں۔ دوشیزہ ایوارڈ تقریب کی تصاویر سچی کہانیاں میں بھی ضرور لگائیں تاکہ ہم بھی ان ہستیوں کا تصویری دیدار تو کرلیں جن سے روبرو ملنا مشکل نظر آتا ہے۔ زندگی روٹھ گئی، اداریہ پڑھ کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھ گئے۔ تاشتمین خان تاشی، امجد جاوید اور ثانی فائزہ شہزاد کو دل کی گہرائیوں سے ویلکم، جی آیاں نوں، خوش آمدید۔ پرانے ساتھیوں کے نام دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ ثریا رانی سدرہ! آپ کے پاپا کا نام سید انور علی تو نہیں؟ میں کون ہوں، بہت زبردست تھی۔ غلام رسول کل! وعلیکم السلام، سلامت رہیں، شفقت حسین! الحمد للہ آپ سنائیں، بہت شکریہ یادگیری کا۔ ویلکم فرحت صدیقی فیصل آباد، آپ بھی ہمارے پرانے ساتھیوں میں سے ہیں۔ نسرین اختر نیناں! کیا بات ہے آپ کی تحریریں آج کل کم نظر آرہی ہیں، سچی کہانیاں میں؟ ادیب سمیع چمن صاحب تحریر اور تصویر ہر دو لحاظ سے بڑے غصے میں لگ رہے تھے۔ ملکہ احوال تحسین جونیجو! جو شخص مخلوق کا شکریہ ادا نہیں کرتا، وہ خالق کا بھی شکرگزار نہیں ہے اور میں ہرگز ایسا نہیں بننا چاہتا۔ محترم عبدالعزیز جی آصاحب! آپ سے ہونے والی ملاقات اور پرخلوص محبت میں مرتے دم تک نہیں بھول سکتا، عامر زمان عامر! کیا حال ہے پیارے بھائی۔ ویلکم ڈاکٹر طارق محمود آکاش صاحب، اشفاق شاہین! چلیے ایسا نہیں کہتے بلکہ یہ خط میں آپ کے لیے لکھ رہا ہوں کیا سمجھے؟ بقول غالب:

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ ۔ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

کاشی بھائی! کہانیوں پر انعام والا سلسلہ شروع کرکے آپ نے ہمارا مان بڑھا دیا، جس کے لیے ہم تہ دل سے آپ کے مشکور ہیں، اس سلسلے سے سچی کہانیاں کو مزید چار چاند لگ جائیں گے۔ کوئی اپنا نہ رہا، جاگیردارانہ نظام سے متعلق تھی۔ کسے الزام دوں پڑھ کر امبر کی ماں کی بے غیرتی پر شدید غصہ آیا۔ مہراں کی قربانی رائیگاں گئی، سب جائز ہے میں باکیشری کی سفاکی حیرت انگیز تھی۔ حیات جاوداں ایک شہید کی داستان تھی۔ ممتاز احمد کی کھلاڑی رانگ نمبر سے شروع ہونے والی موبائل کہانی جس کا انجام افسوسناک تھا۔ بنوارہ میری نظر میں اس ماہ کی بہترین تحریر تھی۔ امجد جاوید صاحب "فیض عشق" ساتھ لے کر آئے ہیں، چشم بددور امجد صاحب! جی آیاں نوں۔ سچ پوچھیے تو پرانے دوستوں کے نام دیکھ کر دل بہت خوش ہو گیا ہے۔ آخر میں ایک بات کہ انشاء اللہ عید 29 جولائی بروز منگل کو ہوگی۔ کوشش کیجیے گا کہ سچی کہانیاں عید سے پہلے ہم تک پہنچ جائے۔ رانا شاہد بتا رہے تھے کہ گزشتہ ماہ بھی بورے والا میں سچی کہانیاں نہیں آیا اور اس ماہ بھی، وجہ؟ خیریت تو ہے۔

☆ بھائی منشی عزیز مئے، آپ کا تبصرہ خوب ہے۔ انعامی سلسلہ پسند کرنے کا شکریہ۔ عزیز احوالی! بورے والا میں یا کسی جگہ جہاں پرچہ نہ ملنے کی شکایت ہو تو اس جگہ کے بک اسٹال کا نمبر، سیل فون ضرور لکھ کر بھیجیں تاکہ بروقت پرچے کی دستیابی کو ممکن بنایا جائے، دیگر یہ کہ شکایت کنندہ کو چاہیے کہ وہ متعلقہ شعبے سے رابطے میں رہے۔



✉ کوئٹہ سے شعبان کھوسہ شامل احوال ہیں، بندہ ناچیز کی طرف سے سچی کہانیاں کی پوری ٹیم کو سچی کہانیاں کے لکھنے پڑھنے والوں کو السلام علیکم! اس بار عروبہ عدنان، زرینہ آپی بہت زبردست کہانیاں لے کر آئیں۔ آپ کی کچھ اچھی باتیں دل کو چھو لینے والی ہوتی ہیں۔ مجھے آپ کی باتوں نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا۔ سچی کہانیاں پہلے سے پرفیکٹ جا رہا ہے، ہم سب آپ کے شکرگزار ہیں کہ آپ نے بلوچستان کے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی، ساحل ابڑو

صاحب مجھے خوشی ہوئی آپ میرے تنی سے ہو۔ اسلم آزاد صاحب ہمارے سینئر لکھاری ہیں، ان سے بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے ملک سچی کہانیاں تحسین جونیجو سچی کہانیاں میں ایک سلطان کا ہونا ضروری ہے کیا خیال ہے؟ وقت کی کمی کی وجہ سے تبصرہ نہیں کر رہا۔ انشاء اللہ اگلے مہینے بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گا، تب تک کے لیے اجازت چاہوں گا۔

کوئی غم مجھے چھو کے نہ گزرے ایسی کوئی دعا دے جاؤ تم

☆ برادر شعبان کھوسہ! احوال میں حاضری کا شکریہ۔ اب برابر حاضری لگاتے رہیے گا، شاید کہ سلطان کا عہدہ..... ہمارا مقصد ہر لکھاری کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔ سچی کہانیاں ہر قاری لکھاری کا پرچہ ہے۔ اہل بلوچستان ہمارے سر آنکھوں پر، ہمارے برادر ہیں۔ ان کی حوصلہ افزائی اگر ہم نہیں کریں گے تو کون کرے گا۔ بھائی اسلم آزاد، برادر ساحل ابڑو، بھائی شعبان کھوسہ، آپ تمام لوگ میرے اچھے لکھاری اور بڑے بھائی ہو، انشاء اللہ آپ سے قلمی رابطہ روز بروز مضبوط ہوگا۔



✉ ملتان سے، شامل احوال ہیں مجید احمد جائی، لکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو، سچی کہانیاں کے تمام اسٹاف، مدیر اعلیٰ منزہ سہام کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ میری طرف سے ڈھیروں عید کی خوشیاں مبارک ہوں۔ جب تک اگست کا تازہ شمارہ آپ کے ہاتھوں میں آئے گا تب عید گزر چکی ہوگی۔ جولائی کا سچی کہانیاں دو تاریخ کو موسم ساون کی بارشوں میں بھیگتا ہوا ملا۔ سرورق پر ہنستی مسکراتی حسینہ رمضان المبارک کی مبارک باد پیش کر رہی تھی۔ کمرشل سے ہوتے ہوئے "زندگی روٹھ گئی" منزہ سہام کے پاس پہنچے۔ ہر بار کی طرح بہترین اداریہ لکھا گیا۔ کچھ اپنی باتیں، کاشی چوہان سہام مرزا کے بارے لکھ رہے تھے۔ سہام مرزا کے لیے مغفرت کی ڈھیروں دعائیں۔ احوال میں سب سے پہلے، سدرہ انور سے ملاقات ہوئی۔ وہ ہر بار کی طرح اس بار بھی خوبصورت تبصرہ کر رہی تھی۔ ان کے بعد فائزہ شہزاد، عادل حسین، ثمینہ بٹ، مسز نوید ہاشمی، عظمیٰ شکور، ایم جے قریشی، پیاری جنجل متیلو، غلام رسول گل، غلام حسین، پیارے دوست ساحل ابڑو، امجد علی، شفقت حسین، نفیسہ فضل، فیض رسول، ظفر ابڑو، محترم جناب ریاض حسین شاہد، سر جی آپ اپنی فریش تصویر دیتے تو کیا بات تھی۔ یاد رکھنے کا شکریہ، عمران فائق، جاوید علی، طارق جاوید، ریحان آفاق، نسرین اختر، بہت پیارے موور شاہد حسین، ادیب سمیع چمن، کنول عمران خان، پکے سچے دوست، ہر دل عزیز لکھاری عبدالعزیز جی آ، سر جی اب تو کاشی بھائی کی بات مان لیں، احتجاج چھوڑ دیں اور نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کریں۔ پیارے صفدر علی حیدری، ظفر اللہ رند، فیصل ندیم بھٹی، مسکراتے عامر زمان عامر، بشریٰ سعید احمد، شاہد فراز، حنا بشریٰ، ڈاکٹر آکاش محمود اور اشفاق شاہین کے تبصرے اچھے تھے۔ انعامات کا سلسلہ شروع کرنے پر مبارک باد۔ یہ نئے لکھنے والوں کے لیے بڑی بات ہے۔ کہانیوں میں کے الزام دوں نے رلا ہی دیا۔ اپنے ہی دام میں صفدر علی اعوان زبردست تحریر تھی۔ مرد، کلموہی، کوئی اپنا نہ رہا، میراں، میں کون ہوں، مقدر کی آگ بہترین تحریریں تھیں۔ ارے واہ "تیرے انتظار میں" مجید احمد جائی کی کہانی بھی شامل حال ہے۔ یہ تو قارئین ہی بتائیں گے کہ میں کہانی کے ساتھ کہاں تک انصاف کر سکا۔ آتش جنوں، مصنفی خوبصورت انداز سے آگے کو بڑھ رہی ہیں۔ سخن آباد بھی بہترین سلسلہ ہے، آخر میں جناب مبارک علی شمسی، مبشر حسن اور ملک عاشق حسین ساجد سے کہوں گا کہ سچی کہانیاں میں اپنی حاضری مستقل بنائیں۔ آخر میں قارئین سچی کہانیاں اور تمام اسٹاف کے لیے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے دعا گو ہوں، اللہ تعالیٰ تمام جہان کی خوشیاں عطا فرمائے اور میرے وطن کو امن کا گہوارہ بنائے۔ آمین ثم آمین!

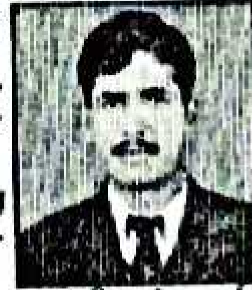
☆ بھائی مجید احمد جائی، تبصرہ خوب ہے، اداریہ کی پسندیدگی کا شکریہ۔ پرچہ آپ کو پسند آیا، ہماری محنت کارآمد رہی۔ سدرہ جیسی خوب صورت ہیں، ویسا ہی خوب صورت تبصرہ بھی کرتی ہیں۔ تمام لکھاری ہمارے لیے ہیرا ہیں اور ان کی تحریریں چاندی کی تختی پر سونے کے حروف۔ اس لیے ہمارے لیے ہر لکھاری اور ہر قاری محترم ہے۔ ہم کسی کی تحریر کو ضائع نہیں کرتے بلکہ حتی المقدور اسے بھی سنوار کر شائع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نئے اور پرانے لکھاری سب ہی

ہمارے لیے مقدم ہیں۔



✉ لاہور سے حنا بشریٰ شامل احوال ہیں، لکھتی ہیں امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے، آپ کو اور تمام اسٹاف کو میری طرف سے رمضان کی مبارکباد، پہلے تو بہت بہت شکریہ کہ میری کہانی آپ نے چھاپ دی۔ جولائی کا شمارہ ملا، ٹائٹل ہمیشہ کی طرح معمولی سا تھا، ایک فرمائش کرنی تھی، اداکارہ "صبا قمر" کا ٹائٹل بھی کبھی دیجیے گا۔ رسالے میں "خوش خبری" جو انعامات کے حوالے سے دی گئی ہے، اس کو پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ تحریریں سب کی بہت عمدہ تھیں، مگر "میں کون ہوں، عشق آتش، ہنوارا اور اپنے ہی دام میں" بلاشبہ رسالے کی جان تھیں۔ پڑھ کر مزہ آ گیا۔ "کلموہی، مہراں، مرد، زخموں کا مداوا، سب جائز ہے، مقدر کی آگ" زبردست تھیں۔ "کھلاڑی، تیرے انتظار میں، حیات جاوداں، ایک حقیقت کہانی" بھی بہت عمدہ تحریریں تھیں، اللہ پاک آپ کے ادارے کو اور ترقی عطا کرے اور جس خلوص سے آپ لوگ کام کر رہے ہیں، اللہ آپ کے اخلاص کو قبول فرمائے سب دیکھنے والوں اور پڑھنے والوں کو میری طرف سے رمضان کی مبارکباد۔

☆ حنا بشریٰ جی! پسند سب کی اپنی اپنی ہے، کل کو صبا قمر کے ٹائٹل پر بھی لوگ اسی طرح تبصرہ کریں گے، صبا قمر کا ٹائٹل اور انٹرویو ہم کچھ عرصہ قبل چھاپ چکے ہیں۔ کہانیوں کی پسندیدگی کا شکریہ، کہانی آپ کی چھپتی رہے گی، قلمی رابطہ مضبوط رکھنے کی ضرورت ہے۔



✉ فیصل ندیم بھٹی، سرگودھا سے لکھتے ہیں محترم جناب کاشی چوہان و قابل احترام منزہ سہام صاحبہ، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس ماہ مقدس کے صدقے آپ کو صحت و تندرستی عطا فرمائے اور کراچی شہر میں امن قائم ہو جائے آمین۔ ماہ جولائی کا شمارہ میرے سامنے ہے۔ زندگی روٹھ گئی، اداریہ منزہ سہام صاحبہ کا کراچی کے حالات کے بارے میں عکاسی کر رہا ہے۔ کچھ اچھی باتیں پڑھ کر اس دور کی تیز ترین ایجادات کے بارے میں آگاہی ہوئی، واقعی آپ نے تو سچ کہا ہے کہ علم کبھی مرتا نہیں، لیکن انسان ختم ہو جاتا ہے اس لیے ہمیں علم ضرور حاصل کرتے رہنا چاہیے مرتے دم تک۔ کہانی کوئی اپنا نہ رہا، وقاص حسین کی قابل تعریف ہے۔ زرینہ جونیجو کی کے الزام دوں ایک ماں کے روپ میں ڈائن دکھائی دیتی ہے۔ کلموہی غزل قریشی کی عورت کی داستان بہت ہی قابل قدر ہے۔ مرد اچھی کہانی ہے۔ سب جائز ہے دولت کی ہوس انسان کو اندھا کر دیتی ہے، حیات جاوداں ایک سپاہی کی لازوال کہانی ہے۔ آتش جنوں سلیم فاروقی، اچھا سلسلہ جا رہا ہے۔ سدرہ انور علی کی "میں کون ہوں" فقیرنی کے روپ میں مجرم کا کردار بہت ہی پسند آئی ہے۔ ممتاز احمد صاحب کی کہانی کھلاڑی نے تو کمال ہی کر دیا۔ نظر کا دھوکا، مکافات عمل بھی اچھی کہانیاں ہیں۔ احوال میں سدرہ انور علی، عبدالعزیز جی آ، حنا بشریٰ، عظمیٰ شکور کے خطوط بہت پسند آئے۔ سدرہ جی عید مبارک۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ مبشر حسن احوال میں اب آ جایئے نہ کہاں غائب ہیں۔ صائمہ شاہین، شاہنوں کے شہر میں نجانے کہاں گم ہیں۔ احوال میں شرکت کریں نا۔ تمام ٹیم کو اور قارئین کو سلام، میری کہانی کب شائع ہو گی؟ ایک اور کہانی بھیج رہا ہوں مل جانے پر رسید دے دینا۔

☆ بھائی فیصل ندیم! کراچی شہر میں امن ضرور قائم ہو گا۔ دعا کرتے رہیں، کہانیوں کی پسندیدگی کا شکریہ، آپ کی کہانی جلد شائع ہو گی۔ بلا کسی عنوان کے ہمیں مل گئی ہے، کہانی کا عنوان ضرور لکھا کریں۔

✉ رحیم یار خان سے فرخندہ بتول لکھتی ہیں۔ پیارے کاشی بھیا، السلام علیکم! سب سے پہلے آپ کو اور سچی کہانیاں کے تمام قارئین کو رمضان کی، ساتھ میں عید کی بھی ایڈوانس مبارکباد۔ آپ نے کوپن والا اور کہانیوں پر انعام کا سلسلہ دوبارہ شروع کر کے بہت اچھا کیا، لیکن آپ ساتھ میں ہمارے خط ملنے کی تاریخ بھی بڑھا دیں، کیوں کہ رسالہ بہت دیر سے موصول ہوتا ہے، اتنے میں آپ کو خط ملنے کی تاریخ نکل جاتی ہے۔ اس دفعہ شاید رمضان شروع ہونے کی خوشی میں ذرا جلدی موصول ہوا۔ اس لیے خط لکھنے کی جسارت کر رہی ہوں۔ ویسے تو 4 یا 5 تاریخ سے پہلے نہیں ملتا۔ اس دفعہ آج دو

جولائی کو موصول ہوا تو ابھی خط لکھنے بیٹھ گئی کہ ایسا نہ ہو کہ آپ کو میرا خط موصول نہ ہو اور میری محنت پر پانی پھر جائے۔ اب اگر یہ رسالہ جلدی موصول ہو گیا ہے تو یہ اللہ کی حکمت ہے۔ اس لیے مجھے اپنے خدا پر بھروسا ہے کہ میری محنت پر پانی نہیں پھرے گا اور یہ خط ردی کی ٹوکری کی زینت نہیں بنے گا۔ میں نے جو تصویر بھیجی ہے، یہ میرے والد صاحب کی ہے۔ یہ بیمار رہتے ہیں، ان کے لیے دعا دیں، اللہ ان کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ مجھے اس شمارے کے سب تبصرے پسند آئے۔ سلسلے وار کہانیوں میں ابھی صرف آتش جنوں پڑھی ہے، اپنے ہر خط کے ساتھ تصویر بھیجنی لازمی ہے یا نہیں۔ خط کو اس دعا پر ختم کروں گی کہ سچی کہانیاں دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے۔ آمین ثم آمین۔

☆ فرخندہ جی! سچی کہانیاں انعامی سلسلہ کی پسندیدگی کا شکریہ۔ خط کی تاریخ بڑھانا ممکن نہیں۔ کوئی بھی خط ہماری یہاں ردی کی ٹوکری کی زینت نہیں بنتا، ویسے بھی آج کل اس کا روزہ ہے۔ پر اسرار کہانی کی وصولی کا وقت گزر چکا، آپ لیٹ ہو گئیں، آپ کے والد کی صحت کے لیے ہم دعا گو ہیں اور اپنے قارئین سے بھی درخواست کریں گے کہ وہ ان کی صحت یابی کے لیے دعا کریں۔ محفل میں آپ کی آمد کا شکریہ، قلمی رابطہ مضبوط کریں۔



✉ کاشف عبید کاوش، بٹہ موری بگرام سے شامل احوال ہیں۔ جناب کاشی اور دانیال شمسی صاحب خوش رہو، امید ہے سچی کہانیاں کا پورا اسٹاف بھی خیریت سے ہوگا۔ جولائی کا شمارہ 1 تاریخ کو ملا۔ ویلڈن...... زبردست شمارہ تھا، معمول کے مطابق جلدی جلدی میں احوال اور چند کہانیاں پڑھ پایا ہوں، اداریہ منزہ صاحبہ نے بہت اچھا لکھا، کچھ اپنی باتوں میں آپ نے سہام مرزا کی محنت و مشقت کا ذکر کیا۔ تو بے اختیار آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انعام یافتہ کہانیوں والا سلسلہ پھر سے شروع کیا بہت اچھا کیا، ڈبل سرورق والا سلسلہ ختم کر کے اچھا کیا۔ سخن آباد میں تمام لکھاریوں کی تحریریں اچھی رہیں۔ مجھے شاعری کا ایک لفظ بھی نہیں آتا، ورنہ میں بھی ارسال کرتا۔ کسی دوسرے شاعر کی شاعری بطور انتخاب میں ارسال کروں کیا چلے گا، ادارے میں۔ پلیز شمارے عید سے 3 یا 4 دن پہلے ارسال کریں، کیوں کہ عید کے دنوں میں ڈاک خانہ بند ہوتا ہے، پھر بہت لیٹ ہو جائیں گے۔ سلسلے وار کہانیاں اچھی جا رہی ہیں، شمارہ بھی خوب سے خوب تر ہوتا جا رہا ہے۔ اب میرے قلم میں پہلے سے زیادہ نکھار آ رہا ہے۔ آخر میں تمام قارئین کو عید مبارک والسلام۔

☆ کاشف عبید! تمہاری کہانیوں میں نکھار سچی کہانیاں کے ان ممبران کی بدولت ہے جو اس پر کام کر کے اسے اس قابل بناتے ہیں۔ کسی دوسرے شاعر کا کلام تو دور، ان کا کوئی مصرع یا شعر بھی کسی کے نام سے شائع نہیں ہوگا۔ رائٹرز و شعراء اپنی تخلیق بھیجیں، تمہارا کارڈ ملا شکریہ۔



✉ ثمینہ ناز کراچی سے شامل ہیں کاشی چوہان بھائی امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے، منزہ آنٹی کا اداریہ "زندگی روٹھ گئی" موجودہ دور کی عکاسی ہے۔ "کچھ اپنی باتیں" کاشی بھائی سہام مرزا کے ساتھ ساتھ آپ کو بھی لوگوں کے دل تسخیر کرنے کا فن خوب آتا ہے۔ احوال میں فائزہ شہزاد المعروف نانی کا خط مزہ دے گیا، کیا واقعی میں یہ نانی ہیں؟ یا نانی والے کام کیے ہیں۔ "کوئی اپنا نہ رہا" زمیندار سسٹم پر مبنی دل سوز تحریر ہے۔ سدرہ انور علی کی "میں کون ہوں" اس ماہ کی پہلی ٹاپ کلاس کہانی ہے۔ اسلم قریشی کی "بٹوارا" دوسری، تیسری بہترین کہانی زرینہ جونیجو کی "کسے الزام دوں" ہے۔ عائشہ صدیقہ کی "ایک حقیقت ایک کہانی" عبدالغفار کی "سب جائز ہے" محمد علی کی "حیاتِ جاوداں" عائشہ وسیم کی "وہ باتیں تیری" پڑھ کر اپنے دادا جی یاد آ گئے۔ مجید احمد جائی کی "تیرے انتظار میں" پڑھ کر ایک اور روپ دیکھنے کو ملا۔ کشور وسیم کی "مہران" بڑی دل سوز، محمد عزیز میمن کی "زخموں کا مداوا" بڑی نصیحت آموز۔ محمد مزمل کی "مرد" لفظوں کی بنت کاری بہت لاجواب۔ ممتاز احمد کھلاڑی بہت شاندار بڑی عبرتناک تحریر۔ عشق آتش بس اچھی تھی حنا بشریٰ کی "نظر کا دھوکا، مقدر کی آگ، بڑی عبرت انگیز کہانی۔ سدرہ انور علی! اللہ پاک اس مہینے کے صدقے آپ کو صحت اور لمبی عمر عطا

فرمائیے۔ تحسین جونیجو! آپ کی پارٹی بھی گرما گرم مسالے دار رہی ایسا تو ہوتا ہے ایسے کاموں میں، نظم کی پسندیدگی کے لیے بہت شکریہ۔ زرینہ جونیجو! احوال کی محفل آپ کے دید کی منتظر ہے۔ تحسین جونیجو، ظفر علی ابڑو، عامر زمان اور اشفاق شاہین نظم کی پسندیدگی پر بہت شکریہ "سخن آباد" میں غزل فریدہ فری، نذیر خان، ریحان آفاق، عمران فائق، صبا جرال، جنجل میتلو، تمثیلہ لطیف اور نظموں میں ثانیہ بھٹی کی تخلیقات نے دل کو چھولیا۔ سچی کہانیاں سے وابستہ ہر فرد کو ڈھیروں پھولوں کے ساتھ "عید مبارک"

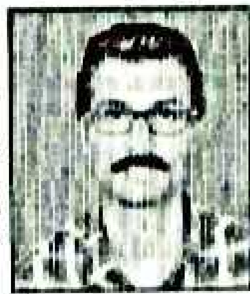
☆ثمینہ جی! کہانی ضرور شائع ہوگی۔ انتظار و امید کا دامن تھامے رہیں اور رابطہ میں رہیں، احوال میں شرکت ضرور کریں۔

✉ سیالکوٹ سے ثانیہ ثانی لکھتی ہیں، کاشی سر امید ہے آپ اور تمام اسٹاف خیریت سے ہوں گے، اللہ پاک ہمیشہ خوش رکھے ابھی چند دن پہلے ہی میں MSc پارٹ ون کے امتحانات دے کر فارغ ہوئی ہوں، پچھلے مہینے بہت زیادہ پڑھائی کی مصروفیت کی وجہ سے سچی کہانیاں کو ٹائم نہ دے پائی، خیر اب دونوں شمارے سکون سے پڑھوں گی۔ آپ میری کہانیاں کیوں نہیں شائع کرتے؟ میں ہر بار حسرت سے اپنا نام تلاش کرتی ہوں، پر ہر بار مایوسی ہوتی ہے۔ شاعری تو آپ شائع کرتے ہیں اس کے لیے بہت بہت شکریہ، پلیز اسٹوری بھی کردیں...... سچی کہانیاں کے تمام قارئین اور اسٹاف کو میری طرف سے بہت سی نیک تمنائیں اور میری شاعری پسند کرنے کا بہت بہت شکریہ، میرے خط کا ضرور جواب دیجیے گا، اللہ حافظ

☆ثانیہ جی! سب سے پہلے تو ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں کہ آپ بہترین پوزیشن لے کر ایم ایس سی پاس کریں، اب فارغ ہیں تو سچی کہانیاں سے رابطہ مربوط و مضبوط کرلیں۔ مایوس نہ ہوں، جلد ہی اسٹوری بھی شائع ہو جائے گی۔

✉ شائستہ جمال کراچی سے لکھتی ہیں۔ معزز قارئین اور خوب صورت تحریریں لکھنے والوں کو میرا پُرخلوص سلام...... شعبان کے مہینے میں عمرہ کی سعادت نصیب ہوئی۔ واپسی پر ایک ہنستے مسکراتے چہرے (سچی کہانیاں) نے میرا استقبال کیا۔ سفر کی ساری تھکن ختم...... سب سے پہلے میں منزہ صاحبہ اور کاشی صاحب اور ان سب لوگوں کی مشکور ہوں جنہوں نے میری آمد کو سراہا۔ مسز نوید ہاشمی اور عامر زمان عامر غزل پسند کرنے کا شکریہ، رسالے کے ابتدائیہ میں منزہ سہام کی "زندگی روٹھ گئی" پڑھ کر آنکھیں نم ناک ہوگئیں۔ کاشی صاحب نے اپنی باتیں میں دورِ جدید کی سہولیات کا ذکر کرتے ہوئے جس طرح سہام مرزا کے کام کو سراہا وہ قابلِ تعریف ہے۔ احوال میں قدم رکھتے ہی سارے اپنے ہی لوگ نظر آئے، ایسا لگا ہی نہیں کہ میں اس محفل میں نئی ہوں۔ سدرہ انور علی آپ جتنی اچھی تبصرہ نگار ہیں، اتنی ہی اچھی رائٹر بھی ہیں اور شاعرہ بھی۔ آپ کی کہانی "میں کون ہوں" دل کو چھوگئی۔ احوال میں عبدالعزیز جی آپ کی نصیحت آموز باتیں اور تحسین جونیجو کا پیار بھرا انداز بہت اچھا لگا۔ ممتاز احمد صاحب آپ کو عمرے کی مبارکباد اور زرینہ جونیجو کو سالگرہ مبارک۔ وقاص حسین کی کوئی اپنا نہ رہا، صفدر عباس اعوان کی اپنے ہی دام میں۔ مرد محمد مزمل کی، زخموں کا مداوا۔ محمد عزیز مے اور عبدالغفار عابد کی سب جائز ہے، بہترین تخلیق ہیں۔ ممتاز احمد کی کھلاڑی زبردست، حنا بشریٰ کی نظر کا دھوکا سچائی پر مبنی خوب صورت تحریر تھی۔ سلسلے وار کہانیوں میں ارشد علی ارشد کی شکستنی نمبر ون ہے۔ سخن آباد میں تمام شعراء کا کلام پسند آیا، خاص کر نثار احمد، فریدہ فری، ظفر اللہ رند، سدرہ انور علی کی شاعری لاجواب تھی۔ خاص کہانی کا انداز ہی بہت خاص ہوتا ہے، دوسری قسط کا انتظار ہے۔ رمضان کا مہینہ ہم سب کے لیے ڈھیروں خوشیاں لائے، آمین۔

☆شائستہ جمال جی! ہماری طرف سے آپ کو عمرہ کی سعادت مبارک ہو۔ اداریہ اور کہانیوں کی پسندیدگی کا شکریہ، اب محفل میں قدم جما کے رکھیے۔



✉ کراچی سے عادل حسین لکھتے ہیں، پیارے کاشی جی! السلام علیکم! امید ہے مزاج بخیر ہوں گے، رخسانہ آنٹی اور منزہ آپی کو بھی سلام اور ڈھیروں دعائیں، دانیال شمسی جی کو مدیر کی حصہ داری مبارک۔ جولائی کا شمارہ مسکراتی ہوئی ماڈل کو ٹائٹل پر سجائے ملا۔ منزہ آپی کی باتیں ہمارے دل کی ہی باتیں ہیں۔ محترم سہام مرزا صاحب کا پورٹریٹ دیکھ کر دل خوش ہوگیا، ساتھ میں اپنی باتیں پڑھ کر بھی، جو کہ سہام صاحب کی محنتوں کو محبتوں بھرا سلام تھا۔ بے شک سہام صاحب کی ادب سے محبت اور

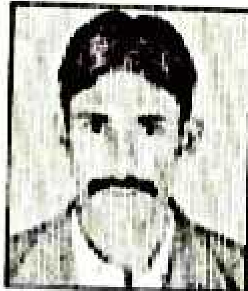
خدمت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔احوال کی محفل ہمیشہ کی طرح ہی جاندار تھی۔جس جس نے میری کہانی پر اظہار خیال کیا ان سب کا شکریہ۔اللہ پاک ممتاز احمد صاحب کے عمرے کو قبول فرمائے۔وقاص حسین کی کوئی اپنا نہ رہا انتہائی خوب صورت انداز میں پیش کی گئی۔زمینداری سسٹم جانے کتنے معصوموں کی جانیں لے گا۔بہن زرینہ جونیجو جی کی بچ میں عبرت انگیز تھی۔غزل قریشی کی کلموہی بہت زبردست تھی۔کشور نسیم جی کی مہراں پڑھ کر دل دکھی ہو گیا۔صفدر عباس اعوان کی اپنے ہی دام میں، محمد مزمل کی مرد بھی بہت اچھی تھی۔زخموں کا مداوا محمد عزیز مئے کی ایک اچھی تحریر، سب جائز ہے عبدالغفار عابد جی کی کہانی بھی دل دہلا گئی۔حیات جاوداں محمد علی سدوزئی جی کی پیش کش جو کہ ہمارے شہید بھائی کی داستان تھی۔پڑھ کر دل دکھی بھی ہوا لیکن سینہ فخر سے چوڑا بھی کہ ہمارے ملک کی حفاظت ٹھیک ہاتھوں میں ہے۔آتش جنوں، ناگن، ملنصی سب ٹھیک چل رہے ہیں۔سدرہ انور علی کی میں کون ہوں بہت زبردست لگی۔تین مرد تین کہانیاں میں تینوں کہانیاں اچھی ہیں۔کھاڑی ممتاز احمد کی موبائل کے غلط استعمال پر تھی۔عشق آتش محمد کاشف مغل کی ایک محبت کے مارے عاشق کی دردانگیز داستان اور خلیل احمد انجم صاحب کی تاپا سب سے بہترین، نظر کا دھوکا بہن حنا بشریٰ کی ایک خوب صورت تحریر۔حنا بہن مبارک ہو۔آپ کا انداز بیاں بھی اچھا لگا۔سخن آباد بھی حسب سابق خوب صورت سجایا گیا ہے۔خاص کہانی پر رائے اگلے پرچے میں دوسری قسط پڑھ کر باقی بس اتنا ہی کہ کاشی بھائی اور دانیال بھائی مل کر اسے کو مزید اچھا کر دیں۔اپنا خیال رکھیے گا۔زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی۔اللہ حافظ

☆ ڈیئر عادل اعتباری محفل میں آمد اور کہانیوں کی پسندیدگی کا شکریہ۔



✉ مور شاہد حسین، قمبر شہداد کوٹ سے لکھتے ہیں۔کاشی چوہان بھیا امید ہے آپ سمیت پورا اسٹاف خیر و عافیت سے ہوں گے۔جولائی کا تازہ شمارہ ملا، ٹائٹل کچھ خاص نہیں تھا۔دانیال شمسی صاحب ویلکم۔اداریہ زندگی روٹھ گئی شہر کراچی سمیت ملک بھر کو خدا نظر بد سے بچائے آمین۔کچھ اپنی باتیں مرحوم سہام مرزا کی برسی کے حوالے سے لکھی گئی، ان جیسے عظیم و باہمت لوگ بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔فائزہ شہزادو نانی جی "خیر رانطے، امجد علی بھیا سلام آداب کیسے ہو؟ شفقت حسین جی شکریہ۔فیض رسول کہانی کی باری آنے تک مجھے بھی انتظار ہے۔غلام رسول گل یہ دوستی تا قیامت رہے؟ غلام حسین کیسے ہو جناب، اوی تحسین جونیجو آپ یہ سوال پہلے بھی کر چکی ہیں۔اس لیے اتنا ہی کافی ہے پسند اپنی اپنی، ظفر علی ابڑو اور ڈاکٹر ایس وفا بھی گلے لگ جاؤ یار سدا سلامت رہو۔فیصل ندیم بھٹی بھیا شکر الحمدللہ ہم ٹھیک ہیں آپ سنائیں، باقی تمام نئے احوالیوں کو ویلکم اور سینئرز کو سلام دعائیں اور ہاں مجھے بھی دعاؤں میں یاد رکھا کرو؟ کہانیوں میں سب سے پہلے پسندیدہ سلسلہ آتش جنوں پڑھا۔انکل سلیم فاروقی کی خدمت میں سلام آداب۔تین مرد تین کہانیاں ممتاز احمد کھلاڑی، کاشف مغل آتش عشق، خلیل احمد انجم تاپا، خوب صورتی سے پیش کی گئی۔نظر کا دھوکا حنا بشریٰ، بنوارا اسلم قریشی، تیرے انتظار میں مجید احمد جائی ایک سے بڑھ کر ایک شعلہ تھا۔ویلڈن۔وقاص حسین کوئی اپنا نہ رہا، غزل قریشی کلموہی، کشور وسیم مہراں، ملک صفدر عباس اعوان اپنے ہی دام میں، محمد مزمل مرد، محمد عزیز مئے زخموں کا مداوا، عبدالغفار عابد سب جائز ہے عمدہ تحریریں تھیں۔محمد علی سدوزئی حیات جاوداں شہید مقیم احمد کی بہادری کو سلام۔ملنصی، ناگن اچھی جا رہی ہیں۔پردیسی کہانیاں تاشفین خان تاشی مکافات عمل، عاصمہ ایاس، مقدر کی آگ، عائشہ صدیقہ ضمیر ایک حقیقت ایک کہانی نے چونکا دیا۔میری رائے میں اول امجد جاوید کی فیض عشق، دوم اوی زرینہ جونیجو کی کسے الزام دوں، سوم سدرہ انور علی کی میں کون ہوں، انعام کی حقدار ہیں۔سخن آباد میں سب کی شاعری اچھی تھی، کسی ایک کا نام لینا دوسروں سے زیادتی ہے۔

☆ ڈیئر مور شاہد حسین آپ کی احوال میں آمد اور بھرپور تبصرہ بہت شکریہ۔



✉ شفقت حسین، حب چوکی سے شامل احوال ہیں۔آج کل اس تیز رفتار دور میں یہ بہت بڑی بات ہے کہ ہم اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر آپ کو خطوط لکھتے ہیں اور آپ بھی اپنی بے پناہ مصروفیات میں سے وقت نکال کر بڑی محبت و اپنائیت کے ساتھ ہمیں خوب صورت مشورہ

سے نواز کر جواب دیتے ہیں۔ سچی کہانیاں کے مطالعے کی ابتدا میں ہمیشہ محفل احوال سے ہی کرتا ہوں کیوں، کہ یہ دل کو بہت بھاتی ہے۔ جو واقعی محبتوں کا رشتہ اور خوب صورت رابطوں کا ذریعہ ہے، یوں لگتا ہے جیسے یہ ایک کنبہ ہے اور ہم سب لکھنے والے اس کے افراد ہیں۔ جولائی کے شمارے میں خود کو پا کر بے حد خوشی ہوئی اس نوازش کا تہ دل سے شکریہ۔ امجد علی اور مور شاہد حسین بھیا خدا آپ کو صحت و تندرستی عطا فرمائے۔ غلام رسول گل، غلام حسین، ظفر علی ابڑو کیسے ہو؟ کاشی بھیا میں سچی کہانیاں دل و جان سے پڑھتا ہوں، تمام کہانیاں اچھی ہوتی ہیں میں پرچے کے بارے میں یہی کہوں گا کہ آپ نے اچھے انتخاب سے جولائی کا تازہ شمارہ سجایا، سارا شمارہ دل کو بھایا تعریف کے لیے الفاظ نہیں، دلچسپ اور سبق آموز تحریریں پڑھ کر دل باغ باغ ہوا۔ آخر میں سچی کہانیاں کے تمام چاہنے والوں کے لیے زندگی، صحت، سلامتی اور سکون کی پرخلوص دعاؤں کے ساتھ۔ اللہ حافظ

☆ برادر شفقت حسین احوال کی محفل آپ کی ہے، اسے آپ لوگوں نے ہی سجانا ہے۔

✉ ڈاکٹر ایس وفا۔ لاڑکانہ سے لکھتے ہیں، بھیا کاشی چوہان سدا سلامت رہو آمین۔ احوال میں یہ میری دوسری شرکت ہے اس کی خاص وجہ مور شاہد حسین اور غلام رسول گل بھائی کی محبت و اپنائیت ہے۔ ہر بار سچی کہانیاں میں کچھ نہ کچھ لکھنے پر مجبور کرتے ہیں لیکن کیا کریں۔ وقت ملتا ہی نہیں، میں ہمیشہ مشکور و ممنون ہوں کہ آپ نے احوال میں تھوڑی سی جگہ دی۔ اداریہ زندگی روٹھ گئی حقیقت پر مبنی تحریر تھی کچھ اپنی باتیں مرحوم سہام مرزا کی یاد تازہ کر گئی۔ اگست کا پراسرار نمبر ہوگا یہ بڑی خوشی کی بات ہے، شدت سے انتظار ہے۔ مور شاہد حسین اور غلام رسول گل کی کامیابی کے لیے ڈھیر ساری دعائیں، خدا آپ کو تمام سچی کہانیاں خوشیاں نصیب کرے۔ آمین۔

☆ بھائی ڈاکٹر ایس وفا، احوال میں اپنی تیسری شرکت بھی یقینی بنائیں، پھر چوتھی، پانچویں بھی اور پھر...... مستقل احوالی ہو جائیں۔



✉ غلام رسول گل، جیکب آباد سے احوال میں شامل ہیں۔ سچی کہانیاں کا مقام اور معیار آپ جس طرح بلند سے بلند کر رہے ہیں۔ اس پر خوشی کے اظہار کے ساتھ مزید کامیابی کی دعائیں۔ خط خاصی تاخیر سے لکھ رہا ہوں اس کی وجہ سچی کہانیاں کا بروقت پر نہ ملنا ہے۔ اس بار جولائی کا تازہ شمارہ 05 جولائی کو موصول ہوا۔ جب کہ ہر ماہ 29 کو مل جاتا تھا۔ حسب عادت پرچہ ملتے ہی محفل احوال کی جانب لمبی چھلانگ لگائی۔ ارے یار واہ اپنے ساتھ چھوٹے بھائی غلام حسین کو پا کر خوشی سے دل جھوم اٹھا۔ امجد علی بھیا آپ ہمیشہ دعاؤں میں یاد رہتے ہیں۔ شفقت حسین ہم ٹھیک ہیں آپ سنائیں، ظفر علی ابڑو صاحب کیسے ہو؟ ظفر اللہ رند واہ بھئی واہ آپ پرچہ ہمارے شہر سے لیتے ہیں اور ملتے بھی نہیں، مور شاہد حسین دو چار قدم ہمارے ساتھ بھی چلو نا؟ ڈاکٹر ایس وفا کی آمد بے حد اچھی لگی۔ زندگی روٹھ گئی اور کچھ اپنی باتیں دل کی آنکھ سے پڑھی ان کے بارے میں کیا لکھوں تعریف کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ تخن آباد میں اسے میں نے ہی لکھا تھا اور مان لو خاص طور پر پسند آئی باقی تمام غزلیں نظمیں اچھی تھیں پسند آئیں۔ مصروفیات کے باعث چند ہی کہانیاں پڑھی ہیں جن کے بارے میں اتنا ہی کہوں گا اپنی مثال آپ تھیں، امید ہے باقی کہانیاں بھی دلچسپ اور سبق آموز ہوں گی۔ اب اجازت زندگی رہی تو انشاء اللہ اگلے ماہ ان ہی صفحات پر ملاقات ضرور ہوگی، خدا حافظ

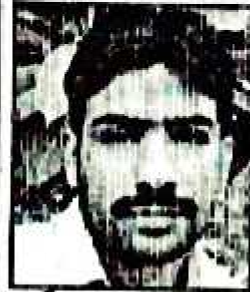
☆ بھائی غلام رسول، ہوئی جو تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا۔



✉ غلام حسین، جیکب آباد سے لکھتے ہیں۔ کاشی چوہان بھیا آپ کی خدمت میں سلام دعائیں اور نیک تمنائیں جولائی کا شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے، ٹائٹل اچھا ہے، زندگی روٹھ گئی کراچی کے امن و امان کے لیے دل سے بے اختیار دعا نکلی، کچھ اپنی باتیں واقعی سہام مرزا ایک عظیم انسان تھے۔ محفل احوال میں 45 افراد نے بھرپور شرکت کی اور 12 ایس ایم ایس کے ذریعے شامل ہوئے 14 جج پر 10 نمبر سیٹ میری تھی۔ بے حد شکریہ۔ بڑے بھائی غلام رسول گل اور

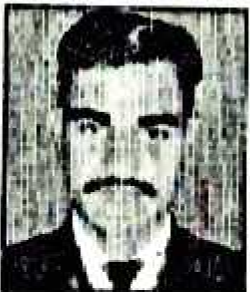
مور شاہد حسین کی خدمت میں سلام۔ آپ دونوں سدا خوشیاں بانٹتے اور سمیٹتے رہیں آمین۔ فیض رسول کی کمی محسوس کرنے کا شکریہ۔ پراسرار نمبر کا اشتہار دیکھ کر ماہ اگست کے شمارے کا خاص انتظار ہے، خدا آپ کو سدا کامیاب کرے آمین، وقت کی کمی اور مصروفیات کے باعث احوال ہی پڑھ پایا ہوں، باقی شمارہ زیرِ مطالعہ ہے، جس کے لیے دلی معذرت اب اجازت۔

☆ اچھے سے غلام حسین، تمہارا احوالی تجزیہ خوب ہے۔



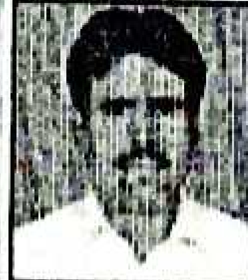
✉ امجد علی، چیچہ وطنی آباد سے احوال میں شامل ہیں۔ مدیر اعلیٰ منزہ سہام اور مدیر کاشی چوہان دانیال شمسی السلام علیکم، امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ 03 جولائی کو چمکتا دمکتا سچی کہانیاں دوپہر کے وقت بہار کی مانند موصول ہوا۔ ماڈل سے ہیلو ہائے ہوئی، اشتہار نظر انداز کرتے ہوئے منزہ سہام کے اداریہ زندگی روٹھ گئی اور کچھ اپنی باتیں پڑھیں بے مثال تحریریں ہیں، محفل خوبصورتی سے سجی ہوئی تھی، ہر ماہ خط کے ساتھ تصویر شائع کرنے پر عین نوازش، مور شاہد حسین، شفقت حسین، ظفر علی ابڑو، غلام رسول گل، سدا خوش رہو آمین۔ ملتفی کی اگلی قسط کا انتظار ہے، ناگن اچھی جارہی ہے۔ سلسلہ خاص آتش جنون بہت سنسنی خیز جگہ پر اختتام کیا، بہت دلچسپ سلسلہ ہے۔ فریدہ فری، ریحان آفاق، محمد ارشد فرہاد، تمثیلہ لطیف، غزالہ جلیل راؤ کی غزلیں اچھی تھیں بے حد پسند آئیں۔ نثار احمد کوئی تو ہو، ارم خان کیوں وفا کروں میں، ظفر اللہ رند آخر کیوں، ثانیہ شانی مان لو، ادیب سمیع چمن اظہار دوستاں، سدرہ انور علی اسے میں نے ہی لکھا تھا، خولہ عرفان کیا کچھ سیکھا تھا، جگنل میتلو کاری، حکیم خان حکیم محبت راس نہ آئی، صبا جرال دل درد کا مارا، عنبرین نعیم ان سب کے علاوہ خیال تھے شاعری دل کو بہت بھائی ہے۔ آخر میں کاشی بھائی اپنا اور تمام احوالیوں کا خیال رکھیے گا۔

☆ برادر امجد علی احوال میں شرکت مبارک ہو۔



✉ ظفر علی ابڑو۔ ملیر کراچی سے لکھتے ہیں، یکم جولائی کو سچی کہانیاں ملا۔ سرورق اچھا تھا۔ منزہ جی کا اداریہ زندگی روٹھ گئی اور آپ کی کچھ اپنی باتیں کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ کوئی معنی نہیں رکھتے۔ محفل احوال بڑے پیار سے سجاتے ہیں آپ کے خلوص و محبت سے بھرپور جواب پڑھ کر دل خوشی سے سرشار ہوجاتا ہے آپ کی محنت ورق ورق سے نظر آرہی ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر جگہ سچی کہانیاں کے چرچے ہیں، دعا ہے کہ آپ کی ادارت میں سچی کہانیاں دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرے۔ امجد علی بھیا اور غلام رسول گل خدا کے کرم سے میں ٹھیک ہوں دعاؤں میں یاد رکھا کرو جی۔ مور شاہد حسین خدا آپ کی زندگی میں ہمیشہ آسانیاں فرمائے آمین۔ باقی تمام احوالیوں کو سلام۔ تمام سچ بیانی کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھی۔ آتش جنوں بہت دلچسپی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ تین مردتین کہانیاں سمیت دیس پردیس سے موصول ہونے والی کہانیاں بے مثال تھیں۔ ناگن اور ملتفی اچھا سلسلہ ہے۔ سب کی شاعری دل کو بھاگئی، کاشی بھائی میری تصویر والے پرچے 7-6 دوستوں اور رشتے داروں کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں۔ تمام بڑے چھوٹے، بہن بھائیوں اور دوستوں کو دل کی گہرائیوں سے عید مبارک۔

☆ سائیں ظفر علی ابڑو، پرچہ تمہیں پسند آیا۔ شکریہ۔ دوستوں اور رشتے داروں کے ہاتھوں کی تعداد بڑھنی چاہیے۔



✉ چیچہ وطنی سے ہمارے قاری اور لکھاری دوست عبدالغفار عابد رقم طراز ہیں، جولائی کا شمارہ میرے ہاتھ میں ہے، ثمینہ بٹ، مسز نوید ہاشمی، عظمیٰ شکور، جگنل میتلو، سدرہ انور علی، فائزہ شہزاد، نفیسہ صاحبہ، مومنہ بتول، فرحت صدیقی صاحبہ، نسرین اختر نینا، تحسین جونیجو، کنول عمران خان، بشریٰ سعید احمد اور رضا بشریٰ صاحبہ آپ یقین مانیے آپ خواتین کی عظمت اور محبت کو سلام۔ اس تعداد کو دیکھ کر پتا چلتا ہے کہ ہمارا سچی کہانیاں کتنا مقبول ہے۔ منزہ باجی کا زندگی روٹھ گئی اور کاشی چوہان کا کچھ اپنی باتیں اپنی مثال آپ ہیں۔ کہانیوں پر تبصرے سے پہلے میری کہانی سب جائز

ہے شائع کرنے پر شکریہ۔ سچ بیانیوں میں زخموں کا مداوا، اپنے ہی دام میں اور کلموہی زبردست رہیں۔ سدرہ انور علی کی میں کون ہوں کمال کی تحریر تھی۔ ممتاز احمد نے کھلاڑی لکھ کر اپنا لوہا منوالیا۔ عشق آتش، تاپا، نظر کا دھوکا، تیرے انتظار میں بھی پسند آئیں۔ امجد جاوید کا فیض عشق کمال رہا۔ باقی کہانیاں اوسط درجے کی رہیں۔ سخن آباد میں سب کا کلام خوب رہا، ناول میں تینوں اچھے جارہے ہیں، اچھا بھائی اب اگلے ماہ ملاقات ہوگی۔

☆ بھائی عبدالغفار عابد! محفل میں آمد، کہانیوں کی پسندیدگی اور مختصر مگر خوب صورت تبصرہ پر شکریہ۔ آپ کی شرکت مستقل رہنی چاہیے۔

✉ محمد اسماعیل بروہی نواب شاہ سے شامل احوال ہیں۔ کاشی چوہان بھیا کیسے ہیں آپ اور منزہ آپی کیسی ہیں؟ جولائی کا شمارہ ہاتھ میں ہے، خوب صورت آنکھوں والی ماڈل اچھی لگی۔ اداریہ پڑھ کر دکھ ہوا، میں تو کہتا ہوں کہ اس کے ذمے دار بھی کراچی کے لوگ ہیں، ان میں آپس میں بھائی چارہ نہیں ہے، احوال کی محفل خوب جمی تھی، پیارے دوست مور شاہد آپ کے چند الفاظ نے بہت بڑا حوصلہ دیا، غلام رسول بھائی اللہ آپ کو بھی خوش رکھے، اچھی تحسین جونیجو دکھ کی گھڑی میں ساتھ دینے کا شکریہ۔ عزیز انکل آپ کے خط میں ہمارا نام کیوں نہیں ہے؟ امجد علی بھائی آپ سے دوستی کرنے کو دل چاہتا ہے۔ کوئی اپنا نہ رہا، کلموہی، میراں اور کسے الزام دوں بہترین کہانیاں تھیں۔ زخموں کا مداوا اور سدرہ انور علی کی کہانیاں بھی لاجواب تھیں۔ آخر میں غلام حسین، ساحل ابڑو، جاوید علی کو سلام پیش کرتے ہیں۔ کاشی بھیا ہم ایک سچی کہانی لکھ رہے ہیں، جوں ہی تیار ہوگی روانہ کریں گے۔

☆ برادر اسماعیل بروہی! احوال میں آمد کا شکریہ، تبصرہ خوب ہے، کہانی کا انتظار ہے۔



✉ سرگودھا سے ممتاز احمد لکھتے ہیں۔ پیارے کاشی بھائی السلام علیکم! ماہ جولائی کا اعزازی شمارہ موصول ہوا، سب سے پہلے میں آپ کا تہ دل سے ممنون و مشکور ہوں کہ آپ نے محبت، چاہت اور خلوص بھری مبارک باد دی۔ اللہ کریم کا بہت بڑا احسان اور فضل و کرم ہے کہ اس کی توفیق اور حضور نبی کریم ﷺ کے نعلین پاک کے صدقے سے عمرہ ادا کرنے اور اپنے آقا کریم رحمت دو عالم ﷺ کی بارگاہ میں عاجزی، انکساری اور ادب کے ساتھ حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔ کروڑ ہا مرتبہ شکر ہے اُس پاک ذات کا۔ سچی کہانیاں کی پوری ٹیم سدا شاد و آباد رہے۔ سچی کہانیاں کو دن دوگنی رات چوگنی ترقی عطا ہو۔ آمین۔ کاشی بھیا سچ پوچھیے تو حقیقت میں دل اور روح تو مدینہ میں ہی رہ گیا ہے بس مادی جسم واپس آگیا ہے۔ صحن حرم میں سجدے، عظمت، جلال، رعب اور شان والے بیت اللہ کا طواف، حجر اسود کے بوسے، مقام ملتزم سے چمٹنا، وہ خوب صورت دلکش نظارے، وہ روحانی وجدانی، پرکیف معطر فضائیں سبحان اللہ، خدا کی قسم مدینہ تو بہت میٹھا اور پیارا ہے۔ فضاؤں میں اس قدر تقدس، سکون اور ادب ہے۔ تاجدار مدینہ سرکار دو عالم ﷺ کا لطف و کرم، ہر لحہ برستی رحمتیں اپنے غلاموں پر کرم نوازیاں وہاں سے کوئی بھی خالی ہاتھ نہیں آتا۔ سرکار کی عطا سے سب جھولیاں بھر کے لاتے ہیں۔ اداریہ میں منزہ سہام نے کراچی کے حوالے سے ایک تلخ حقیقت اور تصویر پیش کی ہے۔ خدا کرے بہت جلد کراچی بلکہ پورا ملک امن و سکون کا گہوارہ بن جائے۔ آمین۔ آپ کی کچھ اپنی باتیں روح میں اُتر جاتی ہیں۔ آپ نے سہام مرزا کو بہت خوب صورت خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ سچ کہا آپ نے سہام مرزا دلوں میں زندہ ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ ادارہ نے ایوارڈ کا قصہ تمام کردیا ہے، آس کا ٹمٹماتا چراغ گل ہوگیا۔ لکھاریوں میں مایوسی پھیل جائے گی، آئندہ کے لیے جو کوپن سسٹم شروع کیا گیا ہے وہ مناسب نہیں ہے۔ کہانیوں پر انعام ضرور دیں، مگر کوپن کے ذریعے نہیں پہلے کی طرح جو لکھاری اپنی رائے اور پسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں تو اسی تناسب سے اول، دوم اور سوم آنے والی کہانیوں کا تعین کیا جائے، بلکہ کم از کم چھ کہانیوں کو انعامی لسٹ میں رکھیں تو زیادہ بہتر ہے۔ اس سے لکھاریوں کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ سب سے پہلے فائزہ شہزادالمعروف نانی کو احوال میں خوش آمدید۔ سدرہ انور علی آپ کا بہت شکریہ، آپ نے سالگرہ کی مبارکباد دی۔ عظمیٰ شکور

صاحب آپ کی احوال میں آمد ہر بار منفرد انداز میں ہوتی۔ بھائی مور شاہد حسین اللہ کا شکر ہے میں ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہیں؟ میرا اسلام قبول فرمائیں۔ بھائی فیصل ندیم بھٹی آپ کی چاہت بھری پُر خلوص مبارکباد کا بہت شکریہ۔ بھائی غلام رسول، وعلیکم السلام جناب کیسے ہیں آپ......؟ محمد شہزاد کنول، فریدہ جاوید فری، کراچی کی ثمینہ ناز، ننڈو جام کے پیر نوید شاہ، لاہور کی عطیہ زہرا، ظفر علی حیدری اور کراچی کی اُم عادل بھئی آپ سب لوگ احوال سے کیوں غائب ہیں؟ جلدی سے احوال میں شامل ہو کر محفل کی رونق بڑھائیں۔ ماہ جون اور جولائی کے دونوں شمارے زیر مطالعہ ہیں، جون کے شمارہ میں چھپنے والی کہانی "حلالہ" روح میں تو نہیں اُتری البتہ روح کو زخمی کر گئی۔ خواہشات نا آسودہ، خارزار ہے زندگی، پانچ پریاں، خواہشوں کا اسیر، شریک سفر، نصیب کی بارش اچھی کہانیاں تھیں۔ ماہ جولائی میں شائع ہونے والی کہانی "کوئی اپنا نہ رہا" ایک روایتی کہانی تھی۔ "کسے الزام دوں، کلموہی، مہراں اور اپنے ہی دام میں اچھی کہانیاں تھیں۔ "عشق آتش" نے تھوڑا غمگین کر دیا، حنا بشریٰ کی "نظر کا دھوکا" بہت عمدہ اور شاندار کہانی تھی۔ اسلم قریشی کی "بٹوارہ بہت زبردست کہانی تھی، بہت پسند آئی۔ محمد عزیز مئے کی "زخموں کا مداوا" اچھی کہانی تھی۔ تمام قارئین، ملکھاریوں اور سچی کہانیاں کی پوری ٹیم کو عید الفطر کی مبارکباد قبول ہو۔ اب اجازت اس پیغام کے ساتھ کہ "زندگی دو دن کی ہے اسے دو ہی اصولوں سے گزاریں۔ رہو تو پھولوں کی طرح، بکھرو تو خوشبو کی طرح۔ انشاءاللہ اگلے ماہ حاضری ہوگی...... تب تک اللہ نگہبان۔

☆ برادر ممتاز احمد! احوال میں شرکت، خوب صورت تحریر اور پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ، ایوارڈ کا چراغ گل نہیں ہوا۔ آپ مایوسی کی باتیں نہ کریں، انعامی کوپن کا سلسلہ آگے کی راہ متعین کرے گا۔

✉ کراچی سے اشفاق شاہین شامل احوال ہیں۔ سرورق بہترین تھا، منزہ سہام کی "زندگی روٹھ گئی" کراچی کا المیہ ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ کراچی کی رونقیں اور امن بحال ہو جائے۔ کاشی چوہان کی اپنی باتیں، بہترین اظہاریہ ہیں سہام مرزا سے محبت کا اور حقیقت بھی ہے جو کاشی نے کہا۔ بہت عرصے بعد خود کو احوال میں دیکھا تو عجیب سی خوشی کا احساس ہوا، اب دیکھتے ہیں کہ یار لوگ کھلے بازوؤں کے ساتھ گلے سے لگاتے ہیں یا...... قبول تو کرنا پڑے گا آپ کو ہمیں، کیوں کہ اب ہم جانے والے تو ہرگز نہیں۔ ہماری طرح فائزہ شہزاد بھی عرصے بعد وارد ہوئیں، انداز تو اچھا ہے، جی آیاں نوں جی! سدرہ انور، عادل حسین، مور شاہد، تحسین جونیجو کے خط بہترین تھے۔ ایم جے قریشی اللہ آپ کی والدہ کو صحت کاملہ سے نوازے۔ رضوان آرئیں، خوش آمدید، وقاص نے "کوئی اپنا نہ رہا" میں خوب جوہر دکھائے قلم کے گڈ۔ زرینہ جونیجو "کسے الزام دوں" کے ساتھ، بہترین تھی۔ غزل قریشی "کلموہی" زبردست۔ "مہراں، اپنے ہی دام میں، مرد" خوب رہیں۔ "زخموں کا مداوا" عزیز مئے بہترین سبق آموز تحریر لے کر آئے وری گڈ۔ عبدالغفار عابد "سب جائز ہے" میں لفظوں کے موتی بکھیر رہے تھے۔ "حیات جاوداں" موجودہ دہشت گردی اور آپریشن کے تناظر میں شہداء کے لواحقین کی حوصلہ افزائی کے لیے ایک بہترین کوشش ہے۔ "آتش جنوں" سلیم فاروقی صاحب اپنے ساتھ قاری کو بھی لے کر چلتے ہیں، بہترین کہانی ہے۔ "میں کون ہوں" سدرہ انور نے خوب صورت انداز میں فقیر کی آپ بیتی بیان کی۔ "ناگن" سے ہمیں تو ڈر لگتا ہے بچی اور اسی طرح پراسرار کہانیوں سے بھی۔ مرد کہانی "کھلاڑی" میں ممتاز احمد نے موبائل کو مورد الزام ٹھہرایا۔ "عشق آتش اور دنیا" بھی بہترین کہانیاں رہیں۔ ملکھنی اور ارشد علی ارشد کا انداز بیاں بہت خوب ہے۔ شعلہ ساماں تحریریں تینوں ہی خوب تھیں، خصوصاً مجید احمد جائی کی۔ "مکافات عمل، مقدر کی آگ اچھی تھیں اور خاص کہانی "فیضِ عشق" امجد جاوید کے قلم کا شاہکار ہے۔ بہترین، انتظار رہے گا اگلی قسط کا۔ سخن آباد میں حکیم خان حکیم، عنبرین نعیم، صبا جرال اور سدرہ انور کی شاعری دل کو چھو گئی۔ کاشی بھائی بہترین اشعار کا سلسلہ کیا دوبارہ شروع نہیں ہو سکتا؟ کہانیوں پر انعامات کا اعلان بہترین فیصلہ اور اچھی خوش خبری ہے۔ تمام دوستوں کی نذر ایک شعر کے ساتھ ہی اجازت

پڑے تھے پاؤں میں چھالے ہزار ہا لیکن تمہاری راہ میں آنکھیں بچھا بچھا کے چلے

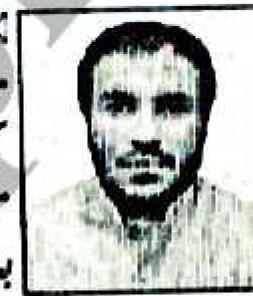
☆ اشفاق شاہین! اب آ گئے ہو تو احوال چھوڑ کر ہرگز نہ جانا، ہم نے تمہیں بڑے زوروں...... گلے لگایا ہے۔

تبصرہ خوب ہے، پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ۔



✉ کھاریاں سے کرن ناز شامل احوال ہیں، جناب کاشی چوہان السلام علیکم ماہنامہ سچی کہانیاں کا تازہ شمارہ ماہ جولائی کی 2 تاریخ کو ہمارے گھر کی دہلیز پر اپنا پیارا قدم رکھ چکا تھا۔ سرورق سے لے کر آخر تک ہر تحریر اپنی مثال آپ تھی۔ سخن آباد میں نثار احمد حسرت، ظفر اللہ رند، ثانیہ ثانی، سدرہ انور علی اور عنبرین نعیم اے ون رہے۔ باقی دوستوں نے بھی اچھا لکھا۔ میں عرصہ 2 سال سے سچی کہانیاں کی مستقل قاری ہوں، لیکن پہلی بار شرکت کر رہی ہوں، امید ہے کہ حوصلہ افزائی کریں گے۔ کاشی بھائی! آپ پرچے میں شعروشاعری اور اقوال زریں بھی شائع کیا کریں۔ ماہنامہ سچی کہانیاں بہت اچھا اور سب سے منفرد ہے۔ ماہنامہ سچی کہانیاں کی پوری ٹیم کی محنت نے پرچے کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ میری اور میری فرینڈز زونیہ، انیشہ، تعظیم اور مہرین کی طرف سے ماہنامہ سچی کہانیاں کی ٹیم، دوستوں اور کاشی بھائی کو ایڈوانس عید مبارک۔ دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

☆ کرن ناز جی! محفل میں آپ کی شرکت اور پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ۔ محفل میں اپنی اور اپنے دوستوں کی شرکت کو لازمی بنائیں۔ شعروشاعری کو چار صفحات پر ہم شائع کرتے ہیں، پرچے کو بغور پڑھا کریں۔ آئندہ تبصرہ ضرور بھیجنا۔



✉ اوچ شریف سے صفدر علی حیدری لکھتے ہیں۔ ڈیئر کاشی چوہان! السلام علیکم! خیریت موجود...... خیریت مطلوب۔ سہام فیملی، اسٹاف ممبرز، قلم کار ساتھیوں اور قاری دوستوں کی سلامتی کی امید اور دعا کے ساتھ عرض خدمت ہے کہ اس بار بھی ''سچی کہانیاں'' حسب معمول دیر سے ملا (30 جون)۔ ہم سہام مرزا کو واقعی نہیں بھولے اور آپ کے کالم کے بعد تو کبھی نہیں۔ اللہ انہیں غریق رحمت کرے، آمین۔ ہم انکی محنت اور محبت کو سلام پیش کرتے ہیں۔ آپ نے ان کے حوالے سے کالم لکھ کر گویا اپنی عقیدت اور جذبات کو بہت خوبصورت اظہار کیا ہے وقاص حسین کی خوبصورت کہانی ''کوئی اپنا نہ رہا'' پڑھ کر لاہور کا واقعہ پھر تازہ ہو گیا۔ جانے حوا کی بیٹی کب تک یہ ظلم سہتی رہے گی؟ ''کسے الزام دوں'' ایک اچھی کہانی تھی۔ ''کلموہی'' میں انیلا کی داستان غم پڑھ کر دکھ بھی ہوا اور حیرت بھی۔ ''مہراں'' ایک معیاری تحریر تھی۔ ''اپنے ہی دام میں'' پڑھ کر ایک مشہور مصرعہ یاد آتا رہا...... لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا...... مزمل صدیقی کی کہانی ''مرد'' ایک خاصے کی چیز تھی۔ بعض جملے واقعی بہت دلکش تھے۔ اگر افسانوی طرز سے نہ لکھتے تو کہانی کی اثر پذیری بہت بڑھ جاتی۔ محمد عزیز مے کی ''زخموں کا مداوا'' ایک اچھی تحریر تھی۔ ''سب جائز ہے'' نے ایک بار پھر یہ حقیقت عیاں کی کہ سب جائز کہیں بھی نہیں ہوتا۔ ''حیات جاوداں'' ایک اچھی رپورٹ تھی۔ کاش یہ کہانی ہوتی...... ''وہ باتیں تیری'' معصوم جذبات کا اچھا اظہار یہ تھی۔ مسز سدرہ انور کی ''میں کون ہوں'' ایک شاندار کہانی تھی۔ ''کھلاڑی'' ایک عمدہ تحریر تھی۔ ''عشق آتش'' ایک مختصر مگر بڑی جاندار تحریر تھی۔ مغل صاحب کو ڈھیروں داد...... ''تایا'' ہمارے منافقانہ سماجی رویوں کی عکاس ہے۔ ''نظر کا دھوکا'' ایک ایمان افروز کہانی تھی۔ حنا بشریٰ کو بہت سی داد۔ میرے خیال میں ''بٹوارا'' جولائی کے شمارے کا حسن تھی۔ اسلم قریشی اس بار بازی لے گئے، بہت سی داد...... اپنے دوست مجید احمد جائی ملتانی کی خوبصورت تحریر ''تیرے انتظار میں'' کی نذر یہ شعر:

قرب کے نہ جفا کے ہوتے ہیں
جھگڑے سارے انا کے ہوتے ہیں

''مکافات عمل'' بڑی پر اثر تحریر تھی۔ بہت پسند آئی۔ ''مقدر کی آگ'' اور ''ایک حقیقت ایک کہانی'' بھی اچھی لگی۔ میری نظر میں پہلی تین بہترین کہانیوں کی ترتیب کچھ یوں ہے۔ 1 بٹوارا...... 2 عشق آتش...... 3 مکافات عمل،

کاشی بھائی! اس بار مختصر تبصرہ تھا آپکو قینچی چلانے کی زحمت نہ ہو۔ اس سے مختصر تبصرہ میرے بس میں نہیں۔ سب دوستوں کو سلام۔ اور عید مبارک

☆ برادر صفدر علی اگر قینچی سے بچنا چاہتے ہیں تو اسی طرح مختصر احوال بھیجتے رہیں۔

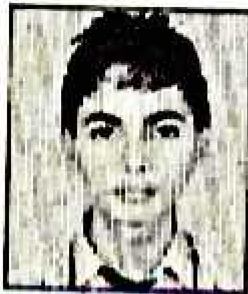


✉ زرینہ جونیجو بورڑی سے لکھتی ہیں۔ کاشی بھیا السلام علیکم! دعا ہے کہ آپ ہمیشہ شاد و آباد رہیں، میری تحریر آپ نے شایع کی اس کے لیے ممنون ہوں آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے سالگرہ بھی وش کی اس لیے بھی Thanks۔ فائزہ شہزاد موسٹ ویلکم کئی سالوں بعد لوٹی ہیں، خیریت؟ سدرہ انور، مور شاہد حسین بہت بہت نوازش ہے آپ کی۔ غلام رسول گل آپ نے میری کمی محسوس کی اس کے لیے تہ دل سے مشکور ہوں۔ مور شاہد حسین میری غیر حاضری کی وجہ میری طبیعت کی ناسازی ہے، شاہد فراز، اشفاق شاہین وعلیکم السلام۔ سدرہ انور، طارق جاوید، مس نوید ہاشمی، ایم جے قریشی، جنجل میتلو، ساحل ابڑو، نفیسہ فضل، بشریٰ سعید احمد، حنا بشریٰ اور تمام احوالیوں کو بہت ساری دعائیں۔ محمد مزمل صدیقی کی تحریر "مرد" اچھی کہانی تھی۔ خوش رہیے۔ باقی کہانیاں بھی نہیں پڑھ سکی لیکن آہستہ آہستہ پڑھوں گی ضرور۔

☆ جنجل جی! اللہ آپ کو صحت دے، محفل میں آمد کا شکریہ۔

✉ تحسین جونیجو خیر پور ناتھن شاہ سے شامل احوال ہیں۔ اچھے بھیا کاشی السلام علیکم! نیک تمنائیں آپ کے نام دل کی بستی میں پھول اُگتے ہیں، جب آپ کی خلوص بھری باتوں سے آراستہ محفل سجتی ہے، آپ لکھاریوں کا حوصلہ بڑھا رہے ہیں۔ دل تو بہت چاہتا ہے کہ لکھتی جاؤں مگر دل افسردہ کہ محترمہ قینچی صاحبہ آسکتی ہے۔ "کچھ اپنی باتیں" من کو بھلی لگتی ہیں، سہام مرزا انکل کو خراج تحسین پیش کیا ان کی برسی پر مالک ان کے درجات بلند فرمائے (آمین) ان کی عظمتوں کو سلام۔ ماشاء اللہ جی کافی رونق لگی ہوئی ہے، محفل میں۔ مدتوں بعد اپنی نانی حاضر خدمت رہیں۔ مجال ہے جو کسی کو بھی بھولے سے یاد فرمایا ہو، آخر نانی جو ٹھہریں۔ ورنہ تو اپن کو بھی لوگ دادی اماں پکارتے ہیں۔ جاننا چاہیں گے کیوں؟ شاہد حسین مور بھائی، آپی کو ساتھ لائی ہوں زبردستی شکریہ۔ ارے او سدرہ انور اس چاند کی چمک تو تم ظالمو کی بدولت جگمگا رہی ہے۔ عرصہ دراز سے غائب بھائی اشفاق شاہین کی اچانک آمد ہوئی ہے، وعلیکم السلام بہت اچھا لگا آتے رہیے گا۔ غلام رسول گل بھائی وعلیکم السلام سلامت رہیے، شاہد فراز بھائی وعلیکم السلام آپ کا خط اچھا رہا۔ شفقت حسین بھائی الحمدللہ ہم اچھے ہیں آپ خیریت سے ہیں؟ سب خوش رہیے۔ "میں کون ہوں" سدرہ انور۔ "سب جائز ہے" عبدالغفار عابد۔ "کوئی اپنا نہ رہا" وقاص حسین۔ "نظر کا دھوکا" حنا بشریٰ۔ "فیضِ عشق" امجد جاوید۔ "زخموں کا مداوا" محمد عزیز میمن۔ بہترین، سبق آموز تحریریں رہیں۔ "مرد" محمد مزمل کی منفرد انداز بیاں، گرفت بھی کافی مضبوط رہی۔ "کیسے الزام دوں" "ماں کا دوسرا روپ۔ تحن آباد میں" "اسے چشتے ہی دیکھا تھا" سدرہ انور، غزل ریحان فائق، دل درد کا مارا صبا جرال، اور رانا عنبرین نعیم نے خوب محفل سجائی۔ اجازت بھیا۔ اللہ حافظ

☆ ادی تحسین جونیجو! محفل میں آمد اور تبصرے کا شکریہ۔



✉ اسامہ ندیم کراچی سے رقم طراز ہیں۔ کاشی بھائی یہ رنگ رنگ کہانی یہ حرف حرف فسوں۔ تمہارے عزم کو ہم سب سلام کرتے ہیں، آپ نے سہام مرزا صاحب کی برسی کے موقع پر یہ شعر لکھ کر صحیح معنوں میں ان کی محبت کا قرض اتار دیا۔ ہم آپ کی محبت کو سلام کرتے ہیں، خدا کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ کچھ اپنی باتیں اور منزہ جی کا زندگی روٹھ گئی

اپنی مثال آپ تھے۔ اس ماہ سچ بیانیوں میں صفدر عباس اعوان کی اپنے ہی دام میں، محمد عزیز مٹے کی زخموں کا مداوا، غزل قریشی کی کلموہی اور محمد مزمل کی مرد پسند آئیں۔ جب کہ عبدالغفار عابد کی سچ بیانی سب جائز ہے نے میلہ لوٹ لیا۔ سلیم فاروقی کا آتش جنوں ٹاپ کلاس جا رہا ہے اور ایسا لگ رہا ہے یہ ناول ایک دو قسطوں میں اپنے انجام پر پہنچ جائے گا۔ کار جہاں دراز ہے میں ڈھڈ ومائی کی کہانی بنام میں کون ہوں لکھ کر سدرہ انور علی نے اپنا لوہا منوالیا۔ اعجاز احمد نواب کی ناگن آٹھویں قسط میں کچھ مزہ نہیں آیا۔ لگتا ہے کہانی ایک جگہ ٹھہری گئی ہے اور اپنا اثر کھونے لگی ہے۔ یہ ناول میں نے پہلے شاید کسی اور ڈائجسٹ میں بھی پڑھا ہے۔ تین مرد تین کہانیوں کا سلسلہ سچی کہانیاں کی جان ہے، ممتاز احمد میرے فیورٹ رائٹر ہیں انہوں نے کھلاڑی میں بھی اپنی سبقت برقرار رکھی۔ محمد کاشف مغل کی عشق آتش اور خلیل احمد انجم کی تایا گزارے لائق تھیں۔ ارشد علی ارشد کے ناول مکھنی میں اب تک تجسس برقرار ہے۔ ارے ہاں ممتاز احمد کو عمرے کی بہت بہت مبارک باد قبول ہو۔ شعلہ ساماں تحریروں میں نظر کا دھوکا، بٹوارہ اور تیرے انتظار میں گوارا تھیں۔ پردیس سے آنے والی کہانیوں میں تینوں کہانیاں بالکل پسند نہیں آئیں۔ اس ماہ کی خاص کہانی فیض عشق شاندار رہی اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے۔ انشاء اللہ اگلے ماہ پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔ سب ساتھیوں کو میری جانب سے عید مبارک۔

☆ بیٹا اسامہ، اتم ہو بہت چھوٹے لیکن تمہارا مشاہدہ بہت وسیع ہے۔ ہمیں تمہارے خط کا اگلے ماہ بھی انتظار رہے گا۔ بھرپور تبصرے کا شکریہ۔ ہم چاہتے ہیں ہمارے دیگر لکھاری بھی پرچے کو پڑھ کر اسی طرح بھرپور تبصرہ کریں۔

ایس ایم ایس کے ذریعے احوال کا حصہ بننے والے قارئین

کاشف خان، کراچی۔ جمیلہ کنول، لیاری، کراچی۔ توصیف خان، فیوچر کالونی، کراچی۔ اعجاز احمد، لاہور۔ سنیعہ احمد، حیدرآباد۔ گل بلوچ، گوادر۔ احمد ریاض، گوجرانوالہ۔ وسیم بھٹی، لیہ۔ محمود مغل، لاہور۔

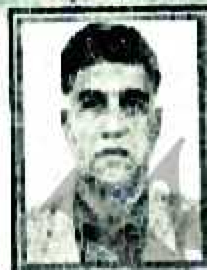
ساتھیو! اس ماہ کا احوال تو اختتام کو پہنچا۔ اگلے ماہ ان شاء اللہ آپ سب سے ان ہی صفحات پر ملاقات ہوگی۔ ادارے اور ادارے کے تمام اسٹاف کی جانب سے تمام
لکھاری، قاری اور پیار کرنے والے ساتھیوں کو دلی **عید مبارک**

آپ سب کی دعاؤں کا طالب

کاشی چوہان



خان زادہ



محمد سلیم اختر

حیرت واسرار سے پُر ایک تاجر کی سنسنی خیز داستان

میں کچھ زیادہ ہی جابر اور سخت گیر تھانیدار ثابت ہوا تھا۔ بدمزاجی اور رشوت خوری کی وجہ سے میری شہرت اچھی نہیں تھی۔ میں بے گناہوں کو گرفتار کرلیتا اور خالموں، جابروں اور مجرموں کو رشوت لے کر چھوڑ دیتا تھا۔ یہی برائی میری وجہ شہرت تھی۔ میری تمام ملازمت ایسی ہی گزری تھی۔ ابھی میری ریٹائرمنٹ میں ایک سال باقی تھا، جب میری تبدیلی ایک دیہاتی علاقے کے تھانے میں ہوگئی۔ یہ ایک سال میں نے اسی تھانے میں گزار کر ریٹائر ہونا تھا، لہٰذا میں اب کچھ زیادہ ہی لالچی ہوگیا تھا۔ میرا چلن ویسا ہی تھا، ایک مرتبہ تھانے کی حدود کے ایک دور دراز گاؤں میں چوری کی واردات ہوگئی تھی اور اس کے اصل مجرم پکڑے گئے تھے، مگر میں نے اس سے منہ مانگی رشوت لے کر ان کو چھوڑ دیا تھا۔ اور ان کی جگہ دو بے گناہ نوجوانوں کو گرفتار کرلیا تھا...... وہ دو دن سے تھانے میں تھے اور ان کی خوب چھترول ہو رہی تھی کہ وہ اعتراف جرم کرلیں اور مال کی برآمدگی بھی کرادیں، مگر انہوں نے ابھی تک اقبالِ جرم نہیں کیا تھا۔

ساون کے دن تھے، گرمی اور حبس نے بُرا حال کر رکھا تھا۔ میں اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا، کہ ایک سپاہی ایک شخص کو اپنے ساتھ لے کر میرے کمرے میں داخل ہوا اور کہنے لگا۔

"یہ صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔" میں نے اس شخص کی طرف ایک نظر ڈالی اور اسے کرسی پر بیٹھنے کو کہا...... وہ بیٹھ گیا تو سپاہی کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں میز پر پڑے کاغذات کو سمیٹنے لگا اور ساتھ ہی میں نے اس شخص کو بھی نظروں میں رکھا۔ وہ چالیس سال سے اوپر کا ایک تنومند شخص تھا۔ اس کے چہرے پر چھوٹی اور خوب صورت انداز میں تراشی ہوئی داڑھی اور پیشانی پر محراب کا نشان تھا، میز پر سر پر اس نے کالے رنگ کی پگڑی باندھ رکھی تھی......

"جی فرمائیں کیسے آنا ہوا؟" میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"میرا نام زمرد خان ہے۔ میں چک چکوڑیاں سے آیا ہوں، جہاں چوری کی واردات ہوئی تھی۔ آپ نے اصل مجرموں کو چھوڑ کر دو بے گناہوں کو گرفتار کرلیا ہے، میں انہیں چھڑوانے کے لیے آیا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ مجھے یوں گھورنے لگا، جیسے میں نے کوئی بہت بڑا جرم کردیا ہو اور ابھی وہ مجھے کچا چبا جائے گا۔

"ان دونوں نے اقبال جرم کرلیا ہے، لہٰذا میں ان کو نہیں چھوڑ سکتا۔ میں آج ہی ان کا چالان بنا کر انہیں

عدالت میں پیش کروں گا۔ تم اب جا سکتے ہو، گھر یا عدالت...... جہاں تمہاری مرضی۔"

میں نے اپنے روایتی انداز میں کہا اور گھنٹی بجا کر ملازم کو بلوایا۔

"میں آج اور ابھی ان کو لے کر جاؤں گا۔" وہ بھی اسی انداز میں بولا جیسا انداز میرا تھا۔ "وہ دونوں بے گناہ ہیں۔" میں نے دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے سے نکل رہے تھے۔ جس وقت اس نے بات کی تھی تو دونوں ہونٹ ملا کر اس نے دائرے کی شکل میں دھواں خارج کیا تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک عجیب قسم کی سیٹی کی آواز بھی مجھے سنائی دی تھی۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ سیٹی کی آواز میرے کمرے کے باہر سے آرہی ہے، اتنے میں ملازم میرے کمرے میں آگیا۔ تو میں نے اس سے پوچھا۔

"باہر سیٹی کون بجا رہا ہے؟"

"نہیں جناب باہر تو کوئی سیٹی نہیں بجا رہا۔" اس نے گھبرا کر کہا۔

میں حیران سا ہو کر ٹکٹکی باندھے زمرد خان کو دیکھنے لگا۔ وہ پھر بولا۔

"تھانیدار صاحب! ان دونوں کو میں نے ساتھ لے کر جانا ہے۔" اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہلکی سی سیٹی کی آواز بھی سنائی دی۔ میں حیران ہو گیا کہ یہ شخص کون ہے اور بات کرتے وقت اس کے منہ سے سیٹی کی آواز کیوں نکلتی ہے؟ اب اس کی صورت سے ہی مجھے ایک خوف سا آنے لگا تھا۔ میری تمام ملازمت کے دوران کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ میں کبھی خوف زدہ ہوا ہوں۔ بڑے بڑے خطرناک مجرموں کو بھی میں اپنے رعب اور دبدبے سے



زیر کر لیتا تھا، مگر نہ جانے کیوں اس زمرد خان نے میرے جسم میں خوف کی لہریں دوڑا دی تھیں۔ میرے ذہن پر طرح طرح کے سوالات کی یلغار ہوگئی کہ یہ بات کرتے وقت سیٹی کی آواز کیوں نکالتا ہے اور اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک کیوں رہی ہیں؟ معاً ایک اور انجانا سا خوف میرے جسم میں کپکپی پیدا کر گیا کہ اس نے اتنے وقت میں پلکیں نہیں جھپکی تھیں۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں یا تو اسے دھکے دے کر اور ذلیل کر کے تھانے سے نکلوا دوں یا پھر ان دونوں ملزموں کو بلا کر اس کے سامنے ان کی چھترول کے ساتھ ساتھ اس کو بھی دن میں تارے دکھا دوں، مگر نہ جانے کیوں میں ایسا چاہنے کے باوجود بھی نہ کر سکا، لیکن میں ان ملزموں کو اس کے کہنے پر چھوڑنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اتنی دیر میں ایک اور ملازم میرے کمرے میں چلا آیا۔ اس کے آجانے سے مجھے کچھ حوصلہ ہوا۔ اس کے آنے پر زمرد خان بولا۔

”تھانیدار صاحب...... میں پانچ منٹ کے لیے باہر جاتا ہوں، اتنی دیر میں آپ دونوں بے گناہوں کو بلا لیں۔“

یہ کہہ کر وہ میرے کمرے سے باہر نکل گیا اور تھانے کے صحن میں ٹہلنے لگا۔ دوسرا ملازم کہنے لگا۔ ”سر! یہ کون ہے...... مجھے تو یہ انسان نہیں لگتا۔ لگتا ہے کہ کوئی سانپ سو سال کے بعد اپنی شکل تبدیل کر کے یہاں آگیا ہے...... یہ کیوں آیا ہے؟“

ملازم کے ان الفاظ نے مجھے لرزا کر رکھ دیا...... ”یہ چک چکوڑیاں والے ملزموں کو چھڑوانے آیا ہے۔“ میں نے وضاحت کی۔

”مگر سر! وہ تو اقبال جرم بھی کرنے پر تیار ہو گئے ہیں، ہم انہیں کسی صورت نہیں چھوڑیں گے۔ آپ آج ہی ان کا چالان کاٹ دیں۔“ ملازم نہایت ہی غصے میں بول رہا تھا۔

”ہاں ایسا ہی ہوگا۔ میں ان دونوں کو مجرم بنا کر سزا دلواؤں گا۔“ میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ میری بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ زمرد خان پھر میرے کمرے میں داخل ہوا اور میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے اس کی آنکھوں کی طرف دیکھا تو مجھے خوف سا آنے لگا۔ دونوں ملازم بھی خوفزدہ ہو گئے۔ وہ اپنی آنکھوں کی گول گول پتلیوں کو بڑی تیزی سے ادھر اُدھر گھما رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ رقص کر رہی ہوں، میں کافی دیر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ بھی مسلسل میری طرف ہی دیکھ رہا تھا اور اب بھی اس نے ایک بار بھی آنکھ نہیں جھپکی تھی، عمر کوئی چالیس سال سے اوپر ہوگی، بوسکی کا لمبا کرتا، سفید رنگ کا لٹھے کا بھاری تہ بند، سر پر کالے رنگ کی بڑی سی پگڑی اور بھاری مونچھیں، سرخ و سفید چہرہ...... ناک اور پیشانی پر چھوٹے چھوٹے گہرے گڑھوں کی طرح بے شمار نشانات...... وہ اس طرح بے خوف اور نڈر ہو کر بیٹھا تھا۔ جیسے ڈی ایس پی وہی ہے اور وہ تھانے کی انسپکشن پر آیا ہوا ہے۔ وہ مسلسل میری طرف دیکھ رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا...... کہ یہ انسان ہے یا کوئی ماورائی مخلوق...... اگر یہ انسان ہے تو یہ آنکھیں کیوں نہیں جھپکتا اور جب بات کرتا ہے تو سیٹی کی آواز کیوں آتی ہے اور سیٹی کی آواز میں پھنکار سی کیوں محسوس ہوتی ہے؟ اس کی آنکھیں کیوں دہک رہی ہیں۔ اس کی ناک پیشانی اور چہرے پر گڑھوں کے نشانات کیسے ہیں؟ جب میں نے اس پر سر سے پاؤں تک ایک گہری نظر ڈالی تو دیکھا کہ اس کے ہاتھوں پر بھی ایسے ہی گہرے نشانات تھے...... یہ دیکھ کر میرا ذہن بے شمار سوالات کی آماجگاہ بن گیا...... کیا یہ نشانات چیچک کے ہیں یا کسی اور بیماری کے...... مگر ان سوچوں کی میرے ذہن نے خود ہی تردید کر دی کہ نہیں چیچک کے نشانات صرف چہرے پر ہوتے ہیں، ہاتھوں پر نہیں اور پھر وہ اتنے گہرے بھی نہیں ہوتے...... اس کے ساتھ ہی میں اندر سے چیخ اُٹھا...... کہ یہ کون ہے؟ اسے کس نے بھیجا ہے؟ اور یہ مجھے ہی کیوں گھورے جا رہا ہے؟ میں نے اپنا سر پکڑ لیا اور شدت خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔

اتنے میں کچھ اور ملازم میرے کمرے میں آگئے...... انہوں نے میری الجھن دیکھی تو وہ سب زمرد خان کے گرد جمع ہو گئے اور اس سے پولیس والوں کے روایتی انداز میں بات کرنے لگے، ایک دو نے تو اس سے خاصی بدتمیزی کر دی کہ اگر وہ واپس نہ گیا تو وہ اُسے بھی حوالات میں بند کر دیں گے۔ مگر ان کی کسی دھمکی کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے جواب میں صرف اتنا ہی کہا۔

میں اپنے گاؤں کے دو بے گناہ نوجوانوں کو لینے آیا

ہوں، جنہیں تم نے حوالات میں قید کر رکھا ہے...... بہتر ہے کہ تم لوگ خود ہی ان کو رہا کر دو...... ورنہ میں انہیں رہا کرا لوں گا۔

"کیسے رہا کرا لو گے تم؟" ایک سپاہی غصے سے بولا۔

سپاہی کی بات سن کر، وہ غصے میں آ گیا۔ اس کی سانسوں میں تیزی آ گئی اور آنکھوں کی سرخی بھی بڑھ گئی اور اس کی سیٹی کی آواز میں بھی تیزی آ گئی۔ ایک منٹ بھی نہ گزرا ہو گا کہ ایک سُرخ رنگ کا نہایت ہی چمکدار سانپ پھن پھیلائے بڑی تیزی سے کمرے میں داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر ہم سب کے اوسان خطا ہو گئے اور پسینہ نہایت ہی تیزی سے ہماری پیشانی سے بہنے لگا۔ میں تو یکدم گھبرا کر کرسی سے گرنے لگا تھا کہ ایک ملازم نے مجھے بچا لیا۔ ہم سب نے پاؤں کرسیوں پر رکھ لیے۔ ہم سب کے چہرے خوف کے مارے زرد ہو گئے تھے، اس وقت ہم سب کی جان پر بن گئی تھی۔ اتنا بڑا اور خوفناک سانپ ہم میں سے کسی نے بھی اپنی زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ نہ جانے یہ بلا کہاں سے آن ٹپکی تھی۔ معلوم نہیں کہ وہ کہاں سے اور کس طرف سے آیا تھا...... اتنے میں زمرد خان نے ہاتھ اُٹھا کر ہمیں تسلی دی اور آرام سے بیٹھنے کو کہا۔ ہم دم سادھے بیٹھے تو تھے مگر ایسے لگتا تھا کہ جیسے ہمارے جسموں میں جان نہیں ہے۔ ہم سب کے سب رنگ اُڑے ہوئے اور زبان گنگ تھی۔ اتنے میں وہ سانپ نہایت اطمینان سے زمرد خان کے پاؤں میں آ کر بیٹھ گیا...... اس نے جوتے اتار دیے تو سانپ نے اس کے پاؤں چاٹنے شروع کر دیے۔ زمرد خان اس کی اس حرکت سے محظوظ ہونے لگا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے کے ساتھ ساتھ اس کے جسم کو بھی سہلانے لگا۔ وہ سانپ ایک وفادار پلے کی طرح اس کے پاؤں میں لوٹنے لگا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد سانپ اس کے پاؤں سے ہٹا اور اس نے اپنا پھن پھیلا کر پھنکارنا شروع کر دیا اور پھنکارتے ہوئے اس نے کمرے کا چکر لگانا شروع کر دیا تھا۔ یہ دیکھ کر تو ہم سب کی چیخیں نکل گئیں اور ہم سب تھر تھر کانپنے لگے تھے۔

"آپ بے گناہوں کو چھوڑ دیں، ورنہ اس جیسے کئی اور سانپ اس کمرے میں آ جائیں گے۔" زمرد خان نے پھنکارتے ہوئے لہجے میں مجھے مخاطب کر کے کہا۔

اس وقت میری تھانیداری مٹی میں مل گئی تھی اور میرا سارا رعب و دبدبہ جھاگ کی مانند بیٹھ گیا تھا۔ میں نے اپنی جان بچانے کی خاطر ہتھیار ڈال دیے اور زمرد خان سے التجا کی کہ وہ اس سانپ کو کمرے سے باہر نکالے اور اپنے دونوں بندوں کو ساتھ لے جائے۔

یہ سن کر زمرد خان کی جلتی ہوئی آنکھوں میں کچھ ٹھنڈک سی پیدا ہوئی تھی اور اب اس کی سانسیں بھی ٹھکانے آنے لگی تھیں، جب وہ پرسکون ہوا تو وہ سرخ سانپ بھی کمرے سے باہر نکل گیا۔ ان کے جانے کے بعد ہم سب کی جان میں جان آئی، پھر میں نے ان دو ملزموں کو زمرد خان کے حوالے کر دیا اور وہ ان کو ساتھ لے کر تھانے سے نکل گیا۔

☆......☆

تھانے میں جیسے سناٹا چھا گیا تھا اور نہ صرف میں بلکہ اس کو دیکھنے والا تھانے کا ہر ملازم خوف زدہ تھا، بلکہ شرمندہ بھی، کیوں کہ ایسا واقعہ اس سے قبل کہیں بھی اور کسی بھی تھانے میں پیش نہیں آیا تھا۔ یہ زمرد خان کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا؟ کہاں رہتا ہے......؟ سانپ سے اس کا کیا تعلق ہے، وہ کہاں سے اور کیوں آیا تھا؟ اس کے پاؤں وہ سانپ کیوں چاٹتا تھا؟ اسے کیسے پتا چلا کہ زمرد خان یہاں ہے؟

میں ان سب سوالوں کے جوابات اور اس راز کو جاننے کے لیے بے تاب ہو گیا۔ میں زمرد خان سے مل کر اپنے سوالات کے جوابات جاننا چاہتا تھا۔ اب میں تھانے کے دیگر تمام کام بھول کر زمرد خان کی حقیقت جاننے کی جستجو میں لگ گیا تھا، یہی حال میرے تھانے کے تمام ملازمین کا بھی تھا، انہیں زمرد خان پر بہت ہی غصہ تھا، کہ وہ ان کو بے بس ہی نہیں، بلکہ بدنام بھی کر گیا تھا۔ وہ ان سب کو مذاق کا نشانہ بنا گیا تھا۔ اگر وہ اس کے خلاف کوئی سخت قسم کی کارروائی کرنے کا سوچتے، تو اگلے ہی لمحے سُرخ سانپ ان کی نظروں میں گھوم جاتا تھا اور ان کا غصہ جھاگ کی مانند بیٹھ جاتا۔ وہ سُرخ سانپ تو اب ہم کو خوابوں میں بھی ڈرانے لگا تھا۔ کئی دن تک ہم سب ہی اُس پر اپنی بے بسی کا ماتم کرتے رہے کہ ایک شخص کار سرکار میں مداخلت کر کے ملزم چھوڑ کر لے گیا

ہے اور ہم اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔

میں نے اپنے بندے اس کے بارے میں جاننے کے لیے ڈیوٹی پر لگا دیے تھے...... ایک دوسرے گاؤں کے نمبردار نے بتایا کہ زمرد خان کا تعلق افغانستان کے علاقے قندھار سے ہے اور یہ وہاں سے ہجرت کر کے یہاں آیا تھا، وہ کچھ پراسرار قوتوں کا مالک ہے، مگر اپنی اس طاقت کو کسی کے خلاف اور نقصان کے لیے استعمال نہیں کرتا، بلکہ اسے علاقے کے لوگوں کے فائدے کے لیے ہی استعمال میں لاتا ہے۔ وہ یہاں زمرد خان کی بجائے "خان زادہ" کے نام سے مشہور ہے۔ مالی لحاظ سے بھی وہ بہتر حیثیت کا مالک ہے، اس لیے وہ غریبوں اور ناداروں کی مدد کرتا رہتا ہے، اور ظالم اور بے ایمان لوگوں سے میل جول پسند نہیں کرتا۔ وہ کیا کرتا ہے؟ اس کے پاس کون سی پراسرار طاقت ہے؟ یہ کوئی بھی نہیں جانتا اور نہ ہی کسی کو اس بارے میں پوچھنے کی جرأت ہے...... وہ اپنے کام سے غرض رکھتا ہے اور کسی کے معاملات میں بے جا مداخلت نہیں کرتا۔

خان زادہ کے بارے میں یہ سب کچھ جاننے کے بعد میرے من میں بھی اس سے ملنے اور اس کی طاقت کا راز جاننے کی خواہش پیدا ہوگئی۔ میں نے اس نمبردار کو تھانے بلوایا اور اس سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا، تو اس نے اس علاقے کے ایک پیر صاحب کا پتا دیا کہ خان زادہ ان کے پاس آتا جاتا رہتا ہے۔ آپ اس کام کے لیے ان تک رسائی کریں، وہ ہی آپ کی ملاقات خان زادہ سے کرا سکتے ہیں۔

☆......☆

وہ پیر صاحب ایک دربار کے گدی نشین تھے...... چند دنوں بعد وہاں میلہ اور عرس منعقد ہونا تھا۔

اس واقعے پر میں بھی وہاں چلا گیا اور پیر صاحب کی قدم بوسی کی۔ یہ اتفاق تھا کہ میری وہاں موجودگی میں ہی خان زادہ بھی وہاں آ گیا، اس نے مجھے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں شعلے ناچنے لگے اور اس کے تیور مجھے خطرناک سے لگنے لگے۔ میں فوراً اُٹھا اور پیر صاحب کے قدموں میں گر گیا اور ان سے التجا کی کہ مجھے خان زادہ سے معافی دلوا دیں...... میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کسی بے گناہ کو نہیں پکڑوں گا۔ اللہ میری توبہ اور آج کے بعد کسی سے رشوت بھی نہیں لوں گا۔"

"خان زادہ!" پیر صاحب نے نہایت ہی محبت بھرے انداز میں اس کو مخاطب کیا......

"تھانیدار صاحب کیا کہہ رہے ہیں اور کس بات کی معافی مانگ رہے ہیں؟"

"یہ خود ہی بتادیں گے۔" وہ یہ کہہ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا، تو میں نے پیر صاحب کو ساری حقیقت بتادی۔ میری ساری کہانی سننے کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا۔

"تم سچے دل سے توبہ کرو، خدا کو حاضر و ناظر جان کر، تو تمہیں خان زادہ ہی نہیں، بلکہ اوپر والا بھی معاف کردے گا۔" اگر تم میری بات اچھی طرح سے سن لو کہ اوپر والے نے تمہیں معاف کر دیا، تو پھر خان زادہ بھی تمہیں معاف کردے گا۔"

پیر صاحب سچ کہہ رہے تھے، میں ساری ملازمت کے دوران اپنے خدا سے بھی تو نہیں ڈرا تھا اور بغیر کسی خوف کے ظلم اور زیادتی کا بازار گرم کر رکھا تھا، مگر اب میں خان زادہ سے خوف زدہ ہو گیا تھا اور اس کی دہشت میرے دل و دماغ میں گھس گئی تھی، یوں لگتا تھا کہ جیسے ابھی وہ سرخ رنگ کا سانپ آئے گا اور مجھے ڈس کر میری زندگی کا خاتمہ کر ڈالے گا۔ اس خوف نے میری زندگی میں یکدم تبدیلی پیدا کردی تھی، پھر میں نے پیر صاحب کے دربار میں اُن کے سامنے سچے دل سے توبہ کرلی اور ان سے وعدہ کیا کہ آج کے بعد میں باقاعدگی سے نماز پڑھوں گا، رشوت کسی سے نہیں لوں گا اور نہ ہی کسی بے گناہ پر ظلم ڈھاؤں گا۔"

جب پیر صاحب کو یقین ہو گیا کہ اب میری کایا پلٹ گئی ہے تو انہوں نے خان زادہ کو بلایا اور اس سے کہا کہ "تھانیدار صاحب نے سچے دل سے توبہ کرلی ہے، اس لیے تم بھی اسے معاف کردو۔"

پیر صاحب کی بات سن کر خان زادہ نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولا۔

"تھانیدار صاحب! اپنے عہد پر قائم رہنا، صرف اس وعدے پر میں آپ کو معاف کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر خان زادہ وہاں سے چلا گیا۔ میلہ ختم ہو گیا اور میں بھی تھانے واپس لوٹ آیا۔ اب میں نے نماز پڑھنی شروع کر دی تھی اور داڑھی بھی رکھ لی تھی۔ میری اس تبدیلی پر سارا اسٹاف حیران اور پریشان ہو گیا تھا، کیوں کہ میں نے رشوت کا دروازہ بند کر دیا تھا، پھر چند ہی ماہ بعد میں ریٹائر ہو گیا اور اپنے گاؤں واپس لوٹ آیا۔

☆......☆

اس بات کو کئی ماہ گزر چکے تھے، لیکن میں ابھی تک خان زادہ اور اس کی شعلے برساتی آنکھوں اور سرخ ناگ کو نہیں بھول پایا تھا۔ ایک سال بعد جب پیر صاحب کا عرس آیا، تو میں بے اختیار ہو کر عرس اور میلے میں شرکت کے لیے چلا گیا۔ پیر صاحب سے ملاقات ہوئی تو وہ مجھے دیکھ کر اور مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ خان زادہ نے مجھے آگے بڑھ کر گلے سے لگا لیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ میں اب راہِ راست پر آ گیا ہوں۔

جب میلہ ختم ہوا تو خان زادہ اصرار کر کے مجھے اپنے ساتھ اپنے گھر لے گیا اور رات کے کھانے پر اس نے میری خوب تواضع کی، پھر کھانے کے بعد وہ کہنے لگا۔

''تھانیدار جی! آپ مجھے کچھ خوف زدہ سے لگ رہے ہیں۔ آپ یہاں بالکل پرسکون اور بے فکر ہو جائیں، یہاں آپ کو کسی قسم کی کوئی تکلیف اور پریشانی نہیں ہو گی۔ آپ یقیناً یہ جاننے کے لیے بے تاب ہوں گے کہ ایک برس قبل آپ کے تھانے میں، آپ کے دفتر میں جو کچھ ہوا تھا...... وہ کیوں اور کیسے ہوا تھا؟ آپ کا یہی تجسس دور کرنے کے لیے تو میں آپ کو اپنے ساتھ یہاں لایا ہوں۔''

''جی ہاں، خان زادہ صاحب! میں اس اسرار کو جاننے کے لیے بہت ہی بے تاب ہوں، کیوں کہ میں اس دن سے ایک انجانے خوف میں مبتلا ہوں، میں تھانے میں اپنے دفتر والا منظر آج تک نہیں بھولا۔ اس منظر کا خیال آتے ہی میرے بدن پر کپکپی سی طاری ہو جاتی ہے۔ اس وقت بھی میں بہت زیادہ خوف محسوس کر رہا ہوں۔''

''چلیں پھر آج میں آپ کا خوف دور کیے دیتا ہوں!!'' خان زادہ مجھے تسلی دینے کے بعد گویا ہوا۔

☆......☆

میرا تعلق قندھار کے ایک کاروباری اور مذہبی گھرانے سے ہے...... میں اپنے ماں باپ کا پہلوٹی کا لڑکا ہوں۔ میرے بعد دو بہنیں پیدا ہوئی تھیں، مذہبی گھرانہ ہونے کے ناتے ہمارے خاندان میں نماز اور روزے کی سختی سے پابندی کی جاتی تھی۔ میرے والد صاحب بڑے تہجد گزار تھے اور کبھی اس نفلی نماز کو قضا نہ کرتے تھے، اس لیے انہوں نے میری تربیت بھی اسی انداز میں کی۔ گیارہ سال کا ہونے سے قبل میں نے قرآن مجید صحیح تلفظ اور قرأت کے ساتھ پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ جب میں گیارہ برس کا ہوا تو مجھے بھی نماز اور روزے کی پابندی کرنی پڑی اور اس کے ساتھ ہی تہجد کی نماز بھی میں اوّل دن سے پڑھنے لگا۔ ابا جان جب تہجد ادا کرنے کے لیے اُٹھتے تو مجھے بھی ساتھ ہی جگا دیتے۔ مجھے یہ دعویٰ ہے کہ میں نے گیارہ سال کی عمر سے تہجد کی نماز قضا نہیں کی ہے اور میں اب بھی اس کا اسی طرح اہتمام کرتا ہوں۔ میرے گھر والے اور عزیز رشتے دار سب ہی مجھ پر فخر کرتے اور مجھے داد دیتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ زر مرد خان سے اللہ راضی ہے اور جس سے اللہ راضی ہو۔ اسے وہ کئی قسم کی دولت سے نوازتا ہے۔

میرے والد صاحب فروٹ کے سوداگر تھے۔ خشک فروٹ وہ ہندوستان بھیجا کرتے تھے، جہاں کئی شہروں میں اس کے سوداگر موجود تھے۔ ابا جان کے علاوہ بھی شہر میں خشک فروٹ کے کئی سوداگر تھے، جب مال ہندوستان بھیجنا ہوتا تو وہ لوگ مل کر ایک قافلے کی شکل میں سفر کرتے تھے اور وہ فروٹ اور دیگر سامان اونٹوں پر لاد کر لے جایا جاتا تھا...... میں پندرہ سال کا ہوا تو والد صاحب نے مجھے اپنے سامان کی فروخت کے لیے اس قافلے کے ساتھ بھیجنا شروع کر دیا جو فروٹ لے کر ہندوستان جاتا تھا۔ اس وقت ہندوستان کا سفر نہایت ہی کٹھن اور بڑا طویل تھا...... جانے آنے میں مہینے لگ جاتے تھے...... کیوں کہ وہ فاصلہ کئی سو میل کا بنتا تھا اور دورانِ سفر راستے میں پہاڑوں، ندی نالوں اور خوف ناک جنگلوں سے بھی گزرنا پڑتا تھا۔ غرض یہ کہ مسافر کو چھوٹی بڑی کئی طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور طرح طرح کے لوگوں سے بھی واسطہ پڑتا تھا اور کئی نہ بھولنے والے واقعات بھی

پیش آتے تھے۔ رات کو کبھی تو کسی آبادی میں اور کبھی ویرانے میں پڑاؤ کرنا پڑتا اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ راستہ ہموار ہونے کی صورت میں راتوں کو بھی ہمارا سفر جاری رہتا تھا، سفر کے دوران اگر کوئی شخص تھک جاتا تو وہ اونٹ پر بیٹھ جاتا اور باقی لوگ اس کے ساتھ ساتھ چلتے رہتے۔ ایک آدمی سب سے آگے والے اونٹ کی نکیل پکڑ کر چلتا رہتا اور باقی اونٹ اس کے پیچھے قطار کی صورت میں چلتے رہتے تھے۔ کھانے پینے کا سامان ہم وافر مقدار میں ساتھ لے لیتے تھے اور ضرورت پڑنے پر ہم کسی آبادی سے خریداری بھی کر لیتے تھے۔ سفر طے کرنے کے دوران ہم شاعری، گلوکاری اور ہنسی مذاق بھی کرتے تھے، یوں ہمارا سفر آسانی سے کٹ جاتا تھا۔

وہ سفر میری زندگی کا انوکھا، پراسرار اور یادگار سفر تھا، جب ہمارا سات اونٹوں کا قافلہ ہندوستان کی طرف رواں دواں تھا۔ ہمارے سامان میں، اخروٹ، خشک خوبانیاں اور چلغوزے تھے۔ ہمارا وہ سفر بھی ماضی کے دیگر سفر جیسا ہی تھا، مگر آگے جا کر وہ بڑا پراسرار بن گیا تھا اور مجھے ایک انہونی اور حیرت انگیز دنیا میں لے گیا تھا اور پھر اس سفر نے میری تو کائنات ہی بدل دی۔ ہوا کچھ یوں کہ دوران سفر ایک پہاڑی علاقے میں ہمیں رات گزارنی پڑ گئی تو ہم نے وہاں پڑاؤ کا ارادہ کر لیا۔ یہ اس علاقے میں ہمارا پہلا پڑاؤ تھا۔ ہم نے رخت سفر کھول دیا اور اونٹوں کو ایک محفوظ مقام پر باندھ دیا، پھر ہم نے اپنے سفری بستر سیدھے کیے اور سب ان پر لیٹ کر آرام کرنے لگے...... وہ رات کافی گہری تھی، ہمارے اردگرد گھنے درخت جھنڈ کی صورت میں موجود تھے اور ان کے پیچھے اونچی اونچی پہاڑیاں تھیں، جو اندھیرے میں بڑی عجیب سی لگ رہی تھیں، لیکن ہمیں کسی بھی چیز سے خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا، کیوں کہ ہم سفر کے دوران ایسی راتیں گزارنے کے عادی ہو چکے تھے، اس لیے ہمیں اس طرح کے ماحول سے کوئی ڈر محسوس نہیں ہوتا تھا۔ میرے ہم سفر چوں کہ تھک چکے تھے، اس لیے وہ جلد ہی سو گئے، مگر میں جاگ رہا تھا، کیوں کہ میں نے ابھی عشاء کی نماز ادا کرنی تھی۔ میں نے ہاتھ میں ایک چھڑی اور ماچس کی ڈبیا لی اور وضو کے لیے پانی کی تلاش میں نکل پڑا۔ درختوں کے جھنڈ سے باہر نکل کر میں

پہاڑیوں کی طرف ہو لیا، کیوں کہ اس جانب سے مجھے کسی چشمے کے بہنے کی آواز آ رہی تھی، گرمیوں کا موسم تھا اور اس وقت رات کے قریباً نو یا دس بجے ہوں گے، گرمی اتنی زیادہ نہ تھی، کیوں کہ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور موسم نہایت ہی خوش گوار سا لگ رہا تھا۔ میں ماچس جلا کر چھڑی سے پتھر اور گھاس پھونس ہٹاتا ہوا آگے بڑھنے لگا، اس طرح جلد ہی میں چشمے پر پہنچ گیا، اس کے ٹھنڈے پانی نے مجھے بہت ہی مزا دیا۔ پہلے میں نے خوب سیر ہو کر پانی پیا اور پھر وضو کیا اور چشمے کے قریب ہی ایک ہموار سے پتھر پر نماز عشاء ادا کی۔

نماز ادا کر کے جب میں نے واپس لوٹنے کا ارادہ کیا تو مجھے یوں لگا کہ جیسے میری ٹانگوں اور پاؤں سے کوئی نرم سی چیز لپٹی ہوئی ہے، جو مجھے چلنے نہیں دے رہی ہے، میں نے چھڑی کی مدد سے کر اس کو ہٹانا چاہا تو وہ چیز تو نہ ہٹی مگر چھڑی ٹوٹ کر دو ٹکڑے ہو گئی۔ یہ دیکھ کر میں گھبراہٹ کا شکار ہو گیا، کیوں کہ اس نے میرے پاؤں اور ٹانگیں ایسے جکڑ لیے تھے کہ میں حرکت کرنے سے بھی قاصر ہو گیا تھا۔ میں نے گھبراہٹ کے عالم میں دونوں پاؤں ایک ساتھ اٹھا کر چھلانگ لگانا چاہی، مگر مجھ سے چھلانگ بھی نہ لگ سکی اور میں ایک طرف کو گر پڑا، کیوں کہ میرے پاؤں سختی سے جکڑے جا چکے تھے، زمین پر گرنے سے میں اور بھی پریشان ہو گیا، پھر میں نے جیب سے ماچس نکال کر ایک تیلی جلائی اور اس کی روشنی میں پاؤں کی طرف دیکھا، تو پاؤں سے لپٹے ہوئے سرخ رنگ کے سانپ کو دیکھ کر میری تو نبضیں چھوٹنے لگیں اور میرا تمام جسم پسینے میں بھیگ گیا۔ میری سانسیں دھونکنی کی طرح چلنے لگیں اور پھر مجھے یقین ہو گیا کہ یہ سانپ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا اور یہ مجھے بہت بُری موت مارے گا، کیوں کہ وہ بہت ہی خطرناک اور زہریلا لگ رہا تھا۔ وہ جب زور سے خراٹے بھرتا تو ہوا میں شعلے سے رقص کرنے لگتے اور فضا میں روشنی سی پھیل جاتی۔ یہ سب کچھ دیکھ کر میں بے بس اور بے جان سا ہو گیا تھا۔ وہ سانپ مجھے اپنی چمکتی اور غضبناک آنکھوں سے گھورنے لگا تھا۔ پھر شاید اسے میری بے بسی پر ترس آ گیا تھا اور اس نے مجھے ڈسے بغیر ہی میری ٹانگوں اور پاؤں کو آزاد کر دیا۔ اور پھر وہ خاموشی سے ایک طرف کو

چل پڑا۔ میں نے موقع کو غنیمت جانا اور وہاں سے جلدی سے اُٹھا اور بھاگ کھڑا ہوا، مگر میں ابھی صرف چند قدم ہی بھاگ سکا تھا کہ وہ سانپ تیزی سے مڑا اور میرے آگے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے سے نکل رہے تھے، جس کی وجہ سے روشنی پھیلنے لگتی تھی۔ میں حیران تھا کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے؟ اس نے مجھے کاٹنے کی بھی کوشش نہیں کی اور نہ ہی اس کا ایسا کوئی ارادہ لگ رہا تھا...... عجیب سی صورت حال بن گئی تھی۔ میں جس طرف مڑتا، وہ بھی اُدھر ہی مڑ کر میرے سامنے آ جاتا اور پھن پھیلا کر کھڑا ہو جاتا، اس لیے میں نے کچھ دیر کے لیے وہاں ہی کھڑے رہنے کا ارادہ کر لیا، پھر میں یک ٹُو وہیں کھڑا ہو گیا، جب اس نے مجھے حرکت نہ کرتے دیکھا تو وہ پھر ایک جانب کو آہستہ آہستہ چلنے لگا، ساتھ ہی وہ پیچھے مڑ کر مجھے دیکھتا بھی رہا، مگر میں نے اب بھاگنے کی کوشش نہ کی اور وہاں ہی ساکت و جامد کھڑا رہا، کچھ دور جا کر وہ پھر واپس میری طرف لوٹ آیا اور میرے پاؤں میں آ کر لپٹنے لگا...... میں اُس کی اِن حرکات کو نہ سمجھ سکا کہ یہ سانپ ایسا کیوں کر رہا ہے، لیکن میں اس سے بچنے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگنے کی کوشش کرتا رہا۔ جب میں اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا، پھر ایک جگہ کھڑے ہو کر میں سوچنے لگا کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے؟ یہ سانپ نہ تو مجھے کاٹتا ہے، نہ کوئی اور نقصان پہنچاتا ہے اور نہ ہی مجھے کہیں جانے دیتا ہے، پھر میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ سانپ کی ان حرکات کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں اس کے پیچھے چلوں، شاید یہ مجھے کہیں لے جانا چاہتا ہے...... مگر کیوں اور کہاں؟ یہ تو مجھے معلوم نہ تھا...... نہ جانے یہ مجھ سے کیا کام لینا چاہتا ہے۔ اس کے باوجود کہ وہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا رہا تھا، لیکن پھر بھی خوف کی لہریں میرے وجود میں دوڑ رہی تھیں، میں دل ہی دل قرآنی آیات کی تلاوت کر کے دعائیں مانگنے لگا کہ ”اے میرے پروردگار! مجھے اس پریشانی سے نجات دلا، اے میرے مولا! یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ قافلے والے میرا انتظار کر رہے ہوں گے اور پریشان ہوں گے کہ میں کہاں غائب ہو گیا ہوں۔ اے میرے اللہ! میری مدد فرما...... مجھے یہاں سے آزاد کرانے کے لیے کوئی وسیلہ پیدا فرما...... اے میرے اللہ! اس سانپ کو ہدایت دے کہ یہ مجھے آزاد کر دے۔“ دعا مانگتے وقت میرا جسم بری طرح کانپ رہا تھا اور میری آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی اور آسمان پر کہکشاں کا راستہ بھی چمکنے لگا تھا، مگر اس جگہ تو اندھیرا تھا۔ بالآخر میں نے سانپ کے پیچھے چلنے کا فیصلہ کر لیا، یہ سوچ کر کہ جو ہوگا دیکھا جائے گا...... اب سانپ آگے آگے تھا اور میں اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ تھوڑی دور جا کر وہ پیچھے مڑا اور میرے پاؤں میں لپٹنے لگا اور اپنی زبان سے میرے پاؤں کو چاٹنے لگا، جیسے وہ ان کو پیار کر رہا ہو اور اپنی خوشی کا اظہار اس انداز میں کر رہا ہو اور اسے میرا اس طرح اس کے پیچھے چلنا اچھا لگا ہو، جیسے میں نے اس کی بات مان لی ہو اور وہ اس کے صلے میں مجھے اس انداز سے پیار کرنے لگا ہو...... مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ میں نے اس کے اشاروں کی زبان سمجھ لی ہے۔ کچھ دیر بعد وہ پھر میرے آگے آگے چلنے لگا اور میں اس کی پیروی کرنے لگا۔ ہر طرف اندھیرا تھا، مگر سانپ تھوڑے تھوڑے وقفے وقفے سے ہلکا سا پھنکارتا تو فضا میں چھوٹے چھوٹے شعلے سے بکھر جاتے، جن سے روشنی ہو جاتی اور میں اس روشنی میں راستہ دیکھ کر قدم آگے بڑھاتا رہا۔ میں سانپ کے پیچھے پیچھے دشوار پہاڑی راستوں پر چلتا رہا، حتیٰ کہ چلتے چلتے صبح ہو گئی۔

ہم سدا ایسے سفر میں رہنے والے دشوار ترین راستوں پر شب و روز مسلسل چلنے کے بعد بھی نہیں تھکا کرتے تھے، لیکن اس روز صبح کے وقت مجھ پر شدید تھکن طاری ہو گئی تھی۔ اوپر سے نیند نہ کر سکنے کی وجہ سے میری آنکھیں بھی بوجھل سی ہو گئی تھیں۔ میرا جی چاہتا کہ بس میں یہیں اس کھردری زمین پر ہی لیٹ کر سو جاؤں، مگر سانپ کے خوف کی وجہ سے میں بھلا کیسے سو سکتا تھا۔ میں اب بھی ڈرا ڈرا اور سہما ہوا تھا کہ نہ جانے یہ سانپ میرے اوپر کون سا ستم ڈھانے والا ہے، پھر نہ جانے آگے جا کر میں کس مصیبت میں گرفتار ہو جاؤں گا، میں اپنے اس خوف کو دور کرنے کی بھی کوشش کرتا کہ نہیں ایسا نہیں ہوگا، اگر سانپ نے مجھے تکلیف اور نقصان ہی پہنچانا ہوتا تو یہ کب کا مجھے ڈس چکا ہوتا اور میں موت کی آغوش میں سو رہا ہوتا۔

صبح ہوئی تو سانپ ایک بنجر اور ویران سی پہاڑی کے قریب پہنچ کر اس کی اونچائی کی جانب بڑھنے لگا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ کر وہ کچھ دیر کے لیے ٹھہر گیا، تو میں بھی اس کے پیچھے ہی رُک گیا اور ایک پتھر پر بیٹھ کر اپنی سانسیں دُرست کرنے لگا۔ اب سانپ نے پہاڑی کی دوسری جانب اترائی میں اُترنا شروع کر دیا تھا، کافی گہرائی میں جا کر مجھے زمین کچھ ہموار سی دکھائی دی اور تھوڑی دُور جا کر سانپ ایک جانب ہو کر لہرانے لگا اور پھر اپنے سر کو ہلا کر اشارہ کرنے لگا کہ میں آگے بڑھ کر اس کے قریب آ جاؤں، میں آٹھ دس قدم چل کر اس کے قریب پہنچ گیا اور اس طرف دیکھا، جدھر کا وہ اشارہ کر رہا تھا۔ وہ ایک ویران سی جگہ تھی، جہاں قدرتی طور پر پتھروں کا ایک کنواں سا بنا ہوا تھا، مگر وہ سارا کا سارا زمین کے اوپر تھا...... اس کے اندر ایک بڑا سا سنہرے رنگ کا نہایت ہی خوب صورت سانپ بیٹھا ہوا جھوم رہا تھا، ایسے جیسے وہ کوئی نغمہ الاپ رہا ہو، میں اس کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا اور گھبراہٹ کے عالم میں پیچھے ہٹنے لگا، تو وہ غصے سے پھنکارا۔ ہوا میں ایک تیز سی روشنی پھیل کر میری طرف آئی، تو مجھے یوں لگا کہ جیسے میرے جسم میں کسی نے آگ بھر دی ہے۔ تپش کے مارے میرا بدن جلنے لگا اور میں وہاں ہی گر گیا۔ وہ سانپ جو مجھے یہاں تک لایا تھا، خود ایک بڑے سے پتھر کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھا ہوا تھا اور مجھے دیکھ رہا تھا۔ وہ فوراً وہاں سے اٹھا اور میرے پاس آ گیا، پھر وہ میرے بدن پر اپنی زبان پھیرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں میرے تمام جسم کی جلن ختم ہو گئی اور یوں لگا جیسے مجھے کچھ ہوا ہی نہ تھا، وہ مجھے اشاروں سے ایک چھوٹے سے پتھر کو دھکیل کر سمجھانے لگا کہ میں اس سنہرے سانپ کو پتھر ماروں۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ سانپ ایک دوسرے کے دشمن ہیں اور ایک دوسرے کو جان سے مارنا چاہتے ہیں۔ اس سانپ کے اشاروں پر میں نے ڈھیر سارے پتھر جمع کر لیے اور پھر وہ پتھر اٹھا اٹھا کر اس سنہرے سانپ کو مارنے لگا۔ وہ سانپ ان پتھروں میں ہی بیٹھا رہا، وہ وہیں بیٹھے بیٹھے ہی پھنکار مارتا رہا، ایک روشنی سی فضا میں پھیلتی اور پھر میرا بدن اسی طرح جلنے لگتا اور میں زمین پر گر پڑتا، اس کی پھنکار سے وہ سرخ رنگ والا سانپ فوراً میری طرف لپکتا اور اپنی زبان سے میرے جسم کو چاٹنے لگتا۔ اس کے چاٹنے سے میرے جسم میں ٹھنڈک سی دوڑ جاتی اور میں ٹھیک ہو جاتا اور دوبارہ پتھر اُٹھا کر اس کو مارنے لگتا۔ وہ پھر اپنا وار کرتا اور پھنکارتا، اس کی پھنکار سے نکلنے والی آگ نے میرے جسم کے تمام کپڑے جلا دیے تھے اور میں تقریباً بالکل ہی برہنہ ہو گیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ میرے سفید جسم کا گوشت بھی جل کر سیاہ رنگت میں تبدیل ہو گیا تھا اور جگہ جگہ سفید رنگ کے چھالے اُبھر آئے تھے، لیکن میں نے پھر بھی ہمت نہ ہاری تھی۔ میں جب بھی اسے پتھر مارتا تو جواب میں وہ پھنکارتا اور پھر اپنی جگہ بیٹھ کر لہرانے لگتا، جیسے وہ مجھے جلا کر خوشی منا رہا ہو...... کبھی وہ جھومتا اور کبھی لہراتا۔ مجھے یہ سمجھ نہ آ رہی تھی کہ وہ اپنی جگہ سے اُٹھتا کیوں نہیں ہے؟ کیوں کہ ہمارے درمیان فاصلہ کچھ زیادہ نہیں تھا۔ اگر وہ چاہتا تو وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر آسانی سے مجھے ڈس سکتا تھا اور مجھے موت کے منہ میں لے جا سکتا تھا...... مگر وہ ایسا نہیں کر رہا تھا اور پھر وہ دونوں سانپ بھی آپس میں نہیں لڑ رہے تھے، بلکہ ان کی لڑائی تو میں لڑ رہا تھا...... یہ لڑائی تقریباً ایک گھنٹہ سے زائد عرصہ جاری رہی۔ میں اس کو پتھر مارتا، وہ پھنکارتا، میرا جسم جلن محسوس کرتا...... سُرخ رنگ والا سانپ مجھے چاٹتا اور میں ٹھیک ہو جاتا۔ اس مسلسل جنگ میں میری ہمت جواب دینے لگی تھی اور دماغ بھی ماؤف ہوتا محسوس ہونے لگا تھا، مجھے خون کی نالیوں میں بھی سوئیاں سی گردش کرتی محسوس ہونے لگی تھیں۔ میں تھک ہار کر بیٹھ گیا کہ سرخ رنگ کے سانپ نے پھر میرے بدن پر زبان پھیری...... تو میں آخری بار کوشش کر کے غصے سے اُٹھا اور ایک بڑا اور بھاری پتھر اُٹھایا اور لڑکھڑاتے ہوئے آگے بڑھ کر پوری قوت سے وہ پتھر سنہرے سانپ کو دے مارا۔ جس نے سنہرے سانپ کا سر کچل دیا۔ میں نے اس کے بعد دو اور پتھر اٹھا کر اس کو دے مارے تا کہ یہ یقین ہو جائے کہ وہ سانپ واقعی میں مر گیا ہے۔ اس کے بعد میں نڈھال سا ہو کر زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد سنہرے سانپ کی پھنکار سنائی نہ دی جس کا یہی مطلب تھا کہ وہ سانپ مر گیا ہے...... یہ سب کچھ محسوس کرنے کے بعد کہ اب اسے کوئی خطرہ نہیں ہے وہ سرخ سانپ خوشی سے

جھومنے لگا اور جھومتا ہوا میری طرف آیا اور پھر دیوانہ وار میرے جسم پر اپنی زبان پھیرنے اور چاٹنے لگا، پھر اس سرخ ناگ نے ایک زوردار پھنکار ماری تو مجھے اپنے جسم پر ایک آگ یوں تیرتی ہوئی محسوس ہوئی جیسے میرے جسم پر کسی چیز کا لیپ کر دیا گیا ہو۔ اس لیپ نے میرے جسم پر ہونے والی جلن میں بہت زیادہ کمی کر دی تھی، لیکن میرے جسم پر پڑے ہوئے چھالے پھٹ گئے تھے اور ان میں سے خون بہنے لگا تھا۔ سانپ نے ایک اور پھنکار ماری اور اسی طرح ایک گرم ہوا کا لیپ سا مجھے اپنے تمام بدن پر دوبارہ محسوس ہو گیا اور پھر میں نے دیکھا کہ میرے چھالوں سے بہنے والا خون بند ہو گیا ہے۔ اس کے بعد میری طبیعت میں کچھ بہتری آ گئی اور میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

جب سانپ نے محسوس کیا کہ میری طبیعت سنبھل گئی ہے، تو وہ پھر اسی انداز میں آگے بڑھنے لگا اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرنے لگا۔ میں اب مزید آگے بڑھنے سے قاصر تھا، لیکن میں اور کیا کرتا، سوائے اس کے کہ اس کی پیروی کرتا، لہٰذا میں نے اپنی بکھری ہوئی طاقت کو یکجا کیا اور ہانپتا کانپتا لڑکھڑاتا ہوا اس پتھروں کے کنویں کی طرف بڑھا، جہاں سنہری سانپ مرا ہوا پڑا تھا۔ سانپ کے اشارے کے مطابق میں نے اس کو دُم سے پکڑا اور اسے تالے کے دوسری جانب پھینک دیا، پھر سرخ سانپ نے مجھے وہ پتھر ہٹانے کا اشارہ کیا۔ میں نے بڑی ہی مشکل اور تکلیف سے ان پتھروں کو وہاں سے ایک طرف سرکایا۔ تو میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ وہاں ایک بڑی سی سرنگ تھی، جو اندر کی طرف جا رہی تھی۔ سرخ سانپ لہراتا ہوا اس میں داخل ہو گیا۔ وہ سرنگ اتنی بڑی تھی کہ میں آسانی سے اس میں داخل ہو سکتا تھا، لہٰذا میں بھی نہایت ہی بُری حالت میں اپنے جسم کو گھسیٹتا ہوا اس میں گھس گیا۔ ذرا آگے جا کر سانپ رک گیا، کیوں کہ اس کے آگے بالکل ہی اندھیرا تھا اور تاریکی کی وجہ سے آگے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس سے آگے روشنی نام کو بھی نہیں تھی۔ میں نے یہ فاصلہ بھی بڑی مشکل سے طے کیا تھا۔ مجھے تو یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ میں ابھی موت کے منہ میں چلا جاؤں گا۔ سانپ نے اب برابر پھنکارنا شروع کر دیا تھا، وہ جب بھی پھنکارتا تو چاروں طرف شعلے سے بکھر جاتے، جس سے غار میں روشنی سی ہو جاتی۔ میں اس روشنی کو دیکھ کر آگے بڑھ جاتا۔ کچھ آگے جا کر جب سانپ پھنکارا تو اس سے آگ کے شعلے بلند ہوئے تو مجھے ان کی روشنی میں اسی قسم کا ایک اور بھاری پتھر نظر آیا، جیسا کہ باہر تھا۔ سانپ نے مجھے اس کو ہٹانے کا اشارہ کیا، مگر اس وقت میرا جسم قریباً بے جان سا ہو چکا تھا اور مجھ میں کسی بھی قسم کی ہمت نہ تھی۔ میرا تمام جسم تھکا ہوا اور پھوڑا بنا ہوا تھا۔ میرے ہاتھوں میں تو بالکل بھی طاقت نہیں تھی۔ میری ٹانگیں، خوف اور کمزوری سے لرز رہی تھیں اور میرے اپنے جسم کا بوجھ اُٹھانے سے انکاری تھیں، لیکن سانپ کا حکم تو ماننا ہی تھا، کیوں کہ اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہ تھا، لیکن میں نے جیسے تیسے کر کے اس پتھر کو ہٹا ہی دیا...... جیسے ہی وہ پتھر ہٹا تو مجھے وہاں ایک اور سرنگ دکھائی دی، بالکل اسی طرح جس طرح کی سرنگ میں ہم نے پہلے سفر کیا تھا، لیکن اس میں ایک فرق تھا کہ اس میں اندھیرا نہ تھا، بلکہ روشنی پھیلی ہوئی تھی، جسے دیکھ کر میری جان میں جان آ گئی۔

سانپ اس کے اندر چلا گیا تو میں بھی اس کے پیچھے پیچھے اس میں داخل ہو گیا۔ کچھ آگے جا کر مجھے ایک بہت ہی بڑا سا صندوق رکھا ہوا دکھائی دیا۔ اس کا رنگ سنہرا تھا اور اس میں سے روشنی چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔ سانپ اس کے قریب جا کر رُک گیا تو میں بھی گرتا پڑتا اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس صندوق کو بڑے سے تالے سے بند کیا گیا تھا۔ سانپ نے پھر مجھے اشارہ کرنا شروع کر دیا۔ میں فوراً ہی سمجھ گیا کہ وہ مجھے تالا کھولنے کے لیے کہہ رہا ہے۔ میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو مجھے کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی جس کی مدد سے میں تالا توڑ سکوں تو میں مایوس سا ہو کر ایک جانب کو بیٹھ گیا۔

سانپ نے جب میری بے چارگی دیکھی تو وہ صندوق کے پاس گیا اور تالے کے قریب منہ کر کے پھنکارا۔ اس کی پھنکار اتنی زوردار تھی کہ تالا سرخ ہو گیا۔ میں نے اُٹھ کر ایک پتھر اُٹھا کر تالے کو مارا تو تالا ٹوٹ کر زمین پر گر گیا، سانپ نے مجھے صندوق کھولنے کا اشارہ کیا۔ تو میں نے ڈرتے ڈرتے صندوق کا ڈھکن اوپر کو اُٹھایا۔ صندوق کھلتے ہی میری آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ صندوق، ہیروں، جواہرات اور سونے کے بھاری

زیورات سے بھرا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں خاصی وزن میں چاندی بھی نظر آرہی تھی۔ اب سانپ کا یہ اشارہ تھا کہ میں وہ تمام سامان نکال لوں، مگر میں نے اس طرف توجہ نہ دی، کیوں کہ ایک تو میں برہنہ تھا، اوپر سے بھوک اور پیاس نے میرا بُرا حال کر رکھا تھا، میری تو جان پر بنی ہوئی تھی۔ اور اس کے مزے لگے ہوئے تھے، میں بھلا اس وقت ان زیورات اور ہیروں کا کیا کرتا۔ مجھے تو لباس اور کھانے پینے کی چیزوں کی ضرورت تھی۔ میں ان چیزوں کو اٹھا کر کہاں لے جاتا، یہ اس وقت میرے کسی کام کی نہیں تھی...... سانپ نے میری مجبوری اور ضرورت کو محسوس کر لیا تھا۔ اس نے اُس صندوق کو وہاں ہی دھنے دیا اور پھر آگے کی طرف رینگنے لگا۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک اور صندوق تھا، جو پہلے والے صندوق سے کچھ بڑا تھا اور اس میں تالا بھی نہیں لگا ہوا تھا۔ وہ لوہے کی موٹی چادر کا بنا ہوا تھا۔ سانپ کے اشارے پر میں نے اس کو کھولا، تو اس میں، ایک طرف کئی طرح کے قیمتی لباس پڑے ہوئے تھے اور دوسری طرف ایک چاندی کی طشتری رکھی ہوئی تھی، جس میں کئی قسم کے خشک میوہ جات بھرے ہوئے تھے اور ایک بڑا سا طاؤس نما تھرماس ناریل کے پانی سے بھرا ہوا تھا...... میں نے بے اختیار ہو کر وہ طشتری اٹھا لی اور خشک میوہ جات کا کھا کر اپنا پیٹ بھرا اور اس کے بعد ناریل کا پانی پیا۔ جس سے میری طبیعت کچھ بحال ہوئی اور میرے جسم میں جان آ گئی، پھر میں نے وہاں سے ایک کپڑوں کا جوڑا نکال کر پہن لیا۔ کھا پی کر اور کپڑے پہن کر مجھے ایک روحانی سا سکون محسوس ہوا۔ اور یوں لگا کہ میں واپس اپنی دنیا میں آ گیا ہوں۔

سانپ نے مجھے مطمئن دیکھا تو وہ بھی خوشی سے جھومنے لگا۔ جھومتے جھومتے اس کے منہ سے ایک مخصوص قسم کی سیٹی کی آواز نکلی، جیسے اس نے خود وہ سیٹی بجائی ہو۔ اس نے دوسری بار پھر اسی انداز میں سیٹی بجائی۔ اس سیٹی کی آواز پر آناً فاناً اس جیسے سیکڑوں سانپ جھومتے لہراتے اور بل کھاتے ہوئے وہاں آ کر اکٹھے ہو گئے۔ ان سب کے آگے ایک نہایت ہی سُرخ اور چمکدار کوئی بالشت برابر سانپ ایک بڑے سے سرخ رنگ کے سانپ کے پھن پر بیٹھا ہوا تھا، وہ سانپ میرے مقابل آ کر ٹھہر گیا، پھر اس نے تھوڑا سا اپنے سر کو جھکایا تو پھن پر بیٹھا ہوا سانپ نیچے زمین پر اُتر آیا اور اس نے میرے آگے اپنے سر کو جھکا دیا، گویا وہ ان کا سردار تھا اور پھر تمام سانپوں نے اس کی معیت میں ایسا ہی کیا۔ یعنی ان سب نے اپنے اپنے سر میرے سامنے جھکا دیے، پھر مجھے نہیں معلوم کہ یہ سب کیا اور کیسے ہوا، کیوں کہ تمام سانپ میرے بدن سے لپٹ کر میرا جسم چاٹنے لگے تھے اور میرے جسم پر جہاں جہاں بھی چھالے پڑے تھے، ان پر اپنی زبانیں پھیرنے لگے، یہ عمل کوئی ایک گھنٹہ سے زیادہ دیر جاری رہا...... مجھے ان کے اس عمل یعنی میرے جسم کو چاٹنے سے اس قدر سکون اور سرور ملا تھا کہ زندگی میں پھر کبھی مجھے ایسا سرور اور سکون نہیں ملا۔ میری تمام تھکاوٹ، درد، بھوک، پیاس اور کمزوری ختم ہو گئی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے جسم میں ایک نئی طاقت اور نئی توانائی دوڑنے لگی ہو، جیسے میرے مردہ جسم میں نئی جان پڑ گئی ہو۔ اس کے بعد ان سانپوں کے سردار نے ایک پھونک سی ماری اور پھر تمام سانپ پیچھے کی طرف ہٹ گئے اور اسی طرف کو لوٹ گئے، جدھر سے وہ سب آئے تھے، آخر میں وہ سانپ رہ گیا جو مجھے یہاں تک لایا تھا۔ وہ خوشی سے لہرا رہا تھا کہ میں اتنی تکلیفیں اٹھانے کے بعد ایک خاص منزل پر پہنچ کر ٹھیک ہو گیا ہوں، پھر وہ میرے قریب آیا اور میری ٹانگوں اور پیروں سے لپٹا، ان کو چاٹا اور پھر اپنی گردن جھکا کر وہ مجھے سلام کرنے لگا اور پھر وہ بھی اسی طرف کو چلا گیا۔ جدھر وہ دوسرے سانپ گئے تھے۔

میں حیران و پریشان وہاں ہی کھڑا رہ گیا تھا۔ ان دو صندوقوں کے سوا وہاں اور کچھ بھی نہ تھا۔ اب میں ذہنی اور جسمانی طور پر مکمل صحیح اور فٹ تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ جیسے میں اس سے پہلے کوئی خواب دیکھتا رہا ہوں اور اب خواب سے ہی بیدار ہوا ہوں، مگر جو کچھ ہوا تھا وہ ایک حقیقت تھی۔ میرے ساتھ جو بھی کچھ ہوا تھا، وہ عجیب اور پراسرار ہونے کے ساتھ ساتھ حیران کن بھی تھا۔ اب میرے سامنے ہیرے، جواہرات سے بھرا ہوا ایک صندوق پڑا ہوا تھا اور ایک میں قیمتی ملبوسات تھے۔ یہ بات تو میں سمجھ گیا تھا کہ اب یہ سارا سامان میری ملکیت ہے، جو ان سانپوں کی بدولت مجھے ملا ہے۔ سانپ کا مجھ کو یہاں تک لانے کا مقصد مجھے یہ خزانہ ہی دینا تھا۔ قدرت نے ان کے وسیلے سے میرے نصیب میں یہ سب کچھ لکھا ہوا تھا، جو اب مجھے

مل گیا تھا...... مگر میں اب کیا کروں؟ کہاں جاؤں، اور اس خزانے کا کیا کروں اور اس کو کیسے اپنے وطن، اپنے گھر لے کر جاؤں؟ میرے قافلے والے تو میری طرف سے مایوس ہو کر جا چکے ہوں گے، میں اس قابل نہ تھا کہ ان بھاری صندوقوں کو اٹھاتا...... میں کئی روز تک اسی غار میں بیٹھا رہا۔ خشک فروٹ اور ناریل کا پانی پی کر میرا گزارا ہو رہا تھا۔

ایک روز میں مایوسی کے عالم میں غار میں بیٹھا ہوا تھا کہ مجھے اونٹوں کی گھنٹیوں کی آواز سنائی دی۔ میں بھاگ کر سرنگ سے باہر نکل آیا اور اس طرف نظر دوڑائی جدھر سے گھنٹیوں کی آوازیں آ رہی تھیں، وہ کوئی قافلہ ہی تھا جو ہندوستان کے دور افتادہ علاقے سے واپس آ رہا تھا۔ میں ان کا انتظار کرنے لگا۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ انہوں نے غار کے علاقے میں اس جگہ پڑاؤ کیا...... مگر یہ میرا والا قافلہ نہیں تھا، یہ اور لوگ تھے، مگر آئے وہ بھی میرے وطن ہی سے تھے۔ میں اُن کے قریب چلا گیا اور ان سے اپنا تعارف کرایا اور پھر ان کو اپنی تمام آپ بیتی سنائی اور ان سے درخواست کی کہ وہ ایک اونٹ مجھے دے دیں۔ میں نے اونٹ کی مالیت کا سونا ان کو دینے کی پیشکش کی تو وہ مان گئے اور ایک اونٹ مجھے دے دیا۔ میں نے اونٹ غار کے ساتھ ہی باندھ دیا۔ ان لوگوں نے مجھے ساتھ چلنے کی پیشکش کی تو میں نے ان کو ٹال دیا کہ میں بعد میں آؤں گا، جب وہ قافلہ کافی آگے نکل گیا تو میں واپس غار کے اندر آ گیا اور میں نے وہ صندوق کھینچ کھینچ کر باہر نکالے اور انہیں اونٹ پر لاد دیا، چوں کہ اونٹ پر سامان لادنے اور اُتارنے کا مجھے خاصا تجربہ تھا، اس لیے مجھے اس سلسلے میں کوئی پریشانی نہ ہوئی، میں نے ایک گہرے رنگ کا کپڑا ان صندوقوں کے اوپر ڈال کر انہیں اچھی طرح سے ڈھک دیا۔

میں جب وہاں سے روزانہ ہونے لگا، تو میں نے دیکھا کہ سرخ رنگ کے سانپوں کا ایک جوڑا غار سے باہر نکلا اور وہ بھی میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ میں جان گیا کہ یہ میری اور میرے سامان کی حفاظت کے لیے میرے ہمراہ چل رہے ہیں۔ وہ میرے گھر تک ساتھ ہی آئے اور پھر اچانک ہی کہیں غائب ہو گئے۔ نہ جانے وہ کہاں گئے تھے، شاید واپس اپنے غار میں لوٹ گئے ہوں گے۔

کئی ماہ کے طویل و کٹھن سفر کے بعد جب میں اپنے گھر میں داخل ہوا تو میرے گھر والوں نے مجھے جاننے اور پہچاننے سے ہی انکار کر دیا، کیوں کہ اتنے عرصے میں زمانے کی مشقت کے سبب میری شکل اور حلیہ ہی بدل گیا تھا، پھر میں نے اپنی تمام عادتیں، نشانیاں اور اپنا حسب نسب ان کو بتایا، تب کہیں جا کر ان کو یقین آیا کہ یہ میں ہی ہوں۔ یعنی زمرد خان عرف خان زادہ۔

میں نے جب اپنے ابا جان کو اپنی آپ بیتی سنائی تو وہ سن کر حیرت زدہ ہو گئے۔ ان کو یقین ہی نہ آ رہا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے، مگر جب انہوں نے ہیرے اور جواہرات دیکھے تو انہیں یقین کرنا ہی پڑا کہ میرے ساتھ جو کچھ بھی بیتا ہے، وہ ایک سچی حقیقت ہے۔ ابا جان نے اس میں سے کچھ قیمتی سوٹ، تھوڑا سا سونا اور تین ہیرے نکال کر میرے حوالے کیے اور پھر وہ دونوں صندوق گھر کے باغیچے میں زمین کھود کر اس میں دفن کر دیے، تا کہ کسی کو اس حقیقت کا علم نہ ہو سکے اور لوگ ہمارے دشمن نہ بن جائیں۔ ان کا ارادہ تھا کہ وہ آہستہ آہستہ یہ خزانہ نکال کر غریبوں اور ناداروں میں تقسیم کر دیں گے۔ ابا جان نے کچھ عالم حضرات کے علاوہ کچھ پیروں سے بھی رابطہ کیا تھا اور اس واقعے کے بارے میں انہیں بتا کر یہ جاننے کی کوشش کی کہ آخر یہ خزانہ ان سانپوں نے میرے بیٹے کے ہی حوالے کیوں کیا۔ ان لوگوں نے روایات کے حوالے سے اندازہ لگا کر بتایا کہ دراصل وہ سنہری سانپ جو غار کے منہ پر بیٹھا تھا، وہ اس سرخ نسل کے سانپ کا دشمن تھا اور اس نے ان کے خزانے پر زبردستی قبضہ کر رکھا تھا۔ چوں کہ ان میں اس سانپ کو مارنے کی طاقت نہیں تھی، کیوں کہ وہ سنہری سانپ نہایت ہی جابر اور طاقتور تھا۔ اس کو صرف انسان ہی مار سکتا تھا اور انسان بھی وہ جو ماں باپ کی پہلوٹی کا لڑکا ہو اور اس نے گیارہ سال عمر ہو جانے کے بعد سے کبھی تہجد کی نماز قضا نہ کی ہو...... اتفاق سے یہ سب باتیں مجھ میں موجود تھیں، مگر ابھی تک یہ معما نہیں جان سکا کہ سرخ سانپ نے کیسے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ میں ہی وہ شخص ہوں جو ان کی نسل کے دشمن سردار کو مار سکتا ہوں؟

☆......☆

ابا جان نے جو فیصلہ کیا تھا کہ وہ ان ہیروں اور جواہرات سے ناداروں اور غریبوں کی مدد کریں گے، پھر

انہوں نے جوں ہی اس پر عمل کرنا شروع کیا تو لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ ہمارے گھر کے صحن میں کوئی خزانہ دفن ہے۔ لوگ اس بارے میں ہم سے طرح طرح کے سوالات کرتے تھے کہ یہ کہاں سے آیا......؟ کیسے آیا؟ کون لایا؟ مگر ہم نے ان لوگوں کے ہر سوال کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور یہی کہا کہ یہ اللہ کی عطا ہے اور اس نے ہمیں اپنی رحمت سے نوازا ہے۔ آہستہ آہستہ یہ بات پہلے محلے میں اور پھر قصبے میں پھیل گئی اور لوگ دور دور سے اپنی اپنی حاجات لے کر آنے لگے۔ ہم نے کسی کو بھی مایوس نہ کیا اور ہر ایک سوالی کا دامن مراد بھرنے لگے۔

ایک صبح جب ہم سو کر اُٹھے تو دیکھا کہ صحن میں وہ جگہ جہاں پر وہ صندوق دفن تھے۔ وہاں تین افراد مردہ حالت میں پڑے ہوئے تھے اور صحن کی کھدائی بھی کی ہوئی تھی اور دونوں صندوق گڑھے میں رکھے ہوئے صاف نظر آرہے تھے۔

یہ تو واضح ہوگیا تھا کہ ہیرے اور جواہرات کو چوری کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ان تینوں کو سانپ نے ڈس کر مار ڈالا تھا۔ ان کا نیلا جسم اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ ان کو سانپ نے ہی کاٹا ہے۔ اس کے بعد تو ہم نے اللہ کے دیے ہوئے اس خزانے کے منہ کھول دیے اور پرسکون ہوگئے۔ میرے پاس اب بھی کافی ہیرے اور جواہرات تھے جو میں نے اپنی شادی کے لیے رکھ چھوڑے تھے، پھر میری شادی دھوم دھام سے ہوئی اور اس میں بے پناہ دولت لٹائی گئی...... ہماری ساری مالی پریشانیاں تو دور ہوگئی تھیں اور ہمارا شمار بھی امیر کبیر لوگوں میں ہونے لگا تھا، مگر میں شادی کے معاملے میں بدقسمت نکلا...... میری زندگی میں اُمنگوں اور آرزوؤں کی صرف ایک رات ہی آئی، صبح ہوئی تو میری دلہن زندگی سے ناتا توڑ گئی تھی۔ اس کا جسم بھی نیلا پڑ گیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے کوئی زہر اس کے جسم میں سرایت کر گیا ہے۔ ایک مستند حکیم نے بتایا کہ مجھے اب شادی نہیں کرنی چاہیے، کیوں کہ جو بھی عورت میری زندگی میں آئے گی، وہ زندگی نہ رہے گی۔ اس نے میرا علاج بھی کیا، مگر کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

یوں ہی کچھ برس مزید بیت گئے۔ میرے ماں باپ بھی اس دنیا میں نہ رہے تو میں وہاں سے ہجرت کرکے اس علاقے میں آ گیا اور یہاں جائیداد خرید کر زمینداری شروع کر دی اور لوگوں کی خدمت کو اپنا مشن بنا لیا، میں نے ایک ہیرا سونے کی انگوٹھی میں جڑوا لیا تھا جو اب بھی میں نے پہنی ہوئی ہے، اس سرخ نسل کا سانپ کہیں بھی ہو، میرے بدن کی خوشبو سونگھ میرے پاس آجاتا ہے اور میرے قدموں کو چاٹ کر واپس لوٹ جاتا ہے۔ اور جب مجھے ان کو بلانا ہوتا ہے تو میں انگوٹھی میں جڑے ہیرے کو اپنے جسم سے رگڑتا ہوں، پھر نہ جانے کہاں سے وہ سرخ رنگ کا سانپ آجاتا ہے اور کبھی کبھی تو ان کی تعداد بھی زیادہ ہوتی ہے۔ وہ سب میرے پاؤں چاٹنے لگتے ہیں اور میں بھی پہروں ان کے ساتھ کھیلتا رہتا ہوں۔ یہ نہ مجھے کچھ کہتے ہیں اور نہ ہی کسی اور انسان کو ڈستے ہیں، البتہ اگر کوئی ان کے ساتھ زیادتی کرے تو وہ اس کو جلا کر راکھ بنا ڈالتے ہیں۔ یہ بہت ہی زہریلے ہیں، یہ پھنکارتے ہیں تو ہوا میں شعلے بھڑک اُٹھتے ہیں...... مگر یہ ایسا کبھی کبھار ہی کرتے ہیں۔

خان زادہ نے اپنی پراسرار داستان ختم کی تو میں خوف زدہ سا ہو کر کانپنے لگا تھا۔ خان زادہ نے جب میری یہ حالت دیکھی تو مجھے تسلی دی اور کہنے لگا۔ ”تھانیدار صاحب! آپ بے فکر ہو جائیں، وہ سانپ آپ کو بھی کچھ نہیں کہیں گے، کیوں کہ آپ نے میرے ڈیرے پر آکر میرے ساتھ کھانا کھا لیا ہے۔ اب آپ میرے مہمان ہی نہیں راز دار بھی بن گئے ہیں اور یہ سانپ میرے دوستوں اور مہمانوں کو کچھ نہیں کہتے۔

خان زادہ کی باتوں سے مجھے کچھ حوصلہ سا ہوا اور اگلے دن میں واپس اپنے علاقے میں لوٹ آیا اور اس کے بعد پھر کبھی بھول کر بھی خان زادہ سے ملنے نہیں گیا۔

☆......☆

یہ کہانی مجھے ایک ریٹائرڈ تھانیدار سہراب خان نے سنائی تھی، اس وقت اس کی عمر اسی سال تھی، میں اس کی باتوں اور خان زادہ کی طلسمی داستان کو نہیں بھول سکا ہوں، جب بھی یہ داستان یاد آئی ہے۔ تو میں پہروں خوابوں کی سی دنیا میں کھو جاتا ہوں، کہ تھانیدار سہراب کو خان زادہ نے جو کچھ سنایا تھا۔ کیا وہ واقعی سچ تھا؟

☆......☆



راج نرتکی

آصفہ ضیاء احمد

راجا ہر بنس رائے کی راج نرتکی کی سنسنی خیز داستان

نازش اور مجسم شادی کے فوراً بعد اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق ہنی مون ٹور پر نکل گئے۔ سب سے پہلے محبت کی لازوال یادگار تاج محل کے سائے میں بیٹھ کر دونوں نے مستقبل کے تانے بانے بنے، ساتھ جینے



مرنے کی قسمیں کھائیں، بہت سے عہد و پیمان کیے اور پھر سے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ ہندوستان کے کئی تاریخی مقامات کی سیر کرنے کے بعد اب دونوں چھتیس گڑھ کے علاقے کی طرف گامزن تھے۔ وہاں کے راجہ مہاراجاؤں کے قلعے اور محلات دیکھنے کے بعد اُن کا پروگرام گھر واپس جانے کا تھا۔ دونوں ان دنوں بے حد خوش و خرم تھے۔ اُن کے لیے ہر دن عید اور ہر رات شب برات تھی اور اُس وقت تو نجم کی خوشی دوبالا ہوگئی جب اچانک چھتیس گڑھ کی سیر کے دوران اُس کی ملاقات اپنے دیرینہ دوست راہول ملہوترہ سے ہوگئی۔ راہول آج کل چھتیس گڑھ میں بحیثیت پولیس انسپکٹر تعینات تھا۔ دونوں دوست برسوں بعد ملے تھے۔ اس لیے باتوں کا سلسلہ ایسا چھڑا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ نجم، نازش اور راہول تینوں اس وقت شہر کے مشہور ریسٹورنٹ میں بیٹھے کافی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ دونوں دوستوں کے ہنسی قہقہے فضا میں بلند ہو رہے تھے اور نازش اپنی کرسی پر بیٹھی کسمسا رہی تھی، اُس کی خاموشی سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بوریت محسوس کر رہی ہے۔ ایکا ایکی راہول نے باتوں کا تسلسل توڑتے ہوئے نازش کو مخاطب کیا اور معذرت طلب لہجے میں کہا۔

"بھابی معافی چاہتا ہوں، میں بالکل بھول گیا تھا کہ اس وقت آپ دونوں ایک دوسرے کے لیے لیلیٰ مجنوں بنے ہوئے ہیں اور میں آپ دونوں کے درمیان کباب کی ہڈی بنا ہوا ہوں۔ دراصل کافی طویل عرصے بعد ملے ہیں نا اس لیے وقت کے گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔" نازش نے احساسِ بوریت کو چھپاتے ہوئے اپنی خوب صورت مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے بالکل مائنڈ نہیں کیا، ہم لوگ ہوٹل "نولکھا" میں ٹھہرے ہوئے ہیں آپ ایسا کریں آج رات کا ڈنر ہمارے ساتھ ہی کریں۔ صرف آپ کے دوست کو نہیں مجھے بھی خوشی ہوگی۔" راہول نے اپنے مخصوص انداز میں ہلکا سا قہقہہ لگایا اور کہا۔

"بھابھی جی اس وقت آپ لوگ میرے علاقے میں بیٹھے ہوئے ہیں، مہمانداری مجھ پر فرض ہے، لیکن آپ لوگوں کو دعوت دینے سے اس لیے ہچکچا رہا ہوں کہ فی الوقت میں ایک ایسے کیس پر کام کر رہا ہوں جو انتہائی پیچیدہ اور پراسرار ہے اور میرے لیے سوہانِ روح بنا ہوا ہے میں آپ دونوں کو بالکل وقت نہیں دے پاؤں گا۔ بس اسی لیے......" نجم نے فوراً اُس کا جملہ اُچک لیا اور استفسارانہ لہجے میں کہا۔

"ایسا کیا بھید، کیا راز ہے اس کیس میں کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ۔" انسپکٹر راہول نے اجازت طلب نظروں سے نازش کی طرف دیکھا اور نازش اُس کی طرف دیکھنے پر بے ساختہ ہنس پڑی اور اپنی مترنم آواز میں کہا۔

"انسپکٹر صاحب آپ بلا کم و کاست اُس عجیب و غریب کیس کے بارے میں ہم دونوں کو بتائیں، کیوں کہ ہم دونوں کی فطرت میں ایڈونچر اور تجسس قدرت نے کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے بس آپ شروع ہو جایئے۔" انسپکٹر راہول نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا اور پر خیال انداز میں تفکر آمیز لہجے میں کہا۔

"گرمی وشوامتر کا نام سنا ہے آپ لوگوں نے" نجم نے اُس کی بات پر لمبا ہنکارا ابھرا۔

راہول نے جواب میں اپنی بات مزید آگے بڑھائی۔

"یہ یہاں کا ایک نواحی علاقہ ہے۔ اتہاس (تاریخ) سے اس کا گہرا تعلق رہا ہے۔ راجہ ہرنس رائے کے محلات کے کھنڈرات یہاں میلوں کے رقبے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ملکی اور غیر ملکی سیاح ہزاروں کی تعداد میں یہاں آتے ہیں، لیکن پچھلے دنوں یہاں پر آنے والوں کی تعداد میں یکدم کمی واقع ہوئی ہے اور اس سے گورنمنٹ کو کافی خسارہ ہوا ہے۔"

نازش نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "آنے والوں کی تعداد میں کیوں کمی آئی ہے اور اس کی کوئی خاص وجہ؟"

راہول نے بات کا سلسلہ جوڑتے ہوئے کہا۔ "جی میں اُسی طرف ہی آ رہا ہوں، دراصل یہاں پچھلے چند مہینوں میں پے در پے کئی نوجوانوں کی خون کی میں نہائی ہوئی لاشیں ملی ہیں ایسا لگتا تھا جیسا کسی نے شہ رگ کاٹ کر اُن کا خون پینے کی کوشش کی ہے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی یہی بتاتی ہے کہ مقتولین کے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی نہیں۔ یہ ہولناک وارداتیں وقفے وقفے

سے ہوتی رہتی ہیں، لیکن ابھی تک ہماری تفتیش ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھی۔ کوئی سرا ہی ہاتھ نہیں آرہا ہے، جبکہ اوپر سے سخت باز پرس ہو رہی ہے۔"

انسپکٹر راہول کا لہجہ شکست خوردہ تھا۔ نجم اور نازش نہایت انہماک سے راہول کی کہانی سن رہے تھے۔ راہول کے خاموش ہوتے ہی نجم نے کہا۔

"یار اب تو گڑھی وشوامتر جانے کا اشتیاق اور شدید ہو گیا ہے۔ ہم دونوں تو ان شاء اللہ وہاں ضرور جائیں گے۔ آخر پتا تو چلے کہ یہ ہے کیا گورکھ دھندا۔" شوہر کے فیصلے پر نازش کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اُس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"بالکل بالکل، ابھی ہمارے پاس کافی وقت ہے۔ ہم کل ہی گڑھی وشوامتر کے لیے نکل جائیں گے۔" اُن دونوں کی گفتگو سن کر راہول نے اپنے سیل فون پر بات کر کے تو پیا ہتا جوڑے کے لیے وہاں کے ایک اچھے سے ہوٹل میں اُن کے لیے کمرہ بک کروا دیا، کیوں کہ اب وہ دونوں انسپکٹر راہول کے مہمان تھے۔ دونوں دوسری صبح گڑھی وشوامتر کے لیے عازم سفر ہوئے۔

☆......☆

نجم الزماں پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھا۔ مکمل طور پر سائنس پر یقین رکھتا تھا۔ مادہ اور انرجی کے تمام اصولوں کو جانتا تھا۔ اس لیے بھوت پریت یا روحوں کا قائل نہ تھا۔ ہر بات کو منطق اور سائنس کے اصولوں پر پرکھنے کی کوشش کرتا، لیکن انسپکٹر راہول کی زبانی جو کہانی سنی تھی، اُس نے اُس کے ذہن کو اُلجھا کر رکھ دیا تھا۔ دونوں میاں بیوی کا آج گڑھی میں پہلا دن تھا۔ دونوں محلوں کے منہدم کھنڈرات گھومتے ہوئے سوچ رہے تھے کہ اگر وہ آج یہاں نہیں آتے تو شاید اُن کا ہنی مون نامکمل ہی رہتا۔ محلات کے منقش در و دیوار، مخروطی چھتیں، طاق و محراب کی نقاشی دیکھ کر وہ عش عش کر اُٹھے، ایکا ایکی چلتے چلتے نازش نے نجم سے استفسار کیا۔

"نجم راجہ ہربنس رائے کی کچھ ہسٹری کا علم ہے آپ کو۔"

نجم نے جواباً کہا۔

"کچھ زیادہ تو نہیں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ نہایت عیاش اور شباب و شراب کا دلدادہ تھا۔ ایک دن راجہ محل میں اپنی خواب گاہ میں اس طرح پایا گیا کہ اُس کا نرخرہ کٹا ہوا تھا اور جسم کا سارا خون کسی نے پی لیا تھا اور بعد میں اس کے سارے خاندان کے بلکہ پورے رجواڑے کی موت ہی اسی طرح ہوئی۔ سنگھاسن پر بیٹھنے والے ہر راج کمار کی لاش اس طرح پائی جاتی تھی کہ جسم میں لہو کی ایک بوند نہ ہوتی۔ خوف و ہراس سارے راج میں اتنا بڑھا کہ رائے خاندان نے خود ہی اپنی حکومت کو تہس نہس کر دیا اور اس طرح یہ خاندان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زوال پذیر ہو گیا۔ گرد و نواح کے دوسرے راجہ مہاراجاؤں نے قبضہ کرنا چاہا لیکن وہ بھی ناکام رہے۔ اب انجام تمہارے سامنے ہے۔ آج یہاں کھنڈر ہی کھنڈر ہیں اور اُلو بول رہے ہیں۔" نازش نے خفگی بھرے لہجے میں ناک سکوڑتے ہوئے کہا۔

"اب اس طرح تو نہ کہو۔ یہاں ہم دونوں بھی ہیں اور بول ہی رہے ہیں۔" نجم اُس کے اس جملے پر بری طرح سٹپٹا گیا اور پھر بے ساختہ ہنس پڑا۔ گھومتے پھرتے ہوئے وہ راج محل کے وسطی حصے میں نکل آئے تھے۔ اچانک چلتے چلتے نازش نے کچھ سوچتے ہوئے پُرخیال انداز میں نجم سے کہا۔

"ویسے نجم برسوں پہلے راجہ کی موت، اُس کی آنے والی نسلوں کی اموات اور حالیہ ملنے والی لاشوں میں ایک قدر بات مشترک ہے۔" نجم راج محل کا قوی ہیکل دروازہ دیکھنے میں محو تھا، اُس نے لاپروائی سے کہا۔ "وہ کیا۔" نازش نے رومال سے اپنا پسینہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب بڑی موٹی عقل ہے آپ کی، انداز قتل تمام لاشوں کا ایک ہی ہے اور اس سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ قاتل کوئی ایک ہی ہے۔" نجم نے جوابی وار کیا۔

"ویسے محترمہ شاید آپ کی عقل مجھ سے بھی زیادہ موٹی ہے۔ آپ کی تھیوری پر سوچا جائے تو اس وقت تو قاتل کی عمر صدیوں پر محیط ہو گی۔"

نازش نے کھسیا کر کہا۔ "یہ میں کچھ نہیں جانتی لیکن جناب ایک نہ ایک دن آپ کو میری بات پر ضرور ایمان لانا ہو گا۔" باتیں کرتے کرتے وہ محل کے عقبی حصے میں

آ پہنچے تھے۔ اچانک ایک جگہ دونوں ٹھٹک کر رک گئے۔ اُن کے سامنے ایک چبوترے پر ایک سنگی مجسمہ نصب تھا۔ مجسمہ عورت کا تھا اور فنِ سنگ تراشی کا بہترین نمونہ تھا۔ مجسمے کے گہنے، زیورات، لباس کی سلوٹیں، جسم کے نشیب وفراز، چہرے کے خدوخال ہر چیز اپنے منہ سے بول رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے رقاصہ رقص کرتے کرتے ایک لمحے کے لیے رک سی گئی ہو۔ ابھی کوئی ساز چھیڑے گا اور اُس کے پائل کی کھنک فضاؤں میں بکھر جائے گی۔ دونوں میاں بیوی مجسمے کو دیکھتے ہوئے خود ہی مجسم حیرت بن چکے تھے۔ دونوں ساکت ہو کر اُس سنگی مجسمے کو تک رہے تھے۔ بے اختیار نجم کی زبان سے نکلا۔

"سبحان اللہ، جس فنکار نے بھی اسے بنایا ہے، اُس کی انگلیاں چومنے کو جی چاہتا ہے۔" نازش نے اپنے اطراف میں نظر ڈالتے ہوئے سہمی سہمی آواز میں نجم سے کہا۔

"جناب یہ کام کسی اور وقت کر لینا۔ فی الحال تو یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں، کیوں کہ نہ گھومنے پھرنے والوں کی ٹولیاں نظر آ رہی ہیں اور نہ ہی وہ گائیڈز نظر آ رہے ہیں جو انہیں جھوٹی سچی کہانیاں سنا کر اپنی جیبیں گرم کر رہے تھے۔" بیوی کے کہنے پر نجم نے بھی گرد و پیش پر نظر ڈالی تو اُسے احساس ہوا کہ نازش درست کہہ رہی ہے۔

☆......☆

دونوں بہت زیادہ تھکے ہارے تھے، اس لیے بستر پر گرتے ہی بے خبر سو گئے۔ دوسری صبح اُن کے لیے کافی ہنگامہ خیز ثابت ہوئی، کیوں کہ صبح ہی انسپکٹر راہول کا فون آیا تھا کہ راج محل کے عقبی دروازے کے قریب پھر ایک نوجوان کی لاش ملی تھی اور اُس کی بھی وہی حالت تھی جو اس سے پہلے ملنے والی لاشوں کا تھا۔ یہ کیس چھتیس گڑھ کی پولیس کے لیے ایک معما بنا ہوا تھا جو کسی طرح حل نہیں ہو رہا تھا۔ راج محل کے گرد سیکورٹی سخت کر دی گئی تھی اور دائرہ تفتیش بھی وسیع کر دیا گیا تھا۔ نازش اور نجم کا ارادہ آج پھر راج محل کی سیر کا تھا، لیکن حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے انہوں نے اپنا فیصلہ تبدیل کر دیا اور پھر دونوں راج محل کے شمال میں واقع برہما مندر دیکھنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ اس مندر کی

خصوصیت یہ تھی کہ اس مندر میں صرف رائے خاندان سے تعلق رکھنے والے لوگ ہی جا سکتے تھے۔ راجہ ہربنس رائے اپنی رانیوں اور اپنی اولادوں کے ساتھ یہاں پوجا پاٹ کر کے دان پن کیا کرتا تھا لیکن اب نہ راجہ رہا تھا اور نہ اُس کی نسل کا کوئی فرد رہا تھا، ہر چیز گورنمنٹ نے محکمۂ آثارِ قدیمہ کے حوالے کر دی تھی اس لیے کسی قسم کی کوئی پوجا ہوتی تھی اور نہ کوئی پنڈت پانڈے تھا۔ سارا علاقہ سیاحوں اور ریسرچ اسکالرز کی آماجگاہ بنا ہوا تھا، لیکن فی الحال ان لوگوں کی آمد بھی کم ہو گئی تھی۔ برہما مندر میں منٹر گشتی کرتے ہوئے انہیں وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ برہما مندر دیکھ کر انہیں اجنتا ایلورا کی مورتیاں یاد آ گئیں، لیکن اس ٹور میں انہیں سب سے خوب صورت چیز رقاصہ کا سنگی مجسمہ لگا تھا جو اُن کے ذہن سے چپک کر رہ گیا تھا۔ رات کا دھندلکا پھیلنے سے پہلے ہی دونوں ہوٹل لوٹ آئے۔

☆......☆

رات کے پچھلے پہر اپنا نام سن کر نازش گہری نیند سے جاگ پڑی، اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کا نام لے کر کوئی پکار رہا ہو، مدہوشی کی سی کیفیت میں اُٹھ کر اُس نے اپنے لانبے سیاہ بالوں کو سمیٹ کر جوڑا بنایا اور کمرے کا دروازہ کھول کر نکل کھڑی ہوئی۔ اُسے خود پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے؟ کیوں جا رہی ہے؟ وہ ہولے ہولے قدم اُٹھاتی ہوئی راج محل کی جانب گامزن تھی۔ اُس کا نام بازگشت بن کر اُس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ اب وہ محل کے کھنڈرات میں داخل ہو چکی تھی۔ صبح کاذب کے آثار نمودار ہو چکے تھے۔ نجم نے آنکھیں کھول کر اپنے برابر بیڈ پر ڈالی تو نازش کو نہ پا کر اُس کے ذہن میں پہلی بات یہی آئی کہ نازش باتھ روم میں ہو گی لیکن جب اُس نے دیکھا کہ کمرے کا دروازہ چوپٹ کھلا ہے تو وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا اور پھر تھوڑی ہی دیر میں سارے ہوٹل میں ہلچل مچ گئی۔ منیجر اور ہوٹل کا اسٹاف بری طرح خائف تھا۔ سب کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں، نجم نے انسپکٹر راہول سے کئی بار رابطہ قائم کرنا چاہا لیکن راہول کا سیل فون بالکل خاموش تھا، اسی اثناء میں پولیس وین ہوٹل کے گیٹ میں داخل ہوئی جس میں انسپکٹر راہول کے ساتھ دو سیکورٹی اہلکار اور گھبرائی سراسیمہ

پریشان حال نازش تھی جو ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ نجم کو دیکھتے ہی وہ دوڑ کر اُس سے لپٹ گئی اور اُس کے کندھے پر سر رکھ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ نجم نے اُس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی، لیکن جواب میں وہ مسلسل روتی رہی، کیوں کہ اُسے خود علم نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہی تھی اور کیوں جا رہی تھی؟ سب کے چہرے سوالیہ نشان بنے ہوئے تھے لیکن یہ کیا چکر، کیا اسرار، کیا بھید ہے، کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ نازش کا ذہن کورا چٹا کاغذ بن چکا تھا، اس لیے وہ کوئی بات بتانے سے قاصر تھی۔

☆......☆

نجم اب گڑھی وشوامتر میں ایک پل بھی ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا، چوں کہ نازش خواب خرگوش کے مزے لے رہی تھی، اس لیے اُس نے خود ہی سامان سمیٹنا شروع کر دیا اور موبائل پر راہول کو بھی اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔ راہول چاہتا تھا کہ دونوں میاں بیوی کچھ دن اور قیام کریں، لیکن نازش کی حالت کو دیکھتے ہوئے دل نہ چاہتے ہوئے بھی اُس نے انہیں جانے کی اجازت دے دی۔ نجم اپنی پیکنگ مکمل کر چکا تھا۔ اسی دوران نازش نے ایک انگڑائی لی اور اپنی خوابیدہ آنکھوں سے شوہر کو دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

کہاں کی تیاری ہو رہی ہے؟ نجم نے پیاری بھری نظروں سے بیوی کو دیکھا اور کہا۔

”بس جناب ہنی مون مکمل، اب بس سیدھے گھر چلیں گے۔“ یہ سنتے ہی نازش فوراً اُٹھ کر تن کر بیٹھ گئی۔ اچانک اُس کے چہرے کا رنگ ہی بدل گیا۔ نیند کا سارا خمار غائب ہو چکا تھا۔ اُس نے تیز و تند لہجے میں کہا۔

”نہیں بالکل نہیں۔ ابھی ہم یہاں کچھ دن اور قیام کریں گے۔“ نجم نے اُسے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی بات پر اڑی رہی۔ نجم نے بیوی کے سامنے ہار تو مان لی لیکن انسپکٹر راہول سے بات کر کے ہوٹل کے ارد گرد حفاظتی اقدامات سخت کروا دیے۔

☆......☆

آدھی رات کے قریب نازش نے ایک جھرجھری لی اور اپنے بستر پر اُٹھ بیٹھی۔ اپنی پلکیں جھپکاتے ہوئے مضطربانہ انداز میں اُس نے شوہر پر ایک سرسری نگاہ ڈالی اور کمرے سے نکل گئی۔ آج وہ آہستہ آہستہ نہیں بلکہ برق رفتاری سے فاصلہ عبور کر رہی تھی۔ ہوٹل کے در و دیوار وہ کافی پیچھے چھوڑ آئی تھی، لیکن آج وہ تنہا نہیں تھی بلکہ اُس کے تعاقب میں انسپکٹر راہول اور نجم بھی تھے۔ نازش راج محل کے وسطی حصے میں پہنچ چکی تھی۔ راہول اور نجم بھی راج محل میں داخل ہو گئے۔ راہول نے پولیس اہلکاروں اور سیکورٹی والوں کو باہر ہی ٹھہرنے کا آرڈر دیا اور وہ خود نجم کو ساتھ لے کر نازش کے عقب میں پہنچ گیا۔ جیبی ٹارچ کی مدد سے وہ متحرک روشنی کے سہارے چل رہے تھے، جبکہ نازش ایسے نپے تلے قدموں سے چل رہی تھی، جیسے یہ کھنڈرات، یہ راستے، یہ در و دیوار اُس کے لیے انجان نہیں بلکہ جانے پہچانے ہیں۔ اب وہ محل کے عقبی حصے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اچانک انسپکٹر راہول اور نجم کو ایسا محسوس ہوا جیسے زمین شق ہوئی اور نازش کسی زمین دوز زینے کے ذریعے پاتال میں چلی گئی۔ نجم نے ایک ہلکی سی چیخ ماری اور خوف زدہ نظروں سے اُس زمین کو دیکھنے لگا۔ خوف اور دہشت سے اُس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ راہول نے بڑھ کر اپنی مضبوط باہوں کا سہارا دیا اور ہولے ہولے اُس کا کندھا تھپکنے لگا۔ نجم نے دہشت زدہ آواز میں راہول کے کان میں سرگوشی کی۔

”راہول میری نازش کو وہ...... وہ...... وہ لے گیا۔“

راہول نے چونکتے ہوئے کہا۔

”کون“ نجم نے لڑکھڑاتی زبان میں کہا یہاں اس جگہ ایک پتھر کا خوبصورت بت نصب تھا، جو کہ اب نہیں ہے، بس اسی جگہ، اس زمین نے میری نازش کو نگل لیا۔ اُف خدایا! اب میں اپنے خاندان اور نازش کے خاندان کو کیا جواب دوں گا۔“ راہول نے تھوک نگلتے ہوئے سہمے سہمے ڈرے ڈرے انداز میں کہا۔

”گھبرا مت میرے یار رب بہتر کرے گا۔“ خوف زدہ وہ بھی تھا، لیکن اپنی افسرانہ شان اور مردانگی کو برقرار رکھے ہوئے تھا۔ اس جگہ نجم سنگی مجسمے کو وہ بھی بارہا دیکھ چکا تھا جو اتنی مضبوطی سے یہاں نصب تھا کہ اُسے ہلانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن اب اُس کا یہاں کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ دور دور تک سناٹے اور تاریکی کا راج تھا کہ پازیب کی جھنکار اور گھنگھروؤں کی مدھرتا سے فضا گونج اُٹھی۔ نجم اور راہول کے دلوں کی دھڑکنیں تیز تر

ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ ننگی مجسمہ، ناچتی ہوئی رقاصہ کا مجسمہ گوشت پوست کا روپ دھار کر چکا تھا۔ رقاصہ کا قیامت خیز حسن، خوب صورت انداز رقص، گھنگھروں کی چھنک دمک اور آنکھوں کو خیرہ کرنے والے لشکارے نے سارے ماحول کو ساکت کر دیا تھا۔ راہول اور نجم کو ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ حرکت کرتی ہوئی کائنات یکلخت تھم گئی ہو۔ دونوں سانس روکے اس حیرت انگیز منظر کو دیکھ رہے تھے۔

رقاصہ کا انگ انگ تھرک رہا تھا۔ اب وہ راج محل کی باؤلی (ایسا کنواں جس میں زینہ اور گہرائی میں جا کر کئی کوٹھریاں یا کمرے بنے ہوئے تھے۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ راجہ مہاراجہ موسم گرما میں اپنی رانیوں کے ساتھ یہاں رہائش پذیر ہوتے تھے اور اِن کوٹھریوں میں ضروریات زندگی کی ہر چیز پہلے سے رکھ دی جاتی تھی) کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اچانک ناچتے ناچتے اُس نے کسی کو اشارے سے بلایا۔ راہول اور نجم نے اُس سمت دیکھا جدھر رقاصہ اشارہ رہی تھی لیکن اُنہیں کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ اب رقاصہ اس طرح لچک رہی تھی جیسے پھولوں سے لدی ڈالی۔ اشاروں میں بھی تیزی آ گئی تھی۔ وہ بہت تڑپ تڑپ کر کسی کو بلا رہی تھی اور اُس وقت تو نجم اور راہول کی حیرت اور خوشی کی انتہا نہیں رہی جب انہوں نے دیکھا کہ رقاصہ جسے اتنے جتن سے بلا رہی ہے وہ کوئی اور نہیں بلکہ نازش ہے۔ نیند اور خواب کی کیفیت میں خراماں خراماں چلتی ہوئی وہ بھی باؤلی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ رقاصہ کے چہرے پر ایک کامیاب اور پُر اسرار مسکراہٹ تھی۔ نازش جیسے ہی رقاصہ کے قریب پہنچی اس نے نڈھال اور گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

"تم کون ہو اور مجھ سے کیا چاہتی ہو؟ مجھے روزانہ کیوں آ کر جگاتی ہو؟ مجھے کیوں بلاتی ہو؟"

رقاصہ کا ایک زبردست قہقہہ فضا میں گونج اُٹھا۔ لیکن قہقہے کی آواز سن کر راہول اور نجم خوف سے کانپ اُٹھے، کیوں کہ اُس رقاصہ کی آواز انتہائی خوفناک اور دل کو لرزانے والی تھی۔ اپنے مچلتے تھرکتے جسم کو اُس نے ساکت کیا اور کاٹ دار آواز میں کہا۔

"سننا چاہتی ہو میری حقیقت کہ میں کون ہوں؟ میرا کیا راز ہے؟ میں کیوں بھٹک رہی ہوں۔ آؤ آج میں

تمہیں بتاتی ہوں کہ میں کون ہوں اور میں تمہیں کیوں بلاتی ہوں۔ میری ایسی کون سی ضرورت ہے جو میں بار بار تمہیں آواز دیتی ہوں۔ آؤ آج میں اس راز پر سے پردہ اٹھاتی ہوں۔ میں...... میں پورنیما ہوں، راجہ ہرجس رائے کی راج نرتکی۔ جب میں ناچتی تو ایسا لگتا تھا جیسے میرا تن نہیں تھرک رہا ہے بلکہ بجلی تڑپ رہی ہے جیسے بن پانی کی مچھلی مچل رہی ہے۔ یہ سارا سنسار میرے پائل کی دھن پر ناچ اٹھتا تھا اور پھر...... پھر راجہ مجھے پسند کرنے لگا۔ میری اداؤں پر مرنے لگا وہ کہتا۔ "پورنیما میں تجھے جی جان سے چاہتا ہوں اپنا سنگھاسن، اپنا راج کھٹ سب تیرے چرنوں میں رکھ دوں گا۔ میں تجھ سے بیاہ رچاؤں گا۔ سب کے سامنے تجھے اپنی رانی تسلیم کروں گا، مگر لڑکی میں بتاؤں وہ جھوٹا تھا مکار تھا۔ وہ پاس کی ریاستوں سے راج کماریاں بیاہ کر لاتا اور انہیں مان سمان دے کر اپنے رنگ محل میں اضافہ کرتا اور مجھے...... مجھے اُس نے صرف راج نرتکی ہی سمجھا، جب اُس کا من للچاتا مجھ سے کھیلتا اور پھر...... بس پھر جیسے جیسے میرا یہ کومل بدن یہ جوان جسم بڑھاپے کی طرف بڑھنے لگا۔ راجہ کا دل مجھ سے اوب گیا اور راجہ نے مجھ سے پیچھا چھڑانے کے لیے اپنے وفاداروں کے ذریعے میری ہتھیا کرنے کی کوشش کی۔ میری سمجھ میں ساری بات آ گئی اور میں نے ساری بات اپنے گرودیو کو بتا کر اُن سے مدد مانگی۔ گرودیو نے میرے لیے خاص تپسیا کی، برہمنوں کے ساتھ مل کر بھوگ ڈالا اور پھر میرے لیے پرارتھنا کی اور کہا "پورنیما تو کبھی بوڑھی نہیں ہوگی۔ یہ گزرتا ہوا سمے تیرا کچھ نہیں بگاڑے گا۔ تو امر رہے گی، تجھے موت بھی نہیں آئے گی، لیکن تجھے راجہ ہرجس رائے کا خون پینا ہوگا اور صرف راجہ کا نہیں بلکہ اُس کی ساری نسل کا خون پی کر اپنی پیاس بجھانی ہوگی اور جب اُس کی نسل ختم ہو جائے گی تو جو مرد بھی تیرے ہاتھ لگے تجھے اُس کا شکار کرنا ہوگا، لیکن اس بیچ تیرے پر ایک سنکٹ ایسا آئے گا جہاں یہ بہتا ہوا سمے پھر تیرے شریر کو کھانے کی کوشش کرے گا۔ تیری یہ سندرتا یہ جوانی پھر بھنگ ہونا شروع ہو جائے گیا اور تو بھی عام استریوں کی طرح بوڑھی ہو جائے گی۔

میں ڈر گئی...... خوف زدہ ہو گئی اور میں نے گرودیو کے چرن پکڑ لیے اور کہا "گرودیو مہاراج مجھے کوئی اُپائے بتائیے، تو پھر انہوں نے میری پراتھنا سویکار کی اور کہا۔ "پورنیما جب تجھے ایسا لگے کہ تیری جوانی ساتھ چھوڑ رہی ہے تو اُس وقت کسی نوبیاہتا دلہن کا شریر حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔ اگر تو اس کام میں سپھل رہی تو جب تک یہ سنسار ہے جب تک تو اس طرح سندر اور جوان رہے گی۔ تیرا بدن اسی طرح پھولوں کی طرح چکتا اور مہکتا رہے گا۔ تیرے آبھوشن (زیورات) چندرما کی طرح چمکتے رہیں گے۔ راجہ ہرجس رائے کا راج ختم ہو جائے گا لیکن تیرا راج ساری دھرتی پر ہوگا، تو بغیر راجہ کی رانی ہوگی۔ کوئی تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ تجھے خود بخود تیری خوراک ملے گی اور تو یہاں کے چپے چپے پر راج کرے گی اور بس لڑکی میں نے اپنے گرودیو کی آگیہ کا پالن کیا اور پھر میں امر بن گئی لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ میرا جسم ڈھلکنا شروع ہو گیا تو میں دُکھی ہو گئی لیکن اُن ہی دنوں تو اور تیرا پتی راج محل میں داخل ہوئے۔ میں گدگدا اٹھی مجھے منہ مانگی مراد مل گئی اور میں نے تیرا شریر حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ آج تیرا دنیا میں آخری دن ہے۔ لیکن میں تیری آبھاری (احسان مند) ہوں کہ تیری وجہ سے صرف تیری وجہ سے میں ابدی اور امر بن جاؤں گی۔ ہا...... ہا...... ہا...... میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے امر بن جاؤں گی۔"

راج نرتکی وحشت ناک انداز میں قہقہے لگا رہی تھی۔ نازش اب خواب وخیال کی دنیا سے نکل آئی تھی۔ وہ لرزہ بر اندام تھی اور خوف ودہشت سے خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہی تھی کہ اچانک راج نرتکی پورنیما نے پوری طاقت کے ساتھ اُسے اپنی طرف کھینچا۔ نازش نے اپنی دفاع کی کوشش کی لیکن اُس کی کوشش ناکام رہی۔ پورنیما کے ہاتھ بھی صرف نازش کے بلاؤز تک پہنچ پائے اور اس چھینا جھپٹی میں بلاؤز بری طرح پھٹ گیا، نازش ساڑی سے اپنا بدن ڈھانپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بے اختیار ہو کر انسپکٹر راہول نے اپنے پورا ریوالور کا سارا چیمبر راج نرتکی پر خالی کر دیا، لیکن اُس بلا پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ ریوالور چوں کہ سائیلنسر لگا ہوا تھا اس لیے باہر والوں کو کسی بات کی خبر ہی نہیں تھی۔ شیطانی قوت کی مالک راج نرتکی نے پھر نازش کو باؤلی میں دھکیلنے کی کوشش کی۔ نازش نے مدد طلب نظروں سے شوہر اور راہول کی طرف دیکھا۔ نازش کے برہنہ جسم پر بلاؤز کے نام پر معمولی سی دھجی تھی۔ مجمع سے

برداشت نہ ہو سکا کہ اُس کی عزت و آبرو راہول جو کہ ایک غیر مرد ہے اُس کے سامنے یوں تار تار ہو جائے، اُس نے عجلت میں اپنا قیمتی کوٹ اُتارا اور بیوی کی طرف اُچھال دیا لیکن نشانہ خطا کر گیا اور کوٹ بجائے نازش کے اُس بلا پر جا گرا۔ کوٹ کے گرتے ہی وہ شیطانی اور خبیث روح نے ایک دلدوز اور بھیانک چیخ ماری اور پھر بھڑکتی ہوئی آگ کا ایک زبردست شعلہ بلند ہوا اور اُس بلا نے رنگ روپ بدلنا شروع کر دیا۔ اب وہاں حسین و جمیل رقاصہ نہیں بلکہ انتہائی بدصورت کریہہ اور خوفناک عورت کی لاش تھی جو مکمل طور پر جل کر راکھ ہو چکی تھی، جبکہ نجم کا کوٹ جوں کا توں تھا۔ دونوں دوست دوڑ کر نازش کے پاس پہنچے۔ نازش اب مکمل طور پر ہوش و حواس میں تھی۔ سب کچھ اپنی جاگتی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ شوہر کو قریب پا کر وہ زارو قطار روتی ہوئی اُس سے لپٹ گئی۔ اچانک ایک سرد ہوا کا جھونکا آیا اور جلی ہوئی لاش کی راکھ ہوا میں بکھر گئی۔ انسپکٹر راہول نے نجم کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”نجم جس خون آشام بلا پر کوئی گولی اثر نہیں کر رہی تھی۔ وہ تمہارے کوٹ سے کس طرح نیست و نابود ہو گئی۔ یہ آخر کیا چمتکار ہے؟“ نجم نے ایک پرسکون مسکراہٹ کے ساتھ بیوی کی طرف دیکھا اور کہا۔

”ہاں دوست آج تو واقعی چمتکار ہی ہو گیا، دراصل جب ہم دونوں گھر سے نکل رہے تھے تو میری دادی نے ایک چاندی کا پترا میرے کوٹ کے استر میں سی دیا تھا۔ وہی چیز انہوں نے نازش کو بھی دی تھی لیکن یہ محترمہ وہ مقدس پترا گھر پر ہی بھول آئی۔“ انسپکٹر راہول نے پھر اپنی بات دہراتے ہوئے کہا۔

”ارے یار میں وہی تو پوچھ رہا ہوں کہ کوٹ کے استر میں جو پترا تھا اُس میں ایسا کیا جادو تھا۔“ نجم نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ ”نعوذ باللہ جادو نہیں بلکہ میرے رب کی رحمت تھی۔ دراصل جو اس زمین اور آسمانوں کا مالک ہے اُس کے ننانوے نام اُس پر کندہ ہیں اور میری دادی اماں نے حفاظت کے خیال سے وہ کوٹ کے استر میں سی دیا تھا۔ آیا کچھ عقل میں۔“ راہول نے ایک گہری سانس لی اور مطمئن لہجے میں کہا۔

”یہ گھر کے بڑے لوگ بھی کتنے تجربہ کار اور بڑی مان (عقل مند) ہوتے ہیں۔ اُن کے اس پوتر پترے نے نہ صرف ہم تینوں کی جانیں بچائیں بلکہ گڑھی دشوامتر کو اس بلا سے آزاد بھی کروایا۔“ تینوں اپنی اپنی جگہ نہایت خوش اور پرسکون تھے۔ نجم کا کوٹ نازش زیب تن کیے ہوئے تھی، اس حلیے میں بھی وہ بہت پیاری اور معصوم لگ رہی تھی۔

تینوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے باہر کی طرف جا رہے تھے کہ اچانک اُن کے قدم لڑکھڑا گئے اور تینوں کی زبان سے ایک تحیر خیز آواز بلند ہوئی، راج نرتکی کا سنگی مجسمہ پاش پاش ہو چکا تھا اور ایک حیرت انگیز نظارہ انہوں نے یہ دیکھا کہ پتھروں کی کرچیوں کے درمیان خون رس رہا تھا۔ جو ناک اور منہ کا حصہ تھا وہاں سے تو خون اس طرح اُبل رہا تھا جیسے حلق اور نکسیر پھٹ گئی ہوں۔ تینوں پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ جو اُن کے لیے ناقابلِ یقین تھا۔

بالآخر نازش نے اس خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

”راہول بھیا اس کیس میں جو کچھ ہوا کیا یہ مادہ پرست دنیا اس پر یقین کر لے گی۔ آپ کس طرح اوپر والوں کو، پبلک کو، پریس رپورٹرز اور میڈیا کو مطمئن کریں گے۔“ راہول نے بغور نازش کی بات سنی اور کہا۔

”بھابھی جی کیس کی فائل بند کرنے کے لیے اس بلا کو کسی درندے کا روپ دینا ہوگا جو باؤلی میں گر کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فنا ہو گیا اور آپ کے متعلق یہ کہنا ہوگا کہ کبھی کبھی آپ پر نیند میں چلنے کا دورہ پڑتا ہے۔

”نجم اور نازش اُس کی بات پر ہنس پڑے، منہدم کھنڈرات میں سپیدۂ سحر نمودار ہو چکی تھی، اُن لوگوں کے چہروں پر بھی مکمل اطمینان اور سکون تھا۔ باہر سیکورٹی والوں اور پولیس اہل کاروں نے اُن تینوں کو گھیر لیا اور انسپکٹر راہول نے اپنی چرب زبانی سے ایک دلچسپ کہانی گھڑ کر انہیں سنا دی اور یہ بھی بتا دیا کہ وہ خونی درندہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے باؤلی میں دفن ہو چکا ہے۔ ایک اہلکار نے آہستہ سے کہا۔

”انسپکٹر صاحب اب تو آپ کی ترقی یقینی ہے۔“ راہول نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اوکے، اوکے میری ترقی اور آپ لوگوں کی شاندار پارٹی جس میں میرا دوست نجم اور اُس کی وائف بھی شرکت کریں گے۔

☆......☆



انار کا درخت



مسز نوید ہاشمی

انار کے درخت کی دوستی کی پُر اسرار داستان

ہم تین بہنیں تھیں۔ ہمارا بہت بڑا گھر اور اُس میں بہت بڑا باغ تھا۔ یہ میرے بابا نے نیا نیا خریدا تھا۔ میرے بابا کا شوق پرانی حویلی خریدنا تھا۔ نہ جانے کیوں وہ پرانی حویلی بہت شوق سے خریدتے تھے۔

میری امی اور ہم تینوں بہنیں نماز کی پابند تھیں، لیکن تھیں، اُن کا زیادہ تر وقت عبادت میں ہی گزرتا تھا۔

جنوں، بھوتوں اور چڑیلوں کی کہانیاں پڑھنا اور مووی دیکھنا ہم تینوں بہنوں کا پسندیدہ مشغلہ تھا، کیوں کہ ہمارا واسطہ کبھی بھی جن بھوت وغیرہ سے نہیں پڑا تھا، اس لیے ہم نے اسے کھیل بنالیا تھا۔



میری امی کے ساتھ ابو اتنی پابندی سے نماز نہیں پڑھتے تھے، ہم نے انہیں صرف جمعہ یا عید کی نماز پڑھتے دیکھا تھا۔ البتہ میری امی اور میری بڑی بہن نماز کے ساتھ ساتھ قرآن پاک اور وظائف بہت شوق سے پڑھتی

ہمارے بابا جب پرانی حویلی یا مکان خریدتے تو ہم جب اس میں شفٹ ہوتے تو جن بھوت کا خوب شور کرتے کہ یہاں جن ہے وہاں چڑیل تھی وغیرہ وغیرہ، اسی کھیل میں ہم تینوں جوان ہوگئے، خوب صورتی ہمیں

ورثے میں ملی تھی۔

اس مرتبہ بابا نے جو حویلی خریدی وہ بڑی خوب صورت تھی اور اس میں بڑا سا باغ دیکھ کر ہم تینوں خوش ہوگئے۔ میرا نام ناز ہے، میری چھوٹی بہن صبا پھر سب سے آخری حبا ہے۔

جب ہم حویلی پہنچے تو بھاگ بھاگ کر کمرے دیکھ کر اپنے لیے پسند کر رہے تھے۔ میں نے جو کمرہ پسند کیا، وہ بہت بڑا تھا اور اس کی کھڑکی باغ کی طرف کھلتی تھی، مگر باغ بے ترتیب پڑا ہوا تھا۔

درختوں کی شاخیں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں، ایک درخت کی شاخ تو میرے ٹیرس تک پہنچ رہی تھی، میں نے ٹیرس میں کھڑے ہو کر باغ کا جائزہ لینا شروع کیا۔ باغ میں آم، امرود، انار، کینو، ناریل، چیکو ہر قسم کا درخت تھا۔ میں ہنسنے لگی کہ یہ تو پورا فروٹ منڈی ہے۔

جس درخت کی شاخ میرے ٹیرس تک آرہی تھی، اس میں جا بہ جا انار لگے ہوئے تھے۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ایک انار توڑا اور کھانے لگی۔ وہ بے حد میٹھا تھا، پھر میری نظر انار کے درخت پر پڑی میں نے ہنستے ہوئے درخت کی شاخ پکڑ کر کہا۔

"آج سے ہم دونوں دوست مگر اک شرط پر کہ تم روزانہ مجھے اچھے اچھے انار کھلاؤ گے، اوکے۔" مجھے ایسا لگا جیسے واقعی درخت خوش ہو رہا ہے۔ صبح جب میں سو کر اُٹھی تو دیکھا کہ میرے بستر کے سائیڈ ٹیبل پر انار رکھے ہوئے ہیں، میری نظر بے ساختہ درخت پر گئی، کیوں کہ کھڑکی میں سے بھی وہ درخت نظر آتا تھا، ایسا لگا کہ وہ صبح بخیر کہہ رہا ہے۔ میں نے بے ساختہ اُسے دیکھ کر Good Morning کہا اور خوشی سے انار کھایا، یہ نہیں سوچا کہ درخت سے ٹوٹ کر یہ انار میرے بستر کے سائیڈ ٹیبل پر کیسے آیا؟

میں جب نیچے پہنچی تو صبا بولی۔

"یار ناز باجی! مجھے پوری رات نیند نہیں آئی، عجیب طرح کے خواب دیکھتی رہی ہوں، جیسے ہماری حویلی کے نیچے ایک تہ خانہ ہے، وہاں کوئی کالی کا مندر ہے اور وہاں انسان کی بلی چڑھائی جاتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "بس بس ذرا سنبھل کے یہ ڈراؤنی مووی دیکھنا بند کرو۔ یہ سب اُس کا فتور ہے، جس گھر میں بھی تم جاتی ہو، تمہیں بھوت دکھنا شروع ہو جاتے ہیں۔"

"مگر باجی میں بھی ساری رات جاگتی رہی ہوں۔ میرے کمرے کے باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز آتی رہی ہے جب میں باتھ روم کا دروازہ کھول کر دیکھتی تو کوئی آواز نہ آتی، لیکن جیسے ہی میں بستر میں لیٹتی تو پانی گرنے کی آواز دوبارہ آنے لگتی۔" آخر میں جب میں غصے میں گئی اور میں نے کہا "کون ہے" اور جیسے ہی باتھ روم کا دروازہ کھولا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ باتھ روم کے نل کھلے ہوئے تھے، پھر جیسے ہی میں بند کرنے کے لیے آگے بڑھی تمام نل خود بہ خود بند ہوگئے اور ایسا ہو گیا تھا کہ کبھی کھلے ہی نہیں تھے۔"

"واہ! بہت خوب صورت کہانی ہے، بند کرو اپنی یہ بکواس کہ نل بند تھے، کھلے تھے۔"

"باجی میں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں۔"

"تم لوگ جس نئے گھر میں جاتی ہو ایسا ہی کہتی ہو۔"

"مگر باجی سچ آج رات یہ سب واقعی میں ہوا ہے کوئی بھی میری بات کا یقین نہیں کر رہا۔"

شام کو ہمارا ایک ملازم گھبرایا ہوا ہال میں داخل ہوا کہ صاحب مجھے بچاؤ۔ ہم نے اُسے دیکھا تو حیران رہ گئے، اس کے جسم پر جگہ جگہ چھالے سے بنے ہوئے تھے جیسے اُسے کسی نے جلایا ہوا ہے، ہم سب نے پوچھا یہ کیسے ہوا۔

"وہ بولا۔ "صاحب! صحن میں وہ جو انار کا درخت ہے اس کی جانب باغ کا تمام کوڑا لے جا کر جلا رہا تھا کہ وہ تمام جلتا ہوا کوڑا مجھ سے چمٹ گیا۔ میں ڈر کر بھاگا اور یہ دیکھیے مجھے بہت جلن ہو رہی ہے۔"

بابا نے فوراً ڈاکٹر کو فون کیا۔ وہ آیا اور اس نے جب ملازم کے جسم پر دیکھا تو کچھ بھی نہیں تھا۔

ڈاکٹر بولا۔ "اُسے تو کچھ بھی نہیں ہوا ہے یہ تو بالکل ٹھیک ہے۔" ہم سب حیران ہوگئے، کیوں کہ ہم سب نے اُس کے جسم پر بڑے بڑے چھالے دیکھے تھے۔ ابو نے نوکر موجو سے پوچھا۔

"موجو جب تم آئے تھے تو تمہارے جسم پر چھالے تھے اب یہ سب ٹھیک کیسے ہوگئے۔"

وہ بولا۔ "صاحب کیا کہہ رہے ہیں، میں تو ٹھیک

تھا، آپ نے ہی زبردستی مجھے لٹا دیا ہے۔"

ہم سب حیران ہو گئے۔ ابو نے سب کو آنکھوں ہی آنکھوں میں منع کیا کہ کوئی ایسی بات نہ کرو۔

ہم سب گھبرائے ہوئے تھے کہ ابو نے کھانا لگانے کا حکم دیا اور میز کی جانب چلنے کو کہا۔ اتنے میں ہماری ملازمہ فاخرہ بھاگی بھاگی آئی۔

"صاحب کچن میں پتا نہیں کہاں سے اتنا کوڑا آ گیا ہے، سمجھ نہیں آ رہا ہے۔"

ہم سب بھاگم بھاگ کچن میں گئے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ انار، آم، کیلے، کینو کے چھلکے کچن میں بکھرے پڑے تھے، ایسے جیسے سو دو سو افراد نے مل کر پھل کھائے ہیں۔

ابو نے فوراً ہم تینوں بہنوں کو کمرے سے نکالا اور ہال میں لے آئے اور ملازم کو صفائی کرنے کا کہہ دیا۔

جب ملازم صفائی کرنے کچن میں گیا تو فوراً واپس آ گیا کہ صاحب کچن تو بالکل صاف ہے وہاں تو کوئی کوڑا نہیں ہے۔ ہم سب حیران تھے کہ یہ کیا تماشا ہو رہا ہے۔ امی بولیں۔

"میں نے کہا تھا نا پہلے قرآن خوانی کرواؤ پھر ہم نئے حویلی میں چلیں گے، میں صبح سب سے پہلے قرآن خوانی کرواؤں گی۔" ابھی ان کی بات ختم ہی ہوئی تھی کہ حویلی کے دروازے کھڑکیاں خود بہ خود بند ہونا شروع ہو گئے، اب واقعی خوف سے ہم سب کا بُرا حال تھا۔ امی نے فوراً پنج سورہ اٹھایا اور بولیں۔ "یہ پانی کی بوتل پڑی ہے، تمام لوگ اس پانی سے کلی کریں اور یہ پنج سورہ پڑھنا شروع ہو جائیں، خدا کے کلام میں بہت برکت ہے۔"

جیسے ہی ہم سب نے پانی کی بوتل کی جانب ہاتھ بڑھایا تو پانی کی بوتل اُڑ کر چھت پر چپک گئی۔ امی نے فوراً پنج سورہ پڑھنا شروع کر دیا۔ امی کی آواز کے ساتھ پتا نہیں کہاں سے اتنا شور اٹھا جیسے بہت سارے کتے بھونک رہے ہیں یا آپس میں لڑ رہے ہوں۔

ہم سب کو جو بھی قرآنی آیات زبانی یاد تھیں، وہ پڑھنے لگے، تو گھر کے دروازے اور کھڑکیاں کھلنا شروع ہو گئیں۔

ابو نے ہم سب کو گاڑی میں بیٹھنے کو کہا۔ ہم سب باہر کی جانب بھاگے مگر باہر آندھی جیسی ہوا چل رہی تھی، امی جان نے چیخ کر کہا قرآنی آیات کو پڑھتے رہو، زبان کو مت روکو۔ ہم سب نے آیت الکرسی پڑھتے ہوئے گاڑی کی طرف قدم بڑھایا۔

باہر چوکیدار، ڈرائیور، مالی سب حیران و پریشان کھڑے تھے کہ باہر تو کہیں ہوا نہیں چل رہی مگر حویلی کے اندر اتنی تیز آندھی کہاں سے آ رہی ہے۔

آخر ہم حفاظت سے نکل کر اپنے پرانے گھر پہنچ گئے، مگر سب گھبرائے ہوئے تھے، ڈر کے مارے کوئی بھی ہال سے اپنے کمروں میں نہیں جا رہا تھا۔ آخر ابو نے کہا۔

"اب ہم سب حفاظت سے ہیں۔ تم سب اپنے اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو تو سب لوگ ڈرتے ڈرتے اپنے کمرے کی جانب چلے گئے۔

ہم تینوں بہنیں زندگی میں پہلی مرتبہ ایک ہی کمرے میں سوئیں۔ صبح ابو نے کہا۔ "میں کسی مولوی کو لے کر اس گھر میں جاتا ہوں۔ اس سے پوچھتا ہوں آخر کیا مسئلہ ہے؟" مجھے حویلی سے خاص سامان بھی لے کر آنا ہے۔ میرا لیپ ٹاپ، بینک اکاؤنٹ، موبائل سب وہاں ہے۔ امی بولیں۔

"سنیں، آپ وہاں اکیلے نہیں جائیں گے، میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی، آپ مولوی صاحب کو بلا لیں۔"

بابا راضی ہو گئے اور سب حویلی کے لیے روانہ ہو گئے۔ حویلی میں جب داخل ہوئے، امی اور مولوی صاحب قرآن کی آیات زور زور سے پڑھ رہے تھے۔

ابو اپنے نوکر، ڈرائیور سب کو لے کر کمرے میں داخل ہوئے۔ جیسے ہی وہ اندر گئے کمرے کا دروازہ خود بہ خود بند ہو گیا، وہ اندر سے چیخ رہے تھے دروازہ کھولو، امی نے باہر سے ہر طرح کی کوشش کر لی، مگر دروازہ نہیں کھلا، صبح سے دوپہر ہو گئی۔ مولوی صاحب بولے۔

"خاتون اب ہمیں یہاں سے چلنا چاہیے، کسی کو مدد کے لیے لے کر آتے ہیں۔"

امی بولیں۔ "نہیں نہیں میں نہیں جاؤں گی ان کے بغیر، آپ جا کر کسی کو مدد کے لیے لے کر آئیں۔

مولوی صاحب بولے۔ "مگر مجھے گاڑی چلانا نہیں آتی اور یہ حویلی بھی آبادی سے بہت دور ہے، اگر آپ کو گاڑی چلانا آتی ہے تو چلیں اور گاڑی چلائیں، کسی کو مدد کے لیے لے کر آتے ہیں۔"

امی بولیں۔ ''مجھے گاڑی چلانا نہیں آتی۔ ڈرائیور اور دوسرے نوکر سب میرے شوہر کے ساتھ کمرے میں بند ہیں۔'' مولوی صاحب بولے۔

''اگر آپ کے پاس فون ہے تو کسی کو مدد کے لیے بلالیں۔'' امی نے موبائل کی جانب دیکھا تو وہاں نوسگنل آرہے تھے۔

امی نے کہا ''یہاں کچھ نہیں ہوگا۔ آپ کو باہر سے مدد لانی پڑے گی۔ میرے شوہر اندر ہیں، اس لیے میں کسی بھی حالت میں انہیں چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔''

اُن کی بات ختم ہی ہوئی تھی کہ کمرے کا سامان آپس میں ٹکرانے لگا۔ مولوی صاحب اور امی باہر کی جانب بھاگے۔ وہ باہر نکلے تو باہر انار کے درخت سے انار ٹوٹ ٹوٹ کر زمین پر گرنے لگے۔

امی نے بے ساختہ انار کے درخت کی جانب منہ کرکے چیخ کر کہا۔ ''یہ سب تمہاری وجہ سے ہی ہو رہا ہے۔'' اچانک لگا انار کے درخت سے آواز آئی ہو۔

''میری دوست ناز کو لاؤ، اگر نہیں لائے تو یہ لوگ جو کمرے میں ہیں کبھی واپس نہیں جاسکتے، ہم بھی واپس نہیں جاسکتے تھے۔'' پھر اتنے زور کی آندھی چلی کہ امی اور مولوی صاحب نے بے ساختہ آنکھیں بند کرلیں۔ کافی دیر بعد جب آنکھیں کھولیں تو مولوی صاحب بولے۔ ''آپ اور میں اللہ کا نام لے کر آگے چلتے ہیں۔''

امی بولیں۔ ''نہیں میں نہیں جاؤں گی، میں حویلی واپس جاؤں گی......''

چلیں آگے چلتے ہیں۔ شاید کچھ راستے کا پتا چلے۔ امی بھی اب ہوش میں آگئیں کہ واقعی مولوی صاحب ٹھیک کہہ رہے تھے، وہ بھی اُن کے ساتھ چلنے لگیں، مگر تین گھنٹے چلنے کے بعد بھی پتا نہیں چلا کہ شہر یا حویلی کی جانب راستہ کہاں سے آتا ہے۔ امی نے پوری زندگی گاڑیوں میں سفر کیا تھا کبھی پیدل نہیں چلی تھیں۔ آج چل چل کر ان کے پیروں میں چھالے پڑ گئے تھے۔

ادھر رات سر پر آنے لگی تھی، ویرانہ، جنگل، آدم نہ آدم ذات، ادھر اب مولوی صاحب گھبرا گئے تھے اور چیخ چیخ کر کہنے لگے۔

''مجھے معاف کردو اس حویلی کے بھوت، اب میں کبھی اس جگہ نہیں آؤں گا، میرا کوئی واسطہ نہیں اس عورت سے نہ اس کے شوہر سے، بس میں گھر واپس پہنچ جاؤں۔''

امی بولیں۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ اگر آپ کو دعا مانگنی ہے تو اللہ تعالیٰ سے مانگیں کہ خدا ہمیں راستہ بتایا، کیوں کہ خدا سے زیادہ طاقت ور کوئی بھی نہیں ہے۔''

''اے چپ ہو جا بکواس مت کر۔ تیرے شوہر اور تیری وجہ سے میں اس مشکل میں پڑا ہوں، اب تو اپنے رستے جا اور میں اپنی راہ لیتا ہوں۔''

مولوی صاحب کی ایسی باتیں سن کر امی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ بولیں۔

''میں اکیلی عورت اس جنگل میں کہاں جاؤں گی۔ ہاں مگر مجھے اپنے خدا کی ذات پر بھروسا ہے۔ آپ جائیں خدا مجھے بھی کوئی نہ کوئی راستہ دکھا دے گا۔''

مولوی صاحب یہ سن کر سرپٹ دوڑ پڑے، جیسے اُن کے پیچھے کتے لگ گئے ہوں۔

امی آنسوؤں کے ساتھ مولوی صاحب کو جاتا ہوا دیکھتی رہیں۔ رات سر پر آپہنچی تھی۔ جنگل میں اکیلی عورت کیا کرے کیا نہیں۔ وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئیں، اگرخوف پوری طرح ان پر حاوی تھا، پھر اپنے چاروں طرف مٹی سے ایک حصار کی لکیر بنائی اور آنکھیں بند کرکے اپنے شوہر اور تینوں بیٹیوں کا حصار کھینچا اور جو جو قرآنی آیات زبانی یاد تھیں، وہ پڑھتے پڑھتے سوگئیں، کہتے ہیں کہ نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے۔

☆......☆

ادھر تینوں بہنیں پریشان تھیں۔ امی، بابا کا نمبر برابر نوسگنل آرہا تھا صبح سے دوپہر اور اب شام سر پر آنے لگی تھی، سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں؟

☆......☆

اُس نے جیسے ہی قدم آگے بڑھایا، پیر کی جانب عجیب چپ چپی سی کوئی چیز ٹکرائی، ارے یہ گیلا گیلا کیا ہے۔ وہ نیچے جھکی اور ٹارچ کی روشنی اُس پر ڈالی۔ اُف وہ تو انسانی سر تھا۔ بے ساختہ اس نے پیر سے انسانی سر کو دور پھینکا اور آگے بڑھ گئی، پھر اُس نے ڈرتے ہوئے ٹارچ کا رُخ زمین کی جانب کیا تو دور دور زمین تک فرش پر انسانی سر کی

کھوپڑی ہی کھوپڑی نظر، اس کی بے ساختہ چیخ نکل گئی ہے، اس وقت ایک ہاتھ آگے بڑھا اور اُسے لے لیا۔ اسی وقت ناز کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ حلق پیاس سے سوکھ رہا اور پیر پر نظر پڑتی ہے۔ ناز کے پیر پر جگہ جگہ خون لگا ہوا ہے، وہ سمجھ نہیں پائی یہ سب کیا تھا، اگر یہ کوئی خواب تھا تو میرے پاؤں میں خون کہاں سے لگ گیا، وہ اللہ کا نام لے کر باتھ روم جاتی ہے اور پیروں پر پانی ڈال کر صاف کرتی ہے پھر گھڑی کی جانب نگاہ جاتی ہے تو رات کے تین بج رہے تھے۔

وہ فوراً وضو کر کے تہجد کی نماز کے لیے کھڑی ہوگئی۔ نماز پڑھ کر بھی اسے نیند نہیں آتی اور وہ قرآن پاک کی تلاوت کرنے بیٹھ گئی، قرآن پاک پڑھ کر دل کو کچھ سکون حاصل ہوا، پھر وہ دونوں بہنوں کے کمرے کی جانب گئی، دونوں بہنیں سو رہی تھیں، پھر وہ امی، بابا کے کمرے کی جانب بڑھی، لیکن وہ خالی تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ امی، بابا ابھی تک واپس نہیں آئے ہیں، مگر کیوں نہیں آئے، کیا ہوا ہوگا؟ اسی طرح سوچ سوچ کر پریشان ہوتی رہی، دور کہیں سے فجر کی اذان کی آواز آئی۔

فجر کی نماز پڑھ کر وہ دوبارہ نیچے آئی تو دیکھتی ہے، دونوں بہنیں بھی نیچے ہی تھیں۔

"ارے تم دونوں تو نماز پڑھ کر سو جاتی ہو، آج جاگ کیسے رہی ہو؟"

"تو کیا ہے باجی جیسے آپ کو پتا نہیں ہے کہ ہم کیوں جاگ رہے ہیں، امی، بابا ابھی تک نہیں آئے ہیں۔ کل صبح روانہ ہوگئے تھے۔ رات تک تو آ جانا چاہیے تھا، مگر پتا نہیں وہاں کیا ہوا ہے۔؟"

"واقعی صبا تم سچ کہہ رہی ہو، پریشان کی تو بات ہے۔ اب انکل دانش کو فون کرنا پڑے گا۔"

"پاگل ابھی صرف صبح کے 5.30 ہو رہے ہیں، اکثر لوگ نماز پڑھ کر سو جاتے ہیں، اچھا لگے گا ہم کسی کو پریشان کریں۔"

"باجی پلیز یہ نہ سوچیں، ہم سے صبر نہیں ہو رہا ہے۔ آپ فوراً انکل دانش کو فون کریں۔"

آدھے گھنٹے میں انکل دانش حاضر تھے۔

"بیٹا، آپ لوگ کل پورا دن پریشان رہے، مجھے نہیں بتایا، آخر بتانا تو چاہیے تھا نا۔"

"انکل ہم نے سوچا۔ بابا، امی اب آ جائیں گے، تب آ جائیں گے مگر وہ رات تک نہیں آئے۔"

انکل بولے۔ "تم لوگ پریشان مت ہو، میں ابھی جا رہا ہوں دو پہر تک آتا ہوں۔" ان کے جانے کے بعد کافی دیر تینوں بہنیں باتیں کرتی رہیں۔ 11 بجے ناز کا نیند کے مارے بُرا حال ہو رہا تھا۔ وہ رات تین بجے سے جاگ رہی تھی۔

وہ حبا اور صبا سے بولی۔ "میں سونے جا رہی ہوں۔" دونوں بہنیں ناز کی شکل دیکھنے لگیں کہ یہ وقت سونے کا نہیں تھا، مگر کچھ بولی نہیں۔

خواب میں پھر وہ ہی جگہ تھی جہاں جگہ جگہ انسانی سر تھے اور وہ اُن کے بیچ پڑی ہوئی ہے۔ اچانک ایک انسانی سر اُچھل کر ناز کے ہاتھ پر آ کر بیٹھتا ہے اور بولتا ہے۔

"ہمیں بچالو پلیز ہمیں بچالو، جانے ہم کب سے تمہاری راہ دیکھ رہے تھے۔ ایک سر جس کا دھڑ غائب تھا، وہ اُس کے ہاتھ پر آ کر ایسے بول رہا تھا جیسے وہ ایک زندہ انسان ہو۔"

وہ خوف سے ہاتھ جھٹک کر سر کو اپنے سے دور ہٹاتی ہے کہ اُسے دور سے بھجن گانے کی آواز آتی ہے۔ وہ گھبرا کر سامنے دیکھتی ہے تو سامنے ایک بڑی سی کالی کی مورتی ہوتی ہے، جو زمین سے چھت تک بڑی ہوتی ہے۔

چاروں جانب انسانی سر اور ایک خون کی ناگوار بو پھیلی ہے۔ اچانک بھجن گانے کی آواز تیز ہو جاتی ہے۔ ایک دم ایک لمبا کالا خوفناک سا آدمی ناز کی جانب بڑھتا ہے اور کہتا ہے۔

"جس کا انتظار تھا وہ شکار آ گیا۔" اور ناز کو بالوں سے پکڑ کر کالی دیوی کی جانب لے کر جاتا ہے۔ ایک دم اس کے ہاتھ میں کرنٹ لگتا ہے۔ وہ ناز کو چھوڑ دیتا ہے، پھر اپنے ہاتھ کو دیکھتا ہے جو بری طرح جلا ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے یہ کیسے جل گیا میرا ہاتھ۔

دور کہیں سے آواز آتی ہے۔ "اس لڑکی نے وضو کیا ہوا ہے یہ پاک ہے۔"

وہ غصے میں خون سے بھری بالٹی ناز پر اُچھال دیتا ہے" اور کہتا ہے۔ "میں کرتا ہوں تجھے ناپاک۔"

ناز کی آنکھ کھل گئی مگر پورے بستر پر خون موجود تھا

اور وہ خود خون میں نہائی ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر وہ خوف سے چیخنے لگی، اس کی چیخ سن کر دونوں بہنیں اور نوکر اس کے کمرے میں داخل ہوئے، ناز کو بُری طرح خون میں نہائی دیکھ کر اور بستر کو خون سے بھرا دیکھ کر وہ لوگ خوف زدہ ہوا اور ناز کو اٹھا کر کمرے سے باہر لائے تو سامنے سے دانش انکل گھر میں داخل ہوئے اور سب کو گھبرایا ہوا دیکھ کر پوچھنے لگے۔ ”کیا ہوا“ تب ملازم نے دانش صاحب کو ناز کے ساتھ ہوئے حادثے کے بارے میں تفصیل بتائی۔

دانش انکل کہنے لگے۔ ”مگر تم کہہ رہے ہو۔ ناز خون میں نہائی ہوئی تھی، لیکن اس کے بال، کپڑے، چہرہ، کہیں بھی خون کا نام ونشان نہیں ہے۔“ دانش انکل کی بات سن کر سب نے ناز کی طرف دیکھا تو واقعی وہاں کسی بھی قسم کا خون کا نام ونشان تھا نہیں۔ نوکر رمضان بولتا ہے۔ ”مالک کمرے کے بستر پر بھی خون پڑا ہوا تھا، وہ چل کر دیکھ لیں۔“ سب نے ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئے مگر وہاں بھی کچھ نہیں تھا۔ سب حیران ہوگئے کہ یہ سب کیا ہے۔

پرانی حویلی خریدنا بابا کا شوق تھا اور شوق کا کوئی مول نہیں ہوتا، مگر اب کی دفعہ بابا کو یہ شوق واقعی مہنگا پڑ گیا تھا۔

☆......☆

ہاشم صاحب بند کمرے میں چیخ چیخ کر تھک گئے تھے۔ دروازہ کھولنے کے ہر طریقے آزما چکے تھے مگر دروازہ نہیں کھل رہا تھا۔ تمام نوکر، گارڈ سب کے چہرے خوف کی وجہ سے پیلے پڑ گئے تھے، اچانک ہاشم صاحب کو بیڈ کے نیچے سے بھجن گانے کی آواز آئی۔ وہ نوکروں سے کہنے لگے۔ یہاں سے ہٹاؤ، دیکھتے ہیں یہاں کیا ہے؟ جب بیڈ ہٹایا گیا تو انہیں زمین میں ایک دروازہ نظر آیا۔ انہوں نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی اور دروازہ کھل گیا جیسے کبھی بند نہیں تھا اندر زینہ نظر آتا ہے۔ ”چلو نیچے چلتے ہیں، ہوسکتا ہے باہر نکلنے کا کوئی راستہ ہو۔“

ہاشم صاحب نے کہا۔

”پھر خود ہی کہنے لگے نہیں یہ باہر نکلنے کا راستہ نہیں ہے، یہ وہ راستہ ہے جہاں سے ہم کبھی واپس نہیں آسکتے۔“

پھر کیا کریں مالک یہاں تو بیٹھے بیٹھے رات سر پر آ گئی ہے۔ پانی کے علاوہ کچھ کھانے کو بھی نہیں ہے اگر ہم کمرے میں رہے تو ہمیں بھوک پیاس سے مرنا نہ پڑ جائے۔

ہاشم صاحب بولے۔ تہ خانے کا دروازہ بند کردو۔ آؤ سب سونے لیٹتے ہیں، پھر جس کو جہاں جگہ ملی وہ سونے کے لیے لیٹ گیا۔

اچانک چیخ وپکار کی آواز پر ہاشم صاحب کی آنکھ کھلی تو کیا دیکھتے ہیں، الو جیسی کوئی چیز ایک نوکر کو بری طرح اُدھیڑ رہی ہے، نوکر لاش کی شکل اختیار کر گیا ہے۔

ہاشم صاحب نے اُس پرندے کو پہلے تو ڈرا کر بھگانا چاہا، وہ نہیں بھاگا تو پھر جوتی اُٹھا کر ماری، تب وہ بڑے آرام سے اُڑ کر تہ خانے کے راستے پتا نہیں کہاں گم ہوگیا۔

ہاشم صاحب نے سب کو چیخ کر خبردار کیا، سب نیند سے بے دار ہوئے تو نوکر کی لاش کو دیکھ کر سب خوفزدہ ہوگئے۔ ہاشم صاحب بولے۔

”اب چیخ کیوں رہے ہو، پہلے یہ بتاؤ یہ تہ خانے کا دروازہ کس نے کھلا چھوڑ دیا تھا۔“

سب نے کہا ہم نے نہیں کھولا۔

”مگر تہ خانے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ سب نوکروں نے پوچھی اب کیا کریں اس لاش کا، کیوں کہ اس کو دیکھ کر خوف آرہا ہے تھوڑی دیر کے بعد یہاں بو پھیل جائے گی۔ ہاشم صاحب نے کہا۔

”اس کا ایک ہی حل ہے کہ اس لاش کو اٹھا کر تہ خانے میں پھینک دیتے ہیں اور دروازہ بند کردیتے ہیں اور اس پر بستر بچھا دیتے ہیں۔“

”سرکار اب شام ہونے والی ہے۔ بھوک کے مارے بُرا حال ہے، یہاں ہم کب تک بند رہیں گے۔“ اگر اس لاش کو تہ خانے میں پھینک دیا تو ہمارے پاس باہر نکلنے کا دوسرا راستہ نہیں ہوگا۔

☆......☆

مسز ہاشم کی آنکھ چڑیوں کی چہچہانے سے کھلی۔ وہ خود حیران تھی کہ وہ اتنے ڈر خوف میں بھی سو گئی، اس نے اُٹھنے کی کوشش کی، لیکن اس سے اُٹھا نہیں جاتا، پورا جسم پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا۔

اس نے بامشکل اپنی تمام تر طاقت کو جمع کیا اور اُٹھ کر ایک سمت کو چلدی، لیکن کمزوری اور تھکان نے ان کا

دس قدم چلنا بھی مشکل کر دیا تھا، آخر وہ چلتے چلتے گر کر بے ہوش ہو گئیں۔

ہوش آنے پر انہوں نے خود کو ایک جھونپڑی میں پایا۔ ان کی آنکھ کھلتی دیکھ کر ایک بوڑھی عورت اس کے ساتھ ہی ایک بوڑھا آدمی بھی موجود تھا۔ ''ہوش آ گیا تمہیں۔'' کہتی ہوئی ان کی طرف بڑھی۔ ''میں کہاں ہوں؟'' مسز ہاشم نے سوال کیا۔ ''تم اس وقت محفوظ جگہ ہو، مگر تم ہو کون اور اس جنگل میں کیا کر رہی تھیں۔ تب مسز ہاشم نے بتایا کہ ہم نے حویلی خریدی ہے مگر وہ حویلی ہمارے لیے مصیبت بن گئی ہے، یہ کہہ کر انہوں نے انہیں ساری بات بتائی۔ یہ سن کر بوڑھا آدمی جس کا نام اقبال تھا حیران ہوا اور کہنے لگا آپ نے وہ حویلی کیسے خرید لی۔ کیا اس سلسلے میں آپ نے کسی سے کچھ پوچھا نہیں تھا، اس حویلی کے بارے میں تو نہایت عجیب غریب کہانیاں مشہور ہیں، آج تک کوئی بھی اس حویلی میں ٹھہر نہیں سکا ہے۔ وہاں لوگ رات تو رات دن میں جانے سے بھی گھبراتے ہیں، وہاں ایک انار کا درخت ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ایک بچے نے لگایا تھا۔ پہلے اس حویلی کی جگہ خالی زمین تھی۔ وہ بچہ اس ننھے پودے کا بہت خیال رکھا کرتا کہ کوئی جانور آ کر اسے برباد نہ کر دے اس کے لیے وہ رات دن حفاظت کے لیے اس کے پاس موجود رہتا حتیٰ کہ سو بھی جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ پورا تناور درخت بن گیا علاقے کے تمام لوگ ہی بچے کی اس محبت سے تمام لوگ ہی واقف تھے۔ پھر رفتہ رفتہ آبادی بڑھتی گئی اور اس جگہ پر ایک حویلی کی تعمیر ہونے لگی جو ایک ہندو خان کی ملکیت تھی۔ وہ انار کا درخت بھی حویلی کی حدود میں آ گیا۔ وہ بچہ جس کا نام احمد تھا اس بات پر بہت رویا تڑپا۔ وہ درخت اب پھل دینے لگا تھا۔ اس درخت سے جدائی کے نتیجے میں احمد کی طبیعت شدید خراب ہو گئی، نیم بے ہوشی میں بھی وہ میرا دوست انار کا درخت میرا دوست انار کا درخت پکارتا رہا۔ اسی عالم میں وہ ایک روز حویلی پہنچا جہاں حویلی کے باہر پہریداروں نے اسے اندر نہیں داخل ہونے دیا۔ آخر کار وہ موقع دیکھ کر حویلی کی دیوار پر چڑھ گیا اور انار کے درخت تک پہنچنے کی کوشش میں نیچے گر گیا جس کے نتیجے میں اس کا سر انار کی طرح کھل گیا اور خون ہر جگہ بکھر گیا تب سب ہی نے دیکھا کہ اس درخت پر جتنے بھی انار لگے تھے ان سب سے انار کا رس بہنے لگا شاید انار کا درخت بھی اپنے ننھے دوست کی جدائی میں رو رہا تھا۔ حویلی کے صحن میں اس وقت لگ رہا تھا گویا خون کی ندی بہ رہی ہو۔ بس اس دن کے بعد اس ہندو خاندان کی تباہی کے دن شروع ہو گئے۔ اس حویلی میں یکے بعد دیگرے عجیب و غریب طریقے سے اموات ہونے لگیں۔ ان کے خاندان کے سربراہ کی لاش تو حویلی میں بنے تہ خانے سے برآمد ہوئی جبکہ وہ دوسرے شہر گیا ہوا تھا۔ اس لیے اس کی غیر حاضری کو گھر میں کسی نے محسوس نہ کیا۔ وہ تو جب حویلی میں بنے تہ خانے سے بدبو آنے لگی اور جا کر دیکھا گیا تو اس کی لاش وہاں گل سڑ رہی تھی۔ اسی طرح اس کی بہو باورچی خانے کا دروازہ بند ہو گیا جو لاکھ کوشش کے باوجود نہ کھل سکا پھر سب نے کھڑکی سے دیکھا کہ وہاں خود بخود آگ لگ گئی اور وہ عورت سب کے سامنے زندہ جل گئی۔ ان سارے واقعات کے بعد وہ لوگ وہ حویلی چھوڑ کر چلے گئے جو پھر آباد نہ ہو سکی۔ اگر کوئی اسے آباد کرنے کی کوشش بھی کرتا تو اسے اتنا تنگ کیا جاتا ہے کہ وہ بالآخر وہ حویلی خالی ہی کرنا پڑتی ہے۔ یہ کہانی سن کر مسز ہاشم کے چہرے سے پریشانی جھلکنے لگی کیوں کہ پروفیسر ہاشم اس حویلی کے ایک کمرے میں بند تھے۔ ''یا اللہ تو ہی ان کی مدد کرنا، تو ہی غفور الرحمٰن ہے۔'' مسز ہاشم نے صدق دل سے دعا کی۔

''بیگم صاحبہ اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں۔'' اقبال نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔ ''ہاں، ہاں کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔''

''یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک بزرگ کا آستانہ ہے ان کی کرامات کے قصے سارے گاؤں میں مشہور ہیں، اگر آپ چاہیں تو ان سے اس سلسلے میں مدد لی جا سکتی ہے۔ ہم تو اس مسئلے میں اس لیے نہیں پڑے کہ حویلی سے ہمارا کوئی تعلق نہیں لیکن آپ تو اس حویلی کی مالکن ہیں آپ کو یقیناً ان بزرگ سے ملنا چاہیے۔'' ''تو پھر مجھے جلد ہی ان بزرگ تک لے چلو، مسز ہاشم نے چارپائی سے

اٹھتے ہوئے کہا۔ یہ سن کر جیسے ان کے کمزور جسم میں توانائی بھر آئی تھی خاتون، اس حویلی میں دو قسم کی روحیں ہیں ایک ارواح خبیثہ اور دوسری ارواح صالحہ، یہ سب کچھ ان کے درمیان چپقلش کا نتیجہ ہے اور اس مسئلے کے حل کے لیے مجھے خود وہاں جانا پڑے گا۔

بیگم ہاشم جب ان بزرگ کو لے کر حویلی پہنچیں تو ناز، صبا اور حیا دانش انکل کے ساتھ وہاں پہلے ہی سے موجود تھیں۔ جنہیں دیکھ کر مسز ہاشم کا دل مزید مضبوط ہو گیا تھا۔

"امی آپ! آپ کو تو حویلی میں ہونا چاہیے تھا۔"

"بیٹی یہ سب بعد کی باتیں ہیں یہ بزرگ اس مشکل کو حل کرنے میں ہماری مدد کریں گے۔"

آپ سب کو آیت الکرسی آتی ہے تو اسے پڑھ کر اپنے گرد حصار باندھ لیجیے۔ آیت الکرسی میں بڑی طاقت ہے، یہ آپ کو ہر بلا اور مصیبت سے محفوظ رکھتی ہے شرط یہ ہے کہ ہمارا ایمان اور عقیدہ مضبوط ہو۔" یہ کہہ کر بزرگ نے کچھ پڑھنا شروع کر دیا اور سب ان کے پیچھے حویلی میں داخل ہو گئے۔

اندر داخل ہوتے ہی سامنے کھڑے انار کا درخت یوں لگا جیسے انہیں دیکھ کر مسکرا رہا ہو۔

"السلام علیکم" بزرگ نے اس انار کے درخت کو دیکھ کر سلام کیا اور پھر سب نے اپنے کانوں سے "وعلیکم السلام" کی آواز سنی۔ "کیسے ہیں حضرت؟ کیوں زحمت کی آپ نے آنے کی؟" انار کے درخت سے سوال آیا اور وہ سب کے سب حیرانگی سے یہ گفتگو سن رہے تھے۔

یہ اس حویلی کے جائز مالک ہیں اور آپ لوگوں کی وجہ سے بہت پریشان ہیں، یہ رحمٰن کے بندے نمازی پرہیزگار لوگ ہیں لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگوں کے جھگڑے میں یہ پریشان نہ ہوں۔ اس لیے آپ سب کو یہاں سے جانا ہوگا۔

"یا حضرت اس انار کے درخت پر ہم جنوں کا قبیلہ برسوں سے موجود ہے۔ اس حویلی کے مالک کی وجہ سے وہ معصوم بچہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا اور دوسرا وہ ہندو کالی کا سیوک تھا جو اپنے گندے عالم کے ذریعے یہاں روحوں کو قید کرنا چاہتا تھا۔ یہ سب کچھ ہم سے برداشت نہیں ہوا۔ یہ لوگ جو آپ کے ساتھ موجود ہیں۔ محض اس وجہ سے محفوظ رہے کہ اس بچی نے ہماری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا اس لیے ہم ان کی حفاظت کرتے رہے۔ ورنہ یہ بھی ان بدروحوں کی نذر ہو جاتے۔ اب ہم اور آپ اپنی روحانی طاقت سے ان ارواح خبیثہ سے اس حویلی کو پاک کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

"مجھے یہیں بیٹھ کر پڑھائی کرنا ہوگی براہ کرم آپ سب لوگ مجھ سے دور ہٹ کر کھڑے ہو جائیں۔" ان بزرگ نے پیچھے مڑ کر ان لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا اور خود وہیں درخت کے نیچے بیٹھ کر پڑھنا شروع ہو گئے، کچھ ہی دیر میں لگا جیسے حویلی میں زلزلہ آ گیا ہو اچانک ہی کالی دیوی کی کانپت اڑتا ہوا آیا اور زمین پر خوفناک آواز کے ساتھ گر کر ٹوٹ گیا۔ حویلی کے در و دیوار بری طرح لرز رہے تھے۔ ایک دم ہی ایک کالا سا آدمی ان بزرگ کے سامنے آ کھڑا ہوا جس کے سارے جسم کو آگ لگی ہوئی تھی اور وہ بری طرح چیخ رہا تھا۔ "مجھے معاف کر دیں میں اب کبھی رحمٰن کے بندوں کو تنگ نہیں کروں گا۔ مجھے یہاں سے چلے جانے دیں۔" آگ کے لپیٹے اس کالے بھجنگ آدمی کو بھسم کیے دے رہے تھے، بزرگ نے کچھ پڑھتے ہوئے ہی آسمان کی طرف سر اٹھایا اور آسمان سے بغیر بادلوں کی بارش شروع ہو گئی لیکن وہ بارش صرف اس کالے بھجنگ شخص پر ہی ہو رہی تھی اور کچھ ہی دیر میں سب کچھ معمول کے مطابق ہو گیا۔

لیکن فضا میں گوشت جلنے کی بو اور صحن میں راکھ کی ڈھیری موجود تھی۔

"ناز! ناز" یہ پروفیسر ہاشم تھے جو بیٹیوں اور بیوی کو دیکھ کر دیوانہ وار بھاگتے ہوئے ان کی جانب آ رہے تھے۔ "بہت شکریہ بابا جی! واقعی رحمانی طاقتوں کا شیطانی طاقتیں کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔" بیگم ہاشم نے پروفیسر ہاشم کو اپنے درمیان صحیح سلامت پا کر مسرت سے کہا اور پروفیسر ہاشم بھی ایک خواب کی سی کیفیت میں یہ ساری داستان سن رہے تھے۔

☆......☆



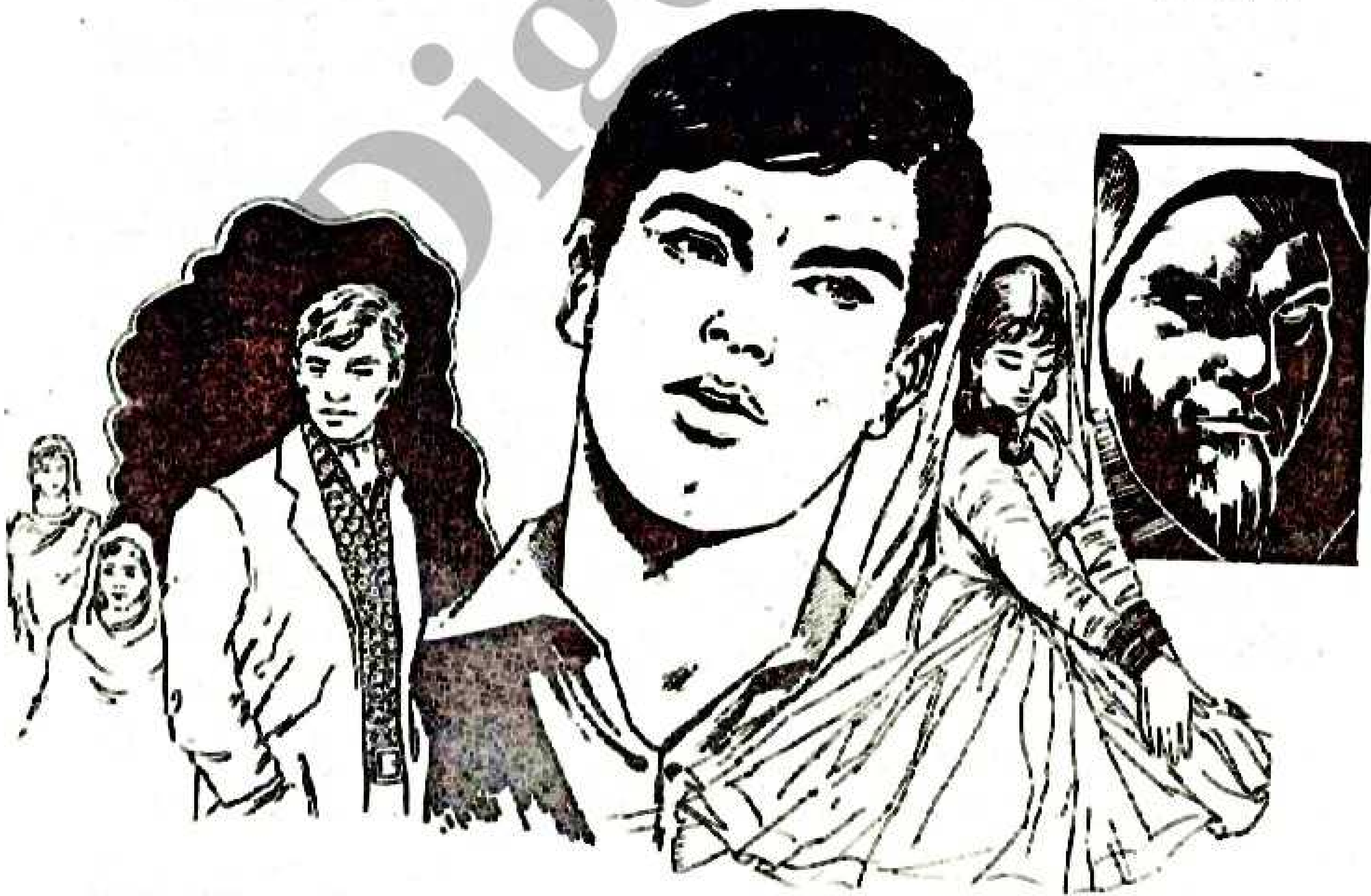
عاشق جن

بشریٰ کفیل خان

جنات نگر سے، عاشق جن کی حیرت انگیز کہانی

یہ واقعہ پاکستان بننے سے پہلے کا ہے، جب میری نانی انڈیا میں رہتی تھیں، میرے خیال میں مناسب یہی رہے گا کہ یہ ناقابلِ یقین سچی کہانی انہی کی زبانی سنی جائے۔

بتانے والے بتاتے تھے کہ میں بہت خوب صورت تھی لیکن مجھے اپنی خوب صورتی کا بالکل احساس نہ تھا، کیوں کہ پہلے شیشے کو اتنی اہمیت حاصل نہ تھی جتنی کہ اب ہے۔ لوگ میرے نہایت ہی گھنے، کالے، چمکدار،



کمر سے بھی نیچے، لمبے بالوں کی بہت تعریف کرتے تھے، لیکن میں اسے بس اللہ کی دین سمجھ کر شکر ادا کرتی تھی، اترائی کبھی نہیں تھی۔ اپنا چہرہ اور بال ہر وقت دوپٹے میں چھپائے رکھنا میری عادت تھی، یہاں تک کہ شادی کے بعد بھی میرا گھونگھٹ چہرے سے نیچے تک رہتا تھا، مگر پتا نہیں اس دن مجھے کیا ہوا کہ نہا کر کمرے میں کنگھا کرتے ہوئے بال سکھا رہی تھی کہ ساس کی آواز پر بغیر گھونگھٹ کے میں ساس کے پاس چلی گئی، جو صحن میں بیٹھی سبزی بنا رہی تھیں۔

وہ کام میں مصروف تھیں اور باتیں بھی کر رہی تھیں، ابھی ان کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ مجھے انہوں نے الگنی پر سے کپڑے اتارنے کا کہا تھا۔ میں ابھی یہ کام کرنے ہی لگی تھی کہ ساس کی آواز پر رکنا پڑا تھا۔

"نثار بانو یہ کیا تم کھلے بالوں کے ساتھ صحن میں آگئیں، عصر سے مغرب کا آخری وقت ہے۔ بیٹا بالوں کو ڈھانپ لو۔ تمہیں پتا ہے اس وقت، جب مغرب ہونے والی ہوتی ہے تو بہت ہی الا بلائیں پھر رہی ہوتی ہیں۔"

میں نے اپنی ساس کی یہ بات سن کر فوراً بال سمیٹ کر سر پر اوڑھنی ڈال لی تھی، عین اسی وقت مغرب کی اذانیں بھی شروع ہوگئی تھیں۔

اس رات کو میں سو رہی تھی اور میری تیسرے نمبر کی بیٹی جو چند ماہ کی تھی میرے ساتھ ہی لیٹی تھی، وہ اچانک بہت زور سے رونے لگی، اس کے رونے سے میری آنکھ فوراً ہی کھل گئی، میں اس کو تھپکنے لگی، دودھ پلانا چاہا، مگر وہ چپ نہ ہوئی تو اس کو گود میں لے کر ٹہلنے لگی۔ میرے میاں جی اُن دنوں گرمی کی وجہ سے صحن میں سونے لگے تھے، مگر میں اپنے تینوں بچوں کے ساتھ اندر ہی سوتی تھی۔

میری بیٹی بڑی مشکل سے پہلے چپ ہوئی اور پھر سوئی، اس کو لٹا کر میں چادر اوڑھ رہی تھی کہ مجھے یوں محسوس ہوا کسی نے اپنا ہاتھ میرے کاندھے پہ رکھا ہے۔ میں سمجھی میرے میاں ہوں گے، مگر جب پلٹی تو وہاں کوئی نہ تھا اور پھر اُس رات مجھے مسلسل یہ احساس ہوتا رہا کہ کوئی میرے قریب موجود ہے۔ میں مارے خوف کے ساری رات سو نہ سکی تھی۔

دوسرے دن صبح فجر کے بعد میرا یہ احساس ختم ہوگیا تھا، لیکن دوپہر بارہ بجے کے بعد سے مجھے پھر یہ محسوس ہونے لگا تھا کوئی مجھے گھورے جا رہا ہے، اور پھر اچانک ہی جیسے کسی نے مجھے مجبور کر دیا تھا کہ میں آئینے کے سامنے بال کھول کر کھڑی ہو جاؤں، میں نے اپنے کمرے میں جا کر ایسا ہی کیا، میں ابھی آئینے میں خود کو دیکھ ہی رہی تھی کہ مجھے آئینے میں اپنی پشت پر ایک سایہ سا نظر آیا، میں فوراً پلٹی تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ لیکن آئینے میں وہ سایہ موجود تھا۔ اس سے پہلے کہ میں خوف زدہ ہو کر چیختی یا وہاں سے بھاگتی، میرے کانوں میں آواز آئی۔

"ڈرومت، مجھے تم بہت اچھی لگی ہو۔ تمہارے بال تو بہت ہی خوب صورت ہیں، میں ان کا دیوانہ ہوں۔ میں تو تمہارے بال اور تمہاری خوب صورتی دیکھ کر ایک پل کو تو ساکت ہی رہ گیا کہ کوئی انسان اتنا خوب صورت بھی ہو سکتا ہے۔ میرے ساتھ میری بستی میں چلو میں تمہیں دنیا کی ہر آسائش دوں گا۔ تمہاری ہر خواہش پوری کروں گا۔ میں تم سے شادی کروں گا اور ہر طرح سے تمہیں آسودہ اور نہال رکھوں گا۔" میں اس کی باتیں سن کر خاموش رہی، کیوں کہ میں اس وقت یہ سوچ رہی تھی کہ اس کو ایسے بھگایا جائے کہ "سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔" مگر یہ میری محض خام خیالی تھی۔ بھلا کبھی کوئی جن اتنی آسانی سے کسی کا پیچھا چھوڑتا ہے۔ اس کی آواز پر میں ایک دم چونکی، کیوں کہ وہ میرے بالکل قریب آ کر بولا کہ "تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔" حالاں کہ میرا تھوڑا سا گھونگھٹ ابھی بھی نکلا ہوا تھا۔

پہلے کی عورتیں ہمیشہ سر ڈھانک کر رکھتی تھیں اور اگر گھر میں مرد ہوتے تو اوڑھنی کو سینے تک ڈال لیتی تھی، جس سے ان کا پردہ رہتا تھا، کیوں کہ گھر میں کوئی نہیں تھا، اس لیے میں نے کم گھونگھٹ نکالا ہوا تھا۔ "میں ان سب کو کیسے چھوڑ دوں، میں ان سب سے بہت محبت کرتی ہوں، مگر تم بھی اچھے ہو۔ کیا تم مجھے اپنی بستی کی سیر کرواؤ گے، مگر ایک وعدہ کرو کہ تم مجھے واپس بھی چھوڑ کر جاؤ گے۔"

"ہاں میں تمہیں ضرور اپنی بستی گھماؤں گا تو کیا تم مجھ سے شادی کرلو گی بعد میں؟"

"میں تمہیں سوچ کر بتاؤں گی، پہلے تم مجھے سیر تو کراؤ۔" میں نے جن سے ساری بات اپنے من کی منوالی اور سکون سے سو گئی۔

دوسری صبح ہوئی تو بانو نے اپنے شوہر، ساس اور سب بچوں کو ناشتا دیا۔ شوہر تو کام پر چلا گیا اور ساس تھوڑی دیر بعد سودا سلف لینے چلی گئیں، چھوٹی والی کو سلا دیا، ایک بچہ اسکول چلا گیا اور ایک بچے کو پڑوسن کے ہاں چھوڑ کے آ گئی۔ ابھی وہ گھر میں داخل ہی ہوئی تھی کہ جن آ گیا۔ وہ تو پہلے سے تیار تھی، اس لیے جن اس کو اپنے ساتھ لے کر جنوں کی بستی میں پہنچ گیا۔ جہاں وہ خوب گھومی پھری، پھر جن کو کوئی بلانے کے لیے آ گیا تو وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا اور جاتے ہوئے یہ کہہ گیا کہ تم اُس بائیں والے گھر کی طرف مت جانا کیوں کہ وہ گھر نہیں بلکہ محل تھا۔

بانو نے سوچا کہ وہاں ایسی کیا خاص بات ہے جو یہ جن مجھے منع کر گیا ہے، وہاں ضرور کوئی ایسی بات ہے، لہٰذا مجھے وہاں ضرور جانا چاہیے، پھر جب وہ وہاں پہنچ گئی تو اس نے ایک عورت کو کھڑکی میں کھڑے دیکھ کر پوچھا کہ تم تو مجھ جیسی ہی لگتی ہو، تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

اس عورت نے اپنا پتا بتاتے ہوئے کہا کہ ہم بہت بدنصیب ہیں، دنیا میں اچھے بھلے سکون سے رہ رہے تھے، مگر لالچ میں یہاں آ گئے اور اب قیدی بن کر زندگی گزار رہے ہیں۔ تم جس قدر جلد ہو، یہاں سے چلی جاؤ، ورنہ یہ جن تمہیں بھی پکڑ کر قید کر لے گا۔" میں نے اس عورت کی باتیں سن کر اسے بتایا کہ "میں نے اس جن سے وعدہ لیا ہے کہ وہ مجھے میری دنیا میں چھوڑ کر آئے گا، مگر مجھے یہ بتاؤ کہ تم لوگ یہاں سے کیسے نکلو گی۔ یہاں تو نہ کوئی انسان آ سکتا ہے، بلکہ یہاں تو کوئی جن بھی نہیں آ سکتا۔ جب تک یہ اس کو خود لے کر نہ آئیں تم خود سے تو نہیں نکل سکتیں یہاں سے۔"

"تم جلدی چلی جاؤ یہاں سے، دوبارہ آنے کی غلطی مت کرنا۔" اس عورت نے بانو سے کہا۔ بانو اس عورت کے بار بار کہنے پر وہاں سے چل دی اور جس جگہ وہ جن اسے چھوڑ کر گیا تھا، وہیں پر جا کر کھڑی ہو گئی۔

تھوڑی دیر میں وہ جن وہاں آ گیا تو بانو نے کہا کہ "اب تم وعدے کے مطابق مجھے واپس چھوڑ کر آؤ۔"

"ابھی تم پوری طرح سیر سے لطف اندوز تو ہو لو" جن نے بانو سے کہا، مگر وہ اپنی ضد پر اُڑی رہی، بالآخر جن نے مجبور ہو کر کہا کہ "تم سے وعدہ کر لیا ہے تو پھر چھوڑ کر آنا ہی پڑے گا۔" پھر وہ واپس اپنی دنیا میں آ گئی تو اس نے سکھ کا سانس لیا۔

اس کی ساس ابھی واپس نہیں آئی تھی۔ بانو نے سوچا کہ ساس کو سب کچھ سچ سچ بتا دوں، وہی اس مسئلے کو حل کریں گی۔ جب ساس آئیں بانو نے سب کچھ انہیں بتا دیا۔ وہ فوراً جن اتارنے والے مولوی کے پاس گئیں اور ان کو سارا احوال سنایا۔ مولوی صاحب نے تمام بات بغور سنیں اور فوراً ساس کے ساتھ ہی ان کے گھر آ گئے تو دیکھا کہ جن بانو کے کمرے میں موجود تھا۔ مولوی صاحب نے آیات قرآنیہ کا ورد کر کے بڑی مشکل سے اس جن کو قابو کیا اور اسے زنجیروں سے باندھ دیا۔ جن نے جب اپنا یہ حال دیکھا تو غصے سے بولا۔ "مجھے دھوکا دیا گیا ہے اب تو میں کبھی بھی یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ بانو میری ہے، اب میں اس کے ساتھ رہوں گا یا پھر اسے اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔"

مولوی صاحب بھی نچلے بیٹھنے والے نہیں تھے، ایسے تو نہ جانے وہ کتنے جنوں کو جلا چکے تھے اور کتنے ہی جنوں کو وہ انسانی بستی سے نکال چکے تھے، مگر یہ جن ایسا ضدی نٹ کھٹ تھا کہ نکل کے ہی نہیں دے رہا تھا۔

آخر مولوی صاحب نے دوسرے دن بڑی مشکلوں سے اس جن کو قابو کیا وہ بانو کو چھوڑ کر چلا تو گیا، مگر اُس نے یہ بات بھی کہی کہ بانو کے سات بھائی اُس صورت میں ہی زندہ نہیں رہیں گے، جب وہ سات مٹھائیاں یا سات پھل ایک ساتھ نہ کھائے گی، چاہے تھوڑا سا بھی چکھے گی، اگر کھا لیے تو ساتوں بھائی فوراً مر جائیں گے۔

وہ دن ہے اور آج کا دن، بانو نے کبھی بھی سات مٹھائیاں یا پھل ایک ساتھ نہیں کھائے، حالاں کہ اس کے تمام بھائیوں کا انتقال ہو چکا ہے اور وہ خود بھی آج سو برس کی ہو گئی ہے۔

☆......☆



پُراسرار حویلی

سلمیٰ غزل

آسیب بھرے گھر کی حیرت انگیز کہانی جس نے مکینوں کا جینا دوبھر کر دیا

آج کل وریشہ بڑی خوش تھی کرائے کے مکان سے جان چھٹنے والی تھی جب بھی مالک مکان گھر خالی کرنے کو کہتے تھے اس کی جان پر بن آتی تھی اپنے بھائی اور ابو کو کرائے کے مکان کے لیے خوار ہوتا دیکھ کر اُسے دُکھ ہوتا تھا اور اسے بھائی کی اس عادت سے بڑی چڑ تھی کہ وہ ہر کام کو بڑا لاابالی لیتا تھا۔

''تم آخر مکان خالی کرنے سے چڑتی کیوں ہو؟'' وریشہ کی بسورتی شکل دیکھ کر اُسے چھیڑنے میں مزہ آتا تھا۔

''بھائی اگر آپ کو سامان سمیٹ کر دوسرے گھر میں سجانا پڑے تو پتا لگ جائے!'' وہ جل کر بولی۔

''بہتا سامان تو میں اور ابو ڈھوتے ہیں تم نئے گھر میں اعتراض کے علاوہ اور کیا کرتی ہو؟'' ارمغان نے ہنس کر اسے چھیڑا اور وریشہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

''ٹرک میں بھر کر سامان لے جانے اور گھر میں سیٹ کرنے میں زمین آسمان فرق ہے میں تو تنگ آ گئی ہوں روز روز کی اس شفٹنگ سے، امی ابو سے کہیں نا اپنا گھر خرید لیں کب تک ہم خانہ بدوشوں یا اٹھائی گیروں کی طرح زندگی گزاریں گے؟''

پریشان تو وریشہ کے ابو پروفیسر ذیشان اور اس کی امی عائلہ خاتون بھی کچھ کم نہ تھے۔ مالک مکان کے نخرے پھر ہر سال کرایہ بڑھانے کا مطالبہ، اس کے علاوہ آئے دن کی تبدیلی سے فرنیچر کی چولیں بھی ہل جاتی تھیں اور نشانات الگ پڑ جاتے تھے اب تو انہوں نے بھی سنجیدگی سے گھر لینے کا سوچ لیا تھا مگر ان کی محدود آمدنی بچوں کی پڑھائی اور پھر ہوشربا گرانی، مکانوں کی قیمتیں بھی آسمانوں پر پہنچی ہوئی تھیں ہاؤس بلڈنگ سے لون بھی ''رشوت'' دیے بغیر نہیں ملتا تھا۔ انہوں نے ہمیشہ حق حلال کا کمایا اور بچوں کو کھلایا، اب اس عمر میں اپنی عاقبت خراب کرنے سے انہیں ڈر لگتا تھا۔ پھر خوشیٔ قسمت ہاؤس بلڈنگ میں ان کے ایک شاگرد کی پوسٹنگ ہوگئی اور یوں انہیں بغیر کسی رشوت کے لون مل گیا اور بہت سوچ بچار کے بعد انہوں نے ''احسن آباد'' میں ایک تین سو گز کا پلاٹ خرید لیا جو شہر سے دور اور ویران ہونے کی وجہ سے نسبتاً سستا اور ان کی رینج میں تھا شروع شروع میں تو وریشہ اور عائلہ اس علاقے کی ویرانی دیکھ کر بڑی گھبرائیں۔

''ابو یہ جگہ تو بڑی ہولناک ہے اور پھر شہر سے اتنی دور میں کالج کیسے جاؤں گی؟'' وریشہ BSC کی طالبہ تھی اور ارمغان C.A کر رہا تھا۔

''بیٹا کراچی کی آبادی بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے یہاں روزگار کے مواقع زیادہ ہیں اس لیے ہر

صوبے کے لوگ یہاں آ کر آباد ہو رہے ہیں مجھے تو حیرت ہوتی ہے ان لوگوں پر جو آنے والوں پر اعتراض کرتے ہیں کیا اپنے ہی ملک میں ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں جانے کے لیے ویزا لینا پڑے گا؟ کیا ہم روزگار کے لیے دوسرے ممالک نہیں چلے جاتے یہ تو پھر اپنا ہی ملک ہے اور بیٹا جب تک ہمارا گھر تیار ہوگا اور بہت سے گھر بن جائیں گے۔"

اور واقعی پروفیسر ذیشان کا اندازہ بالکل صحیح تھا۔ چھ ماہ بعد گھر مکمل ہونے پر انہوں نے شفٹنگ کی تو کافی گھر بن چکے تھے صرف ان کے آس پاس کے پلاٹ خالی تھے۔ گھر دیکھ کر وریشہ خوشی سے بے حال ہوگئی۔ گھر بے حد خوب صورت تھا، خاص طور پر چھوٹا سا سرسبز لان، تین بیڈروم اور اٹیچ باتھ روم پر مشتمل اس گھر میں ہر وہ سہولت موجود تھی جس کا وریشہ خواب دیکھا کرتی تھی۔ ہر کمرے میں "بلٹ ان" الماریاں، امریکن کچن کے ساتھ چھوٹا سا لیکن اسٹائلش سا ڈرائنگ روم۔ جس کے ساتھ باتھ روم بھی تھا وریشہ خوشی سے ابو سے لپٹ گئی۔ "تھینک یو ابو اتنے خوب صورت گھر کا تو میں نے سوچا بھی نہ تھا!"

"اچھا کیا جو نہیں سوچا اس گھر پر صرف میرا اور امی ابو کا حق ہے تم کس کھیت کی مولی ہو؟"

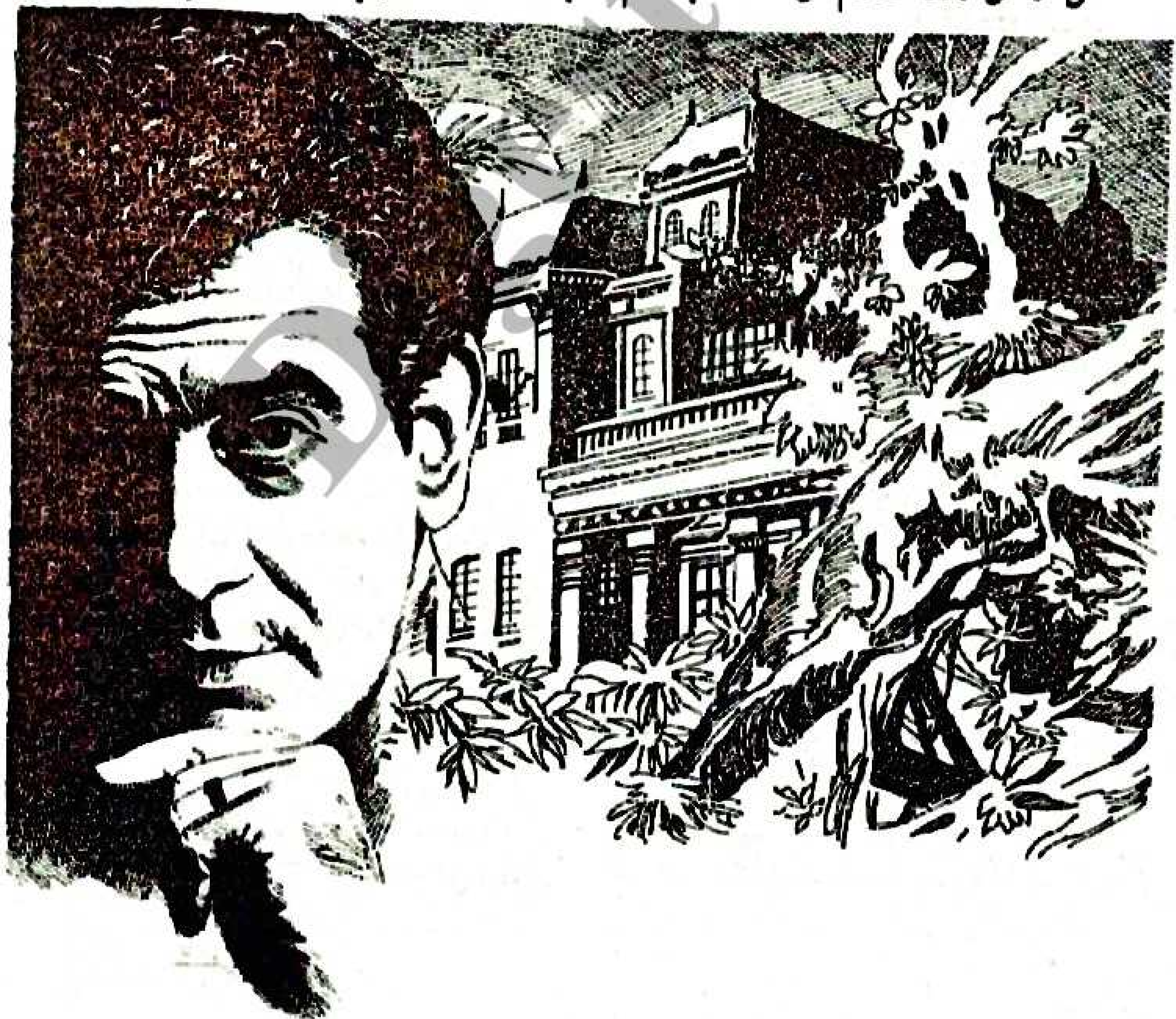
ارمغان نے ہنس کر کہا تو وریشہ کو پتنگے لگ گئے۔

"آپ یونہی جلتے ہیں دیکھنا میں اپنا کمرہ کس خوب صورتی سے سجاؤں گی!" وہ اکڑ کر بولی۔

"صرف نام کا کمرہ ہوگا تمہارا کیوں کہ کچھ عرصے بعد ہم تمہیں اس گھر سے نکال دیں گے انتظار کر رہے ہیں اس شخص کا جو اس مصیبت کو اپنے گھر لے جائے گا!"

ارمغان نے پھر اسے چھیڑا اور وریشہ اس کو مارنے دوڑی لیکن پروفیسر ذیشان بیچ میں آگئے۔

"بھئی ارمغان مت چھیڑا کرو، ہماری چہکتی بلبل کو یہ تو اس گھر کی رونق اور رحمت ہے اس کی رخصتی کے بعد بھی کمرہ اسی کے نام الاٹ رہے گا! وریشہ نے زبان چڑھاتے ہوئے خود کو باپ کی بانہوں میں چھپا لیا۔



☆......☆

کئی دن تو گھر کی سیٹنگ میں نکل گئے پھر وریشہ کو تنہائی ستانے لگی، گھر کس سناٹے اور ویرانی سے دل گھبرانے لگا، حالاں کہ کافی گھر آباد تھے لیکن عجیب خشک اور بدذوق لوگ تھے کسی نے بھولے سے بھی آ کر جھانکا تک نہیں۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا وریشہ ایک عجیب قسم کی بے چینی اور اضطراب کا شکار ہو رہی تھی آج کل کالج کی بھی چھٹیاں تھیں اور موبائل پر دوستوں سے کتنی باتیں کرتی اور کب تک T.V دیکھتی کسی سے اپنی کیفیت شیئر بھی نہیں کر سکتی تھی کیوں کہ گھر خریدنے کے لیے سب سے زیادہ "اُتاؤلی" وہی تھی اس دن اچانک امی کو پروفیسر صاحب کے دوست کی والدہ کے انتقال پر جانا پڑ گیا ابو نے امی کو جنازہ اٹھنے سے پہلے پہنچنے کی تاکید کی تھی۔

"امی میں گھر میں اکیلی کیسے رہوں گی؟"

وریشہ نے احتجاج کیا۔

"میں نے ارمغان کو میسج کر دیا ہے وہ مجھے ایک گھنٹے بعد پک کرے گا تمہارے ابو تو جنازہ پڑھ کر ہی آئیں گے تم جب تک T.V دیکھتی رہنا۔ اور ہاں وہ واپس پلٹ کر بولیں۔ جب تک میں واپس نہ آؤں تم دروازہ مت کھولنا۔"

وریشہ نے لاؤنج میں رکھے T.V کو کھول لیا اس کا پسندیدہ ڈرامہ آ رہا تھا اچانک اسے لگا اس کے پیچھے کوئی کھڑا ہے اس نے مڑ کر دیکھا کوئی بھی نہیں تھا۔ "لاحول ولاقوۃ" اس کو اپنی بزدلی پر ہنسی آ گئی اچانک کسی کا بھاری ہاتھ اس کے کندھے پر آ دھرا۔ اس کی چیخ نکل گئی وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ کوئی نہیں تھا اس کا دل دھڑک دھڑک کر لگتا تھا، پسلیاں توڑ کر باہر آ جائے گا۔ اس نے گھوم کر پورے کا جائزہ لیا وہ پھر گھبرا کر آیت الکرسی پڑھنے لگی۔ اس کو سردی محسوس ہو رہی تھی نومبر کا مہینہ تھا اور کھلے علاقے کی وجہ سے فضا میں خنکی سے پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے T.V بند کیا اور کافی بنانے کچن کی طرف بڑھی جو امریکن اسٹائل میں کھلا ہوا تھا اور کاؤنٹر کے ساتھ دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں جس پر اکثر دونوں ماں بیٹی دوپہر کو کھانا کھایا کرتی تھیں ابھی اس نے سوچا ہی تھا کہ کافی پھینٹنے کی آوازیں آنے لگیں اس کی حیرت سے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں تیار کافی کاؤنٹر پر رکھی تھی وہ گھبرا کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی اور موبائل پر ارمغان سے بات کرنے کی کوشش کرنے لگی مگر شاید سگنلز کا پرابلم تھا وہ چیخ چیخ کر رونے لگی، اچانک کسی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا پھر اسے اپنا ہوش نہیں تھا۔ آنکھ کھلی تو وہ اپنے بستر پر تھی اور باہر سے امی اور بھائی کی باتوں کی آواز آ رہی تھی وہ گھبرا کر کمرے باہر نکل آئی۔

"بھائی دروازہ کس نے کھولا؟" اس نے بمشکل سوال کیا۔

"پاگل تم ہی نے تو کھولا تھا پھر بات کیے بغیر جا کر کمرے میں سو گئیں، مگر امی نے تمھیں اٹھانے نہیں دیا، کیوں کہ تم نے زبردست سگھڑاپے کا مظاہرہ کر کے انہیں ورطہ حیرت میں ڈال دیا تھا کھانا تیار، روٹی پکی ہوئی اور گھر صاف ستھرا۔ تم اس قدر کام چور اور تھی ہو آج یہ تم پر کام کرنے کا دورہ کیسے پڑ گیا؟" ارمغان کے لہجے میں شرارت تھی۔

"مت تنگ کرو میری بیٹی کو اس قدر کام کیا ہے تھک کر سو گئی ہو گی؟" عائلہ نے پیار سے کہا تو وہ سوچ میں پڑ گئی کیسے بتاؤں انہیں کہ میں نے تو کوئی کام نہیں کیا اور پھر بتا بھی دیا تو کیا فائدہ ہو گا۔ قرض ادھار لے کر یہ گھر بنایا ہے کیا اسے چھوڑنا ہو گا؟ شاید میں نے خواب دیکھا ہو گا، لیکن کیا میں خواب میں کھانا پکایا تھا؟

☆......☆

عائلہ اور ذیشان حیران تھے وریشہ جو نماز پڑھنے کی عادی نہ تھی آج کل بغیر کہے نماز کے ساتھ ساتھ تلاوت قرآن پاک بھی کر رہی تھی، دونوں ہی بہت خوش تھے اور دعا گو بھی کہ BSC کرتے ہی اس کی شادی ہو جائے، مگر پریشانی یہ تھی کہ لوگ رشتے کے لیے کہتے ضرور تھے لیکن احسن آباد آنے کے لیے کوئی تیار نہ ہوتا تھا اب تو پروفیسر صاحب کو شہر سے باہر گھر بنانے پر ملال ہونے لگا تھا، گھر خریدنے سے پہلے انہیں گھر والوں کی اور لوگوں کی رائے کو اہمیت دینا چاہیے تھی یا کم از کم اتنا ہی کرتے کہ استخارہ ہی لے لیتے، حالاں کہ ان کی عادت تھی کرائے کا گھر لینے سے پہلے استخارہ ضرور کرتے تھے تا کہ اللہ کی رضا شامل ہو جائے، مگر جانے کس طرح اس اہم کام کے

وقت وہ استخارہ کرنا بھول گئے اور اب پچھتا رہے تھے۔

☆......☆

پروفیسر ذیشان نے وریشہ کی تنہائی کے خیال سے اس کے کمرے کے لیے بیوی کی مخالفت کے باوجود چھوٹا T.V لے دیا تھا تا کہ وہ اپنے کمرے میں سکون سے T.V دیکھ سکے، کیوں کہ جس قسم کے کھلے ڈلے ڈرامے اور پروگرام آتے تھے انہیں خود بھی بچوں کے خاص طور پر بیٹی کے ساتھ بیٹھ کر دیکھنے میں شرم آتی تھی۔

رات نیند نہ آنے پر جب وریشہ نے T.V کھولا تو اس پر کوئی ڈراؤنی مووی آرہی تھی اس نے خوف زدہ ہو کر T.V بند کرنا چاہا تو وہ جام ہو گیا۔ اس کو لگا ہر آنکھ اس کو گھور رہی ہے ہر چہرہ اس پر لگا ہے۔ ایک جگر پاش اور حوصلہ شکن نظارہ اس کے سامنے تھا، خوف سے اس کا ننھا چہرہ مسخ ہو گیا ہاتھ پاؤں مفلوج اور گلا خشک، اس کی گھگھی بندھ گئی۔ ایک ڈھانچہ جیسی چیز جس کے بڑے بڑے دانت آگے کی طرف نکلے ہوئے تھے، آنکھوں کی جگہ خالی گڑھے جھانک رہے تھے اور چیتھڑوں جیسے کپڑوں سے لٹکتے ہوئے ہاتھ زمین کو چھو رہے تھے وہ لرزہ براندام بری طرح چیخنے لگی اس کی چیخیں سن کر سب ان کے کمرے میں آگئے۔ اس نے پھٹی پھٹی نظروں سے سب کی طرف دیکھا اور T.V کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو بند ہو چکا تھا اور بے ہوش ہو کر ارمغان کی بانہوں میں آرہی۔

اس کو ہوش آیا تو کچھ لمحے تو ذہن نے کام کرنا بند کر دیا پھر رفتہ رفتہ یاد آنے پر وہ ماں سے لپٹ کر رونے لگی اور ایک ایک لفظ انہیں بتا دیا۔

"بیٹا آخر منہ ہی منہ میں کیا بڑبڑا رہی ہو بولتی کیوں نہیں، ارے تمہاری آواز کیوں نہیں نکل رہی؟"

"امی ابو اور بھائی اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے اور اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ آخر وہ اس کی بات سن کیوں نہیں رہے، سمجھ کیوں نہیں رہے؟" امی اس کو گلے لگا کر بری طرح رونے لگیں، ابو اور ارمغان بھی پریشان ہو گئے۔ "بیٹا گم صم کیوں ہو، بتاؤ تو سہی کیا تم نے کوئی بھیانک خواب دیکھا تھا؟" اب وریشہ پریشان ہو کر سوچ رہی تھی۔ "آخر میری بات سب لوگ سمجھ کیوں نہیں رہے؟"

"امی وریشہ کو آرام کرنے دیں شاید خواب میں ڈر گئی ہے آپ اسے اپنے کمرے میں لے جائیں؟" ارمغان نے سنجیدگی سے کہا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

☆......☆

"امی میں روزانہ آپ کے کمرے میں سو جایا کروں؟" شام میں اس نے ڈرتے ڈرتے امی سے پوچھا۔ "کیا ہو گیا وریشہ بالکل ہی بچہ بن گئی ہو، یہ دیر تک جاگنے کا نتیجہ ہے۔ میں تو پہلے ہی تمہارے کمرے میں T.V رکھنے کے خلاف تھی، مگر تمہارے بھائی اور ابا کے لاڈ کے آگے میری کہاں چلتی ہے، اب ساری رات جاگتی ہو اور صبح مشکل سے اٹھتی ہو۔"

وریشہ نے ایک مرتبہ پھر زبان کھولنے کی کوشش کی لیکن زبان میں تو جیسے تالے پڑ گئے۔ وہ ماں سے لپٹ کر رونے لگی۔

"امی یہ گھر بیچ دیں۔" اس نے ہمت کر کے کہا۔

"پاگل ہو گئی ہو کس قدر محنت مشقت اور دقتوں سے یہ گھر بنا ہے تمہارے ابو کا خون پسینا شامل ہے اس کی بنیادوں میں۔ میں تو کبھی ایک دیوار میں کیل بھی ٹھونکوں تو وہ کہتے ہیں میرے دل کو تکلیف ہوتی ہے۔ عشق ہے انہیں اس گھر سے، اور پھر ویسے بھی آج کل وہ بے حد پریشان ہیں۔ جن سے ادھار قرض لیا تھا ان کے تقاضے شروع ہو گئے، بس حیرت تو تمہارے ابو کو اپنے ان دوستوں پر ہے جو دام سخن ہر موقع پر ان کے ساتھ تھے یعنی "جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے!" امی نے ٹھنڈی سانس بھری اور کمرے سے باہر نکل گئیں، وریشہ سوچ میں پڑ گئی۔

"کیا اس گھر میں آسیب کا اثر ہے یا میں نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے، آخر سب بھی تو اسی گھر میں رہتے ہیں؟" اس نے سوچا آج وہ ابو کو ضرور بتائے گی کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ "کمرے سے باہر جو نہی قدم نکالا اس کے بولنے سے پہلے امی بول پڑیں "خبردار جو ایک لفظ بھی منہ سے نکالا۔"

"امی پلیز میری بات تو سنیں!" وریشہ نے عاجزی سے کہا۔ "کس سے کہہ رہی ہو امی نہانے گئی ہیں۔" ارمغان نے اخبار میز پر رکھتے ہوئے متانت سے کہا۔

"بھائی امی ابھی یہیں کھڑی تھیں!" وہ گھبرا کر بولی۔
"وریشہ تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے، میں کئی دن سے نوٹ کر رہا ہوں تم بتاتی کیوں نہیں ہو۔"
"بھائی آپ ذرا میرے کمرے میں آئیں۔"
"ہاں اب بتاؤ کیا بات ہے؟" اس کے بستر پر بیٹھتے ہوئے اس نے استفسار کیا اور پھر چیخ مار کر کھڑا ہو گیا، ایک بڑا سا سوا کھال چھیلتا ہوا جہیز میں سے جھانک رہا تھا۔ وریشہ کو لگا سوئے کی دو آنکھیں میں جو اسے بری طرح گھور رہی ہیں۔
"کس قدر لاپروا ہو تم وریشہ یہ بستر میں اتنا بڑا سوا کہاں سے آیا؟ کیا تم لحافوں میں ڈورے ڈالنے کا کام کرنے لگی ہو؟" اس نے سوا کھینچ کر نکالا اور دور پھینک دیا۔
"بھائی......" وہ چیخیں مار مار کر رونے لگی۔
"کیا بات ہے وریشہ کیا پریشانی ہے تم بتاتی کیوں نہیں ہو؟" اسی لمحے امی کمرے میں آئیں اور وریشہ کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔ "کیوں بھائی کو تنگ کر رہی ہو منع کیا تھا نا فضول بات کرنے سے!"
"کیا ہو گیا امی کیوں بلاوجہ اس کو ڈانٹ رہی ہیں؟"
عائلہ نے گھور کر وریشہ کی طرف دیکھا اور جانے ان آنکھوں میں کیا تھا کہ وریشہ کی سٹی گم اور آواز بند ہو گئی۔
اس نے بے بسی سے بھائی کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔
"تم پریشان نہ ہو، میں ابھی امی سے بات کرتا ہوں بلاوجہ تمہیں ڈانٹتی رہتی ہیں!"
"امی آپ کو کیا ہو گیا ہے، کیوں وریشہ کے پیچھے پڑی رہتی ہیں بلاوجہ اس کو ڈانٹ دیا۔"
ارمغان ماں سے بگڑ کر بولا۔ "اکلوتی بہن ہے میری اور مجھے بے حد عزیز ہے!"
"پاگل ہو گئے ہو میں کیوں ڈانٹوں گی وریشہ کو میں تو ابھی ابھی نہا کر نکلی ہوں!" ارمغان کو اچھا نہیں لگا کہ ماں کی اس غلط بیانی پر انہیں ٹوکے۔

☆......☆

اس دن تو حد ہو گئی اس نے منہ پر صابن لگا کر نل کھولا تو ہوا نکلنی شروع ہو گئی بجائے پانی کے، اس نے زور زور سے امی کو پکارنا شروع کر دیا۔
"امی موٹر چلا دیں پانی نہیں آرہا!"

آنکھوں میں مرچیں لگنے لگی تھیں اس نے جونہی تولیے سے منہ پونچھا اس کی چیخ نکل گئی ایک بھیانک چہرہ اس کے سامنے تھا۔ وہ گرتی پڑتی امی کے کمرے کی طرف دوڑی، عائلہ بیگم نے وریشہ کو گھور کر دیکھا ان کے چہرے کا زاویہ بگڑ گیا تھا اور آنکھوں سے قہر برس رہا تھا۔
وریشہ گھبرا کر گھر سے باہر نکل آئی اور گیٹ پر ہی بیٹھ گئی اور بھائی اور ابو کو دیکھ کر جان میں جان آئی۔
"کیا طریقہ ہے یہ گھر کے باہر کیوں بیٹھی ہوا" ارمغان نے ڈانٹنا شروع کیا تو وہ جواب دیے بغیر اندر کی طرف بڑھ گئی سامنے ہی امی کھڑی تھیں۔ "کہاں چلی گئی تھیں تم بیٹا میں کب سے آوازیں دے رہی ہوں۔"
اس نے منہ کھولنا چاہا مگر ماں کی قہر آلود نگاہوں نے اس کی بولتی بند کر دی۔
ابو مجھے وریشہ کی بڑی فکر ہے پتا نہیں کیوں ہر وقت ڈری ڈری سہمی سہمی رہتی ہے، پوچھو تو کچھ بتاتی بھی نہیں، پتا نہیں اس کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟" تنہائی میں ارمغان نے باپ کے سامنے اپنے خدشے کا اظہار کیا اور پروفیسر صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو محسوس تو میں بھی کر رہا ہوں۔"

☆......☆

گھر میں سفید بلی کو دیکھ کر وریشہ کی آنکھیں چمک اٹھیں، اس کو بلیاں بڑی پسند تھیں۔ اس نے بلی کو گود میں اٹھا لیا۔ "امی دیکھیں کس قدر صحت مند اور خوب صورت بلی ہے، بھائی کو دکھاتی ہوں۔" اچانک وریشہ کو لگا بلی کا حجم بڑھتا جا رہا ہے اور اس کے وزن سے اس کے ہاتھ دکھ رہے ہیں اس نے جیسے ہی بلی کی طرف دیکھا اس کی چیخیں نکل گئیں، بلی کے پاؤں زمین سے ٹکرا رہے تھے اور اس کی گود میں ایک صحت مند بکرا تھا اس نے زور سے بکرا پھینکا اور چیخیں مارنے لگی۔ اس کی چیخیں سن کر سب جمع ہو گئے، وریشہ تھر تھر کانپ رہی تھی، اس نے ماں کی طرف سے منہ پھیر کر بولنا شروع کر دیا۔ وہ جانتی تھی ماں کی تنبیہ اس کی بولتی بند کر دے گی۔
"عائلہ تم نے وریشہ کی بات کیوں نہیں سنی؟" پروفیسر ذیشان غصے میں دھاڑے۔
"میں آپ کو کیا بتاتی خود میری بھی بولتی بند تھی میں

خود ساری رات جاگتی ہوں دیواروں پر چھت پر مختلف شکلیں مجھے ڈراتی رہتی ہیں کبھی ان کے ہاتھ لمبے ہو جاتے ہیں اور عجیب عجیب بھیانک، مافوق الفطرت شکلوں کا رقص جاری رہتا ہے کئی مرتبہ آپ کو بتانا چاہا مگر آواز بند ہو جاتی ہے کتنی مرتبہ میں نے وریشہ کو بھی بتانے سے منع کیا ہے اور یہ منع کرنے کی آواز اندر سے آتی ہے جیسے کسی سے اگر ذکر کیا تو کوئی بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔ پھر مجھے یہ بھی احساس تھا کہ کتنی محنت مشقت اور ادھار قرض لے کر آپ نے یہ گھر بنایا ہے اس کی بنیادوں میں آپ کے خون پسینے کی کمائی شامل ہے کیسے اسے چھوڑ دیں۔" آخر میں امی کی آواز گلوگیر ہو گئی۔

"حیرت ہے مجھے تم پر اتنی طویل رفاقت میں تم نے میرے بارے میں یہی اندازہ لگایا۔ ارے بیگم تم سے اور اپنی اولادوں سے زیادہ مجھے دنیا میں کوئی چیز عزیز نہیں ہے اس گھر کو کوڑیوں کے مول بیچ دوں تو بھی سودا مہنگا نہیں، مگر مجھے دکھ یہ ہے کہ دونوں ماں بیٹیاں اس اذیت سے گزرتی رہیں اور ذکر تک نہیں، یقیناً اس گھر پر آسیبوں کا اثر ہے۔"

"ابو آپ بھی جن بھوتوں کے قائل ہیں؟" ارمغان نے حیرت سے کہا۔

"بیٹا اس میں کوئی شک کہ آج کل کے ماڈرن اور سائنٹفک دور میں لوگ ایسی باتوں پر یقین نہیں کرتے لیکن تمہاری امی اور بہن جو بتا رہی ہیں وہ غلط تو نہیں ہوسکتا قرآن شریف میں "سورۃ جن" میں اس کا ذکر ہے، ہم کسی عالم سے رجوع کریں گے اللہ کے کلام کی برکت سے ہمیں ان سے نجات مل جائے گی۔"

"عالموں کو تو بس رہنے ہی دیں، ابو ایک سے بڑھ کر ایک شعبدے اور ڈھکوسلے میں ایسے عالموں پر لعنت بھیجتا ہوں۔" ارمغان چڑ کر بولا۔

"میں بھی جانتا ہوں مگر تلاش کرنا پڑے گا۔ ابھی تو نیک لوگوں کی دنیا میں کمی نہیں، آج سے میں وریشہ کے کمرے میں اور وریشہ اپنی ماں کے ساتھ سوئے گی اور سوتے وقت آیت الکرسی سات مرتبہ پڑھ کر حصار ضرور کر لینا۔"

☆......☆

وریشہ کے کالج کھل گئے تھے، جب سے وریشہ نے ماں کے ساتھ سونا شروع کیا تھا اس کا خوف دور جاتا رہا تھا، پروفیسر صاحب بھی کسی عالم کی تلاش میں تھے، ساتھ ساتھ پراپرٹی ڈیلر سے بھی گھر بیچنے کی بات کر رکھی تھی۔

جب اپنے گھر میں سکون سے رہنے کی عادت ہو گئی تھی، اس لیے سب پریشان تھے کہ کرائے کے گھر میں کیسے رہیں گے کیوں کہ جتنی قیمت گھر کی لگ رہی تھی اس میں تو 120 گز کا گھر بھی نہیں آ رہا تھا۔ آج کل سب پرسکون تھے اور تمام باتیں اپنا وہم سمجھ کر سب کچھ بھول چکے تھے، مگر پروفیسر صاحب نے اپنی مہم جاری رکھی تھی۔ انھوں نے سوچ لیا تھا کہ اگر گھر بک نہ سکا تو کرائے پر دے دیں گے اور شہر میں کرائے پر گھر لے لیں گے، یوں بھی آج کل وریشہ کی شادی کے لیے سخت پریشان تھے۔ اول تو کوئی ڈھنگ کا رشتہ ملتا ہی نہیں تھا۔ اگر کوئی لڑکی دیکھنے کی خواہش کرتا بھی تو احسن آباد کا نام سن کر معذرت کر لیتا۔

اس لیے اب وہ بھی ایسے ویران علاقے میں گھر بنا کر پچھتا رہے تھے۔

☆......☆

اس دن وہ گھر پہنچ کر بیل بجانے ہی والے تھے کہ ایک بزرگ کو اپنی طرف بڑھتے پایا۔

"السلام علیکم!" انھوں نے شائستگی سے سلام کیا۔

پروفیسر ان کے ظاہری حلیے سے متاثر ہو گئے۔ "آپ پروفیسر ذیشان ہیں!" انھوں نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"جی آپ کون!" ذیشان کے لیے وہ بالکل اجنبی تھے۔ "مجھے خلیل الرحمن کہتے ہیں ڈیفنس میں میری رہائش ہے سنا تھا آپ مکان بیچنا چاہ رہے ہیں؟ اسی سلسلے میں حاضر ہوا تھا۔"

پروفیسر صاحب نے انھیں ڈرائنگ روم میں لا کر بٹھایا اور پھر رکھ رکھاؤ سے متاثر ہو کر ہر بات بتا دی سوائے اس کے کہ گھر میں کس قسم کے آسیب کا شک ہے کیوں کہ خود وہ اس تجربے سے نہیں گزرے تھے اس لیے انھوں نے بتانا بھی مناسب نہیں سمجھا۔

"آپ ڈیفنس میں رہتے ہیں پھر یہاں گھر کیوں لینا چاہ رہے ہیں!" پروفیسر صاحب اپنا تجسس برقرار نہ رکھ سکے۔

"آپ کو آم کھانے سے مطلب ہے یا پیڑ گننے سے؟" پھر وہ نرمی سے گویا ہوئے۔ "میں قیمت کا تعین

تقویٰ کی پانچ برکات

مفتی اعظم پاکستان، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تقویٰ کی پانچ برکات ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ متقی کے لیے دنیا و آخرت کے مصائب اور مشکلات سے نجات کا راستہ نکال دیتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کے لیے رزق کے ایسے دروازے کھول دیتا ہے جن کی طرف اس کا دھیان بھی نہیں جاتا، تیسرے یہ کہ اس کے سب کاموں میں آسانی پیدا فرما دیتا ہے۔ چوتھے یہ کہ اس کے گناہوں کا کفارہ کر دیتا ہے۔ پانچویں یہ کہ اس کا اجر بڑھا دیتا ہے اور ایک دوسری جگہ تقویٰ کی یہ برکت بھی بتلائی گئی ہے کہ اس کی وجہ سے اس کو حق و باطل کی پہچان آسان ہو جاتی ہے۔ (معارف القرآن جلد 8 صفحہ 489)

آپ پر چھوڑتا ہوں آپ شہر کے کسی حصے میں بھی اتنا ہی بڑا مکان پسند کرلیں وہ آپ کے نام ہو جائے گا پھر یہ آپ میرے نام کر دینا!"

"دیکھئے میں سودے میں بے ایمانی نہیں کر سکتا جس قیمت میں مجھے یہ مکان پڑا ہے اس قیمت میں تو شہر میں اس سے آدھا گھر بھی نہیں آئے گا پھر ہاؤس بلڈنگ کالون اور لوگوں کا قرض میں تو گھر خریدنے کی پوزیشن میں ہی نہیں ہوں!" پروفیسر ذیشان نے صفائی سے اپنی حیثیت بتا دی۔

بزرگ زیر لب مسکرائے پھر متانت اور سنجیدگی سے گویا ہو جائے۔ "آپ کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے میں آپ کے بارے میں سب جانتا ہوں، آپ جلد سے جلد مکان پسند کرلیں، میں ایک ہفتے بعد آ کر آپ سے ملوں گا اور ہاں۔" وہ جاتے جاتے پلٹ کر بولے۔ "ابھی اس ڈیل کے بارے میں کسی کو بتایئے گا نہیں۔" پروفیسر کو حیران و ششدر چھوڑ کر خلیل الرحمٰن جا چکے تھے اور ذیشان صاحب حیرت میں ڈوبے سوچ رہے تھے۔ "کیا یہ غیب کی مدد ہے؟"

☆......☆

پروفیسر ذیشان نے گھر والوں کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ کسی ایجنٹ نے گاہک بھیجا تھا پھر انہوں نے گھر دیکھنا شروع کیے انہیں ہمیشہ سے K.D.A آفیسرز سوسائٹی بے حد پسند تھی، ان کے دو تین دوست بھی وہاں رہائش پذیر تھے، شہر کے وسط میں صاف ستھرا علاقہ۔ انہیں ایک بنگلہ بے حد پسند آیا ون یونٹ 240 گز پر۔ بے حد خوب صورت نیا بنا ہوا ان کو اندازہ تھا اس کی قیمت کم از کم ڈیڑھ کروڑ تو ہوگی۔ پھر انہوں نے گلشن اقبال صحافی کالونی میں بھی دو سو گز پر ایک گھر دیکھ لیا حالاں کہ انہیں دونوں میں سے کسی ایک کی بھی ملنے کی امید نہیں تھی۔

اب انہیں خلیل الرحمٰن کا بری طرح انتظار تھا اور حسب وعدہ وہ ایک ہفتے بعد آ گئے۔

"امید ہے آپ نے اپنا کام مکمل کرلیا ہوگا۔" انہوں نے بیٹھتے ہی پوچھا۔

"گھر پسند تو کرلیے ہیں، مگر مجھے اندازہ ہے وہ میری Range میں نہیں ہیں آپ اس گھر کی قیمت لگا دیں ہم کرائے کے گھر میں چلے جائیں گے پھر بعد میں خرید لیں گے!" پروفیسر ذیشان نے ہچکچاتے ہوئے شرمندگی سے کہا۔

"جب ہم آپ سے کہہ رہے ہیں کہ آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تو کیوں فکر کرتے ہیں!" خلیل الرحمٰن نے ان کا ہاتھ پکڑا اور اپنی گاڑی میں بٹھا کر شہر کا رخ کیا۔ پروفیسر ذیشان پر تو ایک خواب کی سی کیفیت طاری تھی، پھر ایک ہفتے بعد 240 گز کا مکان ان کے نام ہو چکا تھا۔ انہوں نے احتیاطاً سوک سینٹر جا کر اپنے دوست کے توسط سے معلومات کیں۔ کوئی شک کی گنجائش نہیں تھی، نہ کوئی لمبا چوڑا کیس تھا پوری Payment ہو چکی تھی اور گھر ان کے نام ہو گیا تھا۔ دوسرے دن خلیل الرحمٰن ان کو اپنے ساتھ مختلف دفاتر میں لے گئے اور ایک دن میں ان کا گھر خلیل الرحمٰن کے نام ہو گیا پروفیسر ذیشان کی حیرت پر وہ مسکرا کر بولے۔

"آپ کسی شک میں نہ پڑیں اور رخت سفر باندھیں۔ آپ اپنی بیٹی کی شادی کے لیے بھی پریشان ہیں دیکھئے گا وہ

گھر آپ کے گھر والوں کے لیے خوش نصیبی کی علامت ثابت ہوگا اور بٹیا کی بہت اچھی جگہ شادی ہو جائے گی۔"

☆......☆

ان بزرگ کی پیش گوئی بالکل سچ ثابت ہوگئی یہ گھر ان کے لیے بے حد بھاگوان تھا۔ پروفیسر صاحب کا پروموشن ہوا وہ پرنسپل بن گئے اور وریشہ کے لیے بہت اچھے شریف گھرانے سے رشتہ آ گیا، وریشہ تو جیسے ہواؤں میں اُڑنے لگی تھی، گھر بھی بے حد خوب صورت اور پرسکون تھا۔ امی خلیل الرحمٰن کو دعائیں دیتی نہ تھکتی تھیں۔ ایک دن انہوں نے ابو سے کہا۔ "میرا خیال ہے کسی دن ان بزرگوار کے گھر چل کر شکریہ تو ادا کر دیں، وریشہ کی منگنی کی مٹھائی بھی کھلا آئیں گے۔"

پروفیسر صاحب کو بیگم کی تجویز بہت اچھی لگی۔

دوسرے دن بڑا سا کیک لے کر وہ بیگم کے ساتھ ان کے گھر پہنچ گئے۔ بیل دے دے کر تھک گئے مگر کسی نے دروازہ نہیں کھولا، آخر تنگ آ کر انہوں نے ایک پڑوسی سے پوچھا۔ "یہ خلیل الرحمٰن صاحب کیا گھر میں نہیں ہوتے؟"

"آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟" وہ صاحب حیرت سے بولے۔

"یہ گھر پہلے ہمارا تھا اور ہم نے خلیل الرحمٰن صاحب کو بیچا تھا، آج ان سے ملنے آئے ہیں تو کوئی دروازہ ہی نہیں کھول رہا، حالاں کہ گھر کی لائٹیں بھی جلی ہوئی ہیں اور محسوس ہو رہا ہے کہ کوئی اندر ہے!"

"جائیے جائیے اپنا راستہ ناپیے اس گھر میں تو آج تک ہم نے کسی کو نہیں دیکھا البتہ روزانہ رات کو لائٹیں ضرور جلی ہوتی ہیں۔ عجیب معما ہے نہ سمجھنے کا، نہ سمجھانے کا، لوگ کہتے ہیں کہ اس گھر میں جنوں کا بسیرا ہے واللہ عالم لیکن کوئی آج تک اندر نہیں گیا۔ اگر کبھی کسی بچے کی بال کھیلتے ہوئے اندر چلی جائے تو وہاں سے کوئی باہر پھینک دیتا ہے، جو کوئی بھی ہے جن یا آسیب ہمیں کوئی پریشانی نہیں بلکہ شاید ان ہی کی وجہ سے پورے محلے میں سکون ہے نہ چوری نہ چکاری، نہ قتل، غارت گری، نہ ہنگامہ آرائی جو آج کل کراچی شہر کا وطیرہ ہے!"

واپسی کے سفر میں پروفیسر صاحب نے بیگم کو تنبیہ کی "دیکھو جو کچھ ہم نے سنا سمجھ لو نہیں سنا، بھولے سے بھی کسی سے ذکر مت کرنا جو بھی اس گھر کے مکین تھے وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہم لوگ اس گھر میں رہیں وہ ہماری مجبوری کو سمجھتے ہوئے وہ مکان کے خریدار بن کر آ گئے۔ انہوں نے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا بلکہ ہمارا بھلا ہی کیا، اس لیے بہتر ہے ہم بھی اس بات کو بھول جائیں!" اور عائلہ بیگم تو خود بھی دل ہی دل میں یہی عہد کر رہی تھیں۔

☆......☆



ایک حسینہ



الماس فاطمہ ارمان

-ایک عورت کی کہانی جس کے نومولود بچے پر جن عاشق ہو گیا

گرمیوں کی سخت گرم رات تھی، بارش وقفے وقفے سے ہو رہی تھی، جس کی وجہ سے شدید حبس اور گھٹن کا عالم تھا۔ یہ کہانی پنجاب کے ایک گاؤں راجن پور سے وابستہ گاؤں کے مسجد کے پیش امام عمر دین کی ہے، جب اس کے گھر صبح چار بجے چار بیٹوں پر بیٹی پیدا ہوئی تو پیدائش کے وقت گھر میں ایک عجیب سی گلاب کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ دائی اماں کے علاوہ خدیجہ اور اُس کی سہیلی بھی حیران تھیں کہ یہ کیسی مہک ہے، خدیجہ نے سمجھا کہ امام صاحب نے اگر بتیاں جلائی ہوں گی، بات آئی گئی ہوئی۔

بچی کو جو دیکھتا دیکھتا ہی رہ جاتا وہ بہت ہی حسین تھی مگر اس بچی میں عجیب سی بات تھی کہ وہ یہ کہ اس کے ہاتھ پیر کافی بڑے تھے۔ جسم نازک پتلا سا، گلابی سرخی مائل رنگت، سنہری بال، نیلی نیلی آنکھیں مگر اس کے ہاتھ پیر دیکھ کر حیران ہوتے خدیجہ نے کہا۔ "بلا وجہ آپ لوگ اس بات پر پریشان ہو رہے ہیں، یہ سب تو قدرت کے کھیل ہیں۔" سب لوگ خاموش ہو گئے، عمر دین بچی کے کان میں جس وقت اذان دے رہے تھے بچی ان کی گود میں ہمک رہی تھی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے عمر دین کو تک رہی تھی یہ بات عمر دین نے بھی محسوس کی پھر اپنی بیگم سے ہنس کر بولے۔ "بیگم ہماری بیٹی بہت شریر ہے، چھوٹے بھائیوں کا بھی خوشی کے مارے کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ وہ ہر دوست سے یہ ہی کہتے کہ ہمارے گھر ایک ننھی سی پری آگئی ہے۔

بچی کا نام عالیہ رکھا گیا۔ وہ واقعی ایک ننھی سی پری تھی چھ دن کی بچی اس طرح مسکراتی جیسے کہ وہ دو ڈھائی سال کی بچی ہو۔ اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک واضح ہوتی۔ گاؤں کی بوڑھی خواتین یہ باتیں محسوس کرتے ہوئے خدیجہ سے پوچھتیں۔

"اوئی کی کھا کے جنا ہے؟ اوکڑی کے ہاتھ پیر اتنے وڈے ہیں؟"

"ماسی تسی فضول گلاں مت کیا کرو۔" خدیجہ جواب میں کہتی مگر جب بچی کو دودھ پلاتی تو وہ بے سدھ ہو جاتی۔ عالیہ کا پیٹ بھی نہیں بھرتا تھا۔ وہ اس طرح دودھ پیتی جیسے کئی دنوں کی بھوکی ہے۔ وہ گھبرا کر زبردستی اُسے اپنے آپ سے الگ کرتی، کئی دفعہ اس نے امام صاحب سے کہا تو وہ ہنسنے لگے۔ "نی جھلی تیرا وہم ہے اُسے بھینس کا دودھ پلا، میں کل سے زیادہ لے آیا کروں گا۔"

"عالیہ جس طرح بڑی ہو رہی تھی اتنی ہی حسین ہوتی جا رہی تھی۔ اُس کے بال سنہری اور بہت لمبے

تھے۔ عمر دین ہر دفعہ اُسے گنجا کر دیتا کہ شاید کالے رنگ میں نکل آئیں اور لمبائی میں کم ہوں، کیوں کہ خدیجہ کے لیے انہیں سنبھالنا مشکل ہو جاتا مگر ہر دفعہ

جیسے جیسے عالیہ بڑی ہو رہی تھی عمر دین نے اسے نماز اور دینی تعلیم کی متوجہ کرنا چاہا مگر وہ نہ ہی نماز پڑھتی اور نہ ہی مدرسے جا کر قرآن، بھائی اپنے ساتھ لے کر



وہ بڑھ جاتے گاؤں کی لڑکیاں اس کے بالوں سے جلتی تھیں۔

جاتے، وہ روپیٹ کر آ جاتی، ہر وقت اُڑتی تتلی بنی رہتی کبھی اِدھر کبھی اُدھر۔

گھر کے نزدیک ہی گلاب کا بہت بڑا باغ تھا، عالیہ موقع پاتے ہی وہاں پہنچ جاتی اور پھولوں سے باتیں کرتی۔ باغ کے مالی بھی اُسے پھولوں سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر حیران ہوتے مگر وہ اسے عالیہ کا بچپنا سمجھ کر خاموش رہے، کیوں کہ وہ امام دین کی بڑی عزت کرتے تھے، عمر دین بھی اس کی ان حرکتوں کو بچپنا سمجھتا، مگر ماں کو کبھی کبھی تشویش ہوتی کہ عالیہ میں کوئی نہ کوئی غیر معمولی بات ہے، عالیہ اکثر نہا کر گھنٹوں آئینے کے سامنے بال کھول کر کھڑی رہتی اور آئینے سے باتیں کرتی ہوئی زور زور سے ہنستی۔ اُس کی ہنسی میں عجیب سی کھنک ہوتی۔ خدیجہ کام چھوڑ کر اُسے دیکھتی رہتی۔ وہ کچھ کہنے کے لیے منہ کھولتی اُسے ایسا لگتا زبان اُس کا ساتھ نہیں دے رہی۔ عالیہ نے وقت سے پہلے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو گاؤں میں اُس کے حسن کے چرچے ہونے لگے۔ خدیجہ اور عمر دین پریشان تھے، کیوں کہ عالیہ نہ ہی دین کی طرف راغب تھی اور نہ ہی گھریلو کام کاج کرتی بڑے بھائی نے سختی سے کام لینا چاہا تو وہ اور بھی ضدی بن گئی، کھانا پینا چھوڑ دیتی، سارا دن آئینے کے سامنے بناؤ سنگھار کر کے کھڑی رہتی اور موقع ملتے ہی گلاب کے باغ میں پہنچ جاتی اور اس طرح ناچتی جیسے کوئی مورنی اپنی دنیا میں مگن اپنے پنکھ پھیلا کر ناچتی ہے۔

گندم کی کٹائی کا موسم تھا، عمر دین اور خدیجہ صبح سویرے نماز کے بعد گندم کی کٹائی کے لیے گئے ہوئے تھے، عالیہ بھی ناشتا کر کے سیدھی گلاب کے باغیچے جا پہنچی۔ آج وہ پورے سولہ سال کی ہو گئی تھی۔ اس کی جوانی جوبن پر تھی جو دیکھتا وہ دیکھتا ہی رہ جاتا۔ آج اُسے دیسی گلاب کے بادشاہ کی تلاش تھی۔ جسے کل تک وہ کلی کی صورت میں دیکھ کر خوشی سے جھوم رہی تھی، آج وہ صبح صبح یہاں پہنچی تا کہ مالی اُسے توڑ نہ لے۔ جب وہ اُس پودے کے پاس پہنچی تو اُس نے دیکھا کہ شاخ پر وہ پھول نہیں ہے۔ یہ دیکھ کر وہ پاگلوں کی طرح پورے باغ میں دوڑنے لگی کہ شاید وہ اس گلاب کا پودا بھول رہی ہے، مگر تمام پودوں میں صرف کلیاں تھیں پھول کوئی بھی نہیں۔ اُس پر ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی، پھر اچانک اُس کا چہرہ بھیانک ہو گیا۔ اُس کے منہ سے کف بہنے لگا، زبان حلق سے باہر آ گئی۔ وہ بُری طرح کانپ رہی تھی۔ اتنے مالی کا گزر ہوا وہ عالیہ کو روتا ہوا دیکھ کر رُک گیا۔

"مالی بابا گلاب کے پھول کہاں ہیں۔" وہ مالی کو دور سے ہی دیکھ کر چلائی۔

"بیٹا آج کسی کی شادی تھی اس لیے صبح مالک نے منگوا لیے" یہ کہتے ہوئے مالی بابا اُس کے قریب آیا۔ پتر دو چار دن میں پھر کھل جائیں گے۔ "نہیں بابا وہ جو سب سے بڑا گلاب کا پھول تھا جو پھولوں کا بادشاہ کہلاتا، وہ کبھی کبھی آتا ہے مجھے بس وہی چاہیے" یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بدل سی گئی اور وہ زور سے رونے لگی۔ مالی بابا نے جب قریب سے اس کو دیکھا تو سناٹے میں رہ گیا، کیوں کہ عالیہ وہ حسین عالیہ نہیں تھی۔ اس کی بھیانک شکل دیکھ کر وہ لرزتا ہوا باڑے کی طرف بھاگا جہاں اور مالی کلیاں صاف کر رہے تھے کیا ہوا۔ "وہ عالیہ وہ......" مزید آگے کہتے ہوئے زبان اُس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ تمام لوگ اُس جگہ طرف بھاگے، دیکھا تو عالیہ بے ہوش پڑی ہوئی تھی اور اس کی زبان منہ سے باہر نکلی ہوئی تھی، ہاتھ پیر مُڑ چکے تھے۔ پیش امام کو لوگ کھیت سے بلا کر لائے۔ وہ عالیہ کو اس حالت میں دیکھ کر بہت پریشان ہو گیا کہنے لگا۔ "یہ میری بیٹی نہیں، یہ میری عالیہ نہیں تو یہ کون ہے۔" بڑی مشکل سے ان دونوں کو گھر لایا گیا۔ خدیجہ نے جب ان کو اس حالت میں دیکھا تو وہ بھی رونے لگی، گاؤں کے لوگوں نے پیش امام اور خدیجہ کو تسلی دی اور رائے دی کہ عالیہ کو کسی عامل کو دکھایا جائے۔ بڑی مشکل سے ایک عامل صاحب کو تلاش کیا گیا۔ انہوں نے جب عالیہ کو دیکھا تو پریشان ہو گئے، کہنے لگے کہ کسی گندی روح نے عالیہ کو اپنے بس میں کیا ہوا ہے۔ اس سے نجات دلوانے کے لیے مجھے تین دن کا چلہ کاٹنا پڑے گا، جمعرات، جمعہ، ہفتہ میں چلہ کاٹوں گا۔ ایک بات بتاتا چلوں اگر میں اس چلے میں کامیاب نہ ہو سکا تو عالیہ کی جان بھی جا سکتی ہے، آپ باپ ہیں۔ پیش

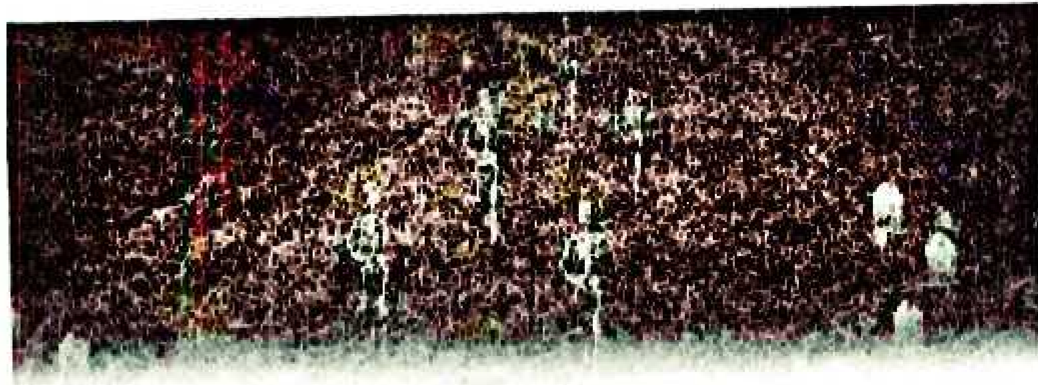
امام نے کہا کہ کچھ بھی ہو، میں اپنی بچی کو پھر سے خوش باش دیکھنا چاہتا ہوں، عامل نے کہا کہ کچھ چیزیں آپ کو لانا پڑیں گی۔ "ایک درجن انڈے، ایک درجن کاغذی لیموں ایک کپڑے کی بنی ہوئی گڑیا، ایک درجن باریک سوئیاں، ایک مٹی کی کوری ہانڈی۔ میں جمعرات کو نماز کے بعد بیٹھ جاؤں گا تم بھی میرے ساتھ موجود ہوگے۔ عمل کے دوران تم ڈرنا نہیں اور نہ ہی مجھے کسی بات کے لیے منع کرنا۔ اگر بیچ میں کوئی ایسی بات ہوئی تو تمام محنت رائیگاں ہو جائے گی۔"

چلہ شروع کیا گیا جیسے جیسے مولانا صاحب پڑھائی کر رہے تھے عالیہ خوفناک انداز میں چلاتی رہی۔ دیکھ مولوی مجھے چھوڑ دے تو اپنا کام مت کر میں عالیہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتی کیوں کہ اس میں میری جان ہے۔ جب یہ ماں کے پیٹ میں تھی اس کی ماں پرانے قبرستان کے ساتھ والے گاؤں جا رہی تھی۔ مجھے بھی ایک ایسی ہی حاملہ ماں کی تلاش تھی جس کے پیٹ میں بچی کا حمل ہو بس میرے دل کی مراد پوری ہوگئی۔ میں قبرستان کی پرانی قبر میں بسیرا کرتی تھی۔ میں جینا چاہتی تھی۔ بہت کم عمری میں میری شادی ہوگئی۔ میرے سسرال والوں کا رویہ میرے ساتھ بہت بُرا تھا مجھ پر بے جا تشدد کیا گیا۔ انہوں نے مجھ پر مٹی کا تیل چھڑک کر زندہ جلا دیا۔ میری روح تڑپ رہی تھی۔ میں ان لوگوں سے انتقام لینا چاہتی تھی۔ میں دوبارہ زندہ ہونا چاہتی تھی اس لیے میں عالیہ کی ماں کی کوکھ میں اُتر گئی اور اپنے جوان ہونے کا انتظار کرنے لگی اور جب میں عالیہ کے شریر پر اپنا قبضہ ساری عمر کے لیے کرتی، وہ لمحہ مجھ سے چھن گیا۔ مجھے شروع سے گلاب کا پھول پسند تھا اس لیے مجھے گلاب کا بادشاہ چاہیے تھا۔ اُس کی خوشبو سے میرا جسم مہکتا رہتا۔ اس مہک کے ذریعے میں کسی کو بھی اپنا غلام بنا سکتی ہوں میرا سب سے چھوٹا دیور جب میری موت واقع ہوئی، آٹھ سال کا تھا، اب وہ کبرو جوان ہے۔ میں اس کو اپنا غلام بنا کر اپنے پورے سسرال سے انتقام لینا چاہتی تھی مگر وہ گلاب کا پھول توڑ لیا گیا اور مجھے مالی نے اس حالت میں دیکھ لیا ورنہ تھوڑی دیر بعد میں اپنی حالت میں آ جاتی۔ آپ یہاں سے چلے جائیں، ورنہ عالیہ کو نقصان بھی ہو سکتا ہے۔

عامل صاحب عالیہ کی بات ایک کان سے سنتے اور دوسرے کان سے اُڑاتے، جیسے جیسے وہ پڑھائی کر رہے تھے وہ بدروح چیخ رہی تھی۔ آج چلے کا آخری دن تھا۔ آج عالیہ بہت ہی اذیت میں تھی۔ وہ رو رہی تھی۔ مجھے چھوڑ دو مجھے جینے دو اگر میں عالیہ سے جدا ہوگئی تب بھی عالیہ اسی طرح بستر پر ایک مردے کی طرح زندگی گزارے گی۔ بس عمر دین سے یہ جملہ برداشت نہ ہوا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ "عالیہ کو جانے دو عامل صاحب عالیہ کو مرنے دو اگر یہ نہیں مری تو یہ پتا نہیں کتنے لوگوں کو نقصان پہنچے۔" اب جب کہ چلہ پورا ہونے والا تھا، اس وقت عمر دین نے سب کچھ خاک میں ملا دیا۔ عامل صاحب چلہ چھوڑ کر اُٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ انہوں نے دیکھا عالیہ جھٹکے لے رہی ہے، کافی دیر تک اس کی کیفیت اس طرح رہی اور پھر اُس کی موت واقع ہوگئی جس وقت اس کے جسم سے روح نکلی کمرے میں عجیب سی کافور اور گلاب کی مہک آنے لگی۔

عمر دین نے اپنا سینہ پیٹ لیا۔ "میری بچی میں تیرا مجرم ہوں، میں نہیں چاہتا تھا تو مردوں کی طرح زندگی گزارے۔" ماں نے اپنے بال نوچ لیے۔ آہوں اور سسکیوں سے عمر دین نے اُسے خود لحد میں اُتارا۔ عالیہ کے بغیر گھر سونا سونا ہو گیا۔ اس غم میں ایک سال کے اندر خدیجہ بھی ہارٹ اٹیک سے مر گئی۔ عمر دین اکیلا رہ گیا۔ بیٹوں نے اُسے سنبھالا۔ وہ روز عالیہ کی قبر پر جاتا ساتھ خدیجہ کی قبر تھی، وہاں بھی فاتحہ خوانی کرتا۔ عالیہ کی قبر پر گلاب کے پھول چڑھا، قرآن پڑھتا اور رو رو کر دعا کرتا۔ الٰہی ہر ایک بچی کو ایسی ناگہانی مصیبتوں سے بچا، پیش امام صاحب نے اپنے دو بیٹوں کی شادی کر دی ہے اپنی دونوں بہوؤں کو بھی وہ عالیہ کی طرح چاہتے ہیں۔ ان میں اپنی عالیہ کو تلاش کرتے ہیں اس نیکی کے صدقے میں ان کے گھر پوتی نے جنم لیا۔ وہ بہت خوش ہیں، ان کی پوتی ماشاء اللہ بالکل صحت مند ہے۔ انہوں نے اپنی پوتی کا نام راحیلہ رکھا ہے عالیہ سے ملتا جلتا، خدا ان کی راحیلہ کو پروان چڑھائے۔ (آمین)

☆......☆



بریانی



مور شاہد حسین

انسانی پنجرے سے بنی بریانی کھانے والے ایک شخص کی داستان

ہر شخص کو کوئی نہ کوئی من پسند چیز کھانے کا "ہوکا" ہوتا ہے اور پھر یہ "ہوکا" اُس کی کمزوری بن جاتا



ہے۔ بچپن ہی سے مجھے کھانے میں "بریانی" بہت پسند ہے۔ بریانی بھلے مہینہ بھر باسی بھی ہو مگر کھاتے ہوئے وہ "گرم بریانی" مجھے تازہ تازہ ہی محسوس ہوتی ہے۔ اکثر و بیشتر میں باہر بھی صرف بریانی ہی کھانا پسند کرتا ہوں۔ میرے من پسند "کھانے" کا علم میرے دوست، احباب اور پڑوسیوں کو بھی ہے۔ کسی بھی تقریب میں میرے لیے بطور خاص بریانی کی پوٹلی الگ باندھ کر دی جاتی ہے۔ میرے ہاں فریزر میں بریانی کی پلاسٹک کی پوٹلیاں ہمیشہ ہی محفوظ رہتی ہیں۔ گھر میں اماں میری بریانی سے محبت کو خوب جانتی ہیں وہ صاف صاف کہتی ہیں۔

"میں ایسی ندیدی اولاد کو پیدا کر کے پچھتائی جو ہر تقریب سے مانگ کر حصہ وصولتی ہے۔"

"لیکن مجھ پر کوئی اثر نہیں پڑتا کہ گویا مجھے عشق ہے بریانی سے۔"

میں ایک فیکٹری میں کام کرتا ہوں، کیوں کہ میرا تعلق ایک متوسط گھرانے سے ہے لہٰذا ہم جیسے گھرانوں میں لڑکے اچھے مستقبل کی آس میں ہلکان نہیں ہوتے، بلکہ جہاں سے دو پیسوں کا آسرا ہو، گھر کے چولہے کے لیے فوراً اپنی خدمات پیش کر دیتے ہیں۔ گھر سے آدھے گھنٹے کی مسافت پر فیکٹری واقع ہے اگر بس سے جاؤ تو دس منٹ

لگ ہی جاتے ہیں اور پیدل شارٹ کٹ سے آدھے گھنٹے میں مٹر گشت کرتے کرتے بندہ پہنچ جاتا ہے، لہٰذا میں شارٹ کٹ والے راستے سے آتا جاتا ہوں۔ راستہ یوں تو گلیوں سے ہوتا ہوا جاتا ہے لیکن بیچ میں ایک میدان اور آخر میں ایک بہت پرانا باوا آدم کے زمانے کا قبرستان بھی پڑتا ہے اور قبرستان کی دیوار کے سامنے ہی باڑے ہیں، جن میں مقامی لوگوں نے گائے بھینس باندھ کر جگہ کو پر رونق بنایا ہوا ہے۔ اس لیے اُس طرف سے آتے ہوئے کبھی خوف یا ڈر محسوس نہیں ہوتا۔ فیکٹری میں ہفتہ واری شفٹیں ہوتی ہیں۔ ایک ہفتہ ڈے اور ایک ہفتہ نائٹ، اُن دِنوں میری نائٹ شفٹ میں ڈیوٹی چل رہی تھی۔

وہ منگل کا دن تھا جب میں ڈیوٹی کرنے فیکٹری پہنچا، فیکٹری کے بڑے دروازے پر ایک نوٹس چسپاں تھا۔

''تمام ورکرز کو مطلع کیا جاتا ہے کہ سیٹھ خالق کی اہلیہ کے انتقال کی وجہ سے آج نائٹ شفٹ اور کل صبح کی شفٹ میں آنے والے ورکرز کو چھٹی دی جاتی ہے۔ بحکم منیجر۔''

اتفاقاً چھٹی نے خوشی تو خیر نہیں دی بلکہ کوفت میں جتلا کیا تھا۔

''اب رات نو بجے اس چھٹی کا کیا فائدہ، کیا کروں کیا نہ کروں۔ اب گھر سے نکلا ہوں تو کسی سے مل ہی لوں۔'' سوچتے سوچتے اچانک میرے ذہن میں شفیق کا خیال آیا جو میرا بہت اچھا دوست فیکٹری کے توسط سے بن چکا تھا۔ اس کا گھر فیکٹری کے قریب ہی تھا اور وہ کئی بار مجھے اپنے گھر مدعو کر چکا تھا۔ میں نے فوری اس کے گھر کی جانب قدم بڑھا دیے۔

دروازے پر دستک دینے پر شفیق ہی باہر آیا تھا، وہ مجھے گھر کے اندر لے گیا۔ دنیا جہان کی باتیں، قصے لے کر ہم بیٹھ گئے۔ وقت اس تیزی سے گزرا کہ پتا ہی نہ چل سکا۔ اُس نے مجھے کھانے کی آفر بھی کی لیکن میں نے قبول نہ کی اور اپنی باتونی طبیعت سے وقت کو آگے سرکاتا رہا۔

جب گھڑی نے ڈیڑھ بجے کا الارم بجایا تو میں کچھ ہوش میں آیا کہ مجھے گھر جانا ہے، اس وقت میں فیکٹری میں نہیں ہوں، شفیق مجھے روکتا ہی رہ گیا لیکن میں نہ رُکا۔

فیکٹری کے قریب پہنچ کر میری نظریں غیر ارادی طور پر فیکٹری کے صدر دروازے کی جانب اُٹھ گئیں۔

''ارے...... یہ، یہ کون ہے؟؟'' ایک کالے برقع پوش خاتون پر میری نظریں گڑ کر رہ گئیں، اتنی رات گئے تنہا، وہ بھی کسی صنفِ نازک کا کھڑے ہونا خود بخود بہت سے سوالات کو جنم دے رہا تھا۔ میں فیکٹری کے دروازے کی جانب کھنچتا چلا گیا۔

''بات سنیں آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟'' میں نے اُسے مخاطب کیا۔ وہ ایک دم پلٹ کر میری طرف دیکھنے لگی۔

''آج فیکٹری بند ہے۔ سیٹھ صاحب کی بیوی کا انتقال ہو گیا ہے، آپ کو رات کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا، آج کل کے حالات کا علم تو آپ کو ہوگا ہی۔'' میں نے اب اُس برقع پوش کو غور سے دیکھا، نقاب سے جھانکتی بڑی بڑی چمکدار آنکھیں دیکھنے والے کو اسیر کر دینے کی بھرپور صلاحیت رکھتی تھیں، بس میں اُسی لمحے اُن آنکھوں کا اسیر ہو گیا۔ اُن آنکھوں کی عجیب سی کشش نے میری سُدھ بُدھ چھین لی تھی۔

''وہ۔ وہ مجھے یہیں کھڑا کر کے گیا ہے۔ میں اُس کا انتظار کر رہی ہوں۔'' اُس کی حسین آواز میرے کانوں سے ٹکرائی، میں ایک سیکنڈ میں معاملے کی تہ تک پہنچ گیا۔

''اوہ...... دیکھیں اگر آپ بُرا نہ منائیں تو آپ کو آپ کا خیر خواہ ہونے کی حیثیت سے ایک مشورہ دینا چاہوں گا۔ کیا آپ اسی علاقے کی ہیں؟''

اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں پانی تیر گیا، میرا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔

''پلیز آپ روئیں نہیں، بات تو کریں۔'' میں جانے کون سے جذبے کے تحت درد میں ڈوبی آواز کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر گویا ہوئی۔

''جی آپ نے ٹھیک پہچانا لیکن اب کیا کروں اکیلے جاتے ڈر لگ رہا ہے۔''

''آج تو میرے گھر میں بھی کوئی نہیں ہے، اور یہ۔ یہ وقت، مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' وہ رونے لگی۔

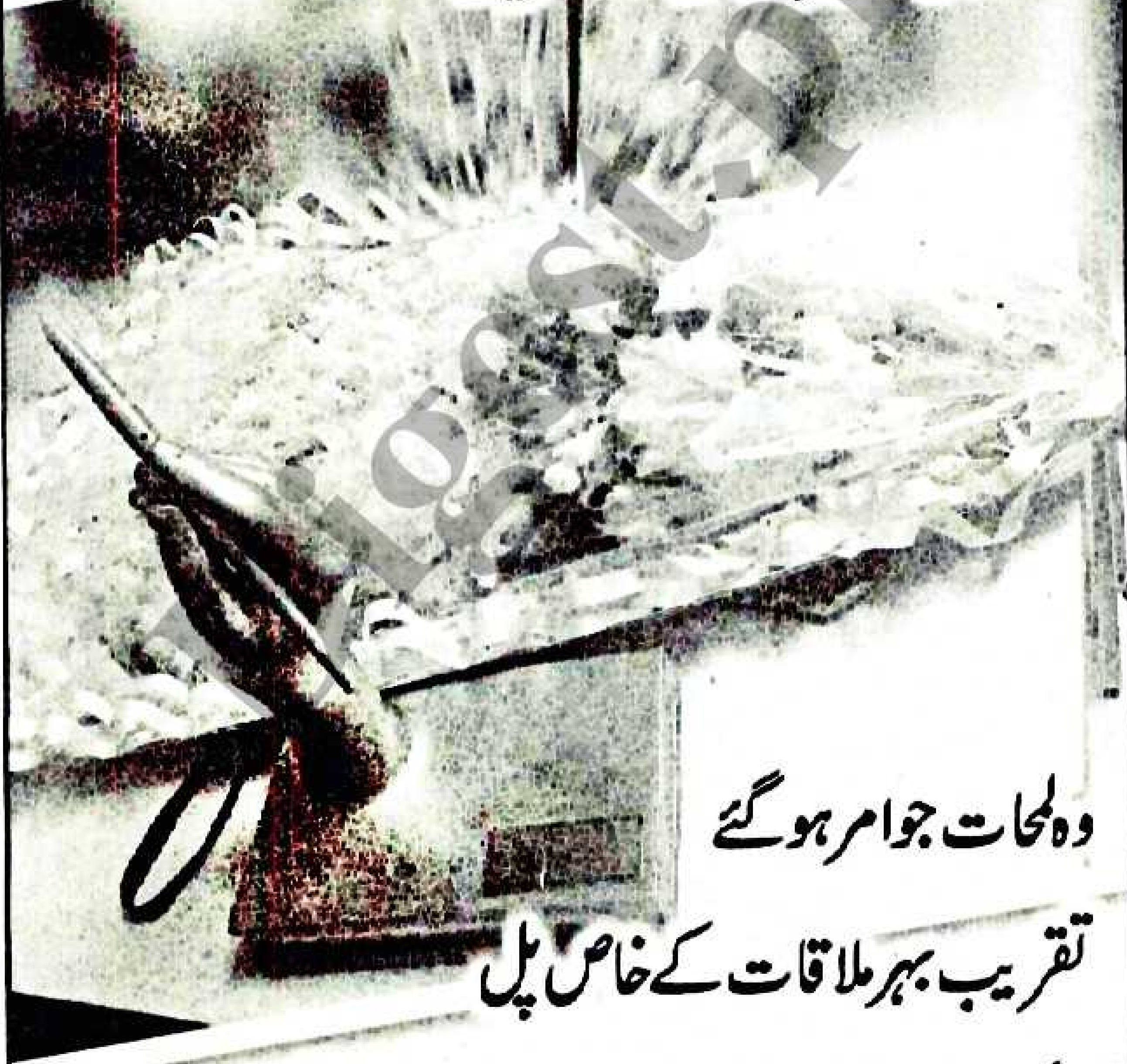
میں نے ہمدردی سے اُسے اپنے ساتھ گھر تک پہنچانے کی آفر کی جسے اُس نے فوراً قبول کر لیا۔ اب میں اُس کی سربراہی میں جس نے اپنا نام ''ریشماں'' بتایا تھا۔ ریشمی ڈوری میں بندھا چلتا چلا جا رہا تھا۔ مجھے پتا بھی نہ چلا کہ کتنی مسافت طے ہو گئی ہے۔ رات کی سنک ہوا

دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ نمبر

دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ کی ستائیسویں تقریب کے یادگار لمحات

ایوارڈ یافتگان کے تاثرات

مندوبین دوشیزہ کی ملن ساز گھڑیاں......



وہ لمحات جو امر ہو گئے

تقریب بہر ملاقات کے خاص پل

ماہِ اگست کے شمارے دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ نمبر میں ملاحظہ کیجیے

ریشماں کی سنگت میں مجھے اڑائے چلی جا رہی تھی۔ جی چاہتا تھا یہ سہانا سفر کبھی ختم ہی نہ ہو۔

مگر جس طرح ہر سفر کی ایک منزل ہوتی ہے اُسی طرح اس سفر کی منزل یعنی ریشماں کا گھر بھی آ گیا۔

ایک بوسیدہ لکڑی کا دروازہ جس پر زنجیر پڑی تھی۔ ریشماں نے زنگ آلود چابی سے کھولا اور مجھے اندر آنے کو کہا۔

باہر سے چھوٹا سا نظر آنے والا گھر اندر سے وسیع و عریض تھا۔ بڑا سارا صحن تھا جس کے ایک کونے پر ہینڈ پمپ لگا ہوا تھا۔ پانی کی سیلن سے اُس کے اردگرد کائی سی جم گئی تھی۔ ایک طرف خوب صورتی سے کیاری میں پودے لگے تھے اور بیلیں دیوار پر چڑھ کر بہار دکھا رہی تھیں۔ رات کی رانی کی مہک نے سارے آنگن کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اس کے سامنے ہی ایک تندور لگا تھا جس کے اوپر تازہ تازہ مٹی سے لیپ کیا گیا تھا۔ بالکل بیچ میں ایک بڑا گھنا جنگل جلیبی کا پیڑ شان سے کھڑا تھا۔ صدر دروازے سے سامنے والے پکے تین کمروں تک قریباً پچاس قدموں کا فاصلہ تھا۔ پکے کمروں سے ملحقہ باورچی خانہ جالی کے دروازے کے ساتھ زندگی کی بہار دکھا رہا تھا۔

"ارے معیز صاحب، آپ کہاں کھو گئے؟؟ بیٹھیے نا۔"

میں واقعی کچھ کھو سا گیا تھا، اُس کے پکارنے پر حقیقت میں واپس آیا، میرا نام اُس نے کیسے پکارا حالاں کہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا میں نے تو اب تک اُسے اپنا نام نہیں بتایا تھا۔

"آپ بیٹھ جائیں" اُس نے ایک مُوڑھا جس پر موٹے کپڑے کا استر چڑھا تھا میرے آگے کھسکا دیا۔

"میں آپ کے لیے کھانا لاؤں؟" میں نے اپنے ہاتھ سے آج بریانی بنائی ہے، شاید آج آپ کی قسمت میں میرے ہاتھ کا کھانا ہی لکھا تھا۔ اسی لیے آپ یہاں ہیں۔" اُس نے جس چاہ سے مجھے کھانے کی آفر کی تھی اگر وہ زہر بھی دیتی تو میں انکار نہ کر پاتا۔

"بریانی" یہ لفظ سن کر سارے جذبے منجمد ہو گئے تھے اور میں اُس کے ہاتھ کی بنی بریانی کا انتظار کرنے لگا۔

"بریانی شاید دم پر تھی کچن سے باہر تک اشتہا انگیز خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی خوشبو سے پانی میرے منہ بھر بھر جا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد ریشماں اسٹیل کی بڑی سی پلیٹ میں بریانی بھر کر لے آئی۔

"آپ ہاتھ سے کھائیں گے یا چمچ سے؟" اُس نے رسان سے پوچھا۔

اب تک وہ برقع اُتار چکی تھی اُس کا حسین نکھرا اچھوتا حسن، ہوش اُڑاتے نقوش سب کچھ "بریانی" کی پلیٹ سے اُٹھتی بھاپ کی لپیٹوں میں تحلیل ہو کر رہ گیا تھا۔

میرے آگے اب "بریانی" سے زیادہ اہم کوئی شے نہ رہ گئی تھی۔

میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور آستینیں اوپر کر کے بریانی پر ٹوٹ پڑا۔

میں تو یہ بھی نہ دیکھ پایا تھا کہ ریشماں کی آنکھیں میرے اس جارحانہ انداز پر لہو رنگ ہو چکی تھیں۔ وہ تِل تِل سرشاری ہو رہی تھی۔

"معیز۔ پانی تو پی لو۔" وہ گلاس میری جانب بڑھاتی ہوئی گویا ہوئی۔

میں نے اُس کے ہاتھ سے گلاس لیا تو اُس کی بڑی بڑی آنکھوں سے میری آنکھیں ٹکرائیں۔ اُس کی آنکھوں کی پتلیاں، لال انگارہ ہو چکی تھیں۔

میں نے گھبرا کر گلاس پکڑا، پانی کی طرف دیکھا پانی کا رنگ لال تھا۔

اب میرے چونکنے کی باری تھی میں نے آخری نوالے میں ایک ہڈی گال کے سائیڈ میں رکھی تھی جو بریانی سے نکلی تھی اب جو میں نے منہ سے وہ ہڈی نکالی میری آنکھیں دہشت سے باہر کو آنے لگیں۔ وہ تو انگلی کی ناخن لگی ایک پور تھی۔

اب بریانی کی پلیٹ میں جابجا انسانی انگلیاں نظر آ رہی تھیں، میں نے آگے کی جانب پیر اٹھانا چاہا تو لگا میرے پیروں میں لوہے کی وزنی بیڑیاں ڈال دی گئی ہیں۔ میرا وجود ٹھنڈا ہونے لگا۔

"ریشماں، یہ سب کیا ہے؟" میں نے مری ہوئی آواز کے ساتھ اسے پکارا۔

"یہ سب۔ ہاہاہا۔" اُس کا بلند قہقہہ فضا میں گونجا۔

"ارے یہ سب تو کچھ بھی نہیں ہے۔ تُو تو بہت

بہادر ہے۔ آج ایک بہادر آدمی کا قیمہ بنا کر کل کباب کھاؤں گی۔ بڑے دن ہو گئے تیرے جیسا تازہ تازہ گوشت کھائے۔" وہ فلک شگاف قہقہہ لگاتے ہوئے دوبارہ گویا ہوئی۔

خوف کی سرسراہٹ سے میرا وجود ٹھنڈا ہونے لگا۔ مجھے اپنی موت سامنے ہی ناچتی محسوس ہوئی۔ یہ جو میں نے ابھی بریانی کھائی تھی وہ انسانی گوشت سے بنائی گئی تھی۔

اب منظر تبدیل ہونے لگا تھا، دیکھتے ہی دیکھتے سامنے لگی کیاری سوکھ کر جھاڑ جھنکار میں بدل گئی، تندور کا چبوترا اندر کو گر کر بے ڈھب ہو گیا تھا۔ سامنے بنا کچن اور کمرے آثار قدیمہ کی جھلک دکھانے لگے تھے۔ جنگل جلیبی کا پیڑ ڈھیر سارے مکڑی کے جالوں کے ساتھ ڈرانے لگا تھا۔

میری نظر جو ریشماں پر پڑی تو میری چیخ نکل کر رہ گئی۔ ریشماں، بال کھولے، سفید چوغہ پہنے، بڑے بڑے دانت لیے گوشت سے خالی ڈھانچے کے ساتھ کھڑی تھی۔ وہ بلند ہونے لگی اور اچانک آسمان تک جاتی نظر آنے لگی۔

مارے دہشت کے میرا برا حال تھا۔ میرے پیر کی بیڑی اب تک نہ پیروں سے لپٹی تھی، میں پوری طاقت سے پیر مارنے لگا۔

میرے پیروں سے لہو رسنا شروع ہو گیا تھا، میں اپنے دل میں فوراً آیت الکرسی کا ورد کرنے لگا اور پھر جیسے میرا اندر ہوش و حواس میں آ گیا تھا، جو جو سورتیں مجھے یاد تھیں صدق دل کے ساتھ انہیں پڑھنے لگا اور خدا سے اپنے اعمال کی معافیاں مانگنے لگا۔

اچانک میں نے دیکھا کہ ایک بزرگ ہستی بالکل میرے عین سامنے آ گئی ہے۔ میں بے ہوش ہو رہا تھا، بزرگ نے آتے ہی اُس چڑیل کو اپنے ہاتھ میں پکڑی بوتل سے کچھ دانے نکال کر مارنا شروع کیے۔

"چھوڑ دے چھوڑ دے آج مجھے اسے کھا لینے دے میں بہت بھوکی ہوں۔ چھوڑ دے میں آج تیرے ہاتھ نہیں آؤں گی۔" وہ چڑیل کرب سے چلا اٹھی۔

بزرگ نے پڑھائی جاری رکھی اور مسلسل اُس پر کنکر پھینکتے رہے۔ وہ چڑیل بے بس ہو کر اُس بوتل میں واپس آ گئی اور بزرگ نے پڑھائی کرتے کرتے بوتل کا منہ بند کر دیا۔

"آج تیری شرارت پھر کسی معصوم کی جان لے لیتی۔ اب تو اس بوتل سے نکل نہیں سکتی۔" بزرگ نے بوتل جیب میں رکھ لی اور پھر کچھ پڑھ کر پھونکا تو میں ہوش میں آ گیا۔

"خوش نصیب ہو، خدا نے تمہاری جان بچا لی، لیکن آئندہ خیال رکھنا، اس راستے کو تم اب چھوڑ دو بیٹا۔ آنے جانے کے لیے اب کسی دوسرے راستے کا انتخاب کرلو یہی بہتر ہے۔" بزرگ میرے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا۔

"مگر بابا جی۔ یہ تو میرا روز کا راستہ ہے۔" میں اب حواس میں واپس آ گیا تھا۔

"لو یہ تعویذ، اب تمہیں کسی چیز سے کوئی ڈر نہیں اللہ نے چاہا تو کوئی تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکے گا۔ خدا آفات و بلاؤں سے تمہاری حفاظت کرے۔" بزرگ تعویذ دے کر غائب ہو گئے۔

میں اپنے اندر نقاہت محسوس کرتے ہوئے اُٹھا۔ اچانک ابکائی کے ساتھ ایک الٹی آ گئی تھی، ساری بریانی باہر آ گئی جس میں انسانی انگلیاں بھی باہر آئی تھیں۔ میں اس مشکل سے باہر نکلا تو دیکھا کہ باہر قبرستان ہے اور میں خود کسی قبر سے باہر نکلا ہوں، میں تعویذ ہاتھ میں لے کر قبرستان سے نکل گیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا گھر کی جانب چل دیا۔

اس واقعے کا ذکر میں نے آج تک کسی سے نہیں کیا۔ اس واقعے کو گزرے ہوئے بیس سال ہو چکے ہیں۔ اب میں ایک اچھی پوسٹ پر ہوں۔ نوٹوں میں کھیلتا ہوں۔ گھر بار سب کچھ ہے، بیوی بچے، سب کچھ...... لیکن ایک بہت بڑی انقلابی تبدیلی اُس دن کے بعد سے مجھ میں یہ آئی تھی کہ مجھے "بریانی" کے نام سے بھی نفرت ہو گئی۔

وہ بابا جانے کون خدا کے نیک بندے تھے، ان کی دی ہوئی نشانی وہ تعویذ آج بھی میرے داہنے بازو پر بندھا، اُس واقعے کی یاد دلاتا رہتا ہے۔

☆......☆



روح سے ملاقات

نایاب نسرین

اپنے شوہر کی روح سے ملاقات کرنے والی ایک عورت کی کہانی

زندگی میں کچھ واقعات ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جن پر یقین ہوتے ہوئے بھی انسان بے یقینی کا شکار رہتا ہے۔ یہ بھی ایک ایسا ہی سچا واقعہ ہے جو کہ شاید سننے والوں کے لیے یقین کا باعث نہ ہو، لیکن میرے پاس یقین نہ کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ میں نے دیکھا ہے، محسوس کیا ہے، اس لیے بھلا میں اسے کیسے بھول سکتی ہوں۔ میں کیسے جھٹلا سکتی ہوں۔

وہ 7 جنوری کی ایک سرد شام تھی، بلکہ رات شروع ہو چکی تھی۔ میں ابھی گلی کے کونے پر رکشے سے اُتری تھی۔ میں جب بھی گھر آتی ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ اندر سے ایک آواز آئے گی "کون؟" مگر یہ آواز اب برسوں سے نہیں آتی، کیوں کہ یہ آواز "وادیٔ حسین" (قبرستان کا نام، جو کہ سپر ہائی وے پر واقع ہے) کے سناٹوں میں گم ہو چکی ہے۔

گو کہ میرے شوہر مجھ سے تین سال پہلے جدا ہو چکے ہیں، مگر میں انہیں ابھی تک بھولی نہیں ہوں۔ کل جب میرے بہنوئی کا انتقال ہوا تو مجھے لگا کہ میں بہت بڑی ہو گئی ہوں، جس کا مجھے شاید پہلے احساس نہیں تھا۔ پہلے میری بھابھی، پھر بڑی بہن، اس کے بعد میرے شوہر یکے بعد دیگرے ہمیں چھوڑ کر چلے گئے اور اب منظور بھائی (میرے بہنوئی) بھی۔ اس لیے اب میں اپنے مختصر خاندان کی تنہا بزرگ خاتون ہوں۔

کتنی بڑی ذمے داری سونپ گئے ہیں مجھے یہ لوگ؟ میں جو بے انتہا کمزور دل اور بات بات پر خائف ہونے والی شخصیت تھی، آج خود کو مضبوط اور باہمت بنانے کی کوشش کر رہی ہوں، کیوں کہ اب تمام بچے اپنے ہر کام کے لیے میری طرف دیکھیں گے۔ اب انہیں میری رہنمائی اور سرپرستی کی قدم قدم پر ضرورت ہوگی! مجھے مضبوط اور ذمے دار بننا ہوگا۔ میں منظور بھائی کی موت کے بعد سے خود کو یقین دلانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ ہاں میں مضبوط اور بہادر ہوں۔

دراصل میں آپا کے گھر سے اپنے گھر چائے بنانے آئی تھی، کیوں کہ موت کے گھر میں تین دن تک چولہا نہیں جلتا، جب کہ سردی بہت تھی اور تمام گھر دُور سے کے لیے آنے والوں مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ میرے دونوں بھانجوں کے تعلقات بہت وسیع ہیں۔ رضا اور رونی ہر ایک کے کام آنے والے لوگوں میں سے ہیں۔ جب بھی کسی کو کوئی پرابلم ہو، اس کی مدد کے لیے میرا چھوٹا بھانجہ

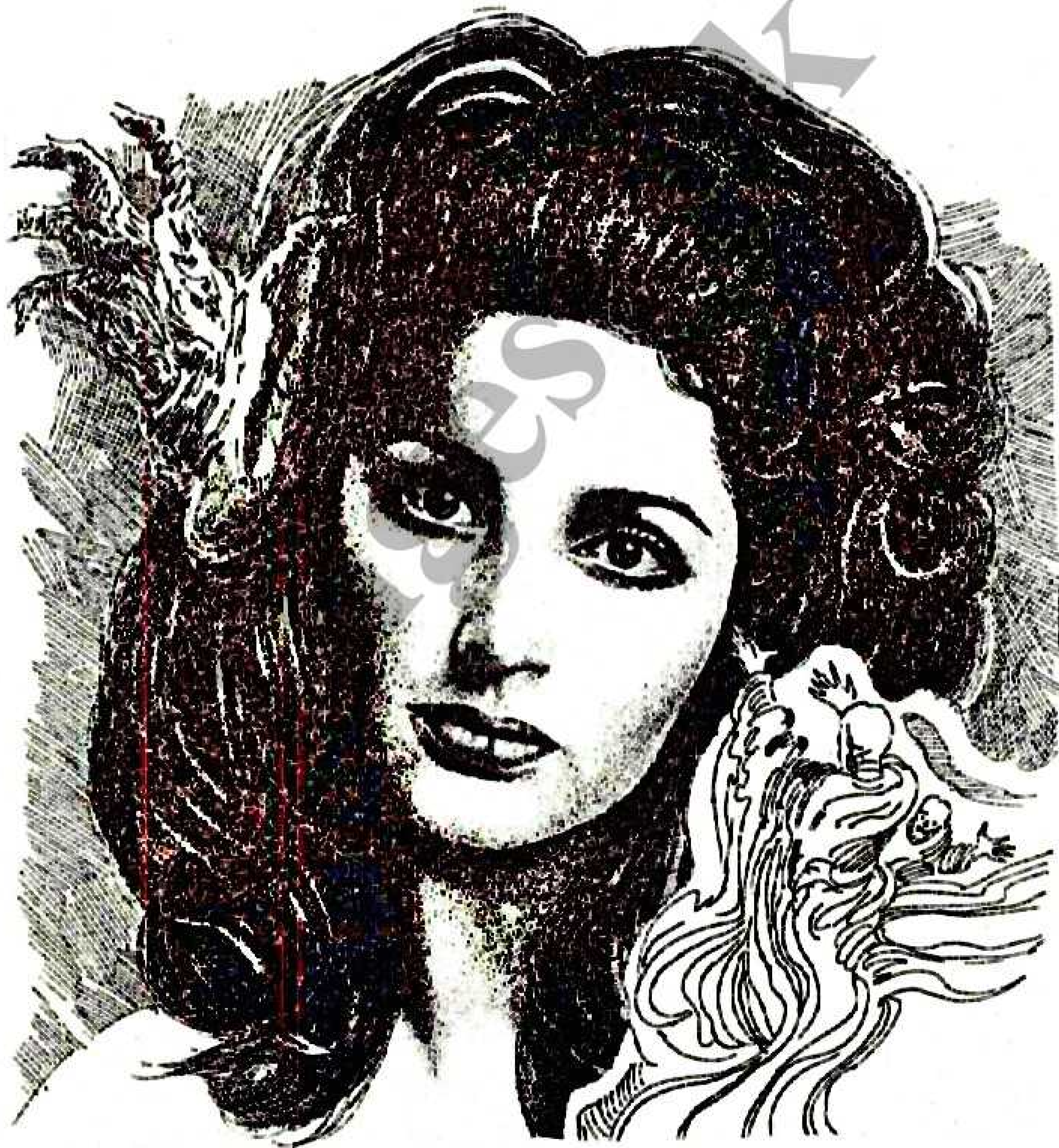
روفی ضرور موجود ہوگا، اس لیے دوسرے دن بھی لوگوں کا تانتا بندھا ہوا تھا، لہٰذا میں نے سوچا کہ میں گھر سے چائے بنالاؤں۔

میں اکیلی ہی چلی آئی تھی، حالاں کہ فرحانہ (روفی کی دلہن) نے ساتھ آنے کو کہا بھی تھا، مگر میں نے منع کردیا۔ ایک تو علی اور عروب کی وجہ سے، دوسرے چالیسویں تک ہمارے گھر کی بہو بیٹیاں کہیں نہیں جاتیں۔

میں نے یاسر (میرا بیٹا) سے چلنے کو کہا تھا، مگر اس نے بھی انکار کردیا، کیوں کہ وہ بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ میں نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا، مگر اس وقت مجھے گھر کے اندھیرے سے قدرے خوف محسوس ہورہا تھا۔

بہرحال میں رکشے میں اکیلی گھر چلی آئی (میں زیادہ تر رکشے میں ہی سفر کرتی ہوں کیوں کہ میری ایک ٹانگ میں تکلیف رہتی ہے)

جب میں گھر کے کونے پر اُتری تو میں نے رکشا کے ڈرائیور (مولانا) سے کہا کہ "جب تک میں چائے بناؤں، آپ چاہیں تو اپنے گھر ہو آئیں۔" (رکشے والے مولانا کا گھر قریب ہی ہے) غرض میں نے دروازہ کھولا تو صحن میں اندھیرا تھا، کیوں کہ لوڈشیڈنگ



کا وقت 7 سے 8 بجے تھا اور اس وقت 7 بج کر 45 منٹ ہوئے تھے۔

موبائل کی روشنی میں، میں نے کمرے کے تالے میں چابی گھمائی تو مجھے اپنے سے کچھ فاصلے پر کسی کے پاؤں نظر آئے۔ کوئی تھا جو کہ مجھ سے تھوڑی سی دوری پر موجود تھا۔

میں بھاگ نہیں سکتی تھی اور گھر میں میری مدد کو بھی کوئی موجود نہیں تھا۔ خوف سے میری ریڑھ کی ہڈی میں ٹھنڈ کی لہر دوڑ گئی، میں نے بے ساختہ کمرے کے دونوں پٹ وا کر دیے، ایمرجنسی لائٹ کی روشنی میں، میں نے جو کچھ دیکھا، وہ میرے لیے ناقابلِ یقین تھا۔

میرے گلے سے خوف اور خوشی کی گھٹی گھٹی آواز نکلی ''آپ؟''

مجھ سے تھوڑے فاصلے پر میرے شوہر کھڑے تھے۔ صحت مند اور مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ۔ مجھے ایسا لگا کہ میں ابھی گر پڑوں گی، میں دروازے کے قریب پڑی ہوئی سیٹی پر بیٹھ گئی، میں نے اپنے حواسوں کو بحال کرنے کی کوشش کی اور مارے خوف کے میں نے اپنی آنکھوں کو بند کر لیا،

شاید میں خواب دیکھ رہی ہوں۔ میں نے خود کو سمجھانے کی کوشش کی، مگر میں نے جب دوبارہ آنکھیں کھولیں تو وہ کچھ فاصلے پر پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھے مجھے مسکراتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

''کیا تم حیران ہو؟'' انہوں نے کہا، لیکن آواز میں ایک سرسراہٹ تھی۔ ''گھبراؤ مت میں تو روز تمہیں دیکھنے آتا ہوں۔''

''روز آتے ہیں؟'' میں نے حیرت سے ان کا جملہ دہرایا۔

''ہاں۔ ہاں روز۔'' انہوں نے یقین دلانے کی کوشش کی۔

''نہیں، آپ نہیں آتے!'' میں نے ضدی لہجے میں کہا۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

''یہ تمہارا خیال ہے۔'' انہوں نے سکون سے کہا۔

''جب میں بیمار تھی؟'' میں نے کہنا چاہا۔

''ہاں، ہاں تم زین العابدین اسپتال میں ایڈمٹ تھیں، مجھے معلوم ہے جاوید اور ثریا تمہارے ساتھ تھے۔''

''آپ کو کیا پتا؟'' میں نے بے یقینی سے کہا۔

''بھئی میں ساتھ تھا...... میں تو جب تک تم ایڈمٹ رہیں، وہیں رہا تمہارے پاس۔ میں تو ہر وقت تمہارے ساتھ رہتا ہوں۔''

"یہ ناممکن ہے۔" میں نے گلوگیر آواز سے کہا۔

"آپ کو کیا پتا کہ میں کس قدر مشکلات سے گزری ہوں، کتنی مشکل میں ہوں؟" میں نے شکایت کی۔

"مجھے سب پتا ہے...... مجھے سب معلوم ہے...... لیکن کبھی مجبوریاں راستے کی رکاوٹ بن جاتی ہیں...... ہر مشکل ایک وقت پر ختم ہو جاتی ہے...... یہ وقتی باتیں ہیں...... مگر ہاں!" انہوں نے اپنے ازلی سکون سے کہا۔

"کسی پر بے جا اعتماد مت کرو...... تمہاری خود انحصاری کی عادت مجھے پسند ہے...... تم اس پر قائم رہو۔ اللہ سب مشکلات دور کردے گا۔" میں نے دیکھا وہ آج بھی ویسے ہی پُراعتماد تھے۔ میں نے انہیں غور سے دیکھا، پھر کہا۔

"جب میں رات کو اکیلے گھر میں ڈرتی ہوں، تو آپ کو ترس نہیں آتا؟"

"آتا ہے...... مگر روحیں مجبور ہوتی ہیں...... وہ اپنی موجودگی کا اظہار نہیں کرسکتیں...... تم سمجھتی کیوں نہیں ہو؟" انہوں نے قدرے دُکھ سے کہا۔

"کیوں؟؟ آخر آج بھی تو آپ موجود ہیں۔ میں آپ سے باتیں بھی کررہی ہوں اور دیکھ بھی رہی ہوں؟"

"شاید میں تمہیں سمجھا سکوں!" انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"روحوں کو ایک خاص فاصلے سے دیکھا اور مخصوص فریکوئنسی سے سنا جاسکتا ہے...... اور شاید آج میں تم سے اسی فاصلے اور فریکوئنسی پر ہوں، جس کی وجہ سے تم مجھے دیکھ اور سُن سکتی ہو...... ورنہ میں تو روز آتا ہوں اور تمہاری پل پل کی خبر رکھتا ہوں...... تم اور یاسر جب میرا ذکر کررہے ہوتے ہو تو میں پاس بیٹھا ہوتا ہوں۔ یاسر اب بڑی سمجھداری کی باتیں کرتا ہے...... میں یہ دیکھ کر خوش ہوتا ہوں تم ہر چیز کا خیال رکھتی ہو...... میں تمہارے صبر و ہمت کی داد دیتا ہوں، مگر......؟" وہ قدرے مسکرائے۔

"جب تم میرا تذکرہ کرکے زار زار روتی ہو تو مجھے بڑا دُکھ ہوتا ہے کہ میں تمہیں تسلی بھی نہیں دے سکتا...... کم از کم اب تو مت روؤ۔"

میں نے اپنے گالوں پر ہاتھ پھیرا تو وہ آنسوؤں سے تر تھے۔

میں نے دوپٹے سے اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں، مگر آنسو تھے کہ رُکنے سے انکار کردیا تھا۔

میں رونا چاہتی تھی، بے حد...... بے حساب۔

"شہزاد!" میں نے کہا "اب آپ روز نظر آئیں گے اسی طرح؟"

"پتا نہیں! یہ فاصلے اور فریکوئنسی کی بات ہے" "مگر اس کا یقین رکھو، میں ہر وقت ہر دم تمہارے پاس موجود ہوتا ہوں۔" انہوں نے مجھے تسلی دی۔

ایک دم دروازے پر دستک ہوئی، شاید رکشے والا مجھے لینے آیا تھا۔

میں اپنی جگہ سے کھڑی ہوکر ایک قدم آگے بڑھی۔ میں نے صوفے کی طرف دیکھا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔

میں نے پکارا...... "شہزاد! شہزاد!" مگر کوئی آواز نہیں آئی۔

میرے ایک قدم نے فاصلے اور فریکوئنسی کو مٹا دیا تھا اور میں پھر مایوسی کے اندھیرے میں تھی۔

دروازے پر مولانا صاحب تھے۔

"باجی!" مولانا نے کہا "کیا چائے بن گئی۔"

"نہیں مولانا صرف بیس منٹ لگیں گے۔" میں نے جلدی سے جواب دیا، مبادہ مولانا یہ نہ پوچھ لیں کہ "باجی چائے بنانے میں اتنی دیر؟"

جب میں آپا کے ہاں چائے لے کر گئی تو عجیب کیفیت سے دوچار تھی، مگر میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔

جب میں دوسرے دن گھر آئی تو مجھے دوبارہ حیرت ہوئی، کیوں کہ میرے شوہر نے جو لباس پہن رکھا تھا، وہ بستر پر اترا پڑا تھا اور الماری کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

اس عجیب و غریب واقعے پر میں آج بھی حیران ہوں۔

میں آج بھی دروازہ کھولتے وقت احتیاط سے مُڑ کر دیکھتی ہوں کہ شاید میں آج بھی ان کو دیکھ سکوں؟ لیکن میں انہیں دوبارہ نہیں دیکھ سکی۔

پتا نہیں؟ یہ حقیقت تھی؟ یا صرف میرا تصور؟؟ میں آج تک نہیں جان سکی۔

☆......☆

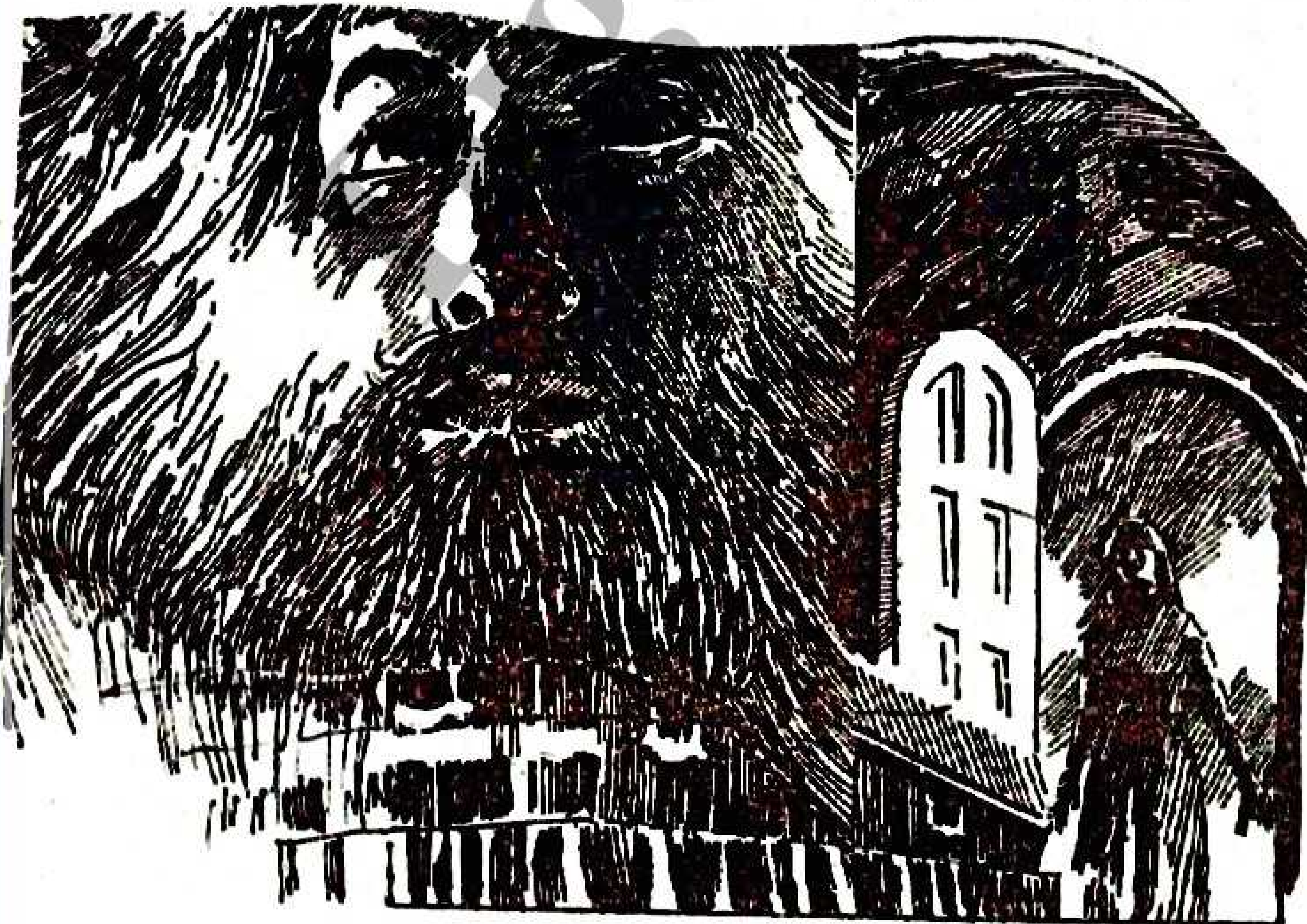


آسیب

حمیرا خان

سکون کی تلاش میں بھٹکتی ماں بیٹے کی روح کی داستان عجب

جیسے ہی رات کی سیاہی نے آسمان پر اپنا قبضہ جمایا اس کے گھر میں پھیلے سناٹے بھی کچھ اور بڑھ گئے۔ اس نے کمرے میں بیٹھے بیٹھے کھڑکی سے باہر کا جائزہ لیا۔ نجمہ ہمیشہ کی طرح گھر کی لائٹس آن کیے بنا جا چکی تھی۔ اسی لیے اندھیرے کی چادر نے گھر کے سناٹے کے ساتھ مل کر عجیب پر اسرار سا ماحول بنا دیا تھا۔ یکدم ہی اسے دہشت نے آگھیرا۔ اس نے باہر آکر جلدی جلدی سارے گھر کی روشنیاں جلا دیں۔ شادی کا ہنگامہ ختم ہوتے ہی سب اپنے



گھروں کو لوٹ گئے اور وہ جو شور شرابے سے تھک گئی تھی، اب گھر کی خاموشی اسے کاٹ کھانے کو آرہی تھی۔ ظاہر ہے سب کو جانا ہی تھا۔ اس کی سسرال میں ایک طرح سے کوئی تھا بھی نہیں۔ عارف کے ماں باپ کچھ سال پہلے وفات پا گئے تھے اور وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھا۔ بارات میں اس کے ماں باپ کے بہن بھائی اور ان کے بچے ہی شائلہ کے سب سے قریبی سسرالی تھے جو کہ ولیمے کے بعد اپنی مصروفیات کے باعث اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے اور اب اس گھر میں شائلہ تھی یا اس کا شوہر عارف۔ اس کی شادی ہوئے تیسرا ہفتہ شروع ہو چکا تھا اور اب تک کے عرصے میں عارف ایک خیال رکھنے والا اور محبت کرنے والا شوہر ثابت ہوا تھا جس پر وہ کافی مطمئن تھی۔ عام طور پر عارف مغرب سے پہلے گھر آجایا کرتا تھا لیکن آج کسی میٹنگ کی وجہ سے لیٹ ہو گیا تھا۔

"یار میرا آج کا دن بہت برا ہے۔"

"کیوں کیا ہوا، سب خیریت تو ہے نا؟" فون پر عارف کی بات سن کر وہ سچ میں گھبرا گئی تھی کہ جانے کیا ہو گیا۔

"ہونا کیا تھا ابھی آفس سے نکلنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ ایک ایمرجنسی میٹنگ بلا لی گئی اور ظالم سماج نے مجھے میری پیاری بیوی سے کچھ اور دیر کے لیے دور رکھنے کا انتظام کر لیا" عارف نے منہ بسورتے ہوئے انوکھے انداز میں اپنے نہ آنے کا بتایا تو اس کے اس انداز پر شائلہ کو ہنسی آگئی۔

"ہنس لو ہنس لو میری بے بسی پر، آکر خبر لیتا ہوں تمہاری بھی" اس کے لہجہ معنی خیز ہوا تو شائلہ کے گالوں پر گلاب رنگ بکھیر گیا۔

"اچھا سنو۔"

"جی کہیے......" شائلہ کی شرم آمیز خاموشی کو محسوس کر کے عارف اسی لہجے میں بولا تو وہ بامشکل یہی کہہ پائی۔

"یار تنہائی سے دل گھبرائے تو میری تصویر سے باتیں کر لینا تنہائی محسوس نہیں ہوگی آزمودہ نسخہ ہے۔ شادی سے پہلے تمہاری تصویر سے باتیں کر کے آزما چکا ہوں۔"

"اچھا آپ میٹنگ کے لیے لیٹ ہو رہے ہیں اللہ حافظ" اس سے پہلے کہ وہ اسی رو میں بہہ کر کچھ اور کہتا شائلہ نے اللہ حافظ کا اسٹاپ لگا کر اسے روک دیا۔ عارف کے شرارتی لہجے کو یاد کرتے ہوئے اس کا موڈ کافی حد تک اچھا ہو گیا۔ وہ صحن میں لگے جھولے پر آبیٹھی اور دھیرے دھیرے جھولا لیتے ہوئے بلا ارادہ ہلکے سروں میں گنگنانے لگی۔ اس کی آواز بہت اچھی تھی، گلوکاری کی کوئی تربیت نہ لینے کے باوجود وہ اچھا خاصا گا لیا کرتی تھی۔ اسی لیے اسکول اور کالج میں اکثر اس سے گانا سنانے کی فرمائشیں بھی ہوتی رہتی تھیں۔ یہی سب سوچتے وہ ماضی کی خوبصورت یادوں کو دہرانے لگی۔

☆......☆

کسی آواز نے اسے چونکا دیا تبھی اسے احساس ہوا کہ جھولے کی بیک کو ٹیک لگا کر شاید وہ غنودگی میں چلی گئی تھی۔ ابھی وہ یہی یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس نے کیا سنا تھا تبھی گھر کے اندرونی کمرے سے وہ آواز ایک بار پھر بلند ہوئی، بلاشبہ عارف اسے پکار رہا تھا۔

"لو جی کمرے میں پہنچ کر مجھے آواز دے رہے ہیں یہاں سے گزرتے ہوئے کیوں نہ جگا لیا اور میں بھی سوچوں میں کیسی گم ہوئی کہ گاڑی کی آواز پر بھی نہیں جاگی" اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے سوچا اور مسکراتے ہوئے دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہو گئی۔ کمرہ خالی تھا بالکل ویسے جیسا وہ چھوڑ گئی تھی۔ اس کی نظریں خود بخود اٹیچ باتھ روم کے دروازے کی طرف گئیں مگر وہاں بھی کسی کی موجودگی کا احساس نہ پا کر وہ آگے بڑھی اور باتھ روم کا ادھ کھلا دروازہ پورا کھول کر اندر جھانکا، اسی لمحے پورا گھر ڈور بیل کی آواز سے گونج اٹھا۔ وہ ذہن میں الجھن لیے باہر آگئی۔

"کون ہے؟" گیٹ کھولنے سے پہلے اس نے پوچھا۔ "میں ہوں یار دروازہ کھولو" عارف کی آواز سن کر اس نے گیٹ کھول دیا۔ "آپ اب آئے ہیں۔"

"ارے ابھی تمہارے سامنے تو گیٹ سے اندر آیا ہوں۔"

"جی مگر کچھ دیر پہلے آپ نے بیڈ روم سے مجھے آواز دی تھی۔ میں یہاں جھولے پر بیٹھی آپ کا انتظار کر رہی تھی اور......"

"لو جی آج ثابت ہو گیا کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ میرے دل نے تمہیں پکارا اور تمہارے دل نے میری آواز سن لی" ایک ہاتھ میں بریف کیس تھامے ہوئے اس نے دوسرے ہاتھ سے گھبرائی ہوئی شائلہ کا ہاتھ تھام کر اپنے قریب کر کے ہلکے پھلکے لہجے میں کہتے ہوئے اسے پرسکون کرنے کی کوشش کی۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں عارف وہ میرا وہم نہیں تھا۔ میں نے واضح طور پر آپ کی آواز سنی تھی۔ آپ نے مجھے پکارا تھا" شائلہ ابھی تک اسی الجھن میں گرفتار تھی۔

"یار ہو جاتا ہے کبھی کبھی ایسا تم میرا انتظار کر رہی تھیں اس لیے تمہیں ایسا محسوس ہوا ہوگا تم آن ریلیکس پلیز" اندر کی طرف بڑھتے ہوئے عارف نے ایک بار پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی اور اس کی اس دلیل پر شائلہ کافی حد تک مطمئن ہو بھی گئی۔

"آپ کی گاڑی کی آواز بھی نہیں آئی۔"

"یار میری گاڑی کچھ پرابلم کر رہی تھی تو مجھے اشفاق نے ڈراپ کیا ہے۔ آج میں نے اسے کہا کہ سامنے روڈ تک چھوڑ دے بس اسی لیے تمہیں گاڑی کی آواز بھی نہیں آئی، اچھا اب ذرا جلدی سے کھانا لگا دو بہت بھوک لگی ہے۔" اسے تسلی دیتے ہوئے وہ موضوع بدل گیا تو شائلہ کا دھیان بھی اس آواز سے ہٹ گیا اور وہ عارف کو فریش ہونے کا کہہ کر کچن کی طرف چلی آئی، کیونکہ بھوک تو اسے بھی بہت لگ رہی تھی۔

☆......☆

رات کا جانے کونسا پہر تھا جب شائلہ کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے اپنے دائیں طرف سوتے عارف پر نظر ڈالی، وہ گہری نیند میں تھا۔ کمرے میں اس کی سانسوں کی سرسراہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔ کوئی چھوٹا بچہ بلک بلک کر رو رہا تھا۔

"جانے کس کا بچہ ہے اور اس وقت اس قدر کیوں رو رہا ہے، لگتا ہے یا تو اسے بہت بھوک لگی ہے یا پھر وہ کسی تکلیف میں مبتلا ہے" اس نے کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کی لیکن اس کا دل بچے کے اس طرح رونے پر بے چین ہونے لگا، اسے یاد آیا کہ اس نے اس بچے کے رونے کی آواز کچھ دن پہلے بھی سنی تھی لیکن زیادہ دھیان نہیں دیا تھا، کیونکہ گھر میں بہت سے لوگ موجود تھے، جن میں چھوٹے بچے بھی تھے، لیکن اب اس کے گھر میں کوئی بچہ موجود نہیں تھا۔ وہ ابھی یہاں کے رہنے والوں سے واقف نہیں ہوئی تھی لیکن اتنا ضرور جانتی تھی کہ ان کے گھر کے دائیں طرف خالی پلاٹ تھا جس پر چار دیواری کر کے محفوظ کر لیا گیا تھا، وہاں کسی بچے کے ہونے کا سوال ہی نہیں تھا، جبکہ بائیں طرف والے گھر میں صرف دو انکل آنٹی رہتے تھے۔ ان کے بیٹے پڑھنے کے لیے باہر کے ملکوں میں گئے اور پھر شادی کر کے وہیں سیٹل ہو گئے لیکن انہوں نے باہر جا کر رہنے سے انکار کر دیا اب وہ دونوں اکیلے ہی اس گھر میں رہتے تھے کام والی صبح کے وقت آ کر کام کر جایا کرتی تھی اور ضرورت پڑتی تو کھانا بھی بنا جاتی تھی۔ یہ ساری باتیں شائلہ کو آنٹی نے خود بتائی تھیں، جب مہمانوں کے جانے کے بعد ایک دن وہ شائلہ اور عارف کو اپنے گھر چائے کی دعوت دینے آئی تھیں، سامنے کی طرف کی جگہ بھی فی الحال خالی تھی وہاں ابھی کوئی گھر تعمیر نہیں ہوئے تھے۔ اچانک شائلہ کو احساس ہوا کہ جیسے بچے کے رونے کی آواز قریب ہوتی جا رہی ہو، اس کے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی، وہ بالکل بے اختیاری کے عالم اپنے کمرے سے نکلی اور اس کے قدم اس سمت میں بڑھنے لگے جدھر سے بچے کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ لاؤنج میں پہنچ کر اس کے قدموں کو بریک لگ گئے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سامنے کا منظر دیکھنے لگی۔ ایک چھوٹا سا بچہ قالین پر لیٹا ہوا تھا تبھی کچن میں کچھ ہلچل محسوس ہوئی لیکن شائلہ کی بالکل ہمت نہیں ہوئی کہ وہ کچن میں جا کر دیکھ سکے کہ وہاں کون ہے، تبھی کچن کے دروازے سے ایک عورت برآمد ہوئی اس نے اپنے آپ کو بڑی سی سفید چادر میں چھپا رکھا تھا جس پر گلاب کے پھول بہت خوبصورتی اور صفائی سے کاڑھے گئے تھے۔ چادر کا جو پلو سر پر تھا وہ کچھ اس انداز میں آگے کو جھکا تھا کہ پیشانی اور چہرے کا کافی حصہ چادر میں چھپ گیا تھا۔ عورت کے ہاتھ میں دودھ کا فیڈر تھا۔ وہ شائلہ کی طرف دیکھے بغیر بچے کی طرف گئی اور اسے گود میں لیتے ہوئے فیڈر اس کے منہ سے لگا دیا، فیڈر منہ سے لگتے ہی بچہ یکدم خاموش ہو گیا اور شائلہ بھی جیسے کسی ٹرانس سے باہر آ گئی۔ اسی لمحے اس عورت نے نظریں اٹھا کر شائلہ کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں، دوسرے ہی لمحے عورت اور بچہ وہاں سے ایسے غائب ہو گئے جیسے کبھی ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ شائلہ ہلکی سی چیخ مار کر بے ہوش ہو کر وہیں گر پڑی۔

☆......☆

اس کی دوبارہ آنکھ کھلی تو وہ اپنے کمرے میں بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ عارف اس کا ہاتھ تھامے بیڈ کے ساتھ رکھی کرسی پر بیٹھا فکرمندی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"تم کیسا محسوس کر رہی ہو اب؟" اسے آنکھیں کھولتا

دیکھ کر عارف اس کے پاس آ بیٹھا۔
''کیسی ہو تم؟ لاؤنج میں کیا کرنے گئی تھیں اس وقت'' عارف کے پوچھنے پر شائلہ کو ساری بات پھر سے یاد آ گئی۔ کس طرح وہ جاگی اور کسی غیر مرئی قوت کے زیر اثر لاؤنج میں پہنچی اور وہاں اس بچے اور عورت کو دیکھا اور پھر جیسے ہی ان کا یکدم غائب ہونا یاد آیا تو وہ نئے سرے سے خوفزدہ ہو گئی۔ عارف کے ہاتھوں کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے وہ اس کے گلے لگ کر رونے لگی اور دھیرے دھیرے اسے ساری بات بتادی۔
''میرا خیال ہے تمہیں کوئی وہم ہوا ہے یا تم نے کوئی خواب دیکھا ہوگا یہ سب کچھ فلموں کہانیوں میں ہوتا ہے یار حقیقت میں یہ سب نہیں ہوتا۔''
''وہ خواب یا میرا وہم نہیں تھا عارف اس دن بھی میں نے بیڈروم میں آپ کی آواز سنی تھی اور اب یہ عورت اور بچہ...... مجھے اس گھر سے خوف آنے لگا ہے ضرور یہاں کوئی بھوت پریت کا چکر ہے پلیز مجھے کہیں اور لے چلیں'' وہ اسی طرح روتے ہوئے بولتی گئی۔ عارف خاموشی سے اس کی ساری بات سنتا رہا۔ اس کے چہرے کے تاثرات ہر لحہ بدل رہے تھے۔ کبھی وہ پریشان دکھائی دینے لگتا تو کبھی اس کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگتا کبھی ندامت اور بے بسی دکھائی دینے لگتی لیکن شائلہ کا دھیان اس کی طرف تھا ہی نہیں کہ وہ یہ سب دیکھ پاتی۔ وہ ابھی تک عارف کی بانہوں میں گھٹی سسکیاں بھر رہی تھی۔

☆......☆

وہ واقعہ تو جیسے آغاز تھا۔ اس کے بعد دن بھر وہ عورت اور بچہ بار بار شائلہ کو دکھائی دیتے، کبھی عورت بچے کو لوری سنا کر سلاتی ہوتی تو کبھی کچن میں اس کے دودھ کی بوتل بناتی نظر آتی، اگرچہ وہ شائلہ کو کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کرتے تھے لیکن پھر بھی شائلہ ان سے خوف محسوس کرتی تھی عارف اس کی ان باتوں کو وہم کہہ کر ٹال جاتا، شائلہ دھیرے دھیرے خود کو نفسیاتی مریضہ محسوس کرنے لگی تھی۔ کوئی ایسا تھا بھی نہیں جس کے ساتھ اپنا مسئلہ شیئر کرتی اس کا ایک ہی بھائی تھا جو کئی سال پہلے سعودی عرب شفٹ ہو گیا تھا اور شائلہ کی شادی کے بعد گھر میں ماں باپ اکیلے رہ گئے تو وہ ان کو بھی اپنے ساتھ ہی لے گیا۔ فون پر ماں سے بات کرتے ہوئے اسے کئی بار خیال آتا کہ ان سے اپنی پریشانی کہے لیکن پھر یہ سوچ کر کہ اتنی دور بیٹھی ماں کو پریشان کرنے سے کیا حاصل۔

☆......☆

''کیا بات ہے آج کل بہت تھکی تھکی رہنے لگی ہو طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری؟''
''طبیعت تو ٹھیک ہے لیکن دماغ خراب ہو گیا ہے میرا اس گھر میں رہ رہ کر، آپ کو میری کوئی پرواہ نہیں۔ میں سارا وقت کتنی ٹینشن اور خوف میں مبتلا رہتی ہوں'' اس روز عارف کے پوچھنے پر وہ پھٹ پڑی۔
''کیا چاہتی ہو تم کیا کروں میں؟''
''کم از کم یہ گھر تبدیل کر لیں مجھے کہیں اور لے چلیں پلیز'' وہ منتیں کرنے پر اتر آئی۔
''گھر بدلنے سے کچھ نہیں ہوگا شائلہ'' عارف کے لہجے میں محسوس کی جانے والی بے بسی تھی۔
''آپ ایسا کیسے کہہ سکتے ہیں۔ میرے کہنے سے ایک بار گھر تبدیل کر کے تو دیکھیں۔''
''ٹھیک ہے میں تمہاری تسلی کے لیے یہ بھی کر لیتا ہوں، حالانکہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔''
''تو کب تک چلے جائیں گے ہم یہاں سے؟'' شائلہ نے عارف کی آخری بات کو اگنور کرتے ہوئے پوچھا۔
''انشاء اللہ بہت جلد'' شائلہ کے چہرے پر پھیلی خوشی اور جوش کے تاثرات پیدا ہوتے دیکھ کر عارف نے بھی خوشگوار لہجے میں جواب دیا۔
''تھینک یو''
''یو آر ویلکم مائی ہوم منسٹر صاحبہ، چلو اب فٹافٹ کھانا لگا دو، میں نے آج لنچ بھی نہیں کیا ہوا۔''
''میں بس پانچ منٹ میں کھانا لگا دیتی ہوں آپ فریش ہو کر آ جائیں'' آج بہت دن بعد شائلہ نے نارمل انداز میں بات کی تھی اسے اس طرح دیکھ کر عارف نے بھی سکون کا سانس لیا لیکن اس کا ذہن آنے والے کل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

☆......☆

''یہ بیٹھے بٹھائے تمہیں گھر بدلنے کی کیا سوجھی۔ اچھا خاصا خوبصورت گھر تھا تمہارا اور کتنا پرسکون علاقہ،

ایسا گھر آسانی سے کہاں ملتا ہے" شمائلہ کی ماں فون پر اسے ڈانٹ رہی تھیں جبکہ گھر بدلنے پر وہ خود کو بہت پرسکون محسوس کر رہی تھی۔

"یہ گھر بھی بہت اچھا ہے امی اور سب سے اچھی بات کہ عارف کے آفس کے بہت قریب ہے۔ اب انہیں صبح شام زیادہ سفر بھی نہیں کرنا پڑتا، رات کو کئی بار دفتر سے لیٹ ہو جاتے ہیں تو پریشانی ہوتی ہے آپ کو تو پتا ہے آج کل کے حالات"

"ہاں یہ بات تو تمہاری بالکل ٹھیک ہے مجھے بھی تم لوگوں کی بہت فکر رہتی ہے۔ کتنی بار کہا ہے عارف میاں سے کہ تمہیں لے کر ہمارے پاس ہی آ جائے اچھا پڑھا لکھا لڑکا ہے نوکری مل جائے گی اس کو یہاں اور تم لوگ ہمارے پاس بھی رہو گے مگر وہ ہے کہ بس دیکھیں گے امی جی کہہ کر بات ٹال جاتا ہے تم بات کرو نا اس سے، تم کہو گی تو شاید تیار ہو جائے" شمائلہ نے ایک ماں کی نفسیات کو ذہن میں رکھتے ہوئے بات کی تو وہ فوراً اس کے فیصلے پر رضامند ہو گئی، کچھ دیر اسی طرح کی باتیں کرنے کے بعد انہوں نے اللہ حافظ کہہ کر فون رکھ دیا تو شمائلہ کی توجہ پھر سے گھر کی طرف ہو گئی۔
اس نے چھوٹا موٹا سامان مختلف جگہوں پر رکھنے کے ساتھ ساتھ سالن بھی پکنے رکھ دیا تھا۔ آج ان کا اس گھر میں دوسرا دن تھا۔ پہلا دن باخیریت گزر گیا تھا، اسی لیے شمائلہ یہ سوچ کر ہلکی پھلکی ہو گئی تھی کہ گھر بدلنے کے ساتھ ہی ان کی مصیبت اور پریشانی کے دن بھی ختم ہو گئے تھے۔

☆......☆

"شمائلہ...... شمائلہ......" دفتر سے واپسی پر گھر میں داخل ہوتے ہی عارف نے شمائلہ کو پکارنا شروع کر دیا۔ اس کے ہاتھوں میں ڈھیر سارے شاپر تھے۔ دراصل اگلے دن شمائلہ کی سالگرہ تھی جو کہ اسے خود کو بالکل بھی یاد نہیں تھی لیکن عارف کو یاد تھی، اسی لیے وہ شمائلہ کے لیے کچھ گفٹس لے کر آیا تھا۔

"کہاں ہو یار---" بیڈروم میں بھی شمائلہ کو نہ پا کر وہ سامان وہیں چھوڑ کر دوسرے کمروں میں شمائلہ کو تلاش کرنے لگا لیکن سارا گھر خالی تھا۔ کسی ان ہونی کے خیال سے اس کا دل بری طرح گھبرانے لگا۔ سارے کمرے دیکھ کر وہ کچن کی طرف بڑھا۔ کچن کا دروازہ کھلا پڑا تھا اور فرج کے قریب شمائلہ بے ہوشی کی حالت میں پڑی تھی، اس کے ارد گرد پانی تھا جس نے اسے بری طرح بھگو دیا تھا، قریب ہی ٹوٹے گلاس کی کرچیاں اور پانی کی خالی بوتل پڑی تھی شاید اس نے فرج سے پانی لے کر پینا چاہا تھا لیکن پھر وہ بے ہوش ہو گئی۔ گلاس اور بوتل اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گئی۔ ٹوٹے ہوئے گلاس کے کچھ ٹکڑے شمائلہ کے بازو کو گھائل کر گئے تھے شاید جب وہ گری تو اس کا بازو کانچ پر جا گرا تھا۔ شمائلہ کو اس حالت میں دیکھ کر عارف کے ہوش حواس اس کا ساتھ چھوڑنے لگے۔ اس نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا اور شمائلہ کو بازوؤں میں لیتے ہوئے باہر کی طرف دوڑ لگا دی جہاں اس کی گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ وہ جلد از جلد اسپتال پہنچ جانا چاہتا تھا۔

☆......☆

تھوڑی دیر بعد وہ ہوش کی دنیا میں لوٹ آئی تھی لیکن یہ تھوڑا سا وقت عارف پر قیامت بن کر گزر رہا تھا، اسے زیادہ چوٹ نہیں آئی تھی بس بازو پر کانچ لگا تھا اور گرنے سے دایاں پاؤں مڑ گیا اور اس میں تھوڑی موچ آئی تھی۔ ڈاکٹر نے بے ہوشی کی وجہ ذہنی اسٹریس بتائی تھی اور کچھ ریورٹس کرانے کے بعد انہیں ماں باپ بننے کی خوشی بھی سنائی تھی لیکن اتنی بڑی خبر سن کر بھی شمائلہ کے چہرے پر خوشی کے کوئی تاثرات نہیں ابھرے تھے اور اس کے ہونٹوں پر جامد خاموشی تھی۔ ڈاکٹر نے کچھ گھنٹے بعد انہیں گھر جانے کی اجازت دے دی تھی، لیکن اپنی تسلی اور شمائلہ کو گھر سے دور رکھنے کے خیال سے عارف نے رات اسپتال میں ہی گزارنے کا فیصلہ کیا تھا۔

☆......☆

"کیسی ہو؟" تنہائی ملتے ہی عارف نے اس سے پوچھا تو وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ اسے دیکھنے لگی "ایسے کیوں دیکھ رہی ہو" اس کی آنکھوں میں اجنبیت محسوس کر کے عارف کے دل کو کچھ ہوا۔

"یہ نہیں پوچھیں گے کہ کیا ہوا تھا؟"

"کیا...... کیا ہوا تھا" شمائلہ کے لہجے کی کاٹ نے اسے جیسے بے دم سا کر دیا۔ اس کے دل نے اسے بتا دیا کہ ایک اور امتحان اس کا منتظر ہے۔

"آپ خوش ہیں ہمارے بچے کا سن کر؟" وہ موضوع بدل گئی تو عارف نے دل میں شکر ادا کیا۔

"ہاں بہت خوش ہوں۔ یہ کیسا سوال ہے میں خوش کیوں نہیں ہوں گا بھلا، کیا تم خوش نہیں ہو؟؟"

"کیا مجھے خوش ہونا چاہیے؟"

"ہاں! کیوں نہیں...... کیا تمہیں بچے پسند نہیں؟" شائلہ کے عجیب سے لہجے میں پوچھنے پر جواب میں وہ بھی سوال کر بیٹھا۔

"کیا میں اس لیے بچہ پیدا کروں کہ ایک دن اس کا باپ اسے اور اس کی ماں کو قتل کر دے؟" شائلہ کے سرد لہجے میں پوچھنے پر عارف کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔

"آج تمہیں مارکیٹ جانا تھا، کون ملا تھا تمہیں وہاں؟"

"اس مظلوم کی ماں جس کی بیٹی اور نواسے کو قتل کر کے قاتل آزاد گھوم رہا ہے، تاکہ پھر کسی کا خون کر سکے۔"

"شٹ اپ...... جسٹ شٹ اپ پلیز" عارف کا لہجہ ضبط کی شدت سے سرخ پڑ گیا۔

"ہاں میں مانتا ہوں میں قاتل ہوں۔ میں نے عدالت میں بھی اپنے جرم کا اعتراف کیا تھا، مگر جج نے مجھے کوئی سزا نہیں سنائی بلکہ ہمیشہ کے لیے اس عذاب جیسی زندگی کے حوالے کر دیا، میں نے اپنی بیوی اور بیٹے کا قتل کیا ہے لیکن اس طرح نہیں، جس طرح تمہیں بتایا گیا ہے بلکہ...." عارف بولنے پر آیا تو بولتا چلا گیا۔ شائلہ خاموشی سے اسے سن رہی تھی۔

☆......☆

وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا لاڈلا بیٹا تھا۔ ماں باپ کے لاڈ پیار نے اسے بگاڑا نہیں تھا لیکن بہت حد تک لاپروا ضرور بنا دیا تھا۔ بے فکری کی زندگی، کم عمری، اس کی طبیعتکی شوخی اور دوستوں کا ساتھ، اس کے لیے دنیا ایک پکنک اسپاٹ تھی، جہاں اسے بس خوشیاں ہی خوشیاں ملنا تھیں اور جہاں اسے صرف ہر دن، ہر لمحے سے لطف اندوز ہی ہونا تھا، پڑھائی میں بھی بس گزارا تھا لیکن بہرحال پاس ہو جایا کرتا تھا۔ اپنا اتنا ماں باپ کے لیے بھی خوشی کافی تھی۔ بیٹا جوان ہوا تو ہر ماں باپ کی طرح اس کے ماں باپ کے دل میں بھی ارمان جاگنے لگے اور جب اس نے جیسے تیسے بی اے کا امتحان پاس کیا، اسی دن سے اس کے لیے لڑکیاں دیکھی جانے لگیں۔ اکلوتا لاڈلا بیٹا پھر شکل وصورت میں بھی لاکھوں میں ایک، کوئی لڑکی نظر کو جچتی نہ تھی آخر خدا خدا کر کے ایک لڑکی پسند کر لی گئی اور چٹ منگنی اور پٹ بیاہ والے محاورے پر عمل کرتے ہوئے اس کی شادی کر دی گئی۔ اس کی زندگی پہلے کی طرح بسر ہونے لگی، بس اتنا ہوا کہ دوستوں کے ساتھ بیوی بھی اس کی زندگی کا حصہ بن گئی، سال بھر میں خدا نے بیٹے جیسی نعمت سے بھی نواز دیا، لیکن اس کی لاپروائیاں اسی طرح تھیں۔ شادی اور بچے کے بعد بھی جب وہ اپنی ذمے داریوں سے پہلو تہی کرتا رہا تو ماں باپ کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا لیکن اب بہت وقت گزر چکا تھا۔ باپ کاروبار میں ہاتھ بٹانے کی بات کرتا، ماں نصیحت کرتی بیوی بچے کے مستقبل کا احساس دلا کر کام کی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتی، لیکن وہ سنی ان سنی کر جاتا۔ ابھی بچہ چھوٹا ہی تھا کہ عارف کے ماں باپ آگے پیچھے دوسرے جہان سدھار گئے۔ عارف پر تو صحیح معنوں میں مصیبتوں اور پریشانیوں کا پہاڑ آ گرا، ماں باپ کی موت کا غم اپنی جگہ لیکن ذمے داریوں کے احساس نے اسے دن میں تارے دکھا دیے۔ کاروبار کی سمجھ بوجھ اسے نہ تھی، کچھ ہی دنوں میں ملازم نقصان پر نقصان کرنے لگے اور اس کی مالی حالت خراب سے خراب تر ہوتی گئی۔ فراغت، سیر سپاٹے دوستوں کے ساتھ انجوائے کرنا اس کے لیے جیسے خواب بن کر رہ گیا اچانک اتنی بڑی تبدیلی اور پریشانیوں نے اسے چڑچڑا بنا دیا اکثر وجہ بے وجہ بیوی سے جھگڑ پڑتا اور پھر احساس ہونے پر خود ہی معافی مانگ لیتا۔ جب کاروبار کرنے کے قابل پیسے نہ رہے تو گھر آ بیٹھا، گھر بیٹھا انسان کب تک بیٹھے بیٹھے کھا سکتا ہے، تعلیم کے نام پر بی اے کی ڈگری تھی جو اسے مناسب نوکری دلانے میں مددگار ثابت نہ ہو سکی، وہ گھر سے دور رہنے لگا۔ بیوی اور بیٹے سے اکتانے لگا۔ سارا دن آوارہ گردی کرنے کے بعد شام کو گھر آتا تو بیوی کے پاس بتانے کو ساری پریشان کن خبریں ہی ہوتیں وہ اور چڑ جاتا، وہ بیچاری بھی آخر کیا کرتی خود تو بھوک بھی برداشت کر لیتی لیکن بچے کی بیماری یا بھوک اس سے دیکھی نہ جاتی، عارف کو کوئی چھوٹی موٹی نوکری ڈھونڈنے کا مشورہ دیتی تو وہ غصے سے اکھڑ جاتا۔ زندگی کے اتنے سال عیش اور لاڈ پیار میں گزار کر دوسروں کی جھڑکیاں اور باتیں سننا اس کے بس کی بات نہ تھی اور

ایک دن اس کی صابر بیوی کی برداشت جواب دے گئی تو اس نے چوہے مار دوا بچے کو بھی دودھ میں گھول کر پلا دی اور خود بھی پی لی۔ دن بھر کی آوارہ گردی کے بعد رات گئے جب عارف گھر پہنچا تو بیوی اور بچے کو مردہ پا کر اس کا ضمیر اسے کچوکے لگانے لگا۔ موت کے کچھ دن بعد اس کی بیوی اور بچہ گھر میں دکھائی دینے لگے تو اس نے گھر بیچ کر دوسرا گھر کرائے پر لے لیا لیکن وہاں بھی یہی صورت حال رہی، کئی گھر بدلنے کے بعد آخر اس نے گھر بدلنا چھوڑ دیا۔ اس عرصے میں بالکل بدل گیا، لاپروائی چھوڑ کر ایک ذمے دار انسان بن گیا جو جاب کی کرلی ساتھ میں پڑھائی بھی شروع کر دی اور آخر ایک اچھی نوکری حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو چچا نے سمجھا بجھا کر اسے شادی کے لیے راضی کر لیا۔ ان کا خیال تھا کہ ضمیر کا بوجھ اور تنہائی مل کر عارف کو نفسیاتی مریض بنا رہے ہیں، اسی لیے اسے اپنی بیوی اور بیٹا دکھائی دیتے ہیں، کیوں کہ وہ اس کے سوا اور کسی کو بھی دکھائی نہ دیے تھے اور اس طرح شمائلہ اس کی زندگی میں شامل ہو گئی اور اس نے ہر ممکن کوشش کی کہ وہ ایک اچھا شوہر بنے اور اب تک کے ساتھ میں اس نے واقعی شمائلہ کو کوئی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ وہ ایک ذمے دار اور پیار کرنے والا شوہر ثابت ہوا تھا۔ عارف نے اپنی کہانی ختم کی اور شمائلہ کی طرف دیکھنے لگا جس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

☆......☆

اس روز جب شمائلہ مارکیٹ سے گھر لوٹی تو بہت ٹینشن میں تھی۔ مارکیٹ میں اس کی ملاقات عارف کی پہلی ساس سے ہو گئی تھی۔ شمائلہ اسے نہیں پہچانتی تھی لیکن وہ شاید اب بھی عارف کے بارے میں سب جانتی تھی، اسی نے شمائلہ کو پہچان کر اپنا تعارف کروایا اور پھر وہ سب اسے بتایا جسے سن کر شمائلہ دکھ اور غصے کی کیفیت کا شکار ہو گئی، گھر پہنچ کر وہ سیدھی کچن میں گئی ابھی وہ گلاس میں پانی ڈال رہی تھی کہ بچے کی چیخ نے اسے اس بری طرح چونکایا کہ اس کے ہاتھ سے گلاس اور بوتل چھوٹ کر نیچے جا گری اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ دونوں ماں بیٹا وہاں موجود تھے۔ بیٹا اب خاموشی سے ماں کی گود میں کھیل رہا تھا، جبکہ وہ یک ٹک شمائلہ کو دیکھے جا رہی تھی۔ شمائلہ تو حرکت کرنے کے قابل بھی نہ تھی۔ ایسا پہلی بار ہو رہا تھا کہ وہ شمائلہ کو اتنی دیر سے دیکھ رہی تھی۔

”چلی جا یہاں سے، مر جائے گی تو بھی اور تیرا بچہ بھی، جا بھاگ جا یہاں سے چھوڑ دے اسے“ اس کا اشارہ یقیناً عارف کی طرف تھا، یکدم وہ رونے لگی اور دھیرے دھیرے اس کا رونا چیخوں میں بدل گیا۔ شمائلہ کے لیے سب کچھ ناقابل برداشت ہونے لگا۔ اس عورت کے چیخ چیخ کر رونے سے اس کے اندر اذیت اترتی جا رہی تھی، آخر وہ لہرائی اور فرش پر جا گری۔

☆......☆

”کہاں ہو تم پلیز ہمارے سامنے آؤ ہمیں تم سے بات کرنی ہے“ وہ دونوں میاں بیوی اس وقت لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ عارف خاموش تھا جبکہ شمائلہ بار بار یہی فقرہ دہرائے جا رہی تھی، آخر وہ دونوں ماں بیٹا ان کے سامنے والے صوفے پر دکھائی دینے لگے ”میں نے تمہیں کہا تھا یہاں سے چلی جاؤ مانی نہیں تم نے میری بات“ عورت کے لہجے میں غصے کے ساتھ شکایت بھی تھی۔ ”میں یہاں سے چلی جاتی لیکن میرا بچہ۔ اس بچے کا کیا مستقبل ہوگا باپ کے سائے کے بنا زندگی اس کے لیے کس قدر مشکل ہو جائے گی۔“

”شمائلہ مصالحت بھرے انداز میں بولی۔

”ہاں لیکن کم از کم زندہ تو رہے گا یہاں رہا تو“ اس کی آواز سسکیوں میں گم ہو گئی۔

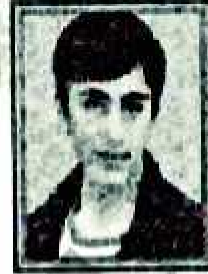
”میں تمہارا دکھ سمجھتی ہوں لیکن خدا کے لیے تم بھی میری بات سمجھو، عارف کو معاف کر دو۔ پلیز اپنا شوہر سمجھ کر نہ سہی میرے بچے کا باپ سمجھ کر معاف کر دو ایک ماں بھیک میں تم سے اپنے بچے کا باپ مانگ رہی ہے۔ تم بھی ماں ہو، میری تکلیف سمجھ سکتی ہو، ہمیں معاف کر دو۔ پلیز لوٹ جاؤ“ یہ سب کہتے ہوئے شمائلہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”معاف کیا..... تمہارے بچے کے لیے معاف کیا“ اسکی آواز سن کر شمائلہ نے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، عارف بھی بے اختیار رونے لگا۔ وہ تینوں رو رہے تھے، کچھ لمحوں بعد وہ صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنے بچے کو سینے سے لگاتے ہوئے باہر کے دروازے کی طرف چل دی۔ ایک ماں نے دوسری ماں کا مان رکھ لیا اور ہمیشہ کے لیے ان کی زندگی سے چلی گئی۔

☆......☆



وہ کون تھی؟



کاشف عبید

ایک جنیہ کی داستان جس نے ایک بچے سے دوستی کرلی

ہماری کلاس میں ایک نیا لڑکا آیا تھا جس کا نام صمد تھا۔ صمد کے لیے کچھ دن تو اسکول کا ماحول اجنبی رہا پھر وہ رفتہ رفتہ شناسا سا ہوگیا، وہ کلاس روم میں میرے ساتھ ہی بیٹھتا تھا، لہٰذا میری اس کی اچھی دوستی ہوگئی۔ ایک دن وہ کچھ اُداس سا نظر آرہا تھا۔ میں نے اُس سے سبب پوچھا لیکن اس نے بات کو ٹالنا چاہا۔ آخر میرے مسلسل اصرار پر اسے ہتھیار ڈالنے ہی پڑے، پھر جو کہانی اس نے سنائی کچھ یوں تھی۔

میرے ایک بھائی کا نام علی تھا، وہ مجھ سے پانچ



سال بڑے، وہ بھی میٹرک کرنے اسی اسکول میں آئے تھے، ہمارے گاؤں کو اسکول سے دو راستے جاتے ہیں، ایک راستہ صاف ستھرا ہے اس سے گزرتے ہوئے پاس چھوٹے کسانوں کے گھر آتے ہیں، لیکن وہ راستہ خاصہ طویل ہے جبکہ دوسرا راستہ قدرے چھوٹا ہے لیکن پرانے درختوں جھاڑیوں سے گزر کر ہمارے گاؤں پہنچتا ہے۔ اس راستے سے بہت کم لوگ سفر کرتے ہیں کیوں کہ اس کے متعلق بہت سی پراسرار کہانیاں مشہور ہیں۔

علی بھائی اسی راستے سے اسکول آیا جایا کرتے تھے۔ مگر کبھی بھی ان کو دہشت محسوس نہیں ہوئی تھی، امی انہیں سمجھا سمجھا کر تھک چکی تھیں کہ اس راستے سے نہ آیا جایا کرو، مگر علی بھائی ماننے والے نہیں تھے۔ اس راستے کے بارے میں مشہور تھا، وہاں جنات کا قبیلہ آباد ہے۔ کبھی کسی شخص کو وہاں ایک دلہن زیورات سے لدی پھندی دکھائی دیتی، کبھی سفید لباس میں ملبوس لوگوں کا ایک قافلہ گزرتا نظر آتا اور کبھی لوگوں کا مجمع جو ایک سردار کے سامنے بیٹھا دکھائی دیتا، اس طرح کی ناقابل یقین کہانیاں لوگ اس راستے کے بارے میں سنایا کرتے تھے۔

علی بھائی ہمیشہ اس شارٹ کٹ راستے کو منتخب کرتے، ماں کے علاوہ ابو، میں اور میری چھوٹی بہن ان کو سمجھاتے مگر ان پر کوئی اثر نہ ہوتا۔

ایک دن علی بھائی آئے تو کچھ گم صم سے تھے، انہوں نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ ماں کے پوچھنے پر انہوں نے کہا کہ "مجھے آج کچھ زیادہ ہی تھکن محسوس ہو رہی ہے، برائے مہربانی مجھے کچھ دیر آرام کرنے دیں۔"

جب علی شام کو نیند سے بیدار ہوگئے تو بخار کی شدت سے جل رہے تھے۔ ماں اس لیے زیادہ پریشان تھیں کہ ان کو معلوم تھا کہ علی کا گزرنا خوفناک اور پراسرار راستے سے ہوتا ہے۔ علی بھائی اس طرح ایک ہفتے تک بیمار رہے، والد صاحب انہیں شہر علاج کے لیے بھی لائے اور ماں کے کہنے پر ہی انہیں ایک بزرگ کے پاس بھی لے کر گئے، بزرگ نے ان پر دم کیا اور انہیں مستقل ایک مہینے تک دم کے لیے آنے کو کہا، رفتہ رفتہ ان کی حالت بہتر ہوتی چلی گئی اور وہ اسکول جانے کے قابل ہوگئے۔ اسکول جا کے پتا چلا کہ دو دن کے بعد سالانہ امتحان تھے اور بھائی کی کچھ تیاری نہیں تھی، لیکن اس بات پر وہ پریشان نہیں تھے۔ اور ایک بات یہ کہ سب کے لاکھ منع کرنے کے باوجود انہوں نے اس پراسرار راستے سے گزرنا نہیں چھوڑا تھا، اور جب ان کا رزلٹ آیا تو سب لوگ حیران تھے کہ بغیر تیاری کے وہ اتنے اچھے نمبروں سے کیسے کامیاب ہوگئے، یہ راز تو اس وقت کھلا جب علی بھائی ایک خوب صورت سی لڑکی کو گھر لائے۔ اتفاق سے اس روز ابا گھر نہیں تھے وہ ایسی باتوں کو سخت ناپسند کرتے ہیں لیکن ماں تو ماں ہوتی ہے انہوں نے اس لڑکی کو محبت سے بٹھایا اور اس کی تواضع کی کچھ دیر گھر میں گزارنے کے بعد بھائی اس لڑکی کو اس کے گھر چھوڑنے چلے گئے۔ واپس آ کر جب ماں نے اس لڑکی کے متعلق پوچھا تو بھائی نے بتایا کہ جس روز ان کی طبیعت خراب ہوتی وہ واپس آ رہے تھے تب اسکول کے کچھ شریر لڑکے ان کے پیچھے آ گئے یہ وہ لڑکے تھے جو علی بھائی سے کینہ رکھتے تھے کیوں کہ علی بھائی پڑھائی میں اچھے تھے تمام ٹیچرز ان کی تعریف کیا کرتے تھے جو ان لڑکوں کو بری لگتی تھی۔ وہ لڑکے جب علی کے پیچھے اس جنگل میں پہنچے تو انہوں نے علی بھائی سے جھگڑا شروع کر دیا اور انہیں مارنے کی کوشش کی۔ عین اسی وقت نہ جانے کہاں سے ان لڑکوں پر پتھروں کی بارش شروع ہوگئی اور وہ لڑکے ڈر کے بھاگ کھڑے ہوئے علی بھائی کو بھی خوف محسوس ہوا اور اسی دہشت میں ان کی طبیعت خراب ہوگئی، جب طبیعت سنبھلی اور انہوں نے دوبارہ اسکول جانا شروع کیا تو ایک بار پھر ان کے دل نے اسی راستے سے گزرنے کی خواہش کی اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس رستے پر آ نکلے۔

ابھی وہ اس راستے کے درمیان میں ہی پہنچے تھے کہ پیچھے سے کسی نے اسے آواز دی کہ "میں نے تمہارا انتظار ایک مہینے تک کیا ہے، میں روز تمہارے لیے یہاں پر کھڑی رہتی ہوں، جب اس طرح کے جملے علی کے کانوں سے ٹکرائے تو ان کی تو جیسے جان ہی نکل گئی، جب اس نے پیچھے دیکھا تو ایک ہم عمر خوب صورت سی لڑکی کو پایا جو ایک درخت کی شاخ سے لٹکے جھولے میں جھول رہی تھی۔

بولو اتنے دن تم کہاں تھے، مگر علی میں کچھ بولنے کی ہمت کہاں تھی، خوف سے ان کا دل دھک دھک کر رہا تھا اور پیشانی پسینے سے چمکتی دکھائی دے رہی تھی۔

"ک ک...... ک ک......کون ہو تم؟" علی نے سوال کیا۔

"ڈرو نہیں۔ میں وہی ہوں۔ جس نے تمہیں ان شریر لڑکوں

سے بچایا تھا، میں نے اس وقت بھی تمہیں بہت آوازیں دی تھیں مگر تم بھی شاید ڈر کے بھاگ گئے تھے، مجھے دیکھو کیا میں ڈرنے والی چیز ہوں۔" تب علی نے تھوڑی ہمت کر کے اس کا بغور جائزہ لیا۔ وہ واقعی ایک خوب صورت لڑکی تھی، جو چہرے پہ معصومیت سجائے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی، علی کا خوف کچھ کم ہوا تو اس نے اس سے پوچھا۔

"تم رہتی کہاں ہو؟ کیا اس خوفناک جنگل میں؟" یہ سن کر وہ لڑکی بے تحاشہ ہنسنا شروع ہو گئی۔

"خوفناک جنگل؟" تم سے کس نے یہ بات کہی، ارے یہاں میرا گھر ہے، جہاں میں اپنے بابا کے ساتھ رہتی ہوں، چلو میں تمہیں اپنا گھر بھی دکھاتی ہوں۔"

علی کے کچھ اور بولنے سے پہلے ہی لڑکی نے اس کا ہاتھ پکڑا، ابھی وہ دو قدم ہی چلے ہوں گے کہ علی کو دائیں بائیں مکانات کی قطاریں نظر آنے لگیں۔ ادھر اُدھر لوگ بھی کام کرتے نظر آ رہے تھے کچھ لوگ گھر کی طرف جا رہے اور کہیں کچھ بچے بھی کھیلتے نظر آ رہے تھے۔ علی بھائی کی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے وہ روز یہاں سے گزرتا تھا، مگر آج تک یہ لوگ اسے کیوں نظر نہیں آئے، آخر علی نے لرزتی آواز کے ساتھ یہ سوال لڑکی کے سامنے رکھ دیا۔

"یہ کون لوگ ہیں، پہلے تو یہ بستی، مجھے نظر نہیں آئی۔" لڑکی یہ بات سن کر پھر ہنسنے لگی اور کہنے لگی کہ یہ لوگ جنات ہیں اور میرا تعلق بھی قوم جنات سے ہے۔ تم مجھے اچھے لگے ہو اور میں چاہتی ہوں کہ تم ہمیشہ میرے ساتھ رہو، علی بھائی یہ سن کر خوف زدہ ہو گئے، لڑکی نے ان کے چہرے کے تاثرات بدلتے دیکھے تو کہنے لگی۔ تم ڈرو نہیں یہ تمہیں نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ تب انہوں نے کہا مجھے بہت دیر ہو گئی ہے آج مجھے جانے دو گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے۔"

"ٹھیک ہے آج تم جاؤ، لیکن کل تم ضرور آنا اور شام کے وقت آنا، میں تمہیں اپنے بابا سے بھی ملواؤں گی۔"

لڑکی کی اجازت ملنے پر علی نے جلدی سے گھر کی راہ لی اور راستے بھر اس جن زادی کے بارے میں سوچتا رہا۔

☆......☆

دوسرے دن علی بھائی پر عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ وہ کچھ کھوئے کھوئے گم تھے، انہیں بار بار اس جن زادی کا خیال آتا رہا اور دل اپنے اس جن زادی سے ملنے کے لیے مجبور کرتا رہا۔ اس طرح پریشان حالی میں شام ہو گئی۔ ماں کی نظر سے بچ کر وہ گھر سے نکلے اور اس پر اسرار راستے یعنی پر اسرار بستی کی طرف چل پڑے۔

وہ وہاں پہنچ کر ادھر اُدھر دیکھنے لگے، اندھیرا پھیل رہا تھا، لیکن اب اسے ذرا خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا، اچانک جھاڑیوں سے وہی جن زادی نمودار ہو گئی۔ جن زادی نے ان کے قریب پہنچ کر ان کا ہاتھ پکڑا اور انہیں اپنے گھر لے گئی، وہاں اس نے اپنے گھر والوں سے انہیں ملوایا اور اس کی خاطر تواضع کی، اور انہیں واپس وہاں چھوڑ آئی علی بھائی گھر واپس آئے تو گھر والے بہت پریشان تھے ماں نے تو رو رو کر بُرا حال کر لیا تھا، سب کے بہت پوچھنے پر انہوں نے یہ سارا واقعہ سنا دیا۔ تمام لوگ ہکا بکا اس کی بات سنتے رہے۔ ماں تو یہ ماجرا سن کر بے ہوش ہو گئی تھی۔ علی بھائی نے والدین کو کہا کہ وہ کل شام وہاں پھر جائیں گے اور جن زادی کو اپنے ساتھ لے کر آئیں گے۔ اور لوگوں سے ملوائیں گے۔ اماں اور ابا یہ سن کر پریشان تھے آخر انہیں گاؤں کے مولوی صاحب کا خیال آیا جو جھاڑ پھونک اور جن اُتارنے کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ انہوں نے ان سے مدد لینے کا سوچا اور مطمئن ہو کر سو گئے۔ اگلی صبح جب وہ بیدار ہوئے تو علی بھائی کمرے میں نہیں تھے۔ انہیں ہم نے بہت ڈھونڈا بہت تلاش کیا، لیکن ان کا کوئی سراغ نہ ملا۔

لوگ کہتے ہیں کہ انہیں وہی جنات اٹھا کر لے گئے شاید انہوں نے ان کے ارادوں کا علم ہو گیا تھا، لوگ بتاتے ہیں کہ جب بھی کبھار وہ جنگل سے گزرتے ہیں تو انہیں علی بھائی نظر آتے ہیں۔ جب انہوں نے آواز دی تو وہ غائب ہو گئے۔ آج بھی ماں علی بھائی کو یاد کر کے روتی ہے، کیوں کہ میں بھی اس اسکول میں ہوں جس میں علی پڑھتا تھا، وہ روز مجھے تاکید کر کے بھیجتی ہیں کہ اس راستے نہ جانا، میں روز اپنی ماں کو روتا چھوڑ کر آتا ہوں، لیکن افسوس کہ میں ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ اس دوران کلاس میں ٹیچر آ گئے اور ہم پڑھائی میں مشغول ہو گئے۔

مجھے آج بھی سمجھ نہیں آئی کہ یہ سب کہانی من گھڑت تھی یا واقعی صمد کے بھائی کو جن لے گئے تھے۔ قارئین آپ کا کیا خیال ہے......؟؟

☆......☆

آتشِ جنوں



سلیم فاروقی

ایک شعلہ صفت نوجوان کی سرگزشت۔ وہ اپنے ملک سے غداروں کا نام ونشان مٹا دینا چاہتا تھا۔ اس معرکے میں اُس نے اپنا سب کچھ ہار دیا لیکن حوصلہ نہیں ہارا

چٹان سا حوصلہ رکھنے والے نوجوان کی رُوداد، 29 ویں کڑی

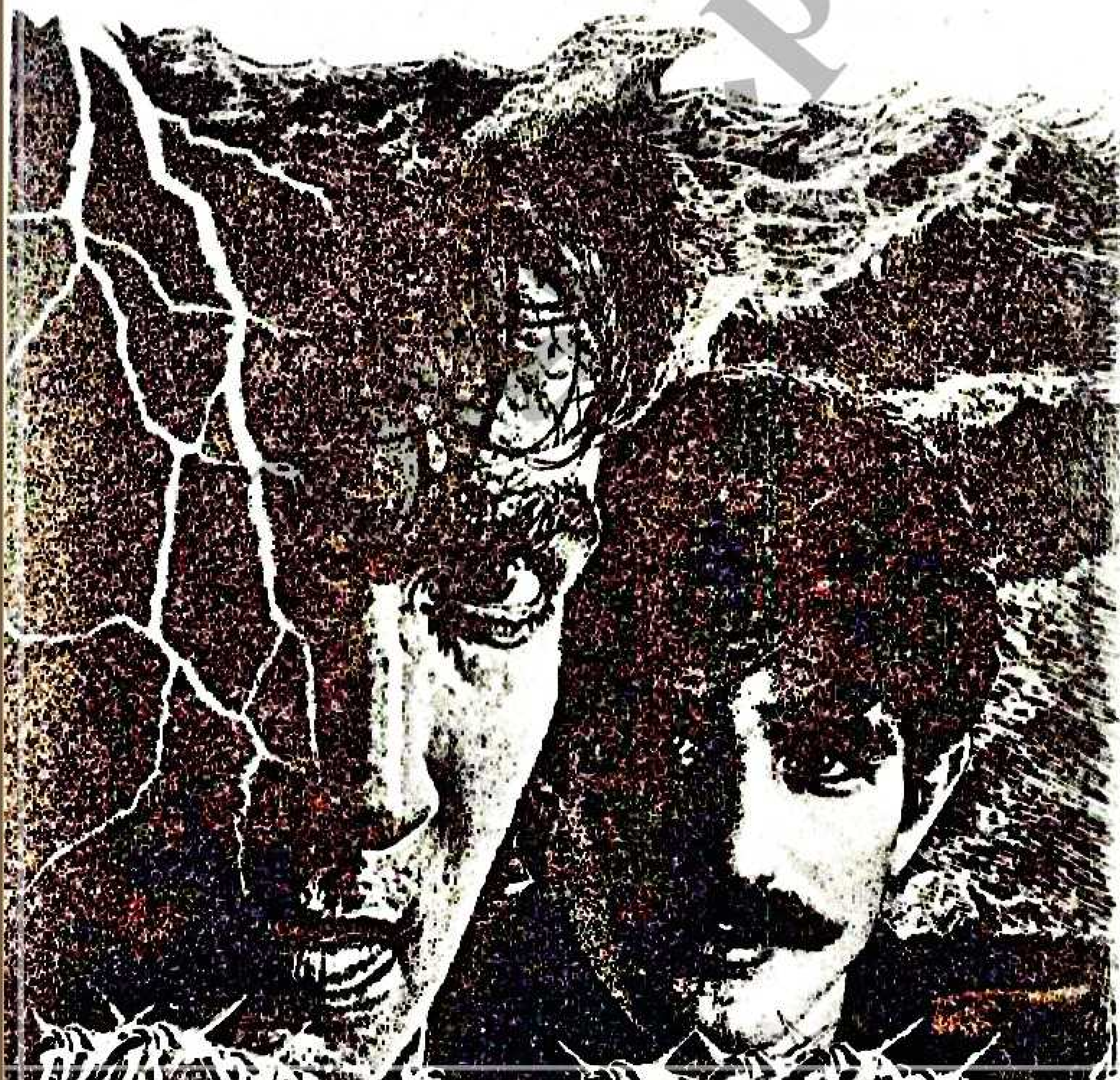
گزشتہ اقساط کا خلاصہ

عمران اور ارسلان دو بھائی ہیں' ایک دوسرے سے شدید محبت کرنے والے' نہایت جرأت مند اور اپنی عزت وانا کے لیے زمانے سے لڑ جانے والے...... ارسلان کچھ لاابالی ہونے کے ساتھ بہت زیادہ جذباتی بھی ہے جبکہ عمران بہت سمجھدار اور سوچ سمجھ کر فیصلے کرنے والا۔ عمران کا ایک دوست راشد ہے' جس کی سمندر میں لانچیں چلتی ہیں۔ عمران اور ارسلان' راشد کی لانچ پر سمندر کی سیر کے لیے جاتے ہیں۔ سفر کے دوران میں اُن کا راشد کی لانچ پر کام کرنے والے ایک جرائم پیشہ ملازم غنی اور اس کے ساتھیوں سے جھگڑا ہوتا ہے۔ غنی' راشد کی لاعلمی میں اس کی لانچ کو غیر قانونی کام کے لیے استعمال کر رہا ہوتا ہے۔ راشد انہیں پولیس کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس عمل کے بعد راشد کے پاس دھمکی آمیز فون آتے ہیں' جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ غنی کسی بڑے جرائم پیشہ گروہ کا آلۂ کار ہے۔ راشد کے گھر حملہ کرنے والوں کا تعلق ایک ایرانی علی اکبر مشہدی سے ہے جو ایک بین الاقوامی گینگ کا ڈان ہے۔ راشد کا مرڈر ہو جاتا ہے اور پھر مشہدی کے آدمی عمران اور ارسلان کی بہن شائستہ کو گھر سے اغوا کر کے لے جاتے ہیں۔ دوسری طرف پولیس عمران کو تھانے لے جا کر شدید تشدد کا نشانہ بناتی ہے۔ تھانے میں عمران پر شدید تشدد کا سلسلہ جاری ہوتا ہے کہ ارسلان اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسے وہاں چھڑانے آ جاتا ہے۔ عمران جب گھر پہنچتا ہے تو اُس کے گھر والے خصوصاً چھوٹا بھائی عدنان اس کی حالت پر سخت پریشان ہو جاتا ہے۔ اسی دوران میں پولیس' عمران کے گھر پر ریڈ کرتی ہے اور اُس کے گھر سے ہیروئن برآمد کرتی ہے۔ عمران کی والدہ کا انتقال ہو جاتا ہے۔ اُس کے والد بھی اس غم کے باعث زندگی چھوڑ کر موت کے مہمان ہو جاتے ہیں۔ عمران اور ارسلان غم سے نڈھال تھے جبکہ ان کے چھوٹے بھائی عدنان پر تو سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ ماں باپ سے محرومی کے بعد اُن کی دہشت گردوں اور پولیس سے جنگ جاری ہوتی ہے کہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ عدالت میں اُن کا کیس لڑنے والا بیرسٹر بھی پولیس کے ساتھ مل گیا ہے۔ انہیں اطلاع ملتی ہے کہ شائستہ نے خودکشی کر لی ہے...... عمران اور ارسلان اپنی بہن کے اغوا کار مشہدی سے اپنی بہن شائستہ کی ڈیڈ باڈی کا مطالبہ کرتے ہیں...... عمران اور تیمور' شائستہ کو تلاش کرتے کرتے حاکم خان کے اڈے پر پہنچ جاتے ہیں مگر شائستہ' حاکم خان کے غنڈوں کو زخمی کر کے پہلے ہی فرار ہو جاتی ہے۔ تیمور' حاکم خان کو ہلاک کر دیتا ہے۔ وہ دونوں حاکم خان کے سیف سے ضروری کاغذات لے کر وہاں سے نکل جاتے ہیں۔ مشہدی فون کر کے ان کاغذات میں سے ایک ریڈ فائل کا تقاضہ کرتا ہے مگر عمران اسے فائل دینے سے انکار کر دیتا ہے۔ ٹیلی فون پر مشہدی اور عمران کی تلخ کلامی ہوتی ہے۔ مشہدی اسے دھمکیاں دیتا ہے اور ملٹری انٹیلی جنس کو اس کے پیچھے لگا دیتا ہے۔ اسی دوران میں عمران کا ایک دشمن غنی بلوچ' عمران سے آملتا ہے۔

جان محمد جو کہ مشہدی کا آدمی ہے لیکن اصل میں وہ عمران کے لیے کام کر رہا ہے۔ معلومات فراہم کرتا ہے کہ ان کے خاتمے کے لیے مشہدی نے جن کرائے کے قاتلوں کو امریکا سے بلایا ہے ان کی تعداد پانچ ہے جن میں سے دو کا تعلق امریکا سے ہے ایک ہندو ہے اور دو یہودی۔ بلوچ شبو کے بارے میں بتاتا ہے کہ وہ کسی زمانے میں چھوٹا موٹا بدمعاش تھا جسے بعد میں مشہدی نے اپنے گینگ میں شامل کرلیا تھا۔ اس کا اصل نام شہاب ہے اور اس کی ڈیوٹی پورٹ پر ہوتی ہے۔ مشہدی کے خاص [illegible] میں سے ہے۔ اخبار میں خبر چھپتی ہے کہ معروف سماجی کارکن اور تاجر عبدالحمید راجپوت کو ہوٹل میں پراسرار طور پر قتل کردیا گیا ہے۔ عمران اس حقیقت سے واقف ہے کہ قتل ہونے والا دراصل "را" کا ایک سفاک اور خونی ایجنٹ وشو دتھا، جو گزشتہ بائیس برس سے پاکستان میں مقیم تھا۔ وہ یہ معلومات اخبار کو مہیا کرنا چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں ان کے ذہن میں معروف انگلش روزنامے کے چیف ایڈیٹر، کالم نگار وقارالحسن کا نام آتا ہے۔ عمران انہیں فون کرکے ملاقات کے لیے کہتا ہے اور اپنے ہمراہ ہاشم کو بھی لے جاتا ہے۔

عمران وقارالحسن کو اپنی فیملی ٹریجڈی کے بارے میں بتاتا ہے کہ کیسے ان لوگوں کی دشمنی مشہدی سے ہوئی اور وہ لوگ ارسلان کو مردہ سمجھتے رہے، جب کہ وہ دہلی کی تہاڑ جیل میں ہے۔ تب وقارالحسن انہیں اپنے انڈیا جانے اور "را" کی قید میں رہنے کے واقعات کی تفصیل بتاتے ہیں۔

بلوچ عمران کو بتاتا ہے کہ اس کی بہن شائستہ کا پتا چل گیا ہے اور وہ تفصیل بتانے گھر آ رہا ہے۔ بلوچ شائستہ کے متعلق بتاتا ہے کہ وہ آج کل میرپور خاص میں کسی پیر کی حفاظت میں ہے۔ عمران اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شائستہ کی تلاش میں میرپور



خاص کے لیے روانہ ہو جاتا ہے۔ میر پور خاص کے داخلی راستے پر بنی پولیس چوکی پر انہیں روک لیا جاتا ہے۔

عمران پولیس آفیسر سے کہتا ہے کہ وہ لوگ وڈیرے ممتاز سومرو کے مہمان ہیں یہ سن کر پولیس انسپکٹر گھبرا جاتا ہے اور ان کی گاڑی کو آگے جانے کی اجازت دے دیتا ہے۔ ممتاز سومرو انتہائی خوش اخلاق اور پڑھا لکھا وڈیرہ ہے، جو درحقیقت ارسلان کا دوست ہے۔ عمران ممتاز سومرو کو ساری کہانی سناتا ہے اور شائستہ کے متعلق بتاتا ہے کہ وہ پیر احسان الحق کی قید میں ہے ممتاز ان لوگوں کو تسلی دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر اس پیر کی پہنچ صدر امریکہ تک بھی ہے تو بھی شائستہ کی رہائی میری ذمہ داری ہے۔ وہ لوگ ممتاز سومرو کے ہمراہ پیر احسان الحق کی حویلی پہنچتے ہیں، ممتاز پیر صاحب سے عمران کا تعارف کرواتا ہے اور کہتا ہے کہ ان کی بہن کچھ لوگوں کی قید میں ہے اور یہ اس کی رہائی چاہتے ہیں اور جس شخص کی قید میں ان کی بہن ہے اس کا نام پیر احسان الحق ہے اپنا نام ممتاز سومرو کے منہ سے سن کر پیر احسان سخت غصے اور طیش میں آ جاتا ہے اور انہیں وہاں سے جانے کے لیے کہتا ہے، تب تیمور پیر احسان پر جھپٹ پڑتا ہے اور خنجر اس کے گلے پر رکھ کر شائستہ کی بازیابی کا مطالبہ کرتا ہے، ممتاز سومرو اس سے کہتا ہے کہ ان لوگوں کا تعلق انڈر ورلڈ سے ہے لہٰذا اپنے آدمیوں کو ہدایت دو کہ شائستہ کو یہیں لے آئیں، تب پیر احسان مشغل کو فون کر کے شائستہ کو لانے کا کہتا ہے، کچھ ہی دیر بعد مشغل شائستہ کو کمرے میں لے آتا ہے شائستہ عمران کو دیکھ کر اس سے لپٹ جاتی ہے۔ عمران بہن کو تسلی دیتے ہوئے کہتا ہے کہ تم نے بہت آنسو بہا لیے اب آنسو بہانے کی باری دشمنوں کی ہے، میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ عمران تیمور کو وہاں سے نکلنے کا کہتا ہے اور پیر احسان کو بھی ساتھ لے جانے کا کہتا ہے اور وہ لوگ وہاں سے ممتاز کی شہر سے باہر والی حویلی پہنچ جاتے ہیں وہاں پہنچ کر وہ پیر احسان سے کہتے ہیں کہ وہ اپنے آدمیوں کو فون کر کے بتا دے کہ وہ حیدر آباد ایک وفاقی وزیر سے ملنے جا رہا ہے۔ ممتاز تیمور کو کہتا ہے کہ میں نے احسان سے پچھلے بہت سے حساب برابر کرنا ہیں۔ عمران تیمور سے کہتا ہے کہ اس ڈبا پیر کو لباس سے محروم کر دو۔

سب اس انکشاف پر حیرت زدہ تھے کہ پیر احسان الحق مسلمان نہیں تھا، پیر احسان اپنا نام رمیش چندر بتاتا ہے۔ ممتاز کہتا ہے کہ اسے ملٹری انٹیلی جنس کے حوالے کر دیتے ہیں وہ خود اس سے اگلوا لیں گے کہ یہ کون ہے اور یہاں کیا کر رہا ہے؟ تیمور اس سے پوچھتا ہے کہ اس نے شائستہ کو اپنی قید میں کیوں رکھا ہوا تھا۔ تب وہ بتاتا ہے کہ اس کے ایک دوست نے کہا تھا کہ ایک لڑکی میرے دوست کی قید سے فرار ہو کر تمہارے علاقے کی طرف گئی ہے، تم اسے اپنے پاس رکھ لو۔ عمران اس سے پوچھتا ہے کہ کیا اس کا تعلق "را" سے ہے۔ پیر احسان الحق (رمیش) یہ سوال سن کر گھبرا جاتا ہے۔ پیر احسان الحق (رمیش) اقرار کرتا ہے کہ اس کا تعلق "را" سے ہے اور وہ گزشتہ پینتیس برس سے یہاں کام کر رہا ہے۔

عمران وقار الحسن کو فون کرتا ہے اور انہیں پیر احسان الحق کے بارے میں بتاتا ہے کہ اس کا نام رمیش چندر ہے اور وہ "را" کا ایجنٹ ہے۔ وہ انہیں پولیس کی نفری اور چینل کی کیمرا ٹیم بھیجنے کے لیے کہتا ہے۔ وقار الحسن آرمی، پولیس اور اپنی چینل ٹیم کے ہمراہ میر پور خاص ممتاز کی حویلی پہنچ جاتے ہیں اور وہاں سے وہ سب پیر احسان الحق کی حویلی میں سرچ آپریشن کے لیے نکل جاتے ہیں۔ آپریشن کی کوریج وقار الحسن کا چینل Live دکھاتا ہے۔ تمام تر کارروائی کے بعد وقار الحسن کراچی روانہ ہو جاتے ہیں۔

بلوچ عمران کو بتاتا ہے کہ مشہدی کے دو خاص آدمی پولیس نے گرفتار کر لیے ہیں اور مشہدی خود انڈر گراؤنڈ چلا گیا ہے، جبکہ مشہدی کی بیٹی ڈولی کراچی میں ہے۔ بلوچ کہتا ہے کہ ڈولی کے ذریعے ہم مشہدی کو بلیک میل کریں گے اور اس کو بھی اسی صدمے سے دوچار کریں گے جو شائستہ کے اغوا کے بعد عمران نے برداشت کیا۔

(اب آگے ملاحظہ کیجیے)

ویسے بلوچ صحیح کہہ رہا ہے۔" ممتاز نے کہا۔ "مشہدی فوری طور پر انڈر گراؤنڈ چلا گیا ہے، حالات سازگار ہوتے ہی وہ دوبارہ منظر عام پر آ جائے گا، مشہدی جیسے لوگ اپنی خبیث فطرت سے کبھی باز نہیں آتے، وہ باہر آتے ہی پھر تمہیں کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا۔"

میں تو سوچ رہا تھا کہ مشہدی کو اب اس کے حال پر چھوڑ دوں اور خود ارسلان کی تلاش میں چلا جاؤں۔"

"تم کیا سمجھتے ہو، مشہدی کیا اس وقت ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا ہوگا، وہ جہاں بھی ہوگا، اپنے گینگ کو کنٹرول کر رہا ہوگا۔ ہاں، یہ اور بات ہے کہ اس کا کام پہلے کی طرح نہ چل رہا ہو، پھر پولیس نے اس کے دو سرکردہ آدمیوں کو گرفتار بھی کر لیا ہے، کیوں کہ وہ اگر قید میں نہ ہوتے تو مشہدی کو بالکل فرق نہ پڑتا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ بھی میری اس بات کے حامی ہیں کہ اب ہمیں مشہدی پر وار کرنا چاہیے اور وار اتنا کاری

ہو کہ وہ کافی عرصے تک سنبھل نہ سکے۔

''ہم تو بولتا ہوں ولیجہ کہ اس مشہدی کا قصہ ہی پاک کر دوں۔'' بلوچ نے کہا۔

''اسے مارنا کیا اتنا ہی آسان ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کیوں، کیا وہ اسٹین لیس اسٹیل کا بنا ہوا ہے۔'' بلوچ نے کہا۔ ''اس کے جسم پر بھی چوٹ لگتی ہوگی، اس کے زخموں سے بھی خون بہتا ہوگا اور رائفل کی گولی یہ نہیں دیکھتی کہ اس کی زد میں امریکی صدر ہے یا مشہدی جیسا غنڈہ؟''

''اچھا بھئی، پہلے کراچی تو پہنچیں، پھر دیکھا جائے گا۔''

اچانک میرے دوسرے سیل فون کی بیل بجنے لگی، میں نے چونک کر سیل فون جیب سے نکالا اور بولا۔ ''شیطان کا نام لیا اور شیطان حاضر'' پھر وہ سیل فون کا بٹن دبا کر بولا۔

''ہاں مشہدی! اب کیا بات ہے، اس مرتبہ تم نے بہت عرصے میں مجھے کال کی؟''

''زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش مت کر کامران۔'' مشہدی نے کہا۔

''میں جانتا ہوں کہ یہ سب کیا دھرا تیرا ہی ہے۔''

''کون سا کیا دھرا؟'' میں نے پوچھا۔

''شائستہ، رمیش کے پاس تھی، کسی طرح تو بھی سراغ لگاتا ہوا وہاں تک پہنچ گیا۔''

''میرے وہاں پہنچنے سے رمیش چند کا کیا تعلق؟'' میں نے کہا۔

''ہم وہاں پہنچے تھے تو شائستہ کو ہر قیمت پر آزاد کراتے۔''



"تو بہت ہواؤں میں اُڑ رہا ہے۔" مشہدی نے کہا۔ "تو سمجھتا ہے کہ میں اگر انڈر گراؤنڈ ہوں تو کچھ نہیں کر سکتا۔ تو شاید کرائے کے ان قاتلوں کو بھول گیا جو میں نے تجھے ہلاک کرنے کو بلائے تھے۔ ان میں سے دو انتہائی خطرناک دہشت گرد تیری تلاش میں ہیں اور وہ تجھے دیکھتے ہی گولی ماردیں گے۔"

"مجھے گولی تو وہ پہلے ہی مارنا چاہ رہے تھے۔"

"تو فکر مت کر۔ تیری یہ خواہش چند گھنٹوں میں پوری ہو جائے گی، وہ دونوں کراچی سے نکل چکے ہیں، اب تو ان سے بچ سکتا ہے تو بچ جا، وہ لوگ یا تو ماریں گے یا مر جائیں گے، تو سپر ہائی وے سے آیا یا قومی شاہراہ سے۔ ہر صورت میں آج کامران تیری زندگی کا آخری دن ہے۔" یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

"اب آپ نے کیا سوچا ہے بھیا؟" تیمور نے پوچھا۔ اس کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے۔

"سوچا کیا ہے؟" میں نے ہنس کر کہا۔ "مشہدی ہمارے ساتھ بلف کر رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر وہ لوگ آ ہی رہے تھے تو بھلا ہمیں پہلے سے اطلاع دینے کی ضرورت تھی؟"

"لیکن وہ بلف کیوں کھیلے گا؟" تیمور نے پوچھا۔

"وہ صرف ہمیں یہاں سے نکالنا چاہتا ہے۔ وہ کامران کی فطرت سے واقف ہے، اگر اس سے یہ کہا جائے کہ خطرہ تمہاری طرف بڑھ رہا ہے تو یہ آگے بڑھ کر اس خطرے کا سامنا کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ پھر وہ دونوں ایجنٹ تو سپر ہائی وے پر یا نیشنل ہائی وے پر ہمارے لیے بہت آسان شکار ثابت ہوں گے۔ مشہدی نے سوچا ہوگا کہ کامران اپنے ان دشمنوں کو ختم کرنے کا یہ موقع ہاتھ سے جانے نہیں دے گا۔ یہ ہی سوچ کر اس نے یہ بلف چال چلی ہے۔"

"لیکن یہ بھی تو سوچو کہ مشہدی آپ کو یہاں سے باہر کیوں نکالنا چاہتا ہے؟" ممتاز نے کہا۔

"اپنی ہر طرح کی کوشش کے باوجود مشہدی کو ابھی تک کامران کا سراغ نہیں ملا ہے۔" ہاشم نے کہا۔ "اس کی ایک وجہ تو یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ ان دونوں کرائے کے قاتلوں کا نام لے کر اپنے کچھ آدمیوں کی سپر ہائی وے پر اور کچھ لوگوں کو نیشنل ہائی وے پر بھیج دے۔ اور اس کے آدمی آسانی سے ہمیں شکار کر لیں۔ وہ کہیں گھات لگائے بیٹھے ہوں اور ہمیں دیکھتے ہی فائرنگ شروع کر دیں۔" ہاشم نے کچھ توقف کیا، پھر بولا۔ "دوسری صورت یہ ہے کہ اس کے کچھ شارپ شوٹرز پہلے ہی میرپور خاص میں موجود ہیں۔ ہم میرپور خاص کی حدود سے باہر نکلیں اور وہ ہم پر حملہ بول دیں۔"

"میرپور خاص کی تو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے یہاں کسی کی جرأت نہیں ہو سکتی کہ وہ میرے مہمانوں کو ٹیڑھی آنکھ سے بھی دیکھ سکے۔" ممتاز نے کہا۔

"مشہدی کے آدمی تمہارے رعب میں کب آئیں گے؟" میں نے پوچھا۔ "وہ تمہیں کیا جانیں کہ کون وڈیرہ ممتاز اور کہاں کا وڈیرہ ممتاز؟"

"یہاں غیر مقامی آدمی فوراً پہچانا جاتا ہے۔" ممتا نے کہا۔

"اگر ایسا ہے تو میں ابھی اپنے آدمیوں کو بھیجتا ہوں وہ آدھے گھنٹے میں آکر بتا دیں گے کہ آس پاس کوئی غیر مقامی یا اجنبی آدمی ہے یا نہیں۔"

"ارے، یہ سب اس کی گیدڑ بھبکیاں ہیں۔" میں نے کہا۔ "ابھی معلوم ہو جائے گا کہ وہ کتنا باخبر ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے اپنا دوسیل فون نکالا جس میں خصوصی سم تھی۔

میں نے مشہدی کا نمبر ڈائل کیا اس نے دوسری ہی بیل پر فون ریسیو کر لیا۔ "ہاں بھائی ڈان!" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "میں آدھے سے زیادہ کا سفر طے کر چکا ہوں اور ابھی تک ان کرائے کے قاتلوں سے میرا سامنا نہیں ہوا۔" میں طنزیہ انداز میں ہنسا۔

"تم جھوٹ کب سے بولنے لگے کامران؟" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تم نے کبھی مصلحتاً ہی جھوٹ بولا ہوگا۔ تم ابھی تک میرپور خاص سے نکلے ہی نہیں ہو، فکر مت کرو، تم جب بھی کراچی آؤ گے، تمہاری کرائے

کہ ان قاتلوں سے ملاقات ضرور ہوگی۔"

"میں تو خیر آ جاؤں گا۔ تو کون سے بل میں چھپا بیٹھا ہے، یہ میں بھی اچھی طرح جانتا ہوں، تو کیا سمجھتا ہے کہ میں تیری طرف سے بالکل ہی بے فکر ہو گیا ہوں۔"

جواب میں مشہدی نے بلند و بانگ قہقہہ لگایا۔

"میں تو اس وقت کھلے سمندر میں ہوں۔" اس نے ہنس کر کہا۔ "کسی میں اتنی جرأت ہے کہ وہ مجھ پر ہاتھ ڈال سکے۔"

"تو شاید اپنے اس ٹنوں وزنی اسلحہ بردار جہاز کی تباہی بھول گیا، میں چاہوں تو یہیں بیٹھے بیٹھے تیرا یہ جہاز بھی غرق کر سکتا ہوں لیکن تو اس وقت کھلے سمندر میں نہیں ہے۔"

"چلو پھر یوں ہی سہی۔" اس نے کہا۔ "ویسے یہ بات تو ٹھیک ہے کہ آج کا دن تمہاری زندگی کا آخری دن ہے۔"

"تو تو اللہ کو نہیں مانتا ہے لیکن میرا ایمان ہے کہ میری جو رات قبر میں ہوگی، اسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں ٹال سکتی اور اگر میری موت نہیں آئی ہے تو دنیا کی تمام طاقتیں مل کر بھی مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتیں۔ اب تو اپنی خیر منا اور دیکھ میں تیرے ساتھ کیا کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے ٹیلی فون بند کر دیا۔

فون کا اسپیکر آن تھا اس لیے وہاں بیٹھے ہوئے لوگ بھی مشہدی کی باتیں سن رہے تھے۔

"ایک بات تو طے ہے۔" تیمور نے کہا۔ "یہاں مشہدی کا کوئی مخبر موجود ہے جو اسے پل پل کی خبر پہنچا رہا ہے۔"

"میں ابھی اپنے آدمیوں کو بھیجتا ہوں۔" وہ فوراً اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔

"ضروری تو نہیں ہے کہ مشہدی نے یہاں اجنبی بھیجے ہوں، وہ یہاں کے لوگوں کو بھی تو خرید سکتا ہے۔ وہ یہاں کی پولیس سمیت تمام سرکاری اہل کاروں کو خرید سکتا ہے۔ وہ اس بہروپیے رمیش چند کے کسی ایک یا کئی عقیدت مندوں کو خرید سکتا ہے۔" ممتاز واپس آیا تو اس کا موڈ کچھ خراب تھا۔

میں نے پوچھا۔ "کیا بات ہے ممتاز! خیریت تو ہے؟"

"میری حویلی کو چاروں طرف سے پولیس والوں نے گھیر رکھا ہے، مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے ان لوگوں نے مجھے بھی اس گھر میں نظر بند کر دیا ہے۔ میں نے باہر جانا چاہا تو گیٹ پر کھڑے ہوئے پولیس کے ایک سنتری نے کہا۔ "سائیں! ابھی آپ باہر مت نکلیں، ڈی آئی جی صاحب نے حکم دیا ہے کہ جب تک رمیش چند کی نشاندہی پر اس کے ساتھی پکڑے نہیں جاتے، آپ باہر نہیں جا سکتے۔"

"مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"سائیں، لیکن یہ ڈی آئی جی صاحب کا حکم ہے۔"

میں اچانک اُٹھ گیا اور ممتاز سے کہا۔ "تم ڈی آئی جی صاحب سے اس معاملے میں بات کرو۔ میں ابھی کراچی کے لیے نکل رہا ہوں۔"

"کیا مطلب؟" ممتاز نے حیرانی سے پوچھا۔

"وہ مردود مشہدی ہمیں میرپور خاص میں روکنا چاہ رہا ہے۔ ممکن ہے ہمارے کراچی پہنچنے سے اس کا پھر لاکھوں ڈالرز کا نقصان ہو جائے۔"

"ہاں، یہ بھی ممکن ہے۔" ہاشم نے کہا۔ "ورنہ کوئی دشمن، وہ بھی مشہدی جیسا گھٹیا اور کمینہ دشمن یوں علی اعلان تمہیں کہتا کہ اگر تم کراچی آئے تو تمہاری زندگی کا آخری دن ہوگا، کیا مشہدی جیسے گھاگ اور مکار آدمی سے ایسی توقع کی جا سکتی ہے؟"

"بات تو آپ کی دل کو لگتی ہے۔" ممتاز نے کہا۔ "لیکن میں نے اپنے جن آدمیوں کو بھیجا ہے، وہ واپس آ کر صورت حال بتا دیں تو پھر اس معاملے پر کچھ سوچتے ہیں۔"

"اس سے بھی کچھ معلوم نہیں ہوگا ممتاز!" میں نے کہا۔ "مشہدی نے اگر خریدا بھی ہوگا تو یہاں کے کسی مقامی فرد یا افراد کو خریدا ہوگا۔ ممکن ہے کوئی اس جعلی پیر کی عقیدت میں مشہدی کو ہمارے بارے میں اطلاعات فراہم کر رہا ہو۔" میں

نے کہا، پھر کچھ توقف کے بعد بولا۔ "رمیش چند عرف پیر احسان الحق کے کچھ خاص آدمی رمیش چند اور مشہدی کے تعلق کو یقیناً جانتے ہوں گے۔"

اسی وقت دروازے پر دستک دے کر ممتاز کا ایک اسلحہ بردار گارڈ اندر آیا اور اس نے جھک کر ممتاز سے کچھ کہا۔

"میرا خیال ہے کہ تمہارے آدمیوں کو ایسا کوئی مشکوک آدمی نظر نہیں آیا جو ہماری مخبری کر رہا ہو۔"

"ہاں سائیں!" ممتاز نے افسردگی سے کہا۔ "میرا آدمی یہ ہی اطلاع لے کر آیا تھا کہ ہماری حویلی کے اردگرد کوئی مشکوک آدمی نہیں ہے۔ بہت سے لوگ پیر سائیں کی حویلی کے پاس جمع ہیں لیکن وہ سب بھی جانے پہچانے لوگ ہیں۔"

"تم اس بہروپیے ہندو کو پیر سائیں کہہ رہے ہو۔ ابھی تک بہت سے لوگوں کو رمیش چند کی گرفتاری کا علم بھی نہیں ہوا ہوگا۔ میرا مطلب ہے کہ میر پور خاص سے باہر کے لوگوں کو ورنہ وہاں تو ایک مجمع ہوتا۔"

"ممتاز! ہمارا وقت پہلے ہی بہت ضائع ہو چکا ہے، اس وقت تک تو ہم حیدر آباد سے بھی آگے نکل گئے ہوتے۔ اب ہم لوگوں کو اجازت دو۔" میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ "تمہارا یہ احسان میں زندگی بھر نہیں بھولوں گا، اگر تم نہ ہوتے تو......"

"بس کریں بھیا!" ممتاز نے بُرا مان کر کہا۔ "آپ تیمور کے بڑے بھائی ہیں ارسلان کے بڑے بھائی ہیں تو مجھ سے اتنی غیریت کیوں برت رہے ہیں۔" پھر وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ "میں آپ کو اکیلا نہیں جانے دوں گا، میں اور میرے گارڈز بھی آپ کے ساتھ کراچی جائیں گے۔"

"بات کو سمجھنے کی کوشش کرو ممتاز!" میں نے کہا۔ "میرے ساتھ پہلے ہی کافی گارڈز ہیں، تمہارے گارڈز بھی ہمارے ساتھ چلے تو ایک جلوس بن جائے گا، اتنے لوگوں کو دیکھ کر تو کوئی بھی سمجھ جائے گا کہ اس جلوس میں کوئی خاص آدمی جا رہا ہے۔"

"ہم لوگ آپ کے ساتھ نہیں چلیں گے۔" ممتاز نے کہا۔ "ہم کچھ فاصلہ رکھ کر آپ کی گاڑی کے آگے اور پیچھے چلیں گے۔" پھر وہ خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ "بھیا! مجھے مت روکیں ورنہ اگر خدانخواستہ کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آ گیا تو میں کبھی خود کو معاف نہیں کر سکوں گا۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"ٹھیک ہے ممتاز!" میں نے کہا۔ "تم ہمارے ساتھ چل سکتے ہو لیکن گارڈز کی فوج ساتھ لینے کی ضرورت نہیں ہے، صرف چار بہترین آدمی اپنے ساتھ لے لو۔" پھر میں کچھ سوچ کر بولا۔ "ممتاز! میں چاہ رہا تھا کہ شائستہ اور نادیہ دونوں فی الحال یہیں رہیں۔"

"نہیں بھیا!" تیمور نے سنجیدگی سے کہا۔ "صرف وہی میری بات کو یوں رد کر سکتا تھا۔" "شائستہ اور نادیہ کو ساتھ لے جانے سے ہم بہت سے جھنجٹ سے بچ جائیں گے۔"

"کوئی جھنجٹ نہیں ہوگا۔ اگر ناکہ بندی ہوگی بھی تو ایس ایس پی علی کا نام ہی کافی ہوگا، پھر ہماری پشت پر ایم آئی کا ایک ذمے دار آفیسر اور ایک انتہائی سینئر اور تجربہ کار جرنلسٹ ہے۔"

"سائیں، میں پھر چلنے کی تیاری کرتا ہوں۔" ممتاز نے کہا۔

"بس پانچ منٹ لگیں گے۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی نادیہ کمرے میں آ گئی اور جھنجلا کر بولی۔ "آخر ہم لوگ یہاں سے چلتے کیوں نہیں؟ کیا آج بھی یہیں رہنے کا ارادہ ہے؟"

"تم تیاری کر لو۔" میں نے کہا۔ "ہم دس منٹ میں نکل رہے ہیں۔"

"مجھے کیا تیاری کرنا ہے، میرے پاس ایک شولڈر بیگ ہے، وہ بالکل تیار ہے۔ شائستہ کے پاس تو صرف وہی ایک جوڑا تھا جو اس نے پہن رکھا تھا، میں نے اسے اپنا جوڑا دے دیا ہے۔"

"ٹھیک ہے، ہم یہاں سے ابھی نکلتے ہیں" پھر میں تیمور سے مخاطب ہوا۔ "تیمور ذرا بلوچ کو میرے پاس بھیج دو۔"

تیمور کمرے سے باہر نکل گیا اور بلوچ کے ساتھ واپس آیا۔

"حکم واجہ؟" بلوچ نے کہا۔

"ہم لوگ ابھی کراچی کے لیے نکل رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "مجھے اطلاع ملی ہے کہ راستے میں ہم پر حملہ ہو سکتا ہے۔"

''اس کی تو فکر ہی مت کرو وڈیرا!'' بلوچ نے کہا۔
''میں پوری تیاری کے ساتھ آیا ہوں، میرے پاس سیون ایم ایم رائفلیں بھی ہیں اور ریپیٹر بھی ہیں، میں نے دو انتہائی طاقت ور بم بھی رکھ لیے تھے، اس کے علاوہ میرے پاس اسموک بم بھی ہیں۔''
''اس حساب سے تو تمہارے پاس توپ اور ٹینک بھی ہونا چاہیے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔
''آپ فکر مت کرو وڈیرا!'' بلوچ نے کہا۔ ''میرے ساتھ میرے چار بہترین گارڈز ہیں۔''
''تم ہماری گاڑی سے کچھ فاصلے پر اس انداز میں چلنا کہ جیسے تمہارا ہم سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔''
''ان سب بات کا فکر مت کرو وڈیرا!'' بلوچ نے کہا۔
''اس کے جانے کے بعد ممتاز آ گیا اور بولا۔
''چلیں بھیا! میں بالکل تیار ہوں۔''
اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا، میں نے اس سے کہا۔ ''ممتاز! مشہدی کا مخبر وہ انسپکٹر بھی تو ہوسکتا ہے جو رمیش چند کا مرید بھی ہے اور کشمور جانے سے گھبرا رہا تھا۔''
''ہاں۔'' ممتاز دبے دبے جوش کے ساتھ بولا۔ ''وہی ہوسکتا ہے، وہ تو رمیش چند کا انتہائی وفادار ہے۔''
''پھر اس نے ٹرانسفر رکوانے کو تم سے کیوں کہا؟'' میں نے پوچھا۔
''اس لیے کہ اس کا ٹرانسفر میں نے ہی کرایا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ رمیش چند اسے یہی جواب دے گا کہ ممتاز سومرو سے میری بنتی نہیں ہے، ہاں، اگر تم اس سے خود ہی بات کرلو تو تمہارا کام ہوجائے گا۔ ممکن ہے رمیش چند میرے پاس اپنے کسی آدمی کے ذریعے پیغام بھی بھیجتا اور انسپکٹر کی سفارش بھی کراتا لیکن اس سے پہلے ہم خود وہاں جا پہنچے۔'' پھر اس نے اپنے ایک آدمی کو آواز دی۔ ''علی مراد!''
اس کا گارڈ فوراً ہی حاضر ہوگیا۔
''بابا، ذرا بڑے صوبیدار (ایس ایچ او) کو تو بلا کر لا۔'' یوسف صاحب نے ابھی فوراً ایک ضروری کام سے بلایا ہے۔''
''حاضر سائیں!'' گارڈ نے کہا اور فوراً ہی وہاں سے نکل گیا۔
گھڑی کی سوئیاں بہت سست رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھیں، تقریباً بیس منٹ بعد مجھے انسپکٹر نظر آیا، وہ حویلی کے مین گیٹ سے موٹر سائیکل پر اندر داخل ہو رہا تھا۔
ممتاز بھی برآمدے ہی میں کھڑا ہوا تھا۔ انسپکٹر نے موٹر سائیکل سے اُتر کے اسے بہت ادب سے سلام کیا اور بولا۔
''حکم سائیں! ایسی کیا ایمرجنسی ہوگئی کہ آپ نے مجھے فوراً بلوایا ہے۔ میرے آدمی تو حویلی کے باہر موجود ہیں۔''
''اندر آ جاؤ بابا!'' ممتاز نے کہا۔ ''اندر بیٹھ کر بات کریں گے۔''
انسپکٹر نے الجھ کر اسے دیکھا کیوں کہ انسپکٹر کا لہجہ انتہائی سرد تھا۔
وہ جھجکتا ہوا اندر آ گیا لیکن بیٹھا نہیں۔
''بیٹھ جاؤ۔'' ممتاز کے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے کہا۔
''سائیں! میں ذرا جلدی میں ہوں۔'' انسپکٹر نے کہا۔
''آپ کو تو معلوم ہے کہ ضلع کے بڑے بڑے افسر یہاں موجود ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی مجھے بلا سکتا ہے۔''
''تم اگر جلدی میں ہو تو کشمور جانے کی تیاری کرو اور چارج کسی دوسرے افسر کو دے دو۔''
''سائیں! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' انسپکٹر گھبرا کر بولا۔
''تم مشہدی کو جانتے ہو؟'' ممتاز نے اچانک پوچھا۔
میں نے دیکھا کہ انسپکٹر کا چہرہ لمحے بھر کو متغیر ہوا لیکن وہ انسپکٹر تھا اور نہ جانے کتنے پاپڑ بیل کر اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پی کر اس عہدے تک پہنچا تھا۔ وہ فوراً ہی سنبھل گیا اور بولا۔ ''کون مشہدی سائیں؟''

"دیکھو اکرم!" ممتاز نے اس مرتبہ اسے انسپکٹر کہنے کی بجائے اس کے نام سے مخاطب کیا۔ "میں نے ہمیشہ قانون کا احترام کیا ہے، مجھے مجبور مت کرو کہ میں تم پر ہاتھ اٹھاؤں، تم تو خیر انتہائی کمینے اور گھٹیا آدمی ہو، جھوٹے بھی ہو لیکن تمہارے جسم پر جو وردی ہے، میں اس کا احترام کر رہا ہوں۔ مجھے سچ سچ بتاؤ کہ تم مشہدی کو جانتے ہو یا نہیں؟"

"سائیں، میں پھر آپ سے پوچھوں گا کہ کون مشہدی؟ یہ نام ایسا نہیں ہے کہ عام ہو اور اس نام کے کئی لوگ ہوں، میں کسی مشہدی کو نہیں جانتا۔"

"تم چاہتے ہو کہ میں تمہاری وردی اتار کے پوچھ گچھ کروں؟" ممتاز بپھر کر بولا۔

"سائیں! میں قانون کا ایک ذمے دار افسر ہوں، آپ میرے ساتھ ایسا سلوک نہیں کر سکتے۔"

"تم کسی بھی معزز آدمی کے ساتھ تھانے میں کیا کرتے ہو؟" ممتاز نے پوچھا۔

"کیا میں وہی کچھ نہیں کر سکتا؟"

"آپ قانون کو اپنے ہاتھ میں لیں گے؟" اس نے تھوک نگل کر کہا۔

"ہاں، اگر تم اسی طرح جھوٹ بولتے رہے تو میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔" پھر اس نے آواز لگائی۔ "علی مراد!"

علی مراد فوراً ہی چراغ کے جن کی طرح حاضر ہو گیا۔ "حکم سائیں؟"

"اس کمینے کو اس کمرے میں لے جاؤ جہاں ہم نے اس ڈپٹی پیر بمیش چند کو رکھا تھا، اس کی وردی اتار دو اور اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دو، پھر یہ سب کچھ ایک دم بتا دے گا۔"

"سائیں! میں اپنے جونیئر افسروں کو یہ بتا کر آیا ہوں کہ میں آپ کی حویلی جا رہا ہوں، اگر میں۔"

"تم اس کی فکر مت کرو۔" ممتاز نے کہا۔ "میں نے تمہارے سینئر افسر کو بتا دیا ہے کہ میں نے تمہیں یہاں کچھ پوچھ گچھ کے لیے بلوایا ہے۔" پھر اس نے کہا۔ "اپنا سیل فون مجھے دے دو۔ تمہارے کسی افسر یا ماتحت کی کال آئی تو میں خود اس سے بات کر لوں گا۔"

"یہ تو زیادتی ہے سائیں!" اس نے اپنا سیل فون ممتاز کو دیتے ہوئے کہا۔

اچانک ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے میرے ذہن میں آیا۔ میں نے ممتاز سے سیل فون لے کر اس میں ڈائل کیے ہوئے نمبر نکالے۔ آخری دفعہ اس نے لگاتار پانچ مرتبہ ایک ہی نمبر پر کال کی تھی، نام کی جگہ اس نے تین اسٹار بنائے ہوئے تھے۔

مجھے وہ نمبر کچھ جانا پہچانا لگا، میں نے اپنا سیل فون نکالا اور مشہدی کا نمبر سرچ کیا۔

اس نے جس نمبر پر کئی دفعہ کال کی تھی، وہ مشہدی کا نمبر تھا۔

انسپکٹر بھی سمجھ چکا تھا کہ اس کا جھوٹ کھل چکا ہے، میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔ "یہ جو تم نے لگاتار ٹرپل اسٹار کی کالز کی ہیں، یہ کون ہے؟"

"یہ..... میرا ایک دوست ہے۔" انسپکٹر مردہ لہجے میں بولا۔

میں نے اچانک وہی نمبر ڈائل کر دیا، دوسری طرف سے مشہدی کی آواز سنائی دی۔ "ہاں انسپکٹر! کیا خبر ہے، وہ لوگ وہاں سے نکلے یا نہیں؟"

"نکل چکے ہیں۔" میں نے حتی الامکان انسپکٹر کا لب ولہجہ اور آواز بنانے کی کوشش کی۔

"تم نے اپنے آدمی تو اچھی طرح چھپا کر بٹھا دیے ہیں نا! وہ کامران بہت حرامی ہے۔ اس سے بڑا حرامزادہ وہ تیمور ہے اور اس کے ساتھی دوسرے گارڈز بھی ہوں گے، اگر پہلے ہی ہلے میں تمہارے آدمی ناکام ہو گئے تو وہ ان دونوں کے ہاتھوں مارے جائیں گے۔ اور ہاں، مجھے وہ لڑکی ہر قیمت پر چاہیے، جو اُن کے ساتھ ہے۔"

"ہر قیمت پر!" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیوں تم اتنے حیران کیوں ہو؟" مشہدی نے پوچھا۔ "کیا تمہیں رقم نہیں ملی، پچاس لاکھ بھی بہت ہوتے ہیں انسپکٹر!"

"گھٹیا آدمی!" میں نے چیخ کر اپنی اصل آواز میں کہا۔

"تو کیا سمجھتا ہے، تو پچاس لاکھ میں میری بہن کا سودا کرے گا؟ اور میں تجھے یہ بتادوں کہ ہماری یہ بات چیت ریکارڈ ہو رہی ہے۔"

"ہوتی رہے۔" مشہدی نے کہا۔ "انسپکٹر جو کچھ بھی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، وہ اس کا خود ذمے دار ہے۔"

"تو شاید بھول گیا کہ تو اس سے پہلے مجھ سے انسپکٹر سمجھ کر بات کر رہا تھا، وہ باتیں بھی ریکارڈ پر ہیں۔"

تھوڑی دیر کے لیے دوسری طرف خاموشی چھا گئی، میں سمجھا کہ لائن کٹ گئی، میں نے کہا۔ "ہیلو؟"

"اس ریکارڈنگ سے بھی فرق تو اس وقت پڑے گا جب میں قانون کے ہاتھ آؤں گا۔" اس نے کہا۔ "میں اس وقت بھارت میں ہوں اور تو شاید جانتا نہیں ہے کہ میرے پاس بھارت کی شہریت بھی ہے۔ پاکستان کی شہریت میرے پاس بھی نہیں، یہاں تو میں نے سرمایہ کاری کی تھی اور بزنس کر رہا تھا، تمہاری حکومت میں عقل کے ایسے اندھے بیٹھے ہیں کہ انہیں صرف سرمائے سے غرض ہے، وہ تو کسی سرمایہ کار سے یہ بھی نہیں پوچھتے کہ سرمایہ کرنے والے شخص کا بیک گراؤنڈ کیا ہے۔ وہ جرائم پیشہ تو نہیں ہے۔"

"تجھ سے تو میں بعد میں بات کروں گا مشہدی۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "پہلے میں تیرے اس زر خرید افسر سے نمٹ لوں۔"

"اب بتا!" ممتاز نے کہا۔ "تو مشہدی کو جانتا ہے یا نہیں؟"

"اب جب اس نے خود ہی سب کچھ اگل دیا ہے تو مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں سائیں؟"

"اب میں جو کچھ پوچھوں سچ سچ بتانا ورنہ اب میں اس وردی کا لحاظ بھی نہیں کروں گا۔" ممتاز نے کہا۔

"مشہدی کا کیا پلان تھا؟"

"اس نے مجھ سے کہا تھا کہ تم اپنے کچھ آدمی میر پور خاص سے باہر نکلنے والے راستے پر بٹھا دو، میں نے کسی بھی پولیس والے کو اس میں شریک نہیں کیا بلکہ کچھ جرائم پیشہ افراد اور ڈاکوؤں کی خدمات حاصل کیں۔ میں نے انہیں چار مختلف جگہ چھپایا تھا کہ اگر ایک حملے سے تم لوگ بچ جاؤ تو تمہیں قتل کرنے کے لیے آگے ایک پارٹی اور بیٹھی ہو۔" میں نے جن لوگوں کو سب سے پہلے کھڑا کیا تھا، ان سے کہا تھا کہ وہ ہوائی فائرنگ کریں یا پھر کامران کی گاڑی کا ٹائر ناکارہ کر دیں اور وہاں دو تین انتہائی طاقت ور اسموک بم چھوڑ دیں، پھر ان کی آڑ میں اس لڑکی کو اٹھا لیں جو آپ کے ساتھ میں ہوگی۔"

"اب تم خود جا کر ان پوائنٹس کی نشان دہی کرو گے جہاں جہاں تمہارے آدمی بیٹھے ہیں۔"

"میں ان جگہوں کی نشاندہی کر دوں گا لیکن ان لوگوں کو اس بات کا علم نہیں ہونا چاہیے کہ ان کے بارے میں آپ کو میں نے بتایا ہے، ورنہ وہ مجھے اور میرے خاندان کے کسی بھی آدمی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔" انسپکٹر نے کہا۔

"اچھا!" میں نے کہا۔ "کیا وہ لوگ اتنے ہی طاقت ور اور خطرناک ہیں؟"

"وہ بہت ہی خطرناک لوگ ہیں سائیں!" انسپکٹر نے کہا۔

"ان میں سے زیادہ تعداد تو ایسے ڈاکوؤں کی ہے جن کی پشت پناہی یہاں کے وڈیرے اور جاگیردار کرتے ہیں۔ وہ اتنے سفاک ہو گئے ہیں کہ کسی انسان کو مارنا تو ان کے لیے ایسا ہی ہے جیسے کسی مکھی کو مارنا۔ انہیں پولیس کا کوئی خوف نہیں ہے، کیوں کہ پولیس کے بڑے افسران تو خود انہیں سلام کرتے ہیں۔"

"ان کی تعداد کیا ہے؟" ممتاز نے پوچھا۔ "ہر پوائنٹ پر کتنے کتنے لوگ ہیں؟"

"صحیح تعداد کا اندازہ تو مجھے بھی نہیں ہے لیکن میرا اندازہ ہے کہ ہر پوائنٹ پر کم سے کم آٹھ سے دس آدمی تو ہوں گے۔"

"اور وہ سب کے سب ڈاکو ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ان میں سے زیادہ تعداد ڈاکوؤں کی ہے، باقی لوگ بھی خطرناک قسم کے جرائم پیشہ ہیں اور مختلف جرائم میں ملوث ہیں۔"

"یہاں سے نکلنے کا وہی ایک راستہ ہے؟" میں نے پوچھا۔ "میں فضول میں خوں ریزی نہیں چاہتا تھا۔"

"ایک راستہ اور بھی ہے۔" انسپکٹر نے سر جھکا کر کہا۔ "لیکن وہاں بھی کچھ لوگ آپ کی گھات میں بیٹھے ہوں گے۔"

"چلو پھر، یوں ہے تو یوں ہی سہی۔" میں نے کہا۔ "میں تو خوں ریزی سے بچنا چاہ رہا تھا، لیکن جب اپنا ہی خون بہنے کا اندیشہ ہو تو پھر اس سے بچا نہیں جا سکتا۔"

"بھیا!" تیمور نے کہا۔ "پہلے میں اپنے آدمیوں کے ساتھ جاتا ہوں۔ دوسرے پوائنٹ پر بلوچ کے آدمی پہنچیں گے، اس سے اگلے پوائنٹ پر ممتاز کے آدمی پہنچیں گے۔ اس وقت تک میں اور بلوچ اپنے مشن سے فارغ ہو کر آخری پوائنٹ تک پہنچ جائیں گے۔"

"اس کا ایک حل اور بھی ہے۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "انسپکٹر ان لوگوں سے یہ بھی تو کہہ سکتا ہے کہ پولیس نے کامران اور اس کے ساتھیوں کو مزید دو دن میر پور خاص میں رکنے کو کہا ہے اس لیے آج کا پروگرام کینسل کر لیا گیا ہے۔"

"سائیں!" انسپکٹر نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "اگر ان کے ہٹنے کے بعد آپ نکل گئے تو وہ لوگ مجھ پر شک کریں گے۔"

"تم پر شک کیوں کریں گے، تم کہہ سکتے ہو کہ ایس ایس پی علی اور ڈی آئی جی صاحب نے ان لوگوں کو یہاں مزید دو دن کے لیے روک لیا ہے۔ میں ممتاز صاحب کی حویلی اس لیے گیا تھا کہ ان لوگوں کو ایس ایس پی صاحب کا تحریری حکم نامہ دے دوں، ویسے ایس ایس پی صاحب نے ان سے ٹیلی فون پر ہی بات کر لی ہے۔"

"ٹھیک ہے سائیں!" انسپکٹر نے کہا۔ "میں ان لوگوں کو وہاں سے ہٹائے دیتا ہوں..... لیکن..... کشمور جانے کے لیے....."

"اگر تم نے ہمارے ساتھ تعاون کیا تو تمہیں کشمور نہیں جانا پڑے گا۔" ممتاز نے کہا۔

"یار تم پولیس افسر ہو کر کشمور سے ایسے ڈر رہے ہو جیسے وہ کشمور نہ ہو کالا پانی ہو۔ انگریز انتہائی خطرناک قاتلوں کو کالے پانی کی سزا دیا کرتے تھے۔ وہ انہیں جزائر انڈیمان بھیج دیتے تھے۔"

"میں جانتا ہوں سر جی!" انسپکٹر نے کہا۔ "لیکن آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ آج کل کشمور سرکاری افسران کے لیے واقعی کالا پانی بن کر رہ گیا ہے۔"

"ہم یہ بھی تو کر سکتے ہیں کہ ان لوگوں کو گرفتار کرا دیں۔"

"ایسا مت کیجیے گا سائیں!" انسپکٹر خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ "پھر تو ان لوگوں کا شک سیدھا مجھ پر جائے گا۔"

"اس بات کو ابھی چھوڑو حسن!" میں نے کہا۔ "ہمارے پاس اتنا وقت کہاں ہے کہ اس بکھیڑے میں الجھیں، پھر چند ڈاکوؤں اور جرائم پیشہ افراد کو گرفتار کرنے سے حالات میں کون سی تبدیلی آ جائے گی۔"

"دوسرے ہی دن وہ لوگ پھر آزاد گھوم رہے ہوں گے۔ اس کا واحد حل یہ ہی ہے کہ انہیں موقع پا کر ہلاک کر دیا جائے۔"

"چلیے، آپ کہتے ہیں تو میں ان لوگوں کو ابھی نہیں چھیڑتا لیکن اکرم سے ان لوگوں کے ناموں کی لسٹ ضرور لے لوں گا اور جب بھی موقع ملا، انہیں ختم کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"سائیں، پھر میں چلوں؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"ابھی کہاں چلوں؟" ممتاز نے کہا۔ "تم ہمارے سامنے ان لوگوں کو وہاں سے ہٹنے کی ہدایات دو جو ہماری گھات میں بیٹھے ہیں۔"

انسپکٹر کے چہرے کا رنگ ایک مرتبہ پھر متغیر ہوا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اب بھی ہمارے ساتھ کوئی چالاکی کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی جیب سے سیل فون نکالا اور کوئی نمبر ڈائل کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی تیمور اور ممتاز کا ریوالور بھی نکل آیا اور ان دونوں کا رخ انسپکٹر کی طرف ہو گیا۔

"ہیلو، اللہ ڈینو!" انسپکٹر نے سلسلہ ملنے پر کہا۔ "بابا! اپنے لوگوں کو بتا دو کہ آج کا پروگرام کینسل ہو گیا ہے۔ ایس ایس پی صاحب نے کامران اور اس کے ساتھیوں کی دو دن تک نگرانی کرنے کا حکم دیا ہے۔ ابھی پیر سائیں کے سلسلے میں ان کے بیانات ہوں گے۔ آئی جی صاحب تو ابھی یہاں آ رہے ہیں، تم لوگ دو دن کے لیے یہاں سے غائب ہو جاؤ۔" نہیں خطرہ تو کوئی نہیں ہے لیکن..... وہی تو سب سے بڑا کانٹا ہے، اس ایس ایس پی کا کوئی علاج کرنا ہی پڑے گا..... ہاں، وہ بھی ہے..... لیکن..... وہ تو ہمارے معاملات میں دخل نہیں دیتا ہے، وہ بہت مصروف آدمی ہے، بہت بڑا صحافی ہے، اس

کے پاس اتنا وقت کہاں ہے؟ ٹھیک ہے، تم وہاں سے ہٹنے کے بعد مجھے کال کرو، میں انتظار کر رہا ہوں۔"
انسپکٹر نے ایک مرتبہ پھر جانا چاہا لیکن ممتاز نے اسے روک دیا اور کہا کہ جب تک کامران اور اس کے ساتھی یہاں سے نکل نہیں جاتے، تم یہیں رہو گے۔
"سائیں لیکن......"
"کوئی لیکن ویکن نہیں۔" ممتاز نے درشت لہجے میں کہا۔ "پھر اس نے اپنے آدمی کو آواز دی۔ "علی مراد! ہمارے اس مہمان کو اس کمرے میں لے جاؤ جہاں اس کا پہرہ کر گیا ہے، اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دینا۔"
"لیکن سائیں۔"
"چلو اندر!" ممتاز نے ریوالور کی نال سے اندر کی طرف اشارہ کیا۔

☆......☆

ہم کراچی پہنچے تو دوپہر کے ڈھائی بج رہے تھے۔ ممتاز ہمارے ساتھ کراچی تک آیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے چار گارڈز بھی تھے، میں نے اس سے ایک دو دن کراچی میں رکنے کو کہا لیکن اس نے معذرت کر لی اور بولا کہ اس وقت میرا میر پور خاص میں ہونا ضروری ہے۔
شائستہ اب خاصی حد تک نارمل ہو چکی تھی لیکن اسے یہ علم نہیں تھا کہ جب ہمارا گھر دھماکے سے اُڑا تو اس میں ارسلان کی موجودگی کا بھی شبہ تھا۔ شبہ کیا، ہم سب کو تو یقین تھا۔ اگر ہمیں مشہدی ہی کے ایک آدمی کے ذریعے معلوم نہ ہوتا کہ ارسلان زندہ ہے، ہم ابھی تک اسے مردہ ہی سمجھے بیٹھے ہوتے۔
نادیہ، شائستہ کو ڈھیروں شاپنگ کرائی تھی، ان کی نگرانی کے لیے میں نے ہاشم اور ندیم کو بھی بھیج دیا تھا۔
طریقہ کار وہی پرانا تھا۔ ان دونوں کو شائستہ اور نادیہ سے دور رہ کر ان کی نگرانی کرنا تھی۔
شائستہ ان دنوں بہت خوش تھی اور اس کا پرانا رنگ وروپ بہت تیزی سے واپس آ رہا تھا۔
مجھے انکل وقار کے ذریعے را کے ان ایجنٹوں کے نام اور پتے مل گئے تھے جو پاکستان اور بھارت میں سرگرم تھے، میں اب بھی فرصت میں ان سے نمٹنا چاہتا تھا، مجھے سب سے زیادہ فکر شائستہ کی تھی۔ اس مہم جوئی میں وہ پھر اکیلی رہ جاتی اور مشہدی پھر کوئی وار کر سکتا تھا۔ اس مرتبہ وہ شائستہ کو ایسی جگہ پہنچاتا کہ اس کا سراغ ملنا بھی محال ہو جاتا۔
انکل وقار سے اب تقریباً ہفتے میں دو تین ملاقاتیں ہو رہی تھیں اور وہ بھی اب ہمارے گھر کے ایک فرد کی طرح ہو گئے تھے۔
ایک دن اچانک مجھے خیال آیا کہ میں شائستہ اور نادیہ کو انکل وقار کی حفاظت میں تو چھوڑ سکتا ہوں، میں نے انکل وقار سے اس کا تذکرہ کیا تو وہ سنجیدہ ہو کر بولے۔ "کامران! تم ابھی تک یہ سوچ ہی رہے ہو کہ شائستہ کو میرے پاس چھوڑ دیا نہیں۔ یہ بھی تمہارا گھر ہے، پھر تمہارا باپ میرا دوست ہی تھا۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میرے جیتے جی شائستہ پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔"
"مجھے اس بات کا تو یقین ہے انکل!" میں نے کہا۔ "لیکن سب سے بڑا مرحلہ شائستہ کی رضامندی کا ہے۔ وہ اتنے عرصے بعد تو مجھے ملی ہے۔ اتنی آسانی سے مجھے نہیں جانے دے گی۔"
"بھئی، یہ مسئلہ تو تم ہی حل کر سکتے ہو یا پھر نادیہ اسے سمجھا سکتی ہے۔ وہ دونوں ساتھ رہیں گی تو زیادہ مطمئن ہوں گی۔"
اس دن رات کے کھانے کے بعد بلوچ اچانک آ گیا اور بولا۔ "واجہ! میں بہت زبردست خبر لے کر آیا ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ مشہدی کا بلایا ہوا کرائے کا ایک قاتل ہوٹل شیرٹن میں ٹھہرا ہوا ہے۔"
"تمہیں یہ اطلاع کہاں سے ملی؟" میں نے پوچھا۔
"واجہ! میں نے آپ کو بتایا تو تھا کہ میرے کچھ آدمی مشہدی کے ساتھ بھی کام کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک آدمی کو یہ ڈیوٹی سونپی گئی ہے کہ وہ مشہدی کے مہمان کو ایک سوٹ کیس شیرٹن میں پہنچائے۔"
"اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ وہ مہمان کرائے کا قاتل ہی ہے جو مشہدی کی دعوت پر یہاں آیا ہے۔"
"واجہ! کل ادھر ایک مخالف پارٹی کے آدمی کا جلسہ ہے، اس جلسے سے قطب الدین صاحب بھی خطاب کریں گے،

والجہ آپ تو جانتے ہو کہ قطب الدین صاحب مشہدی کے دشمن ہیں اور اس کے خلاف بیانات دیتے رہتے ہیں، آپ شاید بھول گئے کہ ان کا نام بھی ان افراد کی ہٹ لسٹ میں شامل ہے جن کے لیے کرائے کے وہ قاتل بلوائے گئے ہیں۔"

"یار، بات ذرا مختصر کیا کرو۔" میں نے کہا۔

"آپ کے ذہن سے تو بہت سی باتیں نکل جاتی ہیں اس لیے آپ کو پوری بات بتانا پڑتی ہے۔" بلوچ نے ہنس کر کہا۔

"لیکن اس سے یہ کب ثابت ہو رہا ہے کہ شیرٹن میں مقیم غیر ملکی کرائے کا قاتل ہے؟" میں نے الجھ کر پوچھا۔

"میرے آدمی کو حکم ملا ہے کہ اس مہمان کو ایک سوٹ کیس پہنچائے، میرے آدمی نے اپنے طور پر معلوم کر لیا ہے کہ اس سوٹ کیس میں جدید نوعیت کا اسلحہ ہوگا، بڑے ہوٹلوں میں آج کل کوئی بھی شخص اسلحہ لے کر تو جا نہیں سکتا ہے، ہوٹل کی سیکورٹی تو سکینر کی مدد سے مہمان کے لباس یا سامان میں چھپا ہوا چھوٹا سا پستول بھی برآمد کر لیتی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ وہ شخص ان ہی لوگوں میں سے ایک ہے، وہ پرسوں ویسے ہی کوئی کارروائی کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔"

"ہاں، تمہاری بات میں وزن ہے۔" میں نے کہا۔

"تمہارا آدمی وہ سوٹ کیس لے کر کب جائے گا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ آج رات دس، ساڑھے دس بجے تک وہاں جائے گا، مشہدی نے اب بھی رات کی شفٹ کے کچھ سیکورٹی اہل کاروں کو خرید رکھا ہے، وہ شخص ہوٹل کے پچھلے دروازے سے اندر جائے گا اور اس شخص کو سوٹ کیس پہنچا کر واپس آ جائے گا۔"

"پھر ہم لوگ بھی چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تم اپنے اس آدمی کو دو تین پسٹل اور وہ خصوصی خنجر بھی دے دینا جو تیمور کے پاس ہیں۔"

"اس کی تو فکر مت کرو والجہ!" بلوچ نے ہنس کر کہا۔

"ہم لوگوں کو اتنا ہلکا مت لو۔ ہم لوگ ہوٹل کے سامنے والے دروازے سے جائیں گے اور ہتھیار لے کر جائیں گے، کچھ تھوڑے بہت تعلقات آپ کے اس خادم کے بھی ہیں۔"

"پھر تم اپنے آدمی سے اس غیر ملکی کا کمرا نمبر معلوم کر لو اور اسے ہدایت کر دو کہ وہ کوئی بھی بہانہ بنا کر وہاں بارہ بجے سے پہلے نہ پہنچے۔"

"وہ کیوں والجہ؟" بلوچ نے پوچھا۔

"بھئی جب تمہارا آدمی اس غیر ملکی کو اسلحہ پہنچا دے گا تو وہ بھی مسلح ہو جائے گا، پھر اس سے نمٹنا ذرا مشکل ہوگا۔"

"میری بات پر بلوچ کھلکھلا کر ہنس پڑا، پھر فوراً ہی سنجیدہ ہو کر بولا۔ "والجہ؟ معاف کرنا میں اپنی ہنسی پر کنٹرول نہیں کر سکا، وہ غیر ملکی بالکل ہی نہتا نہیں ہوگا۔ اس کے پاس ایک آدھ ریوالور یا پسٹل ضرور ہوگا، پھر وہ امریکا کی مشہور کرمنل ایجنسی کا آدمی ہے، ریوالور کے علاوہ بھی اس کے پاس کچھ ایسے ہتھیار ہوں گے جو وہ ضرورت پڑنے پر استعمال کر سکے گا۔"

مجھے اپنی احمقانہ بات پر ہنسی آ گئی، میں نے کہا۔ "یار بلوچ! میں آج کل کچھ ایسی پریشانی میں ہوں کہ مجھے سامنے کی بات بھی نظر نہیں آتی ہے، ظاہر ہے، وہ دنیا کا مانا ہوا دہشت گرد ہے تو وہاں پھولوں کے ہار لے کر تو نہیں بیٹھا ہوگا۔ نہ ہی وہ اتنا بے بس ہے کہ ہوٹل میں ہتھیار لے کر داخل نہ ہو سکے، میرا خیال ہے کہ اس نے مشہدی سے کسی مخصوص اسلحے کی فرمائش کی ہوگی، اس میں ہینڈ گرنیڈ بھی ہو سکتے ہیں، وہ چار رائفل بھی ہو سکتی ہے اور زہریلی گیس کے بم بھی۔ میری عقل پر آج کل پتھر پڑے ہوئے ہیں۔"

"ہوتا ہے والجہ، ہوتا ہے۔" بلوچ نے ہنس کر کہا۔ "کبھی کبھی بالکل سامنے کی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی ہے۔"

"تو پھر طے ہے کہ ہم آج شیرٹن چلیں گے۔"

☆......☆

یہ پرتجسس، سنسنی خیز اور لرزہ خیز آپ بیتی ابھی جاری ہے۔
بقیہ واقعات آئندہ ماہ کے "سچی کہانیاں" میں ملاحظہ فرمائیں



پہلے سوچ لیتے

رخسانہ نباء

ایک شخص کی کہانی جو ان دیکھی قوت کے زیر اثر تھا

میری طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے گھر والے مجھے اسپتال لے گئے۔ وہاں ڈاکٹر نے مجھے تین دن کے لیے ایڈمٹ کرلیا۔ میرے ساتھ والے بیڈ پر ایک بزرگ خاتون داخل تھیں۔ میں نے دیکھا کہ تین دن تک کوئی بھی ان کی عیادت کو نہ آیا۔ اگر کوئی دوائی منگوانی پڑتی تو اس کے لیے بھی اجنبی لوگ ہی مدد کرتے تھے۔ ان تین دنوں میں میرے بھائی نے اس بزرگ عورت کی اچھی خدمت کی۔ تیسرے دن جب میری چھٹی ہوئی تو وہ خاتون رونے لگی اور بولی۔ مجھے دوبارہ ملنے ضرور آنا، گھر آ کر مجھے بار بار ان ہی کا خیال آ رہا تھا کہ ان کا خیال کون رکھے گا؟ ان کا کوئی اپنا ہے یا کہ وہ اکیلی ہے، میرے ذہن میں تھا کہ شاید ان کے بیٹے شادی کے بعد الگ ہو گئے ہوں گے۔ بوڑھی ماں کو تنہا چھوڑ دیا ان لوگوں نے، کتنے بے مروت ہیں ان کے بیٹے، پھر سوچتی کہ ان کی بیویاں بھی کیسی ہیں جو اس بوڑھی عورت کو جس کو میں دادی کہہ کر بلاتی تھی، کو چھوڑ کر اپنی زندگی سکون سے گزار رہی ہیں۔ لڑکیاں شادی کے بعد یہ کیوں بھول جاتی ہے کہ جو ماں باپ چھوڑ کر آئی ہیں وہ ساس سسر کے روپ میں انہیں مل گئے ہیں۔ نندیں اور دیور اس کے اپنے بہن بھائی ہیں، مگر یہ میری سوچ تھی، لیکن جب میں ان سے ملی تو سب کچھ اس کے برعکس تھا۔

بہت اصرار کے بعد آخر بھائی کو منا ہی لیا۔ میں نے کہا بھائی کتنی اچھی تھی وہ دادی، کتنی دعائیں دیتی تھی، دو دن منانے کو لگے بھائی کو۔

جب میں اُن سے ملی تو وہ بہت خوش ہوئی کہ کوئی مجھ سے ملنے آیا ہے۔ میں نے ذرا ڈرتے ڈرتے ان سے سوال کیا۔

''میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں کیا آپ مجھے بتانا پسند کریں گی۔''

''ہاں بیٹی کیوں نہیں پوچھو ضرور بتاؤں گی۔''

''تو پھر دادی جی پہلے یہ بتایئے کہ آپ کے بیٹے بہو کوئی بھی آپ کو ملنے نہیں آتا کیا، وہ سب آپ کو بھول گئے ہیں۔''

''میری بیٹی'' الفاظ انہوں نے دہرائے، بھول گئے اور ساتھ ہی آنکھوں سے نہ ختم ہونے والے آنسو نکل پڑے، جیسے صدیوں سے بے قرار تھے پلکوں کی دہلیز عبور کرنے کے لیے۔ اس عورت کا انگ انگ بتا رہا تھا کہ اس کی جوانی درد میں گزری ہے۔ اس کی عمر رسیدہ زندگی کسی پچھتاوے کی آگ میں جل رہی ہے۔ اس نے دکھوں میں دبی ہوئی ایک لمبی آہ کے ساتھ بتانا شروع کیا۔

میری تین بیٹیاں اور ایک ہی بیٹا تھا۔ وہ تینوں بیٹوں

سے چھوٹا تھا، میرا شوہر ایکسیڈنٹ میں اس دنیا میں غم جھیلنے کو مجھے، بچوں سمیت تنہا چھوڑ گیا، اب میرا واحد سہارا میرا بیٹا حماد تھا۔ میں نے حماد اور تینوں بچیوں کی کفالت کے لیے گھر میں لوگوں کے کپڑے سلائی کرنا شروع کردیے۔ بچیاں بڑی ہوئیں تو انہیں بھی سلائی کی طرف لگا دیا۔ یہ بھی اپنے بھائی کے مستقبل کے لیے میرے ہاتھ بٹانے لگیں۔ میرا بیٹا حماد بہت دل لگا کر پڑھتا تھا، نہ کوئی شرارت، نہ کبھی کسی سے جھگڑا لڑائی۔ وہ تو بس یہی کہتا کہ امی میں آپ سب کی پریشانیاں ختم کردوں گا۔ حماد میرا بیٹا میٹرک کے امتحان سے فارغ تھا، تو کہنے لگا۔

کہنے لگیں۔ ''امی آپ جاؤ اور حماد کو واپس لے آؤ۔'' میں سوچ رہی تھی کہ اگر کشمیر حماد کے پاس جاؤں تو بچیاں اکیلی ہو جاتیں، لیکن میری بچیوں نے مجھے حوصلہ دیا کہ امی آپ ہماری فکر نہ کریں، ہم اپنا خیال رکھ سکتی ہیں، آپ جائیں اور حماد بھائی کو لے آئیں۔ اللہ کے سپرد کہہ کر میں بچیوں سے ایک دن اور ایک رات کے لیے دور ہو گئی۔

کشمیر جا کر دیکھا تو میں حیران رہ گئی کہ واقعی یہ حماد کو کیا ہو گیا، اس کی عادتیں تو یکسر طور پر بدل چکی تھیں۔ میں نے اپنی بہن سے پوچھا کہ ٹھیک ٹھیک بتاؤ اسے کیا ہوا تھا جس کی وجہ سے یہ ایسا کر رہا ہے تو اُس نے بتایا کہ مجھے تو لگتا



''امی گھر میں بھی فارغ ہوں کیوں نہ میں کشمیر آنٹی کے گھر کچھ دن کے لیے چلا جاؤں۔'' میں نے بھی منع نہ کیا اور جانے کی اجازت دے دی۔ وہاں گئے ہوئے اسے ابھی ایک ہی ہفتہ ہوا تھا کہ میری بہن کا پیغام آیا کہ ہاجرہ تمہارا بیٹا حماد بہت تنگ کرتا ہے، بہت بدتمیز ہے۔ جب جی چاہتا ہے بے ہوش ہو جاتا ہے اور الٹی سیدھی باتیں بھی کرتا ہے، مہربانی کرو اور آکر اپنے بیٹے کو لے جاؤ، مجھے بہت پریشانی ہوئی کہ میرا بیٹا ایسا تو نہیں تھا، ضرور میری بہن اس سے تنگ آ گئی ہو گی، اس لیے ایسا کہہ رہی ہے۔ میری تینوں بیٹیاں

ہے کہ کسی ہوائی چیز کا سایا ہو گیا ہے اس پر۔ ہوائی چیز یعنی جن، بھوت، چڑیل وغیرہ کا۔ ہاں ہاجرہ بہن ہمارے پیچھے والی پہاڑی کے بارے میں عجیب و غریب داستانیں مشہور ہیں۔ اکثر رات کو وہاں رنگ برنگی روشنیوں کے ساتھ ناچ گانے کی بھی آواز آتی رہتی ہے۔ اس کو میں نے منع کیا تھا کہ حماد جہاں چاہو گھومو پھرو، مگر اس پہاڑی کی طرف مت جانا، میرے منع کرنے کے باوجود یہ وہاں چلا گیا، تب سے اس کی حالت ایسی ہو گئی ہے۔ یہ تو شکر ہے خدا کا کہ رات کو نہیں گیا، ورنہ زندہ واپس نہ آتا۔ اسی حالت میں، میں

اپنے بیٹے کو لے کر گھر آ گئی یہاں آ کر بھی اس کو بے ہوشی کے دورے پڑنے لگے۔

آج پھر حماد کو دورہ پڑا تو ہمسائی عورت جو میرے پاس بیٹھی ہوئی تھی، وہ بولی۔

''بہن تمہارا بیٹا بھی لڑکیوں کی طرح ڈرامے کرنے لگا ہے۔ اکثر شادی سے پہلے لڑکیوں کو جن بھوت کے دورے پڑتے تھے، یہ سننے میں آیا ہے، مگر کسی لڑکے کو بھی یہ شے ہو سکتی ہے کیا؟'' ہاجرہ، بہن کہیں تمہارا بیٹا بھی تو کسی لڑکی کو دل تو نہیں دے بیٹھا۔'' وہ ہمسائی اکثر ایسی ہی باتیں کرتی اب تو مجھ غریب کو عادت ہو گئی تھی اس کی باتیں سننے کی۔

میں اپنے بیٹے کا علاج بھی نہیں کر سکتی تھی، ڈاکٹر یا سیانے پیسوں کے بغیر تو بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے، گھر کے چھوٹے موٹے اخراجات ہی ہمارے لیے بہت بھاری تھے، بجلی، گیس کا بل یہ تو خدا کا شکر تھا کہ سر چھپانے کے لیے چھوٹا سا گھر اپنا تھا، صحن بھی چھوٹا سا تھا، جس میں صرف ایک دو چارپائی ہی بچھتی، اس تنگ دستی میں حماد کی بیماری پریشانی کا باعث بنی ہوئی تھی۔ حماد پر جب بھی دورہ پڑتا وہ بھی بال نوچتا، کبھی موٹی موٹی آنکھیں نکالتا، اصل میں حماد کی آنکھیں چھوٹی تھیں، لیکن جب دورے کی حالت میں ہوتا تو آنکھیں موٹی اور اتنی سرخ ہو جاتیں کہ دیکھنے والا گھبرا جاتا۔ میری چھوٹی بیٹی فریحہ ہر وقت، دن رات بھائی کے ساتھ رہتی اور اس کی صحت کی دعائیں کرتی، ویسے تو تینوں بہنیں بھائی پر جان نچھاور کرتی تھیں، مگر فریحہ پہلے بھی بھائی کے ساتھ سہیلیوں کی طرح ہر بات شیئر کرتی تھی۔ دونوں بہن بھائیوں میں بہت پیار تھا، مگر حماد اب فریحہ سے کم ہی باتیں کرتا تھا، مگر فریحہ کو معلوم تھا کہ بھائی ٹھیک نہیں ہے، اس لیے وہ ہر لمحہ بھائی ہی کے پاس رہتی۔ کئی بار حماد نے اس کو ڈرایا بھی، لیکن بہنیں کبھی بھی بھائیوں کو تکلیف میں نہیں چھوڑتی ہیں۔

میں ماں ہونے کے ناتے کئی بار ہاتھ جوڑتی۔

''دیکھو حماد بیٹا لوگ باتیں کرتے ہیں کہ ماں کو سہارا دینے کی بجائے بیٹا خود ہی سہارے پہ جینا چاہتا ہے۔''

یا کبھی اس نادیدہ روح کو مخاطب کر کے کہتی۔

''میری بوڑھی کی بات مانو تو تم جو کوئی بھی ہو چلی جاؤ۔ میرا ایک ہی بیٹا ہے، اس کو مت تنگ کرو، خدا کے لیے اسے چھوڑ دو۔'' اس کے بعد ایک زوردار تھپڑ میرے منہ پر لگتا اور میں لڑکھڑاتی ہوئی دور ہو جاتی اور پھر ایک ڈراؤنی یا بھی خوب صورت آواز میں بھی بولتا۔

''تم کون ہوتی ہو مجھے اس سے دور کرنے والی، جو کوئی بھی میرے اور حماد کے درمیان جدائی کا سبب بنے گا، میں اُس کو ختم کر دوں گی۔''

ایک دن حماد اسکول سے واپس آ رہا تھا کہ راستے میں ہی گر پڑا۔ ہماری ہمسائی نے آ کر بتایا کہ تمہارا بیٹا گر پڑا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے یہاں گھر تک لائی ہوں۔ لگتا ہے تمہارا بیٹا کشمیر کسی کو بہت چاہنے لگا تھا۔ اس کا ایک ہی حل ہے کہ تم اُس لڑکی سے اس کی شادی کروا دو۔ میں پہلے بھی تمہیں کہہ چکی ہوں تم اس کو پڑھا کر کیا کرو گی، اب یہ تیرے ہاتھ سے گیا۔ یہ باتیں سُن سُن کر میں پتھر ہو چکی تھی۔

مسلسل 6 ماہ سے میرا بیٹا کسی غیبی چیز کی گرفت میں چور ہو رہا تھا۔ میں تو اپنے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی تھی کہ میری کسی بیٹی کے ساتھ ایسا نہیں ہوا، ورنہ لوگ بیٹے کو معاف نہیں کرتے۔ بیٹی ہوتی تو نجانے کیا کیا الزام لگتے۔

ایک دن وہ ہمسائی مجھ سے کہنے لگی۔

''دیکھو ہاجرہ، بہن میں ایک قاری صاحب کو لاتی ہوں وہ بہت سیانا ہے، سارا دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دیں گے۔'' ہمسائی عورت باتیں کرتی ہوئی باہر نکل گئی اور میں اپنے بیٹے کے مڑے ہوئے ہاتھ پاؤں دیکھ دیکھ کر پریشان ہو رہی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد ہمسائی عورت ایک معزز آدمی کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ ''آیئے آیئے قاری صاحب'' میں نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو ایک درد بھری آہ کے ساتھ آنکھیں بند کرتے ہوئے سارا کرب اندر دبا دیا اور قاری صاحب کو حماد کے پاس رکھی ہوئی کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ قاری صاحب حماد کی طرف بڑے غور سے دیکھتے ہوئے کچھ منہ میں پڑھنے لگے۔ جیسے جیسے قاری صاحب حماد پر پھونکنے جاتے ویسے ویسے حماد کی تکلیف میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ قاری صاحب نے حماد کے بالوں کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ رکھا تھا اور میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ نجانے اب میرے بیٹے کے ساتھ کیا ہوگا۔

''کچھ نہیں ہوتا بہن پریشان نہ ہو، میں ابھی اس کو ٹھیک کر دیتا ہوں۔ یہ ہوائی چیزیں اتنی جلدی نہ بولتی ہیں

اور نہ قابو میں آتی ہیں۔" ابھی قاری صاحب بول ہی رہے تھے کہ حماد ایک جھٹکے کے ساتھ اُٹھ بیٹھا اور نسوانی آواز میں بولنے لگا۔

"او قاری تیرا علم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، جاؤ چلے جاؤ، مجھے قابو نہیں کر سکتے۔ یہ تیرے بس میں نہیں اور حماد سے کوئی بھی مجھے جدا نہیں کر سکتا۔ اگر ایسا کرنے کی کسی نے کوشش کی تو بہت نقصان ہوگا۔ میں اپنا خاندان اس کے لیے چھوڑ آئی ہوں، اب اس کو نہیں چھوڑوں گی۔"

"تم اس طرح نہیں مانو گی۔" جیسے ہی قاری صاحب نے ڈنڈا ہاتھ میں پکڑا حماد کی آنکھیں ایسے گھومیں جیسے چابی کے ساتھ کسی کھلونے کو گھمایا جائے، حماد کی سُرخ سُرخ آنکھیں ڈنڈے پر جا ٹکیں اور ڈنڈا قاری صاحب کے ہاتھ سے نکل کر ہوا میں لہرانے لگا اور ساتھ ہی قاری صاحب پر ڈنڈے کی چوٹیں لگنے لگیں، قاری صاحب تو پاؤں سر پر رکھ کر بھاگ گئے، ساتھ ہی ہمسائی عورت یہ سارا ماجرا دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ وہ بھی جلدی سے اُٹھی، مگر اس سے پہلے حماد کی اگلی حرکت میں آ چکی تھی اور وہ ہمسائی عورت اوپر کو اُٹھی اور اپنے گھر کے صحن میں جا گری۔ اس دن کے بعد بھی ہمسائی عورت نے حماد کے خلاف بات نہ کی اور نہ ہی میرے گھر کا رُخ کیا۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ حماد کو اگر کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو وہ اس کے پاس پڑی ہوتی۔ اگر گھر میں کھانے پکانے کو کچھ نہ ہوتا تو حماد کچن میں جاتا اور پھر واپس آ کر وہ کہتا۔ "جاؤ جی جی چاہتا ہے وہ پکاؤ۔" تو میں بہت حیران ہوتی اور ساتھ خوشی بھی ہوتی کہ پیسے خرچ کیے بغیر ہر چیز مجھے میسر ہو جاتی ہے، بس پھر مجھ غریب بے بس عورت کی آنکھوں پہ لالچ کی پٹی بندھ گئی اور میں نے جان بوجھ کر اپنے بیٹے کا علاج نہ کروایا، کیوں کہ جو چیزیں ہمیں بغیر پریشانی کے مل رہی تھیں، وہ چھوٹ جائیں گی۔ پہلے ہمارے گھر میں کئی کئی دن فاقے رہتے تھے اور اب ہمارے گھر میں کھانے کو سب کچھ مل رہا تھا۔ میں اس سہولت کو گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ اب تو حماد کو بھی بہت کم دورے پڑتے تھے۔ کبھی کبھی شرارت کر دیا کرتا تھا اور ہم کچھ دیر کے لیے پریشان ہو جاتے تھے، پھر سب کچھ ٹھیک ہو جاتا تھا اب صرف اس کی شرارتیں ہی باقی رہ گئی تھیں،

میں نے بھی اب اس پر توجہ دینا چھوڑ دی تھی، کیوں کہ وہ باقاعدگی کے ساتھ پڑھائی بھی کرتا تھا۔ اگر ہم کہتے کہ حماد آج کھانے کو کچھ نہیں ہے تو فوراً ہر چیز موجود ہوتی تھی، اب میرا خیال تھا کہ جو کوئی بھی ہے حماد کے ساتھ وہ اس کو نقصان نہیں پہنچائے گی اور یہی میں نے غلطی کی تھی۔

حماد اور فریحہ دونوں پڑھتے تھے، اس لیے دونوں اکٹھے ہی رہتے تھے، رات کو مطالعہ کرتے اور اسی کمرے میں سو جاتے۔ فریحہ اپنے بھائی کو تنہا نہ چھوڑتی تھی۔ وہ رات کو اس کے ساتھ ہی اُسی کے کمرے میں سوتی تھی، آج رات کو بھی دونوں بہن بھائی پڑھتے پڑھتے سو گئے تھے، حماد بھی فریحہ کے بغیر نہیں سوتا تھا۔ اگر فریحہ ہمارے ساتھ سوتی تو وہ اُٹھا دیتا۔ بچپن سے دونوں اکٹھے رہتے تھے اس رات کو بھی اکٹھے سوئے تھے، مگر اس روز حماد نے آدھی رات کو اُٹھ کر الماری سے فریحہ کے سارے کپڑے نکال کر پھاڑ دیے، کچھ کپڑے بکھیر دیے، ٹوتھ پیسٹ کریم جو حماد نے ہی فریحہ کو لا کر دی تھی، ساری کمرے میں پھیلا دی اور خالی ٹیوبیں فریحہ کو جگا کر اُس کے کانوں میں ٹھونسنے لگا۔ فریحہ ایک دم ڈر گئی۔

"بھائی کیا بات ہے۔"

"میں تمہارے کان بنا رہا ہوں۔"

"کان۔" فریحہ بولی۔

"ہاں کان، کیوں کہ تم میرے گھوڑے ہو۔ اُٹھو، میرے لیے گھوڑا بنو۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو۔"

"ہاں میرا حکم مانو ورنہ تجھے مار دوں گی۔"

"اچھا اچھا میں گھوڑا بنتی ہوں۔" فریحہ دونوں ہاتھ زمین میں رکھ کر گھوڑا والے انداز میں منہ نیچے کر کے جھک گئی۔ حماد اس کے اوپر بیٹھ کر بولا۔

"چل میرے گھوڑے یہ ساری گھاس تمہارے لیے ہے۔ تازہ تازہ ہے اس کو کھاؤ۔" فریحہ بچاری جان چھڑوانے کی ترکیب سوچنے لگی، مگر حماد اس کو دروازے کی طرف جانے نہیں دیتا تھا۔ فریحہ نے گھوڑا بننے انداز میں چلتے ہوئے دروازے کی طرف چلنے لگی۔ دروازے کے پاس پہنچ کر فریحہ نے اپنے سارے زور کے ساتھ چیختے ہوئے اپنی امی اور بہنوں کو آواز دی، ساتھ ہی تو تھے باقی گھر والے، کیوں کہ گھر چھوٹا ہونے کی وجہ سے فریحہ کو

زیادہ آوازیں دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، میں بھاگتی ہوئی فریحہ اور حماد کے پاس پہنچی تو دیکھا کے فریحہ گھوڑا بنی ہوئی ہے اور حماد اس کے اوپر بیٹھا ہوا ہے، یہ دیکھ کر میں پریشان تو ہوئی، مگر ہمت کر کے آگے بڑھی۔

حماد میرے پیارے بیٹے، یہ تم کیا کر رہے ہو، میرا بیٹا حماد تو بہت اچھا ہے، بہت پیارا ہے نیچے اترو۔ یہ صبح تمہارے لیے گھوڑا بنے گی، اب رات ہے اپنی ماں کی بات مان لو۔" مجھے پتا تھا کہ یہ نحتی نقصان کا باعث بنے گی اس لیے جتنی بھی تعریف ہو سکے کرو تو حماد بات مان جائے گا، چنانچہ میں نے بھی ایسے ہی ہاتھ جوڑے، پاؤں پکڑے بڑی مشکل سے فریحہ کی جان چھوٹی تو فریحہ کی سانسیں بحال ہوئیں، اس کے بعد فریحہ اتنی ڈر گئی کہ وہ پانچ سال تک دن کو سوتی اور باقی کی رات ساری جاگ کے کاٹ دیتی، کیوں کہ حماد اس کے بغیر سوتا بھی نہیں تھا، کیوں کہ اکثر حماد رات کو ہی کچھ نہ کچھ غلط کرتا۔ باہر اگر کوئی تنگ کرے تو اسی وقت سبق سکھا دیتا تھا، مگر گھر میں پہلے تو کسی کو نہ چھیڑتا، اگر کسی سے کوئی غلطی ہو جائے تو پھر بات ضروری تھی، اس بات کا شکر ہے کہ وہ نقصان کم پہنچاتا تھا، ہاں شرارتیں ضرور کرتا تھا۔ اسکول میں بھی اس کے کلاس فیلو اس کی شرارتوں سے حیران ہو جایا کرتے تھے، ایک دفعہ لڑکوں نے شکایت لگائی کے حماد کے گروپ کے لڑکے شرارتیں بہت کرتے ہیں۔ ہر کسی کو تنگ بھی کرتے ہیں۔ استاد تک جب یہ بات پہنچی تو استاد صاحب نے حماد کے گروپ کے سارے لڑکوں کو سزا دی اور ساتھ ہی دس دس ڈنڈے بھی مارنے شروع کیے۔ سب لڑکوں کو ڈنڈے لگے، پھر ماسٹر صاحب حماد کے پاس آئے اور بولے۔

"تم لائق فائق اسٹوڈنٹ ہو کر نالائق لڑکوں والی حرکتیں کیوں کرتے ہو، یہ سمجھتے ہوئے کہ تم لائق ہو، استاد کچھ نہیں کہے گا۔ جس طرح قانون سب کے لیے ایک جیسا ہے، اسی طرح استاد کی نظر میں شاگرد برابر ہوتے ہیں۔ چلو ہاتھ آگے کرو تمہیں بھی ڈنڈے لگیں گے۔" حماد نے خاموشی کے ساتھ ہاتھ بڑھا دیا۔ ماسٹر صاحب ڈنڈا ہوا میں لہرا کر نیچے حماد کی طرف لائے، مگر یہ کیا ڈنڈا اتنا وزنی ہو گیا کہ ماسٹر جی کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے فرش پر جا گرا، دوسری بار بھی ایسا ہی ہوا اور جب تیسرے بار بھی ایسا ہی ہوا تو ماسٹر صاحب گرا ہوا ڈنڈا اُٹھانے کے لیے جھکے تو پھر رکوع کی حالت میں ہی رہ گئے۔ ایک دم ماسٹر جی کے منہ سے نکلا۔

"ہائے میری کمر نیچے اترو، میں کہتا ہوں نیچے اترو، میں تم کو چھوڑوں گا نہیں۔" ماسٹر جی کی آواز سن کر باقی کے استاد بھی اس کے کمرے کی طرف آ گئے۔

"کیا بات ہے ماسٹر طالب۔"

"یار اس حماد کو میری کمر سے نیچے اتارو۔ کتنا گستاخ اور بدتمیز شاگرد ہے۔ میں ڈنڈا اُٹھانے کے لیے نیچے ہوا تو یہ میرے اوپر چڑھ کر بیٹھ گیا، اب میں سیدھا بھی نہیں ہو سکتا، لگتا ہے جیسے کوئی ہزاروں کا وزن لاد دیا گیا ہو مجھ پر۔"

یہ سن کر دوسرے ماسٹرز کو بڑا تعجب ہوا اور وہ بولے۔ "یار کیوں بچوں کے سامنے مذاق بنا رہے ہو، سیدھے ہو جاؤ۔ حماد تو اپنی جگہ پر کھڑا ہوا ہے۔

"تم سارے ماسٹرز لگتا ہے اندھے ہو گئے ہو یا پھر حماد کی حمایت کر رہے ہو۔" ماسٹر طالب نے ہار مانتے ہوئے کہا۔

"یار ٹھیک ہے میں حماد کو سزا نہیں دوں گا، لیکن اسے کہو کہ یہ نیچے تو اُترے۔" اتنے میں حماد بول پڑا۔

"ماسٹر جی میں تو اپنی جگہ پر کھڑا ہوں، آپ سیدھے ہونے کی کوشش تو کریں۔"

اتنا کہنا تھا کہ ماسٹر صاحب سیدھے ہو کر کھڑے ہو گئے۔ ماسٹر طالب غصہ کو ضبط کرتے ہوئے باہر نکل گئے اور حماد ماسٹر کو دیکھ کر دھیرے سے مسکرا دیا۔

اس واقعے کے بعد ماسٹر طالب حماد سے کترانے لگے اور دوسرے ماسٹرز کو بھی کہنے لگے۔

"یار اس بچے میں کوئی اور طاقت بھی ہے، ورنہ یہ 14-15 سال کا بچہ۔"

"او۔ یار یہ تیرا وہم ہے، ویسے ہی کبھی کبھی کمر سے اچانک درد نکل آتا ہے کہ انسان کو بہت تکلیف ہوتی ہے اور پھر رکوع کی حالت میں چلنا پڑتا ہے اور پھر جب تک اس علاج نہ کروائے تو...... یقیناً تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہوگا۔" ماسٹر طالب پھر وضاحت کرتا۔

"یار تم میرا وہم کیوں سمجھتے ہو۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ وہ میری پیٹھ پر بیٹھ گیا تھا اور تم کہتے ہو کہ وہ اپنی جگہ پہ کھڑا تھا۔ تم سب مانو یا نہ مانو کوئی بات ضرور ہے۔"

اب حماد کی زندگی ایک داستان بن گئی تھی۔ ہر روز ایک نئی کہانی یا کوئی نیا واقعہ پیش آتا تھا۔ ان واقعات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ایک روز حماد کے اسکول میں لڑکوں کا میچ تھا اور وہ حسب معمول گھر لیٹ آیا۔ اس وقت گھر میں مہمان آئے ہوئے تھے میری بڑی بیٹی کا رشتہ لے کر، گھر میں جو کچھ بھی تھا مہمانوں کو پیش کیا گیا۔ مہمان زیادہ تھے اور کھانا کم پڑ گیا۔ اسی شرمندگی سے ہم نے مہمانوں کو کھانے کا دوبارہ نہیں پوچھا کہ اگر دوبارہ کھانا دینا پڑا تو کہاں سے دیں گے، جب مہمان جانے لگے تو حماد واپس آ گیا تھا۔ مہمانوں میں ایک بڑی عمر کی عورت بھی تھی جو جاتے ہوئے یہ کہنا نہ بھولی کہ آپ مہمانوں کا کھانا تو پورا نہیں کر سکے بھلا بیٹی کو کیا دو گے۔ کبھی ہمارے گھر آنا، مہمان نوازی کیا ہوتی ہے ہم آپ کو بتائیں گے۔ حماد نے اندر داخل ہوتے ہوئے جب یہ الفاظ سنے تو فوراً سمجھ گیا حماد جلدی سے بولا۔

”آنٹی ہم بھی آ کر دیکھ لیں گے کہ آپ کتنے مہمان نواز ہیں۔ اگر آپ میں دم ہے تو ہمیں ضرور بلانا۔“ جب مہمان چلے گئے تو میں نے حماد سے کہا۔ ”بیٹا گھر آئے ہوئے مہمانوں کے ساتھ ایسی باتیں نہیں کرتے۔“

سوری امی یہ ہماری انسلٹ ہے کہ وہ ہمارے گھر ہمیں ہی باتیں کر کے چلے جائیں۔ مانا کہ ہم غریب ہیں، مگر امی ہم غریب لوگ دل کے غریب نہیں ہوتے۔

یہ امیر لوگ صرف بینک بیلنس اور جیبوں کے امیر ہوتے ہیں، یہ دل کے تو نہایت ہی غریب ہوتے ہیں۔ اگر ان سے کہا جائے کہ کسی غریب کی بیٹی کی شادی کروا دیں، کسی یتیم کے سر پہ ہاتھ رکھ دیں، کسی محتاج کا سہارا بن جائیں تو پھر بات سوچنے پہ آ جاتی ہے۔ سوچیں گے، کیوں کہ ہماری ضرورتیں بہت ہیں، کچھ کریں گے، ایسے الفاظوں سے ٹال دیتے ہیں اور اگر کہیں ناچ گانے، فیشن، شاپنگ یا کسی شادی میں خرچ کرنا پڑے تو دل کھول کر اپنا پیسا لٹا دیں گے۔ کہیں گے، ہماری ناک نہیں رہتی۔ اگر ہم ایسا نہ کرتے تو عزت میں کمی آئے گی۔“

امی اگر انہوں نے ہمیں نہ بھی بلایا تو ہم جمعہ کے دن ضرور جائیں گے مہمان بن کر۔ جمعہ کے دن میں اور حماد اُن کے گھر گئے تو اُن کے ملازم نے ہمیں الگ کمرے میں بٹھا دیا، کمرہ بہت خوب صورتی کے ساتھ ڈیکوریٹ کیا ہوا تھا جس کو میں بہت غور سے دیکھ رہی تھی اور یہ دیکھ کر حیران ہو گئی کہ حماد اپنی جگہ پہ بیٹھا ہوا ہے، مگر کمرے کی ہر چیز بے ترتیب ہوتی جا رہی تھی اور پھر جب وہی عورت جس نے ہمیں طنز کیا تھا، اندر داخل ہوتے ہی بکھری ہوئی چیزیں دیکھیں تو یہ بھول ہی گئی کہ اس کا پاؤں راستے میں الٹا پڑے ہوئے گلدان سے ٹکرائے گا، جیسے ہی پاؤں گلدان سے ٹکرایا تو ہائے کی آواز کے ساتھ ہی وہ اوندھے منہ لڑکھڑاتی ہوئی ہمارے پاس آ کر گری۔ مجھے بہت شرمندگی ہوئی کہ ہماری موجودگی میں بے چاری بُری طرح گری ہے۔ حماد نے جلدی سے آگے بڑھ کر اُسے اٹھانا چاہا، مگر وہ خود ہی اُٹھ گئی تھی۔

”سوری بہن کیا حال ہے۔“ حماد جلدی سے بولا۔

”آنٹی ہم تو ٹھیک ہیں مگر آپ شاید ٹھیک نہیں۔“

”سب ٹھیک ہے پتا نہیں یہ کمرے کی چیز اتنی بے ترتیب کیسے ہو گئی۔“

”آنٹی جی چھوڑیں، ہم ایسے ہی بیٹھ جائیں گے، پچھلے جمعے کو آپ ہمارے مہمان تھے، اس جمعے کو میزبانی کا شرف آپ کو بخشا ہے۔“

”جی جی کیوں نہیں، بیٹھیے ہمارے گھر میں آپ کو کمی نہیں ہو گی۔“ طنزیہ بات آخر کر ہی دی۔

”کوئی بات نہیں ابھی پتا چل جائے گا۔“ حماد دھیرے سے دل میں مسکرایا۔ تھوڑی دیر کے بعد آنٹی جی کے شوہر اندر تشریف لائے، جیسے ہی حماد کے سامنے ہاتھ بڑھایا سلام کے لیے چکرا کر نیچے گر گئے، پیچھے سے آتی ہوئی ان کی بیٹی جس کے ہاتھ میں مشروبات کی ٹرالی تھی، باپ کے گرتے ہی ان کی ٹانگ ٹرالی سے جا لگی، ساتھ ہی مشروبات والی ٹرالی لٹ گئی اور لڑکی ٹرالی کو سنبھالتے ہوئے خود بھی زمین پہ جا پڑی، کمرے میں بچھی ہوئی قالین پانی کی وجہ سے خراب ہو گئی۔

”کیا بات ہے انکل“ حماد نے جلدی سے اُٹھاتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ نہیں بیٹا ایسے ہی چکر آ گیا تھا، اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا۔“

چکر تو بہت آئیں گے ابھی، آگے دیکھو کیا ہوتا ہے۔“ حماد کا دل پھر شرارت سے مسکرایا۔ حماد اپنی ہنسی

چھپاتے ہوئے بولا۔

"انکل آپ اپنے مہمانوں کا استقبال ایسے کرتے ہیں، کیا خوب انداز ہے آپ کا، اس سے پہلے میں نے ایسا استقبال نہیں دیکھا۔"

میں تو سمجھ گئی تھی کہ یہ ساری خرابیاں حماد ہی کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ میں اس کو منع بھی نہیں کر سکتی تھی، کیوں کہ گھر سے آتے ہوئے اس نے کہا تھا کہ مجھے آپ نے نہ روکنا ہے اور نہ ہی ٹوکنا ہے۔

میں خود بھی حیران تھی کہ حماد میرے پاس بیٹھا ہوا ہے، لیکن کچن میں ہر نظام خراب ہو رہا ہے۔ سارا سالن گر گیا، فریج سے ہر چیز غائب، ٹھنڈا پانی بھی گرم ہو گیا، سارے گھر میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ یہ ساری معلومات حماد مجھے کمرے میں بیٹھے بیٹھے بتاتا جا رہا تھا، جتنی روٹیاں پکتی تھیں ساری غائب ہو جاتی تھیں، تنگ آ کر انہوں نے چاول بنا لیے اور جلدی جلدی برتنوں میں ڈال کر پیش کر دیے، تاکہ اب پھر کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے اور کچھ پریشانی اور کچھ سکون کے ساتھ آنٹی جی ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔ حماد نے میری طرف دیکھتے ہوئے برتنوں کی طرف اشارہ کیا کہ یہ بھی خالی ہیں۔

"آیئے نا آنٹی جی ہمارے ساتھ۔ نہیں آپ لوگ کھائیں، آپ ہی کے لیے بنایا ہے۔"

"ٹھیک ہمارے لیے بنایا ہے تو ہمیں ہی کھانا چاہیے کچھ خاص ہی ہوگا۔" حماد نے جیسے ہی برتنوں سے ڈھکن اتارنے شروع کیے تو وہ سارے برتن خالی تھے۔ پاس بیٹھی ہوئی میزبان عورت پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتی ہی رہ گئی۔

"کیا بات ہے آنٹی، کبھی مہمان نہیں آئے آپ کے گھر میں۔ [illegible] ہاری سب نے قلابازیاں کھائیں، پھر آٹا روٹیاں ختم، کبھی سالن گرتا تھا اور کبھی نمک تیز، تین چار گھنٹے سے بھوکے پیاسے بٹھایا ہوا ہے آپ نے۔ اللہ اللہ کر کے اگر کھلائے ہیں تو وہ بھی خالی برتن، کیا خوب مہمان نوازی کرتے ہیں آپ۔" آنٹی جی تو مارے شرمندگی کے پانی پانی ہو رہی تھیں۔ سارے گھر والے حیران و پریشان تھے۔ یہ پراسرار واقعات پہلے کبھی نہیں ہوئے تھے، یہ آج کیا ہو رہا ہے۔ آنٹی جی نے حماد سے پوچھا۔

"تمہیں کیسے پتا ہے کہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے، تم تو کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے، پھر کچن، فریج، گھر کے سارے نظام میں خرابی تمہارے علم میں کیسے آ گئی۔"

آنٹی جی حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ ادھر کمرے میں بھوکے پیٹ بیٹھنے سے بہتر ہے کہ اُٹھ کر چہل قدمی ہی کر لوں، تھوڑی دیر کے بعد باہر کا بھی جائزہ لیتا تھا، مجھے شک ہوا تھا کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے لیکن ابھی یقین ہو گیا ہے کہ آپ ہمیں بے وقوف بنانا چاہتی ہیں۔ ہمیں پہلے ہی معلوم تھا کہ امیر لوگ بہت کنجوس ہوتے ہیں، خالی برتنوں سے بہلانے کی بجائے صاف کہہ دیتے کہ آپ چلے جائیں ہمارے پاس آپ کو دینے کے لیے کچھ نہیں تو ہم شکوہ نہ کرتے، مگر گھر آئے مہمان کے آگے خالی برتن رکھ کر اس کی انسلٹ کرنا تو کوئی آپ سے سیکھے۔ آنٹی جی آپ تو بہت دعوے کرتی تھیں، آج کیا ہوا؟ کدھر گئی وہ باتیں جو ہمارے گھر سے آتے ہوئے ہم سے کی تھیں۔ ہم نے تو آپ [illegible] کا الوداع نہیں کیا تھا۔"

گھر والوں کی حالت دیکھتے ہوئے میں نے حماد سے کہا۔

"بیٹا چلو چلتے ہیں" پہلے تو اس نے انکار کیا پھر میرے اصرار پر راضی ہو گیا۔

"ٹھیک ہے امی آپ میرے سامنے ہاتھ نہ جوڑیے۔" میرے جوڑے ہوئے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے حماد نے کہا۔

"امی ابھی ان کو اور سبق سکھانا تھا تاکہ کسی غریب پر دوبارہ طنز کے تیر نہ چھوڑیں۔"

"بس بیٹا کافی ہو گیا" چلتے چلتے حماد نے بھی آنٹی جی کے دکھتے دل کو اور دکھا دیا یہ کہہ کر کہ اُف آنٹی جی ابھی سے آپ ایسے ہو، بھوکے پیٹ گھر سے رخصت کر رہے ہو، جب ہماری بہن آئے گی تو کیا ہوگا ہم تو ایسے بے ڈھنگ کنجوس لوگوں کو اپنی بہن ہرگز نہیں دینے والے۔ وہ عورت خاموشی سے حماد کا منہ تکتی رہ گئی اور ہم دونوں ماں بیٹا اُن کے گھر سے باہر نکل آئے اور وہ ہمیں روک بھی نہ سکے، کیوں کہ جو کام بھی سیدھا کرتے وہ اُلٹ ہو جاتا تھا، کچھ بھی تو ٹھیک نہیں ہو رہا تھا۔

اس طرح دن مہینے گزرتے رہے، حماد نے ایف اے بھی کر لیا تھا۔ میری دو بیٹیوں کی شادی بھی بہت [illegible] سے ہو گئی تھی، یہ سب کچھ حماد نے ہی کیا تھا۔ [illegible] ہر چیز بہنوں کو دی تھی، اندھے کو کیا چاہیے ہے دو آنکھیں، جس میں

بہت خوش تھی کہ ہر میرے بیٹے کے ساتھ جو چڑیل ہے وہ بہت اچھی ہے اور ہر طرح کا خیال رکھتی ہے۔ اگر مجھے کوئی کہتا کہ اپنے بیٹے کا علاج کرواؤ، اس کے ساتھ جو ہوائی چیز ہے۔ کسی موڑ پر یہ نقصان نہ کر جائے تو میں اُس کے ساتھ جھگڑ لی تھی۔

"خبردار کسی نے میرے بیٹے کا نام لیا تو...... میرا بیٹا بالکل ٹھیک ہے، میں اس کا علاج کیوں کراؤں۔ میں ڈرتی تھی کہ اگر اس کا علاج ہوا اور وہ چیز چلی گئی تو کون کرے گا میرے گھر کی ضرورتیں پوری، اسی لالچ نے مجھ سے میرا بیٹا لے لیا۔"

یہ بتاتے ہوئے وہ بزرگ خاتون اتنا روئی کہ ایسے معلوم ہوتا تھا آج آخری بار روئے گی یا اس کی روح پرواز کر جائے گی، پھر اس کی طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے نرس نے ایک گھنٹہ کے لیے دوائی دے کر سلا دیا اور پھر مجھے ایک گھنٹہ اور انتظار کرنا پڑا۔ ایک گھنٹے کے بعد جب ہوش آیا تو مزید آدھا گھنٹہ اور لگا اور جب ٹھیک طرح سے ہوش آ گیا تو میں سامنے بیٹھی ہوئی تھی، مجھے دیکھ کر وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"بیٹی ابھی تک ادھر ہی ہو۔"

"ہاں دادی جی ابھی آپ کی کہانی مکمل نہیں ہوئی۔"

"ہاں بیٹی آگے زیادہ بولنے کی مجھ میں ہمت نہیں، مختصر سا ایک اور میں اپنے بیٹے کا واقعہ سناتی ہوں، اب میری زندگی صرف چند سانسوں کی امانت ہے، نجانے کون سی سانس آخری ہو جائے۔"

ایک دن حماد باہر سے واپس اپنے گھر کی طرف آ رہا تھا کہ چند آدمی کھڑے باتیں کر رہے تھے، جب حماد ان کے پاس سے گزرا تو بولے۔

"دیکھو یہ بڑا بنا پھرتا ہے، کہتا ہے کہ میں بڑے بڑوں سے مقابلہ کر سکتا ہوں۔ باتیں اس کی سنو تو گھر اس کا دیکھو، آج تک مکان نہیں بنا سکا۔" میں حیران ہوں یہ باتیں حماد نے برداشت کیسے کی گھر آیا تو آنکھیں سوجی ہوئی تھیں، اتنی سُرخ تھیں جیسے خون کر کے آ رہا ہو۔ آتے ہی بولا۔

"میں نے پہلے اس بارے میں سوچا نہیں، لیکن امی اب میں نے سوچ لیا ہے کہ اپنے علاقے کی سب سے بڑی کوٹھی ہماری ہوگی۔" ٹھیک دس دن کے بعد کافی دیر تک غصے میں لال اپنے آپ سے باتیں کرتا رہا جیسے کوئی اور بھی شامل ہو اس کی گفتگو میں، پھر جب کمرے سے باہر آیا تو بالکل نارمل تھا جیسے کبھی پہلے ہوا کرتا تھا اور میرے پاس بیٹھا پھر اُٹھ کر کمرے میں چلا گیا اور پھر اس انداز میں باہر آیا کہ جیسے کسی کو الوداع کر رہا ہو۔

اور واقعی میں اس نے اپنی چڑیل کو الوداع کیا تھا، سیٹھ زمان کی کوٹھی میں۔ سیٹھ زمان ہمارے علاقے کا سب سے بڑا امیر تھا اور کام اس کا تھا کالا دھندہ، ناجائز دولت سے اس نے تین کوٹھیاں بنوائی ہوئی تھیں، ایک میں خود رہتا تھا اور باقی دو کو کبھی کبھی استعمال میں لاتا تھا۔ سیٹھ زمان کی ایک ہی بیٹی تھی، حماد کی چڑیل اُس کے اندر داخل ہوگئی اور اس لڑکی کے ساتھ گھر والوں کو بھی تنگ کرنے لگی، سیٹھ اپنی بیٹی کو بڑے سے بڑے ڈاکٹر کے پاس لے جاتا، مگر کوئی بیماری نہ ہوتی۔ اس کی بیٹی پاگلوں کی حرکتیں کرتی تھی۔

"کبھی کہتی بابا یہ گھر چھوڑ دو ورنہ وہ مجھے مار دے گی" سیٹھ زمان بہت پریشان ہوتا۔

"بیٹی تم کو کوئی نہیں مارے گا، ہم تمہارے ساتھ ہیں۔"

اس لڑکی کو بھی دورے پڑتے تھے اور اس کے ہاتھ پاؤں بھی مڑ جاتے تھے، ماں باپ اس کی حالت سے بہت پریشان ہوئے، اسی رات کو سیٹھ زمان کی بیوی پانی پینے کے لیے اُٹھی تو چلاتی ہوئی اپنے شوہر کو جگانے لگی، شوہر صاحب ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے۔ "کیا بات ہے بیگم۔"

"وہ دیکھو سامنے۔ سو فٹ لمبا انسان کھڑا ہے، وہ ہمیں مارنا چاہتا ہے۔" سیٹھ صاحب نے لائٹ آن کی تو کچھ بھی نہیں تھا۔

"سو جاؤ بیگم، یہ تمہارا وہم ہے ورنہ ایسی کوئی بات نہیں۔"

"جی یہ میرا وہم نہیں ہے کل تو کر ڈر گئے تھے، آج میں، پھر ہماری بچی کی طبیعت بھی خراب ہو رہی ہے، دن بدن مجھے لگتا ہے کئی آسیب آ چکے ہیں ہمارے گھر میں۔ ہمیں یہ گھر چھوڑ دینا چاہیے، ہمارے پاس اور بھی گھر ہیں، کبھی دیواروں پر سائے چلتے ہوئے نظر آتے ہیں تو کبھی کتا، بلی، گدھا اور کبھی ہیبت ناک شکل نظروں سے گزرتی ہے۔"

بیگم لاکھ کہتی "ہماری کوٹھی آسیب زدہ ہو چکی ہے، ہمیں یہ گھر چھوڑ دینا چاہیے۔ ہماری بچی ان کی زد میں ہے، ہمیں اپنی بچی کی خاطر کچھ سوچنا ہوگا، ورنہ یہ جو کوئی

بھی ہے، کہیں ہماری بچی کو نقصان نہ پہنچا دے۔" مگر سیٹھ صاحب کو یقین کون دلائے، سیٹھ صاحب بات ٹال دیتے تھے۔

ایک دن میں سیٹھ صاحب نے خود دو تین پراسرار واقعات دیکھے تو انہیں یقین ہو گیا کہ میری بیگم ٹھیک کہتی ہے۔ چھ دن میں اس چڑیل نے اتنا تنگ کیا کہ سیٹھ صاحب نے کوٹھی فروخت کرنے کا اعلان کر دیا۔ اب جو کوئی بھی اس کوٹھی کو دیکھتا تو خریدنے کی خواہش کرتا، مگر پھر نجانے کیا ہوتا کہ انکار کر دیتے۔ سیٹھ صاحب کو اب اور بھی پریشانی لاحق ہوتی جا رہی تھی، کوئی بھی تیار نہیں تھا اس کو خریدنے کے لیے۔ ایک کروڑ کی کوٹھی 80 لاکھ میں آپ کو مل جائے گی، ایک نئے گاہک کو دکھاتے ہوئے کہہ رہے تھے، مگر خریدار کی نظر کسی اور کی طرف متوجہ تھی۔

"سیٹھ صاحب آپ اگر یہ ہمیں پانچ لاکھ میں بھی دیں تو ہم نہیں خریدیں گے۔" سیٹھ صاحب پانچ لاکھ کا سن کر حیرت میں دبی ہوئی آواز میں بولے۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں آج کل سفید پلاٹ پانچ لاکھ میں مل رہے ہیں، آپ میری اتنی بڑی کوٹھی کا پانچ لاکھ، شرم نہیں آتی، نہیں خریدنی تھی تو کم از کم قیمت تو ٹھیک بولنی چاہیے تھی۔"

"سیٹھ صاحب شرم تو آپ کو آنی چاہیے کہ آسیب زدہ کوٹھی کسی اور کو بیچ رہے ہیں۔ اپنی مصیبت دوسروں کے گلے ڈالنا چاہتے ہیں۔" سیٹھ صاحب کو حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔

"یہ سب کچھ آپ لوگوں کو کیسے معلوم ہو جاتا ہے۔"

دراصل حماد کی چڑیل کسی انسان کی شکل میں آ کر خریدنے والے کے پاس کھڑی ہو جاتی ہے جو صرف اسی کو نظر آتی اور کسی کو نظر نہ آتی اور وہ چڑیل کبھی بزرگ کبھی جوان لڑکے کی شکل اختیار کر لیتی، اس بار بھی وہ ایک لڑکے کی شکل میں اس خریدنے والے کے سامنے آئی اور کہتی۔

"میں ان کے ہمسائے میں رہتا ہوں اور ہم سب جانتے ہیں کہ یہ کوٹھی آسیب زدہ ہے، اس گھر میں جنات کا بسیرا ہے اور وہ نہ کھانے دیتے ہیں نہ پینے سونے دیتے ہیں، اسی لیے یہ خوب صورت گھر فروخت کر رہے ہیں۔ ہم جھوٹ نہیں بولتے بے شک سیٹھ صاحب سے پوچھ لو، کیوں سیٹھ صاحب یہی بات ہے نا۔" اور سیٹھ صاحب کا سر خود ہی حرکت کر جاتا ہاں کی صورت میں اور، پھر خریدنے والے الٹی باتیں سنا کر چلے جاتے کہ سیٹھ صاحب اپنی مصیبت ہمارے گلے ڈالنا چاہتے ہیں۔ آسیب زدہ گھر دھوکے میں فروخت کر رہے ہیں، آخر سیٹھ صاحب نے پوچھ ہی لیا تھا آخر آپ لوگوں کو کون بتاتا ہے۔"

"اس گھر کی نحوست دیکھیے سیٹھ صاحب، ابھی جو لڑکا آپ کے ہمسائے کا آیا تھا، اس نے آپ کے سامنے بتایا بلکہ تصدیق کے لیے آپ سے بھی ہاں کروائی تھی۔" اب تو سیٹھ کی مشکل و پریشانی میں اور اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ سیٹھ صاحب کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔

ایک دن سیٹھ صاحب کی بیٹی کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی تو سیٹھ صاحب نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا، لیکن دورے کی حالت میں سیٹھ کی بیٹی نے کہا۔

"بابا میں یہ کوٹھی بیچنا چاہتی ہوں، کیوں کہ اگر ایسا نہ کیا تو یہ مجھے مار دے گی۔"

"نہیں بیٹی ہم تمہیں مرنے نہیں دیں گے، تم جیسے کہو گی ہم ویسا ہی کریں گے۔"

"ٹھیک ہے بابا آپ وکیل کو بلائیں، میں خریدار کو بلاتی ہوں۔" باپ جتنے میں وکیل کو بلاتے، اتنی دیر میں حماد کی چڑیل دو لڑکے اور ایک لڑکی کی صورت وہاں موجود تھی، یوں اس نے سیٹھ صاحب کے گھر سے پانچ لاکھ چرا کے اسی گھر والوں کو دے کر اس کوٹھی کو خرید لیا۔

سیٹھ صاحب پانچ لاکھ کی کوٹھی چلے جانے سے ناخوش تو تھے مگر انہیں اپنی بیٹی کی جان پیاری تھی اور ویسے بھی اُن کے پاس اور بھی بہت کچھ تھا جس کی وجہ سے کوئی خاص اثر نہ ہوا، مگر جب دس دن کے بعد حماد نے یہ خوش خبری سنائی تو میں حیران ہو گئی اور خوشی بھی کہ اس چڑیل نے ہمیں اتنا پیارا مکان رہنے کو دیا، وہ بھی ثبوت کے ساتھ، کوئی بھی ہمیں نکال نہیں سکتا تھا۔ میرے ساتھ میری چھوٹی بیٹی فریحہ بھی بہت خوش تھی۔ اس کوٹھی میں آ کر میں نے اپنی بیٹی فریحہ کی بھی شادی کر دی، یوں اب میں اور حماد بھی اس اتنی بڑی کوٹھی میں رہتے تھے، یوں اکیلے میں میرا دل نہ لگتا تھا۔ اس تنہائی کو دور کرنے کے لیے میں نے

حماد کا رشتہ دیکھنا شروع کر دیا۔ جب حماد کو پتا چلا تو اُس نے مجھے منع کر دیا کہ امی میری شادی کے بارے میں نہ سوچیے، کیوں کہ میں شادی نہیں کر سکتا۔ اگر آپ میری شادی کسی بھی انسانی لڑکی سے کروائیں گی تو پھر یا تو میں نہ رہوں گا یا پھر وہ لڑکی جو میری زندگی میں آئے گی، اس لیے یہ خیال میرے ساتھ ساتھ آپ بھی اپنے ذہن سے نکال دیں، ورنہ نقصان برداشت نہیں کر سکیں گی۔

یہ سب سن کر میں بہت پریشان ہوتی، میں اپنے بیٹے کو بھی کھونا نہیں چاہتی تھی اور نہ ہی یوں تنہا چھوڑ سکتی تھی، ہر وقت ہر قسم کے وسوسوں سے دل گھبرانے لگا تھا۔ اتنا بڑا گھر اور اکیلی میں، حقیقت میں پر اسرار معلوم ہوتا تھا۔

بہت سوچ بچار کے بعد میں نے حماد سے چوری ایک لڑکی سے رشتہ طے کر دیا اور سوچا کہ خاموشی کے ساتھ حماد کو لے جا کر نکاح کروا دوں گی، میں نے حماد سے چوری ساری تیاریاں مکمل کیں اور جس روز حماد کے نکاح کے لیے جانا تھا، اس روز ہی وہ لڑکی اچانک مر گئی۔ جیسے ہی یہ خبر مجھے ملی تو اُسی وقت حماد میرے پاس آیا اور بولا۔

''امی میں نے آپ کو منع کیا تھا، لیکن آپ نے میری بات نہیں مانی، آج ایک غریب کی بیٹی کی موت ہو گئی، بڑی پریشانی ہوئی مجھے، بہت دیر تک یہ سوچ میرے دماغ سے نہ نکلی، اس واقعے کے تین چار ماہ بعد میں نے ایک عامل سے رابطہ کیا اور اُس کو ساری بات بتائی تو اس نے مجھے ایک تعویذ دیا اور کہا۔ جس لڑکی سے اب رشتہ طے کرو تو اُس کے گلے میں ڈال دینا۔ چناں چہ بہت کوشش کے بعد ایک رشتہ مل گیا۔ میں نے اُن لوگوں سے یہ کہا کہ ہمارے خاندان والے میرے بیٹے کی شادی نہیں ہونے دیتے، اس لیے اس کی لڑکی کی حفاظت کے لیے یہ تعویذ میں اپنی ہونے والی بہو کے گلے میں حفاظت کے لیے ڈالنا چاہتی ہوں، اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو انہوں نے بغیر کسی احتجاج کے میری بات مان لی۔ اب یہ مسئلہ تو حل ہو گیا، مگر حماد کو کوئی نقصان نہ پہنچا دیں اس لیے میں نے اُسی عامل سے حماد کے لیے بھی تعویذ بنوا لیا اب ہمارے گھر میں عجیب عجیب حرکات ہونے لگیں۔ کبھی کوئی نقصان، کبھی توڑ پھوڑ، ڈراؤنی، آوازیں، سارا گھر خوف میں ڈوبا ہوا تھا، بس یہی ایک پریشانی تھی کہ حماد کی شادی بغیر کسی نقصان اور پریشانی کے اچھے طریقے سے انجام پائے، آخر بہت سی دعاؤں کے بعد آج شادی کا دن بھی آ گیا۔ میں ہر قدم پر اپنے رب سے دعائیں کرتی، لیکن کبھی کبھی دعائیں بے اثر بھی ہو جایا کرتی ہیں۔ آج تک صرف سکون دولت ہی مانگی، جب بھی دعا کی تو اسی کے لیے ہاتھ اُٹھائے کہ اچھا گھر ہو، پیسا ہو، وہ سب کچھ تو ملا مگر اس کے بدلے میں میرا بہت قیمتی خزانہ گم ہو گیا۔ برات والے دن جب حماد نہانے کے لیے غسل خانے میں گیا تو کپڑوں کے ساتھ عامل کا دیا ہوا تعویذ بھی اتار کر رکھ دیا بس پھر وہی چڑیل حاضر ہو گئی اور میرے بیٹے کو کہنے لگی۔

''میں نے تم سے کہا تھا نا کہ کسی اور سے شادی نہ کرنا مگر تم نے میری بات رد کر دی، اب میں تم کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔'' حماد نے جلدی سے کپڑے پہنے اور باہر نکل کر مجھے آواز دی، میرے ساتھ مہمان بھی تھے، وہ بھی بھاگتے ہوئے باتھ روم کی طرف آئے۔ میں نے جب حماد کی حالت دیکھی تو سمجھ گئی۔

حماد نے میرے ساتھ آخری بات یہی کی۔ ''کاش امی آپ پہلے سوچ لیتیں تو آج۔'' اس کے بعد حماد کی حالت اتنی خراب ہوئی کہ وہ میرا بیٹا اپنی زندگی کی بازی ہار گیا اور پھر میں بُری طرح چور ہو گئی۔

آج مجھے احساس ہوا کہ میں لالچی ماں تھی، میں اپنے بیٹے کی قاتل ہوں۔ میں نے چھینی ہے اس کی زندگی، میں نے ہی اس چڑیل سے پیچھا نہیں چھڑوایا اس کا، کسی پیر فقیر کے پاس نہیں لے کر گئی، میں قاتل ہوں۔ رخسانہ بیٹی سب کو بتانا کہ ایک ماں نے اپنے بیٹے کی زندگی ختم کر دی۔ اس لیے آج میں تنہا ہوں۔ بیٹیاں اپنے گھروں میں مصروف ہیں، کبھی کبھی دیکھنے آ جاتی ہیں۔

مجھے اُس بزرگ خاتون کی کہانی اتنی دلچسپ اور دکھی بھی لگی۔ مجھے اس کہانی نے الجھا دیا تھا۔ اب آپ سب کی نظروں کے سامنے ہے، آپ بتائیے گا کیسا پایا آپ نے اس کو، آپ کے ذہن میں کتنے سوال چھوڑے ہیں اس کہانی نے، میں تو سوچتی ہوں اگر کسی ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہی ملے تو وہ بھی گنوانا نہیں چاہیے۔

☆......☆



ناگن

اعجاز احمد نواب

زندگی صرف وہی تو نہیں جو ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ زندگی تو وہ بھی ہے جسے ہم صرف سوچتے ہیں۔ نیا سلسلہ ''ناگن۔'' آپ کو یقیناً ایک نئی دنیا' نئی زندگی میں قدم رکھنے پر مجبور کردے گا۔ ہزاروں سال کی تپسیا پر پھیلا' زندگی کا نیا رنگ۔ ناگن کے روپ میں آپ کو ضرور تسخیر کرے گا

قسط نمبر: 9

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

جوگی مہاراج کے پر دادا کو اس کے گرو نے مرتے سے شیش ناگ کا جوڑا دان کیا تھا اور بتایا تھا کہ ان ناگوں کے سر پر تاج کے نشان ہیں اور آنکھوں میں سنہری روشنی۔ آنکھوں کی سنہری روشنی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ بادشاہ سانپ ہیں۔ اگر یہ سو سال تک زندہ رہ گئے تو یہ نہ صرف انسان کے روپ میں آ جائیں گے، بلکہ ہر جاندار کا روپ دھار سکیں گے۔ زمین کی تہوں میں چھپے خزانے ان کی دسترس میں ہوں گے اور اس وقت یہ جس کے قبضے میں ہوں گے یہ اسی کے حکم کے غلام ہوں گے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے ہر ساون میں اماوس کی رات ناگ دیوتا کے حضور ایک مرد اور ایک عورت کی قربانی دی جائے۔ جان جوکھوں میں ڈال کر ان کے پرکھوں نے ان ناگوں کو نازو نعم سے پالا تھا اور نگہبانی کا یہ عمل اب جوگی مہاراج کے حصے میں آ چکا تھا۔

وہ رات بھی اماوس کی رات تھی اور ان ناگوں کی عمر کے سو سال مکمل ہونے جا رہے تھے۔ جوگی مہاراج نے یہ کہانی بیس سال سے ساتھ رہنے والے چیلے صابو کو سنائی تو اس کی نیت میں کھوٹ آنے لگا۔ گرو مہاراج ہاتھ میں خنجر تھامے ناگ منتر کا جاپ کر رہے تھے اور صابو انہیں طنزیہ نظروں سے دیکھ کر زیر لب مسکرا رہا تھا۔ جاپ مکمل کر کے جوگی مہاراج نے بلی کا عمل مکمل کیا۔ دونوں ناگ اور ناگن انسانی خون میں اشنان کر رہے تھے اور سرخ زبانیں نکال کر خون چاٹ رہے تھے۔ جوگی مہاراج بیٹھے یہ منظر غور سے دیکھ رہے تھے، یہ ہی وہ لمحہ تھا جس کا صابو کو انتظار تھا۔ اس نے پلک جھپکنے میں خنجر کا وار مہاراج کی گردن پر کیا اور گرو مہاراج پتھرائی آنکھوں سے اپنے چیلے کو دیکھتے رہ گئے۔ صابو لاش ٹھکانے لگا کر جب کمرے میں آتا ہے تو پٹاری والی جگہ ایک خوب صورت نوجوان مرد اور سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی موجود تھے۔ صابو انہیں کہتا ہے کہ تم میرے غلام ہو۔ وہ ان کے نام ارجن اور شکنتلا تجویز کرتا ہے۔ تب ارجن اور شکنتلا اسے بتاتے ہیں کہ انہیں معلوم ہے کہ صابو ان کا گرو مہاراج نہیں بلکہ ایک چیلا ہے۔ تب صابو کے خون سے شیش ناگ کا یہ جوڑا اپنی پیاس بجھا کر شہر کا رخ کرتا ہے۔

لوگ اسے دیکھ لیتے ہیں اور اس پر تیل ڈال کر آگ لگا کر مار ڈالتے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر شکنتلا غصے میں آ جاتی ہے اور کہتی ہے۔ ''ارجن کے قاتلو! تم نے میرے ناگ کی ہتھیا کر کے بڑا انیائے کیا، تم ناگن کی طاقت اور انتقام سے واقف نہیں، شکنتلا تمہاری زندگیوں میں زہر گھول دے گی۔ میں اس گاؤں کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گی، تم موت مانگو گے لیکن موت بھی تم سے روٹھ جائے گی۔ ایک ایک کو تڑپا تڑپا کر ماروں گی میں پھر آؤں گی اور تمہارے لیے قیامت بن کر آؤں گی۔''



شکنتلا گاؤں کے لوگوں سے جان بچا کر بھاگ گئی ہے اور جنگل میں موجود ریاست تاپانہ کے مہاراجہ رام ناتھ کے قافلے تک جا پہنچتی ہے۔ مہاراجہ رام ناتھ اس کی خوب صورتی دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں اور اسے اپنی کنیز بنانے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔

مہارانی ماریہ مہاراجہ رام ناتھ کو بتاتی ہے کہ شکنتلا ناگن ہے اور انسانی روپ میں انہیں بے وقوف بنا رہی ہے اور اس کے لیے وہ چاہیں تو شاہی پنڈت گرو نرائن سے تصدیق کر سکتے ہیں۔ مہاراج اس سے کہتے ہیں کہ اگر شکنتلا ناگن ہوئی تو اس کو آگ میں جلا دیا جائے گا اور اگر یہ الزام جھوٹا ثابت ہو گیا تو ماریہ کو اسی آگ میں پھینک دیا جائے گا۔ ایک ہجوم شکنتلا کی رہائش گاہ پہنچتا ہے۔ مہارانی ماریہ اپنے لباس میں چھپا کر لایا جانے والا آئینہ اچانک شکنتلا کے سامنے کر دیتی ہے جس میں ایک بڑی سی ناگن لوگوں کو نظر آتی ہے۔ سپہ سالار بکرام شکنتلا کے بجائے راجہ رام ناتھ کو گرفتار کر لیتا ہے۔

سامری، شکنتلا، بکرام اور پریہ تاپانہ کی حکومت پر اپنی گرفت مضبوط کر چکے تھے۔ کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف نہ ہو سکتا تھا۔ ہر طرف ظلم کا راج تھا۔ شکنتلا جاپ کے ذریعے کالی ماتا کی مہان شکتی کے حصول میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ شکنتلا اب صرف ناگن نہ تھی بلکہ جادوگرنی بن چکی تھی۔ پریہ اس کے لیے ہر روز ایک خوب صورت نوجوان مہیا کرتی۔

شکنتلا سبز آنکھوں اور گھنگریالے بالوں والے نوجوان کو دیکھ کر مبہوت رہ جاتی ہے۔ وہ شکنتلا کو بتاتا ہے کہ وہ جنات کے بادشاہ خسگران کا بیٹا شگران ہے اور تمہارا کوئی جادو مجھ پر کارگر نہیں ہوگا۔

شکنتلا خسگران کو دوست بنانے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ وہ بھی اس کا ساتھ دینے پر راضی ہو جاتا ہے۔ سامری گرو نرائن کو منڈل جاپ سے باز رکھنے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے گرو شداو کی روح سے مدد طلب کرتا ہے۔ سامری جادوگر کی ملاقات خسگران سے ہوتی ہے۔ شکنتلا، شگران اور سامری تینوں گرو نرائن کے منڈل کے پاس جا پہنچتے ہیں لیکن گرو نرائن اپنا جاپ مکمل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ خسگران دونوں کو لے کر کلکتے سے دور لے جاتا ہے اور ان دونوں سے کہتا ہے کہ میں اپنی سلطنت واپس جا کر اپنے باپ اور دوسرے عقلمندوں سے اس بارے میں مشورہ کرتا ہوں۔ سامری بھی اپنے گرو شداد جادوگر سے رابطہ کرنے کے لیے شکنتلا کو اکیلا چھوڑ جاتا ہے۔ گرو نرائن کو شکنتلا کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ وہ مہا پنڈت لکشم ناتھ سے اس سلسلے میں مدد طلب کرتا ہے۔ مہا پنڈت شکنتلا سے فائدہ اٹھانے کے وعدے پر اس کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ گرو نرائن اور لکشم ناتھ شکنتلا دیوی تک پہنچ جاتے ہیں۔ گرو نرائن شکنتلا کو کہتا ہے کہ وہ اپنے مہابیروں کو حکم دے کہ وہ ہم سب کو ریاست کلکتہ کالی ماتا کے استھان کے اندر لکشم ناتھ کے کمرۂ خاص میں لے چلیں۔

شکنتلا کی ساری شکتیاں معطل ہو گئی تھیں اب وہ بالکل ایک عام سی کمزور بے بس لڑکی تھی۔ گرو نرائن شکنتلا سے کہتا ہے کہ چنگارے بولو کہ آئندہ تمہیں مالکن نہ کہے بلکہ براہ راست میرا حکم مانے۔

ادھر پریہ حیران تھی کہ کئی دن گزر گئے نہ شکنتلا واپس آئی اور نہ سامری یا خسگران۔ پریہ کو پتا تھا گرو نرائن شکنتلا کو غلام بنانا چاہ رہا ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ شکنتلا کا غلام بن جانا اس کے حق میں بہتر ہے تاکہ وہ حکومت پر قبضہ کر کے ملکہ بن جائے تب اچانک خسگران آتا ہے اور اسے بتاتا ہے کہ گرو نرائن تیرتھ جاپ میں کامیاب ہو کر شکنتلا کے جسم و جان اور اس کی تمام شکتیوں پر قابض ہو گیا ہے اور سامری بھی اس کے پاس قید ہو گیا ہے، یہ سن کر وہ خوش ہو جاتی ہے۔ سامری کو ہوش آتا ہے تو سامنے گرو نرائن اور لکشم ناتھ موجود تھے۔ تب وہ اپنے دیوتا کارمیکا کو اپنی سہائتا کے لیے پکارتا ہے، گرو نرائن منتر پڑھتا ہے اور نیلی آگ کے شعلے سامری اور شکنتلا کو گھیر لیتے ہیں۔ شکنتلا گرو نرائن کو بھی اس آگ میں کھینچ لیتی ہے اور ان کے جسم جلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ جب شکنتلا کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ ایک ویران اور بنجر جگہ پر موجود تھی۔ اس کا جسم بری طرح جلا ہوا تھا اور زخموں میں پیپ پڑ چکی تھی، اسی حالت میں شکنتلا تڑپتی سسکتی آبادی تک پہنچتی ہے جہاں اس پر کتے حملہ کر دیتے ہیں اور وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔ جب اس کو ہوش آتا ہے تو وہ ایک گھر میں موجود ہوتی ہے ایک نوجوان لڑکا، لڑکی اور ادھیڑ عمر عورت اور مرد موجود تھے۔ علاج اچھی خوراک اور مکمل آرام سے اس کے زخم بھرنے شروع ہو چکے تھے۔ لڑکی سندری شکنتلا کی دوست بن گئی ہے۔ شکنتلا دیکھتی ہے کہ سندری کا بھائی مگن رات گئے چپکے سے روز باہر نکل جاتا ہے۔ شکنتلا کو خود میں خون کی کمی محسوس ہوتی ہے اور وہ چنگارے کو یاد کرتی ہے۔ وہ اس وقت حیرت زدہ رہ جاتی ہے جب چنگارے کو اپنے سامنے کھڑا دیکھتی ہے، وہ سوچتی ہے کہ اس کو کھوئی ہوئی شکتیاں واپس مل گئی ہیں۔

شکنتلا کھوئی ہوئی شکتیاں پا کر کھلکھلا اٹھتی ہے۔ گاؤں کے کھیتوں سے نوجوان کی لاش ملتی ہے جس کی شہ رگ کاٹ کر اس کا خون پی لیا گیا تھا۔ گاؤں کے لوگ اس بات سے بہت خوف زدہ ہوتے ہیں۔ دلاور نامی شخص جس کو سادھو کوٹھاری نے اپنے بس میں کیا ہوا تھا۔ کوٹھاری دلاور سے کہتا ہے کہ تمہارے ذریعے ایک جن میرے قبضے میں آئے گا جو میرے تمام کام پل بھر میں کر دے گا۔

پھر تو بھی کوٹھاری کا چیلا بن کر عیش کرتا۔ پر یہ خسکران اور دونوں کی مدد سے حکومت کر رہی تھی اور دونوں کو خوش رکھتی تھی۔ تب ایک روز خسکران شکستلا کی تلاش میں نکلتا ہے اور پھر واپس نہیں آتا اور پھر ایک روز وہ بگرام کو بھی قید خانے میں ڈال دیتی ہے جہاں بھوک پیاس سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر بگرام بھی بے بسی کی موت مارا جاتا ہے۔

شکستلا کو چیکار بتاتا ہے کہ سندری کے بھائی گگن کو ایک چڑیل خوب صورت لڑکی بن کر اپنے جال میں قید کر چکی ہے اور روزانہ تھوڑا تھوڑا کر کے اس کا خون پیتی ہے۔ چیکار شکستلا کو اس جگہ لے جاتا ہے جہاں گگن مدہوشی کی حالت میں تھا اور وہ لڑکی اس کا خون پینے کو اس پر جھکی ہوئی تھی۔ تب وہاں اچانک شکستلا نمودار ہوتی ہے اور کالی دیوی کا جاپ پڑھ کر اس چڑیل کو آگ لگا کر ہلاک کر دیتی ہے۔ گگن کو ہوش آتا ہے تو وہ اسے سب بتا کر گھر واپس جانے کا کہتی ہے۔

سپیرا کروڑیا اور اس کے چیلا شیش ناگ کو اپنے بس میں کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے وہ بڑی تپسیا میں مصروف تھے۔

کوٹھاری دلاور کو ساتھ لے کر قبرستان پہنچتا ہے اور کدال سے ایک قبر کی مٹی ہٹاتا ہے۔ قبر سے جواں سالہ عورت کی لاش نکلتی ہے۔ دلاور اس کے بال کاٹ کر اپنے پاس محفوظ کر لیتا ہے۔ وہاں سے کوٹھاری اسے ایک مکان کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے اور دلاور سے کہتا ہے کہ اس مکان میں میاں بیوی اور ان کی ایک جواں سال بیٹی ہے، بوڑھے کو باہر بلا کر میں ابھی قتل کرتا ہوں، جبکہ لڑکی کو تو ہی لائے گا میرا ہاتھ لگانا منع ہے۔ اس کے بعد دلاور دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اندر سے ایک ادھیڑ عمر شخص باہر نکلتا ہے، کوٹھاری اس پر حملہ کر دیتا ہے اور اسے گردن سے دبوچ لیتا ہے۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر دلاور مکان میں گھس جاتا ہے۔ جہاں ایک کمرے میں نوجوان دوشیزہ موجود تھی اور دروازے کی آواز سے نیند سے بیدار ہوئی لگتی تھی۔ وہ دلاور کو دیکھ کر خوف زدہ ہو کر چلانے لگتی ہے۔

(اب آپ آگے ملاحظہ کیجیے)

بوڑھے کی بیوی ابھی تک دلاور کو نظر نہیں آئی تھی۔ دلاور نے آگے بڑھ کر لڑکی کو بالوں سے پکڑ لیا۔ لڑکی ہذیانی انداز میں چیخ پکار کرنے لگی۔ دلاور نے ایک لمحے کو سوچا اور پھر کھڑے ہاتھ کا وار اس کی کنپٹی پہ کیا۔ لڑکی کٹے ہوئے شہتیر کی مانند بے ہوش ہو کر گر پڑی تھی۔ دلاور لڑکی کو کندھے پر اٹھا کر باہر نکلا جہاں کوٹھاری اس کا منتظر تھا۔ بوڑھے کی لاش ایک



طرف پڑی تھی۔ کوٹھاری نے شاید ایک ہی گرفت سے اس کا کام تمام کر دیا تھا۔

کوٹھاری دلاور کو دیکھتے ہی اس کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے تیز تیز ایک طرف چل دیا اور دلاور لڑکی کو بانہوں میں اٹھائے اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی کوٹھاری کا ساتھ دینے پر مجبور ہو چکا تھا۔ ورنہ کوٹھاری اسے عبرت کا نشان بنا دیتا، سادھو کوٹھاری حیرت انگیز اور ناقابل یقین شکتیوں کا حامل انتہائی ظالم شخص تھا۔

وہ ابھی سوچوں میں غرقاب تھا کہ کوٹھاری کی منحوس آواز اس نے سنی۔ ''بس یہیں رک جا'' دلاور ٹھٹھک گیا۔ اس نے ارد گرد سر اٹھا کر دیکھا تو حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ یہ ایک بے آب گیاہ پہاڑی علاقہ تھا۔ ہر جانب بنجر اور بھوری پہاڑیاں تھیں۔ تاحد نگاہ آبادی کے آثار نہ تھے۔ جبکہ ابھی کچھ ہی دیر قبل وہ لڑکی کو اغوا کر کے نکلے تھے۔ اتنی جلدی آبادی سے دور کیسے آ گئے اس نے سوچا جبکہ ہم ابھی بمشکل ساٹھ ستر قدم چلے ہوں گے۔

''دیدے نہ پھاڑ دلاورے'' کوٹھاری اپرم پار شکتیوں کا سادھو ہے۔ کوٹھاری کی بات سن کر دلاور گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ کوٹھاری لمحوں میں آبادی سے خاصا دور کسی نامعلوم مقام پر آ گیا ہے۔ حیرت یا احتجاج فضول ہے اس وقت وہ ایک بہت بڑے لیکن ٹنڈ منڈ درخت کے عین نیچے کھڑے تھے اور یہ کسی کوہ کا دامن تھا۔ دلاور کو رات کے آخری پہر خاصی پر ہیبت جگہ لگی۔ کوٹھاری نے جلدی سے تھیلا جس میں عورت کے بال تھے اور کچھ دوسرا سامان تھا نیچے رکھا اور پھر کاندھے سے لٹکا جھولا بھی اُتار کر نیچے رکھ دیا۔ کوٹھاری نے اب جلدی جلدی ارد گرد سے پتھر اکٹھے کرنے شروع کیے۔

تھوڑی ہی دیر میں اس نے چھوٹے بڑے پتھروں کا ایک ذخیرہ کر لیا اور اب انہیں ایک ترتیب دینے لگا۔ جلد ہی اس نے ایک چتا بنا ڈالی۔ اب اس نے دلاور کو اشارہ کیا تو دلاور نے بے ہوش دوشیزہ کو چتا پر لٹا دیا۔

کوٹھاری نے تھیلے سے جھٹ پٹ پتلی ڈوری نکال کر لڑکی کے پہلے پاؤں اور پھر ہاتھ باندھ دیے۔ اس کے بعد دو بھاری پتھر اس کے پیٹ اور رانوں پر رکھ دیے۔ وزنی پتھروں کی تکلیف سے لڑکی کو ہوش آ گیا۔ تھوڑی دیر بکتے کے عالم میں رہنے کے بعد کسمسانے لگی تو کوٹھاری نے کھینچ کر دو تین جھانپڑ اسے رسید کیے۔ لیکن لڑکی صورت حال کو سمجھ کر چیخنے چلانے لگی، لیکن اُٹھنے سے قاصر تھی۔ لہٰذا دلاور کی طرف دیکھ کر گڑگڑانے اور رحم کی بھیک مانگنے لگی۔ دلاور سے اس کا گڑ گڑانا اور واسطے دینا دیکھا نہ گیا اور پھر اچانک ہی اس کے اندر سے ایک اچھا انسان انگڑائی لے کر چیتے کی سی تیزی سے اٹھا اور دلاور کوٹھاری کی طاقت اور اختیارات بھلا کر بجلی کی سی تیزی سے اس کے سر پر پہنچ گیا اور ہاتھ فضا میں بلند کر کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں، انگلیوں میں پھنسائیں اور ہتھیلیاں جوڑ کر ایک زوردار ہتڑ کوٹھاری کی پشت پر گردن کے پیچھے مارا تو کوٹھاری برق رفتاری سے پلٹا۔

''کتے کے پلے، حرامزادے...... تیری یہ جرأت'' دلاور دوسرے وار کے لیے ہاتھ بلند کر چکا تھا، لیکن اوپر لے جا کر ہاتھ نیچے لانے کی حسرت اس کے دل میں ہی رہ گئی اور وہ باوجود کوشش کے ہاتھ نیچے نہ لا سکا بلکہ اب وہ پاؤں بھی حرکت میں لانے سے قاصر ہو چکا تھا اور کوٹھاری خشمگیں نگاہوں سے نفرت انگیز لہجے میں بولا۔

''دلاور تیری اس موقع پر اس حرکت سے میری برسوں کی تپسیا نشٹ ہو سکتی تھی میں تجھے معاف نہیں کروں گا۔''

یہ کہہ کر وہ پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا کیوں کہ اب پو پھٹنے ہی والی تھی اور کوٹھاری کو تمام جنتر منتر اندھیرے میں کرنے تھے۔ اب عورت کے بال نکال کر ان میں سے مختلف سفوف تھوڑے تھوڑے لے کر پیالے میں ڈالتا چلا گیا ان کاموں کے ساتھ اس کے ہونٹ بھی ہلتے جاتے تھے۔ شاید جنتر منتر میں مگن تھا اب اس نے عورت کے چند بال پیالے میں ڈالے اور کچھ پڑھ کر پیالے پر پھونک ماری تو نیلے رنگ کی چنگاریاں پھوٹیں جو بڑھتے بڑھتے آگ کی شکل اختیار کر گئیں۔

چنگاریاں پھوٹتے ہی کوٹھاری کی آنکھوں میں چمک اُبھری اور اس کے ہونٹ تیزی سے ہلنے لگے اور آواز بھی قدرے بلند ہو گئی۔ کوٹھاری اٹھا اور سرعت کے ساتھ لڑکی کے قریب آیا اور ایک تیز دھار چھوٹی سی چھری نکالی۔ لڑکی کا الٹا ہاتھ پکڑا اور ایک جھٹکے سے چھری اس کی کلائی پر پھیر دی۔ لڑکی کے حلق سے ایک فلک شگاف سماعت خراش چیخ نکلی۔ جس سے ویرانے کی خاموش فضائیں گونج اُٹھیں۔ لڑکی بُری طرح تڑپ رہی تھی۔

دلاور اپنے پورے ہوش وحواس میں یہ سارا عمل دیکھ رہا تھا لیکن کوٹھاری کی نادیدہ شکتیوں نے اسے لاچار کر رکھا تھا۔
اب کوٹھاری نے لڑکی کا دوسرا ہاتھ کاٹ کر پیالے میں ڈالا۔ مزید چنگاریاں اُبھر کر آگ کی شکل اختیار کر گئیں۔ لڑکی ذبیحہ جانور کی طرح ڈکرانے لگی۔

کوٹھاری خاصی بلند آواز میں اشلوک پڑھنے میں مصروف تھا۔ اور پیالے میں آگ بھڑک چکی تھی۔ تھوڑی دیر عمل کرنے کے بعد کوٹھاری نے الٹے ہاتھ سے بھڑکتی آگ والا پیالہ اُٹھا کر چتا پر لیٹی دوشیزہ کے اوپر اُلٹا دیا۔ ایک زوردار شعلہ بلند ہوا اور لڑکی جلنے لگی اور آگ کے نیلے شعلے بلند ہو کر اوپر کی طرف جانے لگے۔ نیلے شعلے نے ایک لکیر کی شکل اختیار کر لی جو بلند ہو رہی تھی۔ شعلے کی لکیر بنتے ہی کوٹھاری نے بالشت بھر کی شیشی نکالی جس کا پیندا گول تھا اس کو زمین پر رکھ دیا اور حیرت انگیز طور پر پیندا گول ہونے کے باوجود شیشے کی وہ بوتل سیدھی کھڑی رہ گئی۔ اس کا منہ کھلا تھا۔

نیلی لکیر بلند ہوتے ہوتے غائب ہو چکی تھی۔ آگ بجھ چکی تھی اور اس کے ساتھ ہی مشرق سے پو پھٹ گئی اور صبح کا نور اندھیرے کو کھانے لگا۔ آسمان گھرے بادلوں سے ڈھکا تھا لڑکی کا جسم جل کر خاکستر ہو چکا تھا۔ چتا سے دھواں اُٹھنے لگا۔ دلاور جوں کے توں زاویے پر تھا۔ اس کے بازوؤں کے جوڑ اب دُکھنے لگے تھے۔ کوٹھاری آلتی پالتی مار کر کچھ پڑھنے میں مصروف تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی اور پتلیاں تیزی سے گردش کر رہی تھیں۔

اور یہ منظر ختم ہو گیا۔ خاصی دیر گزر گئی جوں جوں دیر ہو رہی تھی کوٹھاری کی آنکھوں میں اُلجھن کے آثار بڑھتے جا رہے تھے۔ اسی اثناء میں بارش شروع ہو گئی لیکن زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ بادلوں کے دبیز لحاف سے ایک نیلے رنگ کا چمکتا نقطہ کوٹھاری کو نظر آیا جو آہستہ آہستہ بڑا ہو رہا تھا۔ چند ہی گھڑیوں میں نیلا نقطہ واضح ہوا تو کوٹھاری نے دیکھا کہ یہ وہی نیلا شعلہ تھا جو چتا سے نکل کر آسمان کی جانب لپکا تھا۔ یہ سیدھا زمین پر اسی طرف آ رہا تھا جہاں چتا اور کوٹھاری تھا۔

پھر کوٹھاری کی باچھیں کھل اُٹھیں جب اس نے یہ دیکھا کہ نیلے شعلے کے درمیان کوئی دھواں دھواں سا ہے اسے یقین ہو چلا کہ کوئی جن اس کے قبضے میں آیا ہی چاہتا ہے جسے نیلا شعلہ اپنے حصار میں قید کر کے لا رہا ہے! کوٹھاری نے سرعت سے گول پیندے والی بوتل اُٹھائی اور الٹے ہاتھ سے چتا میں آڑی ترچھی ایک خاص انداز سے انگلیاں پھیرنے لگا اور پھر جلدی سے مٹھی بھر راکھ اُٹھا کر اس نے بوتل میں ڈال دی اور بوتل چتا کے اوپر رکھی اور بوتل کا ڈھکن بھی قریب کر لیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے نیلا شعلہ چتا کے اوپر رکھی بوتل تک آ گیا اور بوتل کو گھیرے میں لے کر اس کے محور میں گھومنے لگا اور اس کے درمیان کا سفید دھواں جو کہ حسکران جن تھا آہستہ آہستہ بوتل میں داخل ہونے لگا یہاں تک کہ تمام بوتل دھوئیں سے بھر گئی اور نیلا شعلہ بوتل کے گرد گھومتے گھومتے معدوم ہونے لگا اور معدوم ہوتے ہوتے ختم ہوتا چلا گیا اور کوٹھاری نے آگے بڑھ کر ڈھکن لگا کر بوتل کا منہ بند کر دیا۔

''ہی ہی ہی ہا ہا ہا ہو ہو ہو'' کوٹھاری خوشی سے ناچنے لگا۔ ''ہے ہے ہے ہے!'' کوٹھاری خوشی سے قہقہے لگا رہا تھا۔ آج میری من مراد پوری ہو گئی۔ جن میرے قبضے میں آ گیا ہے۔ یہ میرے سارے کام کرے گا۔

''دلاور'' وہ دلاور کو جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔

''دیکھو کوٹھاری آج کتنی بڑی شکتی بن گیا ہے، کوٹھاری تو پہلے ہی اپنا ثانی نہ رکھتا تھا، لیکن آج اس سنسار کی بہت بڑی بلکہ سب سے بڑی شکتی بن چکا ہے اور تو نے میرے عمل کو بھرشٹ کرنے کی سعی کی ہے میں تجھے سزا ضرور دوں گا۔'' وہ دلاور کو قہر آلود نگاہوں سے تکتے ہوئے بولا۔ دلاور کے دونوں ہاتھ دو جنتر مارنے کے انداز میں بلند تھے اور قدرے آگے جھکا ہوا سیدھا کھڑا تھا۔ وہ اس وقت مکمل ہوش حواس اور جیتے جاگتے دیکھنے سننے اور زندہ وجود والا دلاور تھا سوائے اس کے کہ وہ حرکت سے قاصر تھا اور اس زاویے میں کافی دیر کھڑے رہنے کے باعث اس کو سخت تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی گویائی بھی اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ یعنی وہ اب مکمل کوٹھاری کے بس میں تھا۔ کوٹھاری آگے بڑھ کر اس کے دونوں کان ہاتھوں سے پکڑ کر کہہ رہا تھا۔ ''تو اب اس وقت تک یہاں اس حالت میں رہے گا جب تک میں اپنے سب سے پرانے اور ازلی دشمن راجہ ہری داس کے جیون کا خاتمہ نہیں کر لیتا۔ جس نے آج سے بیس سال قبل جب میں ایک معمولی سادھو تھا مجھ

پر جادوگر ہونے کا الزام لگا کر مجھے آگ کے الاؤ میں پھینکنے کا حکم دیا تھا۔ لیکن میں کسی طور بچ نکلا اور روپوش ہوگیا لیکن آج میں طاقتور ہوں طاقتور تو میں کافی عرصہ پہلے ہی ہو چکا ہوں لیکن مجھے مناسب وقت کا انتظار تھا اور آج جن قابو کر لینے کے بعد میں بہت خوش بھی ہوں اور ایک دن کے لیے فارغ بھی کیوں کہ یہ جن ابھی مجھے ایک رات ایک دن تک مسلسل بوتل میں بند رکھنا پڑے گا تا کہ لڑکی کی راکھ اس کے شریر کو نرم کر دے اتنا نرم کر دے کہ وہ موم کی طرح ہو جائے اور جدھر کوٹھاری چاہے وہ مڑ جائے یعنی ہر حکم کی تعمیل کسی زر خرید غلام کی طرح کرے۔" یہ کہہ کر کوٹھاری اپنا سامان سمیٹنے لگا۔

ولادر چاہتا تھا کہ کوٹھاری اسے معاف کر دے کیوں کہ اس کے جسم میں سخت تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ اٹھائے اور آگے کے جھکے ہوئے تھا اور اس حالت میں اسے کئی گھنٹے ہو چکے تھے اور وہ عام انسانوں کی مانند ہی تکلیف محسوس کر رہا تھا لیکن حرکت اور بولنے سے مجبور تھا اور چاہنے کے باوجود بھی کوٹھاری کو مخاطب نہ کر سکا اور اب ولادر سوچنے لگا کہ اگر کوٹھاری اسے چھوڑ کر چلا گیا تو اس کا کیا بنے گا۔ جانے وہ کب لوٹ کر آئے۔

کوٹھاری سامان سمیٹ کر تھیلا کاندھے پر لٹکا کر اٹھنے کی تیاری میں مصروف تھا کہ اچانک اس کے اوپر ایک بہت بڑا جال آ پڑا اس نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن بہت سے سپاہیوں نے اسے لاتوں اور ڈنڈوں پر رکھ لیا یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ کوٹھاری کو کچھ کرنے کا موقع نہ ملا اور مسلسل پڑنے والے ڈنڈوں سے اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

کوٹھاری کو ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو انتہائی تکلیف دہ حالت میں پایا۔ لوہے کی باریک تار اس کے اوپری ہونٹ سے گزار کر ناک کے نتھنے سے مضبوطی سے باندھ دی گئی تھی اور اسی طرح نچلے ہونٹ کے درمیان سوراخ کر کے لوہے کی تار گزار کر اس کی گردن کے گرد مضبوطی سے لپیٹ دی گئی تھی! ہونٹ جدا ہونے سے وہ کوئی بھی جنتر منتر پڑھنے سے قاصر تھا جبکہ تار گلے میں بندھی ہونے سے اسے سانس گھٹتا محسوس ہو رہا تھا ادھر ناک میں تار کی موجودگی اس کی آنکھوں میں مسلسل پانی لا رہی تھی۔

پاؤں میں بیڑیاں جبکہ گلے میں بھاری لوہے کا طوق تھا اور دونوں ہاتھ طوق کے ساتھ بندھے تھے۔ بیٹھے بٹھائے وہ اس مصیبت کا شکار ہو جائے گا کوٹھاری نے سوچا تک نہ تھا۔ آہستہ آہستہ آنکھوں میں پانی آنا بند ہوا تو اس کی آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو سامنے عجب منظر نظر آیا۔ ایک صاف شفاف پانی کا بڑا سا تالاب تھا جس کے چاروں طرف سفید سنگ مرمر کی سیڑھیاں تھیں جو تالاب سے لے کر اوپر تک جاتی تھیں۔ تالاب سے لے کر اوپر آخری سیڑھی تک تقریباً دو دو قدموں کے وقفے سے قیامت خیز حد تک خوب صورت سانولی اور سفید چمڑی والی دوشیزائیں کھڑی تھیں۔ جبکہ تالاب کے اندر بہت سی لڑکیاں اشنان کر رہی تھیں، ان کے درمیان تقریباً پچاس کے پیٹے میں ایک بھاری بھرکم شخص جس کا سر گنجا جبکہ چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی، غبارہ نما تختے پر لیٹا تھا اور ہنستی کھلکھلاتی دوشیزائیں اس کے گرد جھرمٹ ڈالے اس کے بھدے جسم پر اپنے نازک ہاتھوں سے پانی ڈال ڈال کر نہلا رہی تھیں۔

کوٹھاری نے اپنے آپ کو ایک سیڑھی پر پڑے پایا اس کے گرد چند دوشیزائیں کھڑی تھیں۔ دو کے ہاتھوں میں کوڑے جب کہ تیسری نے وہ زنجیر مضبوطی سے تھام رکھی تھی جس کا سرا کوٹھاری کی ناک میں تھا۔ کوٹھاری فوراً جان گیا کہ اس کے ازلی دشمن ہری داس نے اسے گرفتار کر لیا ہے اور اس وقت وہ اپنے محل کے اندر بنے ہوئے اشنان گھاٹ پر صبح کا اشنان کر رہا ہے!! کوٹھاری کو ہوش میں دیکھ کر دوشیزاؤں کے کوڑے لہرائے تو کوٹھاری تڑپ اٹھا۔ لڑکیاں اسے کھڑا ہونے کا اشارہ کر رہی تھیں۔ بڑی مشکلوں سے کوٹھاری کھڑا ہو گیا۔ کھڑا ہونے میں اس کی کسی نے مدد تو نہ کی، البتہ صحیح کھڑا ہونے تک اس کا جسم سرخ ہو چکا تھا۔ کوڑوں کی ضربوں سے!!

راجہ ہری داس ایک جنگجو اور عیاش طبع راجہ تھا صرف پندرہ سال کی عمر میں اپنے باپ راجہ مان داس کو قتل کر کے راج دھانی پر قابض ہو گیا تھا۔ ساری عمر اس نے شادی نہ کی البتہ ہر وقت خوب صورت کنیزوں کی جھرمٹ میں رہنا اس کا مشغلہ تھا۔ پوری راجدھانی سے خوب صورت لڑکیاں اس کے حرم میں پہنچا دی جاتیں پھر ان میں سے راجہ اپنی خاص خدمت کے لیے کنیزیں چن لیتا۔ یہی کنیزیں اس کو نہلاتیں اور ہر وقت اس کے پہلو میں ہوتیں اور پھر خواب گاہ میں جلوہ

افروز راتیں بھوجن کے وقت بھی خوب صورت لڑکیاں ہی نوالے اس کے منہ میں ڈالتیں سفر میں بھی ساتھ ہوتیں، مزید کم سن اور صحت مند حسیناؤں کی آمد کے ساتھ پرانی لڑکیوں میں سے چھانٹی کر دی جاتی اور چھانٹی کی جانے والی لڑکیوں کو اچھی خاصی دولت دے کر چھوڑ دیا جاتا۔ راجہ ہری داس کی کوئی رانی یا مہارانی نہ تھی کیوں کہ بقول ہری داس جب تازہ دودھ دستیاب ہو تو بھینس پالنے کی کیا ضرورت ہے۔ ان تمام عیاشیوں کے باوجود راجہ ہری داس ایک مہربان رحم دل اور رعایا کا خیال رکھنے والا ہمدرد حکمران تھا۔ یہی وجہ تھی عوام کی بھرپور تائید اسے حاصل تھی۔

عنان حکومت سنبھالتے ہی اس نے عوام کے جس مطالبے کو سب سے پہلے پورا کیا وہ یہی تھا کہ راجدھانی شانت نگر میں جادوگروں کا قلع قمع کرتا تھا۔ ان دنوں شانت نگر میں جادوگروں اور جادوگرنیوں کی وباء عام تھی۔ ان لوگوں نے الٹی سیدھی حرکتوں سے عوام کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔

راجہ ہری داس نے جادوگروں جادوگرنیوں کے لیے موت کی سزا کا قانون بنایا جو جادوگر یا جادوگرنی نظر آ جاتی اس کو آگ میں جلا دیا جاتا۔ سینکڑوں ایسے مرد وزن بھی اس قانون کی زد میں آ گئے جن پر معمولی سا شک بھی گزرتا کئی لوگوں نے اس قانون کی آڑ میں اپنے کئی دشمنوں کو ٹھکانے لگوایا جس کی بناء پر اب پوری راجدھانی شانت نگر میں جادو ٹونا کرنے والا ڈھونڈے سے نہ ملتا تھا۔

کوٹھاری بھی اس جرم میں کئی بار گرفتار ہو چکا تھا، لیکن ہر بار کسی نہ کسی طور فرار ہو جاتا، کیوں کہ وہ تقریباً مکمل جادوگر تھا، لہٰذا بعض دفعہ کئی لوگوں کو اذیت ناک موت سے ہمکنار کر دیتا۔ آخری دفعہ وہ بیس برس پہلے گرفتار ہوا تھا اور چونکہ وہ اب خطرناک ہو چکا تھا لہٰذا اس کے ہونٹ علیحدہ کر کے سی دیے گئے تھے تاکہ وہ جادو ٹونا نہ کر سکے۔ کوٹھاری اس بے کسی کے عالم میں راجہ ہری داس کو اشنان کرتے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بھاری طوق اور بیڑیوں سے شل ہو رہے تھے، جبکہ ہونٹوں اور ناک سے گزرتی لوہے کی تار سخت اذیت دے رہی تھی اور گلے سے لپٹی تار اس کا سانس بند کر رہی تھی۔

جس دوشیزہ نے اس کی ناک ہونٹ سے گزرتی زنجیر تھام رکھی تھی وہ اسے تھوڑی دیر بعد ہلکا سا کھینچتی یا ہلاتی تو تکلیف سے کوٹھاری بلبلا اٹھتا۔ تمام کنیزیں یوں اپنی حرکتوں میں مگن تھیں جیسے کوٹھاری موجود ہی نہ ہو۔ کافی دیر اس کی حالت سے بے خبر راجہ ہری داس خوب صورت حسیناؤں کے جھرمٹ میں اشنان کرتا رہا۔ تالاب کے اندر اور سیڑھیوں پر الہڑ جوانیوں کی کھنکتی ہنسی اور نقرئی قہقہے یوں گونجتے رہے جیسے کسی کو کوٹھاری کی خوفناک اذیت سے کوئی سروکار نہ ہو!!

پھر راجہ ہری داس کی ہوا بھری کشتی کنارے پر لگائی گئی۔ کنیزیں اسے اپنی بانہوں کے گھیرے میں اٹھا کر کنارے پر لائیں۔ سیڑھیوں پر کھڑی لڑکیوں کی دو قطاریں تالاب سے لے کر اوپر آخری سیڑھی تک تھیں۔ راجہ ہری داس ان کے درمیان فراز و قوسین کے سہارے سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی کوٹھاری کی زنجیر تھامی لڑکی نے مسکرا کر زنجیر ہلائی اور کوٹھاری کو سیڑھیاں چڑھنے کا اشارہ کیا۔ بھاری طوق اور وزنی بیڑیوں والے پاؤں کے ساتھ کوٹھاری لڑکھڑا کر اوپر چڑھنے لگا اور کوڑا بردار لڑکیاں کوڑا لہرا لہرا کر اس کے جسم پر سرخ لکیریں بنانے لگیں۔

☆......☆

دلاور بڑا حیران تھا کہ سپاہیوں نے جال پھینک کر کوٹھاری کو تو دبوچ لیا لیکن دلاور کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ کیا کوٹھاری نے کوئی ایسا عمل کیا ہے جس کی وجہ سے دلاور عام آدمی کو نظر نہیں آتا۔ یہ خیال آتے ہی دلاور کا خوف سے رواں رواں کھڑا ہو گیا، کیوں کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب جب تک کوٹھاری آزاد ہو کر اس جگہ واپس آ کر دلاور کو خود صحیح نہیں کرتا دلاور اسی عذاب میں مبتلا رہے گا۔ کیوں کہ یہاں سے گزرنے والے کسی بھی آدمی کو دلاور نہ تو دکھائی دے گا نہ دلاور کی آواز نکلتی ہے۔

اور اس وقت تو دلاور کی بھوک اور پیاس بھی چمکنا شروع ہو گئی تھی۔ دلاور کی پریشانی دوچند ہو گئی اور کوٹھاری سپاہیوں سے رہائی پا کر کب آتا ہے اس سوال کا کوئی جواب دلاور کے پاس نہ تھا۔

اس عالم میں رات ہو گئی اور دلاور تھکن اور بھوک پیاس سے نڈھال ہو کر ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گیا۔

☆......☆

ہری داس سونے چاندی سے بنے ایک بہت بڑے سنہرے تخت پر براجمان ہو چکا تھا۔ تمام درباریوں کی کرسیاں تخت سے خاصی نچلی سطح پر قطار در قطار لگی تھیں اور حسین و جمیل لڑکیاں دربار میں تتلیاں بن کر اُڑ رہی تھیں۔ ہری داس درباری امور نمٹانے اور مختلف مقدمات کے فیصلے کر رہا تھا۔

آخر وہ کوٹھاری کی طرف متوجہ ہوا۔

"تمہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ شانت نگر میں جادوگری کی سزا موت ہے پھر بھی تم گزشتہ کئی سالوں سے اس قبیح فعل میں مصروف ہو۔ تمہیں کئی بار پابند سلاسل کیا گیا لیکن تم ہر بار فرار ہو گئے! اور اب تم اتنے طاقتور ہو گئے تھے کہ معصوم انسانوں کے پے در پے سفاکانہ قتل تمہارے لیے کوئی معمولی بات ہے۔ اپنے کالے علم اور جنتر منتر کے لیے تم نے نہ جانے کتنے خون کیے ہیں ابھی رات ہی تم نے ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا اور جو شخص باہر نکلا اس کو گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا اس کی بیوی پر پے در پے وار کر کے اسے شدید گھائل کر دیا اور اس کی لڑکی اغوا کر کے لے گئے!

اور پھر اس لڑکی کو اپنے شیطانی عمل کی چتا پر جلا دیا۔

جب تم عورت کو گھائل کر کے نکلے تو اس کے شور سے اہل محلہ اکٹھے ہوئے اور ان کے بیان کی روشنی میں تیری تلاش شروع ہوئی ہر مرگھٹ، ہر ویرانہ اور کھنڈرات راتوں رات کھنگالے گئے، بالآخر تجھے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا۔ افسوس معصوم نوجوان لڑکی کو نہ بچایا جا سکا وہ تیری سفلی خواہشات کی بھینٹ چڑھ گئی۔

اب تیرے ہونٹ اسی لیے جدا کر کے سی دیے گئے ہیں کہ تو کوئی عمل نہ کر سکے۔ مجھے افسوس ہے کہ مرنے سے قبل اب تو موت تک بھوکا پیاسا اسی حالت میں رہے گا......

کل صبح سورج نکلنے کے بعد کھلے میدان میں دربار لگے گا اور وہی عورت جس کی بچی تو نے اغوا کی ہے تیرے اوپر تیل انڈیل کر تجھے آگ لگا دے گی اس وقت تک تجھے میں اپنی آنکھوں کے سامنے ہی رکھوں گا میں اب تیرے کارن کسی پر وشواس نہیں کر سکتا۔

اس کے ساتھ ہی راجہ نے دربار ملتوی کر دیا۔

اب کوٹھاری پریشان ہو چکا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس نے فرار کے لیے جو کچھ بھی کرنا ہے کل سورج نکلنے سے پیشتر ہی کرنا ہے گویا اس کی موت میں اٹھارہ بیس گھنٹے ہی فقط باقی ہیں!

چاق چوبند سپاہیوں کا ایک دستہ اسے جلو میں لے کر راجہ کے ساتھ ساتھ محل کی جانب رواں تھا۔ کوٹھاری کے لیے ایک قدم اٹھانا بھی دوبھر تھا لیکن تسلسل کوڑا زنی اس کو چلتے رہنے پر مجبور کر رہی تھی۔ کوٹھاری سوچ رہا تھا کہ کسی طرح صرف میرے ہونٹ کھل جائیں تو یہ راجہ، دربار، یہ سپاہی اور یہ تمام لوگ تو میں ایک پھونک سے بھسم کر دوں، لیکن راجہ داس کو کسی نے صحیح مت دی تھی کہ کوٹھاری کے ہونٹوں کی آزادی راجہ کی موت ہوگی! راجہ داس اسی لیے صبح تک اسے اپنی آنکھوں کے سامنے رکھنا چاہتا تھا۔

سپاہیوں کا دستہ کوٹھاری کو اپنے حصار میں لیے خلوت گاہ تک آپہنچا۔

یہ ایک بہت بڑا اور انتہائی آراستہ و پیراستہ کمرہ تھا جس کی چھت اونچی اور قدرے بیضوی تھی دیوار سے دیوار تک قالین بچھے تھے ایک جانب قیمتی لکڑی کا بنا ہوا بہت بڑا پلنگ تھا۔ پلنگ پر انتہائی نرم دبیز گدا اور پھولوں سے مزین ریشمی چادریں بچھی تھیں۔ پلنگ کے سرہانے والی سمت سمیت تین اطراف چھت سے فرش تک سیکڑوں پھولوں کی بھینی خوشبو سے پورا کمرہ مہک رہا تھا۔ کمرہ میں جا بجا کشادہ کھڑکیاں اور ان کے آگے بستر کی چادروں کے ہم رنگ پردے لٹک رہے تھے۔

بستر کے علاوہ وہاں اعلیٰ قسم کے صوفے بھی رکھے تھے دیواروں کے اندر جا بجا طاق تھے جن کے اندر شمعیں تھیں جو رات کے وقت روشن کر دی جاتی ہیں راجہ ہری داس باوقار چلتے ہوئے صوفے پر تشریف فرما ہو گئے اور دھنک رنگ لباسوں میں ملبوس کنیزیں ان کے پیچھے اور دائیں بائیں مؤدب کھڑی ہو گئیں۔

سپاہیوں کا دستہ اندر داخل ہوتے ہی بڑے دروازے کے ایک کونے میں کوٹھاری کے گرد مستعد گھیرا ڈال کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن ہری داس نے سب سپاہیوں کو دروازے کے باہر کھڑا ہونے کا حکم دیا تو سپاہی باہر نکل گئے اب ہری داس ہنے

چند کنیزوں کو کوٹھاری سے ذرا فاصلہ رکھ کر کھڑے ہونے کا حکم دیا اور بولے۔ صبح تک تین تین کنیزوں کا ٹولہ دو دو گھنٹے اس کے ارد گرد ہوگا نہ تو اس خبیث کو سونے دیا جائے اور نہ بیٹھنے کی اجازت ہے اور اس کے سر پر ڈنڈوں سے مسلسل ایسی ضربیں لگاتی رہو کہ یہ کچھ سوچ نہ سکے۔ حکم صادر کرنے کے بعد اس کے بعد کچھ دیر راجہ ہری داس صوفے پر بیٹھے سانسیں درست کرتے رہے اور پھر ایک کنیز کو حقہ لانے کا اشارہ کیا اور ہولے ہولے کش لینے لگے۔

دوسری کنیز نے چاندی کے پیالے میں انگوروں کا شربت ان کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ چند گھونٹ بھرنے کے بعد راجہ ہری داس صوفے پر ٹیک لگا کر بیٹھ گئے تو تیسری کنیز اپنے رنگین و مہین آنچل سے ہری داس کے ہونٹ صاف کرنے کے لیے جھکی جس وقت اس کا ہاتھ ہری داس کے ہونٹوں پر تھا تو اس کے ریشمیں زلف و بدن کی خوشبو نے ہری داس کو دیوانہ کر دیا اور ہری داس نے اس کی کھنکناتی کلائی تھام لی۔ شوخ و شریر گلابی رنگت اور بڑی بڑی آنکھوں والی چنچل کنیز شاید اسی لمحے کی آس میں تھی لہٰذا وہ پکے ہوئے پھل کی طرح آغوش شاہانہ میں بسیرا کر گئی اور ارد گرد کی تمام کنیزیں ہنسی کی نقرئی گھنٹیاں بجانے لگیں۔

کوٹھاری ایک سن رسیدہ سادھو تھا۔ عمر کے آخری حصے میں ہونے کے باوجود وہ طلسمات کی وجہ سے پھرتیلا اور سخت جان نظر آتا تھا، لیکن اس وقت جادو کی غیر موجودگی بھوک پیاس کی شدت، بیڑیوں اور زنجیروں کی سختی اور وزن، منہ ناک سے گزرتیں اور گردن پر کسی زنجیر، ہاتھ پاؤں اور سارا جسم ایک ہی زاویے پر کھڑا رہنے کی مسلسل تکلیف اور جسم اور سر پر پڑنے والی ضربات اس کو پاگل کر رہی تھیں۔ اس کے حواس باختہ ہو رہے تھے اور سب سے بڑھ کر موت کا رونگٹے کھڑے کر دینے والا تصور جو ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کے قریب ہو رہی تھی۔ کوٹھاری کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن ایسی بری طرح راجہ ہری داس نے اس کو شکنجے میں کسا تھا کہ وہ پھڑپھڑا کر رہ گیا۔

دو کنیزیں پشت سے سر پر وقفے وقفے سے ضرب لگاتیں۔ جس سے کوٹھاری کا دماغ گھوم جاتا۔ رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا خواب گاہ کے طاقوں میں رکھے ہوئے بے شمار چراغ روشن ہو چکے تھے۔ چراغوں کی جھلملاتی روشنیوں میں کنیزوں کے رنگ برنگی لباس عجیب سماں پیش کرنے لگے۔ راجہ گاؤ تکیوں کے سہارے بیٹھ گئے۔

خاص کنیزیں ان کے گرد بے تکلفی سے براجمان ہوگئیں۔ شراب کا دور چلنے لگا اور چند ساز ینہ نواز دوشیزائیں آئیں اور ساز بج اٹھے...... گھنگھرو چھنک اٹھے...... اعصابی شاعری کی آڑ میں۔ رقص کی ماہر کنیزیں جو شراب کے نشے میں چور تھیں! راجہ کا دل بہلانے کو ناچنے لگیں اب راجہ بھی پلنگ سے نیچے اتر کر لڑکھڑانے لگا۔

ادھر کوٹھاری ہونٹوں کو حرکت دینے کی بھرپور کوشش میں مصروف تھا کہ سرسوتی دیوی کا دو لفظی کٹھن جاپ کسی طرح سے جپ لے تا کہ بندھن کرچی کرچی ہو کر بکھر جائیں، لیکن ظالموں نے لوہے کی تار سے ہونٹ اس طرح متضاد سمتوں میں کسے تھے کہ دونوں ہونٹ کسی طور پر جڑتے ہی نہ تھے اور وہ ایک لفظ بھی کہنے سے قاصر تھا، لیکن اب کوٹھاری کو آخری کوشش کرنی ہی تھی کیوں کہ رات ہی رات میں اسے کچھ کرنا تھا۔ صبح ہوتے ہی سپاہی اسے گھیر لیتے اور پھر اس کی کوششیں رائیگاں تھیں اور پھر آگ کی موت...... ایک بھیانک موت...... کوٹھاری اس بے بسی کی حالت میں چوہے دان میں پھنسے چوہے کی طرح مرنا نہ چاہتا تھا۔ اس نے اپنا زور لگایا اور ہونٹ ملا کر صرف دو لفظی جاپ جپنے کی کوشش کی، لیکن ہونٹ خاصے دور تھے اس نے اور زور لگایا تو یکایک اس کی چیخیں نکل گئیں ہونٹ چرنے لگے تھے، ناک بھی چر گیا اور کوٹھاری کے ناک منہ سے خون کے قطرے گرنے لگے اور آنکھوں سے پانی جاری ہوگیا۔ کھنچاؤ سے اس کی گردن میں کسی ہوئی زنجیر مزید تن گئی۔ اس کی حرکت کو دیکھتے ہوئے پہرے دار کنیزوں نے دھڑا دھڑ لاٹھیاں اس کے سر پر برسانی شروع کر دیں۔

اب کوٹھاری کے اعصاب شل ہوگئے اور اس کے حواس جواب دے گئے اور وہ بے ہوش ہوگیا۔

☆......☆

ایک چنڈال میں راجہ ہری داس کا دربار لگ چکا تھا۔ چنڈال عوام و خواص سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ لوگ شانت نگر کے مشہور جادوگر کا حشر دیکھنے جمع تھے۔ کوٹھاری ایک جانب زمین پر گرا پڑا تھا۔ گو وہ ہوش میں آ چکا تھا تاہم اب اس کی قوت ارادی اور طاقت جسمانی ختم ہو چکی تھی اس کو اپنی بے وقت اور بے بس موت کا پورا احساس ہو چکا تھا۔ اس نے جیون کے اس

موڑ پر جب وہ ہر طرح سے طاقتور ہو چکا تھا اپنی ایسی اچانک اور بے بسی کی موت کا سوچا تک نہ تھا، لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس وقت تیج اس پر جلنے کا تیل ڈالا جا چکا تھا وہی عورت جس کی بیٹی کو کوٹھاری نے قتل کیا تھا تم وانیدہ اور نفرت کی تصویر بنی کوٹھاری کو خشمگیں نگاہوں سے گھورتے ہوئے آگ کی مشعل اٹھائے راجہ کے اشارے کی منتظر تھی۔ راجہ ہری داس کے اشارے کا انہیں انتظار تھا۔ ہری داس کو اس وقت کوٹھاری کے تھیلے اور جائے وقوعہ سے برآمد ہونے والا سامان دکھایا جا رہا تھا۔ کوٹھاری چوں کہ ایک جادوگر سادھو تھا لہٰذا اس کا سامان بغیر دیکھے کوڑا کرکٹ میں نہیں پھینکا جا سکتا تھا، کیوں کہ اس میں کوئی خطرناک چیز بھی ہو سکتی تھی! کوٹھاری کے سامان میں ایک پنڈلی کی ہڈی، کئی چھوٹی چھوٹی ڈبیوں میں کچھ سفوف، چھوٹے بڑے مختلف رنگوں کے کئی ایک کپڑے اس کے علاوہ تیز دھار آلات بھی تھے۔ چند چھوٹی چھوٹی عجیب الشکل مورتیاں اور ایک شیشے کی بوتل تھی جس میں دھواں بھرا تھا راجہ نے حکم دیا کہ تمام سامان کسی چلتے پانی میں پھینک دیا جائے ہاں اس شیشے کی بوتل کا ڈھکن کھول کر اس کا دھواں نکال کر ضائع کر دو پتا نہیں اس خبیث نے اس دھوئیں کا کیا عمل کرنا تھا۔

راجہ کے حکم کے ساتھ ہی ایک درباری نے بوتل اٹھا کر ہلائی اور راجہ کی طرف دیکھ کر بولا۔

"جہاں پناہ...... حجم کے لحاظ سے وزن اس کا بہت زیادہ ہے۔"

"ہم نے تمہیں اس کا دھواں نکال کر ضائع کرنے کا کہا ہے موہن سنگھ تقریر کرنے کا نہیں۔" راجہ کا کرخت لہجہ دیکھ کر موہن سنگھ کانپ اٹھا اور کانپتے ہاتھوں سے بوتل کے منہ میں سختی سے پھنسی لکڑی باہر کھینچ ڈالی تو اچانک گھپ اندھیرا چھا گیا اور تیز ہوا شائیں شائیں کی آواز سے چلنے لگی۔ سب لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی! چیزیں ادھر ادھر گرنے لگیں ہاتھ کو ہاتھ سجائی نہ دے رہا تھا۔ سب درباری سپاہی، کنیزیں اور عام لوگ چیخنے چلانے لگے، ایک ہاہا کار مچ گئی!

لیکن چند ہی لمحوں میں اندھیرا چھٹ گیا ہوا چلنا بند ہو گئی۔ لیکن اب منظر تبدیل ہو چکا تھا میدان میں ایک بہت بڑی عجیب الجثہ مخلوق کھڑی تھی۔ یہ جن تھا...... خسکران...... جو بوتل میں بند تھا اور اب باہر آ چکا تھا۔ سیاہ کالا رنگ...... ننگ دھڑنگ...... قد درختوں سے اونچا، سر بہت بڑا لیکن آنکھیں چھوٹی چھوٹی، ناخن گز گز بھر کے، سر پر دو بڑے بڑے سینگ ہونٹوں کے بغیر منہ جس سے خوفناک حد تک بڑے دانت نظر آ رہے تھے اور کوٹھاری زمین پر اسی طرح پڑا ہوا تھا۔

"ہاہاہا...... ہوہوہو...... میرا نام خسکران ہے میں جن ہوں...... پہلے آزاد تھا اب غلام ہوں کوٹھاری کا...... کیا حکم ہے میرے آقا۔" خسکران دو قدم چل کر کوٹھاری کے پاس آ گیا اس کے چلنے سے زبردست دھمک پیدا ہوتی تھی۔ کوٹھاری اسی طرح زمین پر پڑا تھا۔ خسکران کی بات کا وہ کوئی جواب دینے سے قاصر تھا، لیکن اس کی آنکھوں میں شیطانی چمک ابھر آئی اور وہ تیزی سے کسمسانے لگا۔

"ہوہوہو...... تم تو بول بھی نہیں سکتے میرے آقا۔" خسکران اپنی بے وقوفی پر ہنسنے لگا۔ پہلے تمہیں آزاد تو کروں اس کے ساتھ ہی تڑخ تڑخ کی آوازیں ابھریں اور کوٹھاری کے بندھن ٹوٹنے لگے۔ بیڑیاں گر پڑیں، طوق کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور ناک کان سے گزرتی زنجیر ٹوٹ کر دور جا گری۔ کوٹھاری آزاد ہو چکا تھا کچھ لوگوں نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن ان کے پیر اپنی جگہ پر جم چکے تھے۔ کوٹھاری کو اتنی جلدی پانسہ پلٹنے کی امید نہ تھی اس کے جسم پر تو تیل بھی گرایا جا چکا تھا۔ بس آگ دکھانے کی دیر ہوتی اور وہ کوئلہ ہو جاتا۔ لیکن بوتل کا ڈھکن کھلا اور خسکران باہر آ گیا۔ جو ایک دن اور ایک رات بوتل میں قید رہنے کے بعد یقینی طور پر کوٹھاری کا غلام ہو چکا تھا اور کوٹھاری کے حکم کا پابند ہو چکا تھا۔ کوٹھاری خوشی سے ناچنے لگا۔

"خسکران......" کوٹھاری کڑک دار آواز میں بولا۔

"کیا حکم ہے میرے آقا؟" خسکران ہاتھ باندھ کر مؤدب لہجے میں بولا۔

راجہ ہری داس اس کے محل اور اس کی چند کنیزوں کے علاوہ باقی سب لوگوں اور پوری ریاست کو جلا کر بھسم کر ڈالو۔

کوٹھاری کے منہ سے آواز نکلنے کی دیر تھی کہ آگ کے شعلے بلند ہوئے اور پنڈال میں کھڑے سب لوگوں کے جسموں میں آگ جل اٹھی...... لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی جس کا جدھر منہ اٹھا تھا بھاگنے لگا۔ لیکن ہر جانب آگ لگ گئی ہر طرف موت کا رقص شروع ہو گیا آگ پھیلتی چلی گئی...... عمارتیں اور جاندار مال اسباب سب جلنے لگا۔ جسم کوئلہ بننے لگے۔ مرد،

عورتیں، بچے، بوڑھے سب زندگی کی تلاش میں سرپٹ دوڑنے لگے۔ لیکن آگ چاروں جانب تھی۔ موت کا دیوتا قہقہے لگا تا رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہنستی بستی ریاست شانت نگر راکھ کا ڈھیر بن گئی۔

☆......☆

گگن کے ذہن میں یہ خیال ابھرنا ایک فطری عمل تھا۔ شکنتلا رات کے اس سے جب ہر طرف اندھیرا اور ویرانے کا راج ہوتا ہے کھنڈرات میں کیسے پہنچی اور پھر اگر وہ خوب صورت لڑکی چڑیل تھی تو شکنتلا کو کیسے پتا چلا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شکنتلا اسے ختم کرنے میں کیسے کامیاب ہوئی۔ ان خیالات کے اُبھرتے ہی وہ اُٹھا اور شکنتلا کے پیچھے پیچھے کمرے میں چلا آیا۔ کمرے میں اس کی بہن سندری بھی ایک چارپائی پر آڑھی ترچھی پڑی سو رہی تھی۔ شکنتلا اپنی چارپائی پر لیٹی کچھ سوچ رہی تھی۔ گگن کو دیکھ کر اس کی آنکھوں نے خفیف حرکت کی اور وہ سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

”شکنتلا۔“ گگن آہستگی سے بولا۔

”کیا ہے؟“ شکنتلا نے قدرے بلند آواز میں پوچھا۔

”کچھ باتیں پوچھنی ہیں تجھ سے!“ گگن اس کی چارپائی کے نزدیک آ گیا۔

”جو کچھ پوچھنا ہے، رات کو گاؤں سے باہر بیری کے درختوں کا جو جھنڈ ہے وہاں پہنچ جانا وہاں بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کریں گے۔“

شکنتلا نے گگن کا جواب سنے بغیر ایسے آنکھیں بند کر لیں جیسے کہہ رہی ہو کہ اب تم جا سکتے ہو اور گگن چپ چاپ باہر نکل گیا!

ان لوگوں کی بہت بڑی حویلی تھی چاروں طرف اونچی سی دیوار ڈیوڑھی سے اندر گھستے ہی مردان خانہ تھا۔ جس کے پیچھے برآمدہ پھر صحن اور صحن کے بعد زنان خانہ تھا۔ گگن اور سندری کے پتا مورار یا گاؤں کا مکھیا اور علاقے کا ٹھکانے دار بھی تھا۔ گاؤں میں اس کی بہت سی زرخیز زمین تھی شکنتلا سارا دن گھر کے کاموں میں سندری کا ہاتھ بٹاتی رہی اور گگن چارپائی پر لیٹا پہلو بدلتا رہا۔ آج اس نے پہلی بار شکنتلا کو بغور دیکھا تھا یہ تو نہایت خوب صورت تھی اس سے قبل تو کھنڈرات کے چڑیل نے اس کا ذہن مکمل قابو میں کر رکھا تھا اور وہ شکنتلا کے بارے میں سوچ ہی نہ سکا، لیکن کیا یہ وہی شکنتلا ہے جو رات کھنڈرات کے ڈراؤنے ماحول میں بھی مکمل وارفتگی اور سکون سے گگن کے ساتھ مصروف تھی اور اب چتی سر پر لیے نگاہیں جھکائے گھر کے کام ایسے کر رہی تھی جیسے رات کی بات گئی۔

☆......☆

گگن خاصی دیر سے درختوں کے جھنڈ میں بیٹھا شکنتلا کا انتظار کر رہا تھا۔ رات خاصی بیت چکی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بڑی خوشگوار معلوم ہوتی تھی اور اس سے زیادہ خوشگوار بیت گگن کے لیے آنے والے لمحات کا احساس تھا۔ اسے بیٹھے خاصی دیر ہو چکی تھی لیکن شکنتلا کا کچھ پتا نہ تھا رات آہستہ آہستہ اپنا سفر طے کر رہی تھی۔ کبھی کبھی کسی جانور کی آواز سکوت کو تہس نہس کر دیتی وگرنہ پھر قبر کی سی خاموشی چھا جاتی۔

زمین پہ بڑی بڑی گھاس تھی گگن جانے کتنی ہی دیر بیٹھا گھاس کے تنکے توڑ تا رہا گئی شب کے لمحات اسے خواب محسوس ہونے لگے۔ نیند سے اس کی آنکھیں بوجھل ہونے لگی تھیں۔ تب اس نے اٹھنے کی ٹھانی کہ اسے دونوں بغلوں میں کسی چیز کے آہستگی سے رینگنے کا احساس ابھرا۔

اس نے چونک کر پلٹنے کی کوشش کی لیکن دو ہاتھوں نے بغلوں سے نکل کر سینے پر آ کر انگلیاں انگلیوں میں پھنسا لیں اس کے ساتھ ہی اس نے سریلی ہنسی کی جلترنگ اور شانوں کے پیچھے حلاوت محسوس کی۔

”ڈر گئے......؟“ شکنتلا کی آواز سن کر گگن نے اطمینان بھری گہری سانس لی۔

”ڈرتا تو اس اندھیری رات میں پہروں سے تیرا انتظار نہ کر رہا ہوتا۔ اتنی دیر لگا دی؟“ گگن نے الٹا سوال داغ دیا۔

”سندری سو ہی نہیں رہی تھی۔“

”سندری کو شک تو نہیں ہو گیا؟“

''نہیں وہ گہری نیند سوئی تو میں آئی اور باہر سے کنڈی بھی لگا آئی ہوں۔ شکنتلا اس کے سامنے آ کر انداز دلربائی سے گھاس کے فرش پر لیٹتے ہوئے بولی۔ ''چلاک بھی ہو اور بہادر بھی۔'' گگن اس کے عارض چھو کر بولا۔

''اور خوب صورت نہیں ہوں؟'' شکنتلا نے بڑی بڑی آنکھیں مکمل کھولیں اور انگشت گالوں پر رکھ کر سوالیہ نظروں سے گگن کو دیکھا تو گگن کی بے تابیاں بے باکیوں میں ڈھلنے لگیں اور پھر گگن نیند کی وادی میں اُترتا چلا گیا اور تھوڑی ہی دیر میں اسے کوئی سدھ بدھ نہ رہی اور شکنتلا اسے آہستگی سے دور کر کے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

☆......☆

شکنتلا کی خونی پیاس نے اب اسے بے تاب کر دیا تھا۔ گگن کے گھر والوں کے اس پر چونکہ احسانات تھے، لہٰذا اس نے گگن کا خون پینا مناسب نہ سمجھا۔ خیر ایسی بات بھی نہ تھی کہ وہ رحم دل ہو گئی تھی بلکہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ موقع شناس ہو گئی تھی کیا اسے پتا تھا کہ وہ کھڑ ماؤنٹ سے نکل کر کہیں نہیں جا سکتی اور یہاں گگن کے گھر والوں کا سہارا غنیمت تھا۔ گگن کا خون پی کر وہ خواہ مخواہ اپنی ذات پر لوگوں کا شک نہ کروانا چاہتی تھی، لہٰذا گگن کو سوتا چھوڑ کر وہ شکار کی تلاش میں نکل پڑی۔ سانپ کی شکل میں وہ رینگتی جا رہی تھی، چلتے چلتے وہ ایک بہت بڑے حویلی نما مکان میں داخل ہو گئی۔ دروازہ بند تھا لہٰذا وہ دیوار کے ذریعے سے اندر آئی وسیع و عریض صحن کے ایک طرف چند چارپائیاں بچھی تھیں، چادریں اوڑھے گھر والے سو رہے تھے۔ شکنتلا چوکنے انداز میں چارپائیوں تک پہنچی۔ اب وہ کشمکش و پیچ میں پڑ چکی تھی کہ اگر شور شرابے سے سب لوگ اکٹھے جاگ گئے تو کیا بنے گا، کچھ سوچ کر وہ کمروں کی طرف گئی، تمام کمرے بھی خالی تھے یعنی گھر کے تمام مکین صحن میں ہی سوئے تھے! اب شکنتلا نے چنکار سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔

''چنکار''

''جی مالکن'' ''ان کی چادریں خاموشی سے اتار دو......''

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سب چادریں آہستگی سے سرکتی اُترتی چلی گئیں۔ شکنتلا آہستگی سے پھنکار مار کر انسانی روپ میں آ گئی اور سب کو بغور دیکھنے لگی۔ ان میں ایک بھرپور جوان عورت تھی، جو خاصی صحت مند بھی تھی۔ شکنتلا نے خون کی پیاس اسی سے بجھانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ آہستگی سے چارپائی کی پٹی پر بیٹھ گئی اور ہولے ہولے عورت پر جھک کر اسے دیکھنے لگی۔ یہ تقریباً پچیس سالہ بھری بھری سانولے رنگ کی عورت تھی۔ اب شکنتلا نے چنکار کو کہہ کر سوتے میں ہی اسے بے ہوش کیا اور مزے سے اس کے نرخرے میں دانت گاڑ کر اس کا خون پینے لگی، تھوڑی ہی دیر میں عورت کا چہرہ سفید پڑ گیا اور وہ دم توڑ گئی۔ شکنتلا بھی سیر حاصل خون پی چکی تھی۔

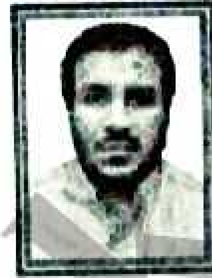
☆......☆

پورے گاؤں میں کہرام مچ گیا۔ چند دنوں میں یہ دوسری خونی واردات تھی۔ سارا گاؤں جمع ہو گیا۔ مورادیا نے پنچایت بلائی، لیکن پنچایت کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی۔ شکنتلا چپ چاپ معصومیت سے ساری کارروائی دیکھتی رہی اور دل ہی دل میں مسکراتی رہی۔ بات آئی گئی ہو گئی، لیکن شکنتلا تو انسانی خون کے بغیر رہ ہی نہ سکتی تھی، لہٰذا چند ہی دنوں میں وہ ایک اور قتل کر چکی تھی اب تو علاقے میں کہرام مچ گیا۔ پورا گاؤں اکٹھا ہو گیا۔ پھر پنچایت جمع ہو گئی، عورتیں ایک طرف بیٹھ گئیں جبکہ مرد علیحدہ تھے۔ اس مجلس میں کسی نے سوال کھڑا کر دیا کہ علاقہ بھر میں ان وارداتوں سے کچھ عرصہ پہلے جو لوگ آ کر آباد ہوئے تھے ان کو علاقہ بدر کر دیا جائے شاید ان میں سے ہی کوئی خون آشام ہو۔ لوگوں کی تلاش شروع ہو گئی گنتی کے ہی چند لوگ تھے۔ ان سب کو علاقہ چھوڑنے کا حکم دے دیا گیا۔ چلتے چلتے بات شکنتلا تک آ پہنچی تو لوگوں نے گاؤں کے مکھیا اور گگن کے چاچا جی سے مطالبہ کر دیا کہ شکنتلا بھی چونکہ مقامی نہیں ہے، لہٰذا اس کو بھی گاؤں اور علاقے سے باہر نکال دیا جائے۔ اس مطالبے پر بظاہر خاموشی سے بیٹھی شکنتلا کا دل دھڑک اُٹھا، کیوں کہ اسے تو چنکار نے بتا دیا تھا کہ اس علاقے میں ہی فی الحال اس کی سلامتی ہے باہر جانا خطرے سے خالی نہیں۔

☆......☆

(حیرت کے نئے رنگوں سے آباد اس سلسلے وار ناول کی اگلی قسط ماہ ستمبر میں ملاحظہ کیجیے)





عشق ہوش رُبا

صفدر علی حیدری

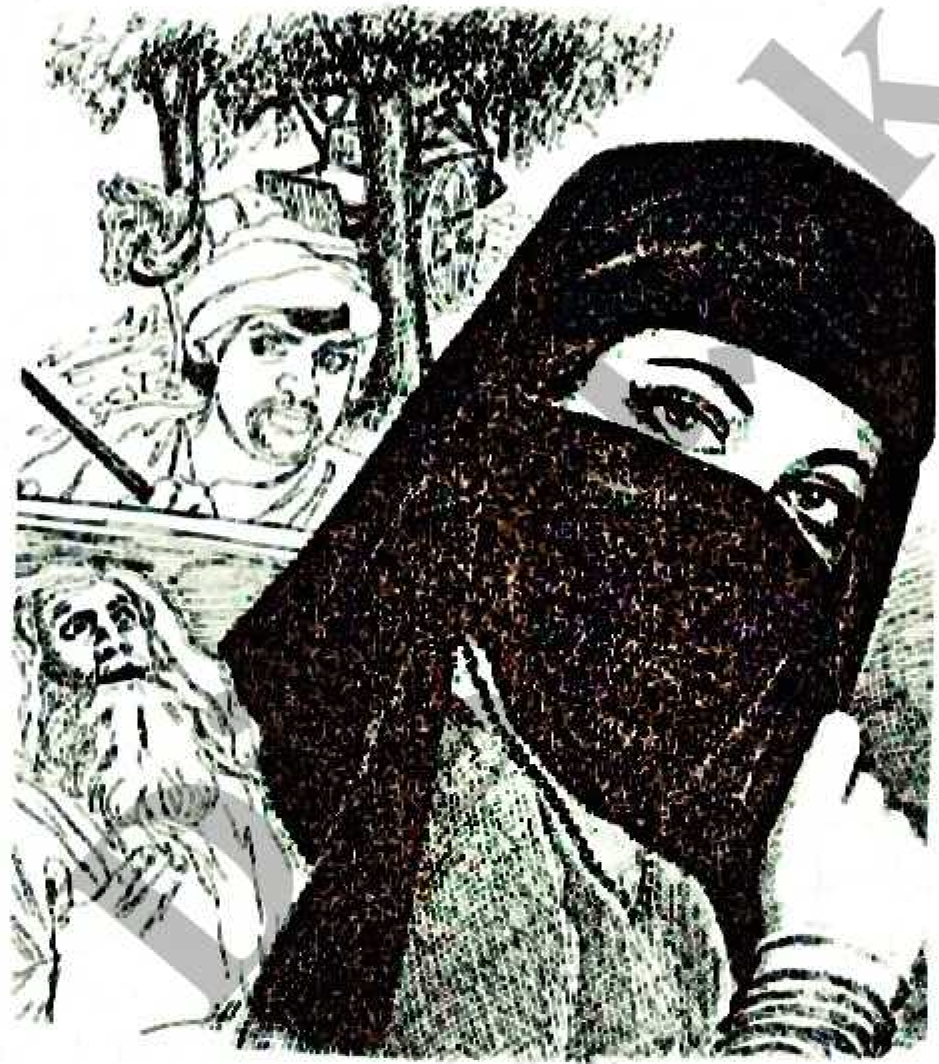
اس شخص کی پراسرار کہانی جو قبر کے اندر چلّہ کاٹ رہا تھا کہ اچانک......

مایوس آدمی اماوس کی کالی سیاہ رات کی لپیٹ میں ہوتا ہے۔ دن میں بھی ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا... ہر پہلو... پہلو در پہلو تاریکی۔ نہ کوئی راستہ دِکھائی دے نہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی دے۔ وہ بھی اماوس ہی کی رات تھی۔ چاند کی آخری تاریخیں اور اوپر سے اندھیرے کے غلاف میں لپٹے تاریک سیاہ بادل... ماحول بے انتہا خوفناک سا ہو گیا تھا۔ رات آدھی سے زیادہ بیت گئی تھی۔ اکتوبر کے مہینے میں رات کے وقت عموماً ہوا میں ہلکی سی خنکی بھی تو در آتی ہے۔ اتفاق سے یہ تھی بھی اکتوبر کی آخری تاریخ، سو ٹھنڈک کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی اور پھر آج تو ہوا میں نمی کا تناسب بھی کہیں زیادہ تھا۔ بھیگی بھیگی ہوا بارش کی آمد کا پتا دیتی تھی کہ وہ اب آئی کہ تب۔ بادل تھے کہ ہر گزرتے پل گہرے سے گہرے ہوئے جاتے تھے۔ کبھی کبھی جب وہ گرجتے تو یوں لگتا جیسے بہت سے لوگ مل کر کوئی دیو ہیکل ڈرم لڑھکاتے چلے جا رہے ہوں۔ حشرات الارض کی مخصوص آوازوں نے ماحول کی پراسراریت حد درجہ بڑھا دی تھی۔ تاریکی، بادلوں کی گرج، بجلی کی چمک، تیز ہوا کے تھپیڑے اور حشرات کی ڈراؤنی آوازیں، کیا کم ہولناک تھیں کہ ایک دم زور سے بجلی چمکی اور ایک انتہائی زور کا دھماکہ ہوا جیسے قریب ہی کوئی زوردار طاقت کا بم پھٹا ہو، شاید اطراف میں کہیں بجلی گری تھی۔ بجلی کی تیز چمک سے رات میں دن کا سا سماں ہو گیا۔ یوں جیسے پرانے زمانے کی کوئی پرانی ٹیوب لائٹ پوری طرح روشن ہونے سے پہلے مسلسل جلنے بجھنے کے بعد ایک دم روشن ہو جائے اور ماحول روشنی سے نہا جائے، لیکن ایسا صرف چند لمحوں کے لیے ہوا اور وہ ٹیوب لائٹ یکایک بجھ گئی اور تاریکی نے پھر سے اپنا تسلط جما لیا۔ اس لمحاتی روشنی نے ایک انسانی وجود کو ضرور بے نقاب کیا تھا، جو حالات سے بے نیاز آگے کی جانب سرک رہا تھا۔ اس نئی پیش رفت نے اسے بھی ٹھٹھک کر رکنے پر مجبور کر دیا تھا، لیکن چند لمحوں بعد وہ پھر آگے کی جانب بڑھنے لگا۔ یہ دلاور تھا۔ اپنے نام کی طرح ایک شیر دل نوجوان، گویا اسم بامسمیٰ۔ اس تاریک رات، سنسان راستے پر اس طوفانی موسم میں آدھی رات کے وقت تن تنہا اس کی موجودگی اسے شیر دل ہی تو ثابت کرتی تھی۔ دھماکے نے ایک لمحے کے لیے تو اس کا بھی دل بھی دہلا ڈالا تھا۔ تاہم اب فضا کو سناٹے نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور تاریکی نے اپنے پر پہلے سے کہیں زیادہ پھیلا لیے تھے۔ دلاور کی چال میں اب پہلے سے زیادہ تیزی آ گئی تھی، شاید وہ جلد سے جلد اپنی منزل مقصود

پر پہنچنا چاہتا تھا۔ پچھلے کئی روز سے اس کا یہ روز کا معمول تھا کہ آدھی رات کے وقت چوروں کی طرح گھر سے نکلتا اور کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد واپس لوٹتا۔ چاند کی پندرہ تاریخ سے اب تک یہ سفر وہ پورے یقین اور آہنی عزم کے سہارے طے کرتا چلا آیا تھا۔ اس کی منزل اب چند سو گز کے فاصلے پر تھی۔ چاند رات کو اس کا سفر ختم ہوا چاہتا تھا۔ جس کے بعد گوہر مراد اس کے ہاتھ میں ہوتا۔ بالآخر اس کا عشق کامیاب ہو جاتا اور کامیابی اس کے قدم چومتی۔ یہ دس بارہ دن اس نے کس کرب میں گزارے یہ

دور تک دیر نہ جانے کتنی نگاہیں اسکا پیچھا کرتیں۔ پر وہ ایسا بے نیاز اور لاتعلق کہ اپنے اردگرد کی کچھ خبر نہ اس سے سروکار۔ وہ تو شاید کسی اور ہی دنیا کا باسی تھا۔ چپ چاپ.... گم صم اور... سب سے الگ تھلگ.... مگر پھر بھی سب سے نمایاں... سب کا مرکز نگاہ۔

بستی کے کسی بندے بشر کو یہ خبر ہو جاتی کہ دلاور جیسا سیلانی چلہ کشی میں لگا ہے تو گمان غالب ہے انہیں سن کرتو رہا ایک طرف، دیکھ کر بھی اپنی آنکھوں پر بھی یقین نہ آتا۔ ”دلاور... اور چلہ کھینچے.... ناممکن۔ وہ جو



وہ جانتا تھا یا اس کا خدا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو نہ جانے کب کا ہوش گنوا چکا ہوتا یا جان .... لیکن یہ دلاور تھا.... آہنی اعصاب کا مالک....... علاقے کے لوگ جس کی بہادری کے گن گاتے نہیں تھکتے تھے اور الھڑ مٹیاریں جسے دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرا کرتی تھیں۔ کسی کے لبوں پر اس کا نام سنتیں تو شرم سے دوہری ہو جاتیں۔ راز دار سہیلیوں سے سرگوشیوں میں جس کے تذکرے من پسند مشغلہ ہوتے۔ کہیں دکھائی دے جاتا تو

پورے علاقے کا سکندر ہے.... جس کا رعب اتنا ہے کہ کوئی اس کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات نہیں کر سکتا.......... وہ اور سفلی عمل میں مشغول........ جھوٹ ..بکواس...“ لیکن یہ بات صد فیصد درست تھی کہ وہ پچھلے کئی روز سے یہی سب کر رہا تھا...... اور اب تک اس کا راز راز ہی تھا۔ گاؤں کا ایک بھی آدمی اس کے اس کارنامے سے واقف نہیں تھا۔ شاہ صاحب اور اسکا جگری دوست اگر جانتے تھے بھی تو وہ کون سا اس گاؤں میں

رہتے تھے۔رازداری کی کڑی شرط اور ہدایت کے ساتھ ہی تو اسے اس کڑے عمل کی اجازت ملی تھی، پھر بھلا وہ اس کا راز کیوں کر فاش کرتے؟ پیار بھی بڑی ظالم شے ہے ..... بڑے بڑوں کو ان کی اوقات یاد دلا دیتا ہے۔تب انا کا خمار ٹوٹتا ہے اور ساری بے نیازی دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔سانس کی ڈور الجھ الجھ سی جاتی ہے۔دھڑکنیں ہی نہیں زندگی بھی عجیب لے پر تھرکتی ہے۔زندگی کے سارے معمولات تلپٹ ہو کر رہ جاتے ہیں۔"نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن" جیسی کیفیت بھی اسی عشق ہی کا تو فیض ہوتی ہے۔میر نے سچ ہی تو مذہب عشق کے بانی کو "سخت کافر" کہہ ڈالا تھا۔دلاور بھی تو اسی کے باعث برگشتہ ہو گیا تھا۔سفلی عمل کبھی بھی آسان نہیں ہوتا کہ ہر عام دخواص اس میں سے سرخرو ہو کے نکلے۔دلاور جیسے جی دار کا بھرکس نکل گیا تھا، پھر عام آدمی کی بھلا کیا اوقات؟؟؟ پیار کی طلب ہی اس موڑ پہ لے آئی تھی کہ وہ ان جنتی راہوں پر دور ..... بہت دور نکل آیا تھا۔یہ بھی خبر نہ تھی کہ منزل کی سمت بڑھ رہا ہے یا لمحہ لمحہ دور ہوتا جا رہا ہے۔کسی نے غلط تو نہیں کہا کہ "اس گلی کی دوسری جانب کوئی رستہ نہیں"۔

ہلکی ہلکی پھوار اب بوندا باندی میں بدل گئی تھی۔اس نے اپنی رفتار اور تیز کر دی۔قبرستان ابھی بھی دس پندرہ منٹ کی دوری پر تھا۔رات اب خاصی سرد ہو گئی تھی۔دیہات میں رات کو ویسے بھی ٹھنڈ زیادہ پڑتی ہے۔رفتہ رفتہ بارش میں تیزی آنے لگی تھی۔کچے راستے پر چلنا دشوار ہو رہا تھا۔کیچڑ جوتے کے تلوے سے چپک کر انہیں وزنی بنا چکی تھی۔اس سے بھی چلنا دشوار ہو چلا تھا سو اس نے رفتار کم کر دی تھی اور پھونک پھونک کر قدم اٹھانے لگا تھا۔موٹی موٹی بوندیں ڈھیلوں کی طرح اس کے جسم پر برس رہی تھیں۔یوں لگتا تھا جیسے کوئی تاک تاک کر نشانے باندھ رہا ہو۔درختوں کے ایک جھنڈ کو قریب پا کر اس نے آگے جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور لپک کر اس کی پناہ میں آ گیا۔ایک دم یوں لگا جیسے وہ اپنے کمرے میں داخل ہو گیا ہو۔وہ جگہ بارش کی پہنچ سے دور تھی، ہاں البتہ اکا دکا بوندیں اپنی راہ نکال لیتی تھیں۔اس کا لباس پوری طرح بھیگ گیا تھا۔اس نے اپنے اوپر کوئی چادر بھی نہیں اوڑھی تھی، سو سارا لباس پانی سے گیلا ہو گیا تھا۔سردی کی شدت جس نے دو چند کر دی تھی، پھر اس نے لباس کو نچوڑ نچوڑ کر اس میں در آنے والا پانی نکالنا شروع کر دیا کہ خود کو سردی سے بچانے کے لیے اس کے پاس اور کوئی حل بھی تو نہیں تھا۔پانی کم ہو جانے سے اسے کسی قدر راحت کا احساس ہوا تھا لیکن ..... بھیگے کپڑے اب بھی الجھن سی ہو رہی تھی۔سکڑا سمٹا دلاور درخت کے مضبوط تنے سے ٹیک لگائے بارش کے رکنے کی دعائیں کرنے لگا تھا۔وہ اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتا تھا؟

☆......☆

فیض پور کی داستان بھی خاصی دل چسپ ہے۔لگ بھگ سات ہزار نفوس پر مشتمل اس دیہی خطے کو نہ بستی کہا جا سکتا نہ قصبہ۔وہ اس کے بین بین کی کوئی چیز تھا۔اپنی سہولت کے لیے اسے گاؤں کہے دیتے ہیں۔اس کے باسیوں کی اکثریت کا روزگار زمین سے جڑا تھا۔کاشت کاری اور ڈھور ڈنگر پالنا مرغوب پیشہ ہی نہیں مشغلہ بھی تھا۔زمین ان کی نظر میں ماں تھی تو ان کے جانور کماؤ پوت کہ جن کی دیکھ بھال وہ اپنے بچوں کی طرح کیا کرتے تھے۔ان کا دودھ اور اس سے حاصل شدہ دیسی گھی نقد رقم سے کہیں زیادہ اہمیت کے حامل تھے۔قریبی قصبے کے تاجر ڈھونڈ ڈھونڈ کر مہنگے داموں خریدا کرتے تھے۔جس سے ان کی آمدنی میں خاصا اضافہ ہو جاتا تھا۔سخت جان اور محنتی تو ویسے بھی بلا کے تھے، سو ایک آسودہ زندگی بسر کرتے تھے۔چند ایکڑ زمین کا مالک بھی زمیندار کہلاتا تھا اور یہ معمولی سی زمین بھی ان کے گھر کی کفالت کو کافی ہوتی جس کی آمدنی کم بھی ہوتی تو وہ اپنے اخراجات میں مناسب حد تک کمی لا کر اپنی زندگی کو گزارے لائق بنا لیا کرتا۔شاید یہی وجہ تھی کہ دیگر علاقوں کی نسبت فیض پور کے رہائشی خوش حال زندگی بسر کر رہے تھے۔ایک اور خوبی بھی ان کی قابل ذکر تھی کہ وہاں "نو نقد نہ تیرہ ادھار" کا اصول چلتا تھا، یوں وہ سود جیسی لعنت سے بہر طور بچے ہوئے تھے۔اسی سبب سے ادھار کے ہاتھی کی نسبت نقد کی مرغی انہیں زیادہ "وارے" کھاتی تھی۔امن وامان کی صورت حال بھی

خاصی بہتر تھی۔ گاؤں والوں کی قلیل تعداد تجارت سے منسلک تھی۔ دکان یا ٹھیلے لگا کر اپنی گزر بسر کا سامان کرلیا کرتے تھے۔ یوں انہیں گھر میں ہی روزگار مل جایا کرتا اور بڑے شہروں یا قصبوں میں دھکے نہیں کھانے پڑتے تھے۔ گاؤں میں ایک سرکاری ڈسپنسری بھی "پائی" جاتی تھی جس کو چلانے کی ذمے داری قریبی قصبے کے ایک کمپوڈر کی تھی جسے عرف عام میں "ڈاک داز" کہا جاتا تھا۔ اسی قصبے میں ایک دو "اتائی" ڈاک دار بھی تشریف لایا کرتے تھے جو سر شام اپنی دکان بڑھا کر اپنی اپنی "پھٹ پھٹی" پر گھروں کی راہ لیتے۔ سرکاری خزانے کی رنگ برنگی گولیاں کھانا "درد بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" کے مترادف تھا، سو لوگ زیادہ تر "اتائی" حضرات کا آسان شکار بنتے اور ان کی مہنگی دواؤں کو ترجیح دیتے۔ یوں اتائیوں کا دھندہ، مندا نہیں ہوتا تھا۔ ایک عدد بوائز مڈل اس کول اور ایک گرلز پرائمری اس کول بھی اس علاقے میں موجود تھے، جن سے بخوبی ظاہر ہوتا تھا کہ جدید علمی ترقی سے یہ علاقہ بھی محروم نہیں تھا۔ آج سے بیس سال قبل اتنی ترقی بھی تسلی بخش سمجھی جاتی تھی۔ یہ دیگر بات کہ اہل علاقہ تعلیم کی جانب کوئی خاص توجہ دیتے نہ اہمیت۔ گاؤں میں لڑکوں کی تعلیمی حد آٹھ، جبکہ لڑکیوں کی پانچ ہوا کرتی۔ شاذ و نادر کوئی اس "آخری حد" کو کراس کر پاتا۔ اگر کوئی اس حد سے تجاوز کرتا تو اسے قریبی قصبے رسول پور جانا پڑتا تھا اور وہ کون سا کوئی دو کوس کے فاصلے پر تھا، کم و بیش تیس بتیس کلومیٹر کا فاصلہ حائل تھا جسے روزانہ طے کرنے کی ہمت کم کم لوگوں میں تھی۔ بچے آخر بچے ہیں، ان میں بھی تعلیم کا شوق تب پروان چڑھتا ہے جب بڑوں کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی میسر ہو۔ رہی سہی کسر اساتذہ کی "فرض شناسی" نے پوری کروالی تھی جو اکثر اس کول سے غائب اور محض حاضری کے رجسٹر میں حاضر پائے جاتے تھے۔ ان کی دلچسپی بچوں کے شوق میں اضافہ کرسکتی تھی لیکن جب مقصد صرف تنخواہ کھری کرنا اور نوکری بچانا ہو تو پھر بہتری کا امکان دم توڑ دیا کرتا ہے۔ گاؤں والے بھی تو اس بات کا کوئی نوٹس نہیں لیتے تھے، ورنہ صورت حال بہتر ہو سکتی تھی۔ یوں ٹیچروں کی چاندی ہوگئی تھی۔ اس دور افتادہ جگہ اول تو محکمے کی کوئی ٹیم آتی ہی نہیں تھی اور کبھی کبھی آ بھی نکلتی تو انہیں اس کی اطلاع کسی نہ کسی ذریعے سے ٹیم آنے سے قبل مل جایا کرتی۔ یوں وہ کسی کارروائی سے اکثر بچ جایا کرتے تھے۔ اگر کبھی کبھار بے خبری میں مار کھا بھی جاتے تو کچھ دے دلا کر اپنی بگڑی پھر سے بنالیا کرتے تھے۔

☆......☆

گاؤں کے بیچوں بیچ کوئی دس ایکڑ زمین کا ایک ٹکرا کسی چٹیل میدان کی صورت موجود تھا۔ اسے بابا کا ڈیرہ کہا جاتا تھا۔ یہ بابا فیض ہی کا عطیہ تھا۔ وہی بابا فیض جن کے نام نامی کی نسبت سے یہ گاؤں فیض پور کہلاتا تھا۔ بابا کی اس جہان فانی سے رخصتی نصف صدی کا قصہ تھی۔ اب تو خال خال ہی کوئی آدمی ملتا تھا جس نے بابا جی کے درشن کر رکھے تھے۔ بابا بڑا بھلے مانس بندہ تھا، ایک بے غرض روح۔ اس جگت بابا کی اپنی اولاد تو تھی نہیں، سو گاؤں کا ہر فرد اس کے لیے اپنی اولاد کی طرح تھا۔ لوگوں نے بابا جی کی محبت میں انہیں بابا، بابا کہنا شروع کر دیا تھا کہ کہیں بے اولادی کا دکھ اس کی روح کا ناسور نہ بن۔ کہنے والے کہتے ہیں یہ سارا گاؤں بابا کی ملکیت تھا۔ ساری زمین اسی ایک آدمی کی تھی۔ گاؤں میں بسنے والے لوگوں کو اس نے خود یہاں لا کر آباد کیا تھا، پھر چھوٹے چھوٹے یونٹس میں اپنی زمین کو بانٹ کران افراد کو دے دی۔ انہیں ان کی محنت کا ایک خاص حصہ مل جایا کرتا جو اتنا ضرور ہوتا کہ ان کی گزر بسر با آسانی ہو جاتی۔ یہ یونٹس پانچ سے بارہ ایکڑ کے درمیان ہوتے تھے جو کنبے کے سائز کے لحاظ سے تقسیم کیے جاتے تاکہ کسی کے ساتھ ناانصافی نہ ہونے پائے۔ بھلے آدمی تھے سو تمام عمر ایک ہی بیوی کے ساتھ رہے اور دوسری شادی کا سوچا تک نہیں۔ شادی نہ کرنے کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ انہیں اپنی بیوی سے بے انتہا پیار تھا، پھر متقی شخص تھے ناانصافی کے تصور تک سے انہیں خوف آتا تھا۔ لوگوں کو ان کے عشق کا اندازہ تب ہوا جب "اماں جی" اچانک چل بسیں۔ اس کے بعد لوگوں نے انہیں اکثر و بیشتر گم صم دیکھا۔ مسکراہٹ تو گویا ان کے لبوں سے روٹھ ہی گئی تھی۔ اماں بی بھی بابا جی کی طرح گاؤں کی ہر دل عزیز ہستی تھیں۔ بچوں بچیوں کو قرآن پاک پڑھانے کی تمام تر

ذمے داری انہی کے کندھوں پر تھی۔ عورتوں کو امور خانہ داری کی تربیت دینا اور انہیں شریعت کے مطابق زندگی گزارنے پر مائل کرنا بھی انہی کی ذات کے ساتھ مخصوص تھا۔ سب کے دکھ سکھ میں شریک ہوتیں۔ گویا دونوں میاں بیوی گاؤں کے بزرگ تھے اور ہر ایک کام میں دخیل بھی۔ ان سے پوچھے اور مشورہ کیے بنا کوئی کام کرنا گاؤں والوں کی نظر میں انتہائی معیوب بات تھی اور بے برکتی کا سبب بھی۔ اماں کی وفات کے ٹھیک ایک سال بعد بابا جی نے بھی خدا کو دم دے دیا۔ وفات سے چند دن پہلے تک بہت ملول دکھائی دیتے تھے۔ لگتا تھا انہوں نے موت کی چاپ سن لی تھی۔ جبھی تو بار بار کہتے۔

"اے کاش میں تمہارے لیے وہ سب کر پاتا جو میں نے سوچ رکھا تھا۔ بس وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ بند مٹھی سے ریت کی مانند نکل گیا اور......" وہ بات مکمل نہ کر پاتے۔ اچھے بھلے ہی تھے۔ سہولت سے دن گزارا اور عشاء کی نماز کی تکمیل کے ساتھ ہی زندگی کا سفر بھی مکمل ہو گیا۔ گاؤں والے یوں روئے جیسے ان کا کچھ بھی باقی نہ رہا ہو۔ کافی عرصہ سوگ کی فضا فیض پور میں طاری رہی۔ کہتے ہیں قدرت کے پاس وقت سے بڑا مرہم کوئی اور نہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ آخر وہ معمول کی زندگی کی طرف لوٹ ہی آئے۔ لیکن بابا جی اور اماں بی کے تذکرے کبھی نہ تھم سکے اور تھمتے بھی کیسے کہ محسن کو یاد رکھنا اہل وفا کا خاص مسلک ہوا کرتا ہے اور بستی کے باسی احسان فراموش ہرگز نہ تھے۔ اپنی وفات سے چند دن پہلے تمام زمین اور سارے اثاثے انہی لوگوں کے نام کر دیے جو ان میں کھیتی باڑی کیا کرتے تھے۔ بابا کا ڈیرہ جو لگ بھگ دس ایکڑ پر محیط تھا اب پوری بستی کی ملکیت تھا۔ کوئی فرد واحد اسے بیچ نہیں سکتا تھا۔ بابا بستی کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتے تھے لیکن وقت نے انہیں مہلت نہ دی۔ اسکول، اسپتال اور ایک رفاحی مرکز......ان کا خواب ادھورا رہ گیا۔ سادہ دور تھا، زندگی کی جدید سہولیات کا دائرہ ابھی صرف چند بڑے شہروں تک محدود تھا، ورنہ وہ اپنے اس مشن کو ضرور پایۂ تکمیل تک پہنچاتے۔ زندگی کے آخری روز بڑے ملول دکھائی دیتے تھے۔ بار بار کہتے "کاش میں تم لوگوں کے لیے وہ سب کر جاتا جس کا میں نے خواب دیکھا تھا۔ انتقال سے قبل وصیت کی کہ ڈیرے کو کھیلوں اور دیگر تعمیری سرگرمیوں کے لیے وقف کر دینا۔ کبھی تو حکومت کو اس علاقے کی ترقی کا خیال آئیگا......"

وہ دن ہے اور آج کا دن، گاؤں کے لوگ ہر سال ان کی یاد میں عرس کی تقریبات کا اہتمام کرتے تھے۔ لوگ اپنے دونوں محسنوں کی قبر پر حاضری دیتے، پھولوں کی چادر چڑھاتے اور فاتحہ خوانی کرتے۔ بستی کے ہر فرد کو اس دن لنگر کے چاول ملتے جو وہ تبرک سمجھ کر کھایا کرتے تھے۔ عرس کی تقریبات تین دن جاری رہتی تھیں۔ بابا کے ڈیرے کی رونق دیدنی ہوتی۔ وہاں دوسرے اور تیسرے دن کشتی، کبڈی، نیزہ بازی، گھڑ سواری، پنجہ آزمائی اور رسا کشی کے زور دار مقابلے ہوتے۔ اردگرد کے علاقوں سے ٹیموں کو دعوت دی جاتی تھی۔ دلاور نے پچھلے پانچ سالوں سے اپنی مہارت کا سکہ جما رکھا تھا۔ کوئی اس کے اور اس کی ٹیم کے آگے ٹھہر نہ پاتا تھا اور یوں دلاور اینڈ کمپنی مرد میدان ثابت ہوتی۔

☆......☆

فتح داد گاؤں کا ایک بجیلا نوجوان تھا۔ گاؤں کے بڑے زمیندار کرم داد کا اکلوتا بیٹا۔ جوانی جس پہ ٹوٹ کے آئی تھی۔ اتھرے گھوڑے کی طرح سرکش اور کسرتی بدن کے مالک فتح داد کو اپنی طاقت، چستی اور چالاکی پر بڑا ناز تھا۔ گاؤں میں اس کا مقابلے کسی کے بس کی بات تھی نہیں تھی۔ اپنی بہادری، جواں مردی اور باپ کے بے جا لاڈ پیار نے اسے سرکش، خود پرست اور اکھڑ سا بنا دیا تھا۔ اس کا باپ کرم داد ان پانچ افراد میں سے ایک تھا جسے خود بابا نے اپنا جانشین بنایا تھا۔ یہ افراد بابا کی وفات کے وقت نہ صرف جوان تھے بلکہ بہادری اور معاملہ فہمی میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے تھے اور وقت نے بابا کی دور اندیشی کو ثابت کر دیا تھا۔ ان پانچ افراد نے اپنی ذمے داریوں کو بحسن وخوبی سرانجام دیا تھا۔ اب تک یہ سلسلہ اسی خوش اسلوبی سے جاری تھا۔ کرم داد ان سب میں عمر رسیدہ و جہاندیدہ شخص تھا۔ اس کی حیثیت ایک لحاظ سے گاؤں کے سرپنچ کی سی تھی۔ کرم داد میں ہوس اقتدار ہوتی تو کب کا وہ یہاں کا بلا شرکت غیرے حاکم ہوتا۔ اب ایسا

بھی نہیں تھا کہ وہ کوئی سادھو، درویش تھا، اچھا بھلا دنیادار شخص تھا لیکن اس کے مزاج میں ایک طرح کی "فقیری" پائی جاتی تھی، سو وہ سرداری کی لالچ میں گرفتار نہ ہوا تھا۔ شاید اسی سبب اس کی تکریم علاقے کے سربراہ سے بڑھ کر تھی۔ ستر سے اوپر کا ہو کر بھی اس کی کاٹھی سیدھی تھی اور عزم و ہمت جوانوں کو بھی شرماتا۔ گاؤں کے دیگر تمام افراد کی طرح وہ بھی ان لوگوں میں شامل تھا، جس نے بابا جی سے جائیداد میں حصہ پایا تھا، لیکن اپنی محنت سے اس نے اپنی زمینوں اور ڈھور ڈنگروں میں خاطر خواہ اضافے کے بعد اب وہ گاؤں کا سب سے زیادہ مالدار آدمی تھا۔ آج کا فیض پور بابا کے عہد سے خاصا بڑا تھا، لیکن یہاں وقت رکا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ یہ علاقہ اپنے باسیوں کی سادگی اور قناعت پسندی کے سبب جدید ترقی سے تاحال دور تھا، سو یہ شہر سے دور اور الگ تھلگ بھی تھا اور بہت حد تک کٹا ہوا بھی۔ لے دے کے بجلی ہی وہ واحد جدید سہولت تھی جس نے اس علاقے کا رخ کیا تھا۔ اب یہ سہولت تھی یا مصیبت فیصلہ آپ پر چھوڑتے ہیں۔ ایک ایم پی اے کو ووٹ دینے کی "پاداش" میں انہیں یہ نعمت میسر آئی تھی اور وہ بھی اسی ایم پی اے کی ذاتی دلچسپی کے بموجب، ورنہ تو اگلے کئی برس بغیر بجلی کے گزر جاتے۔ اس سادگی، قناعت پسندی اور سیاست بازی سے دوری نے ہی اس علاقے کو امن کا گہوارہ بنا دیا تھا، لیکن فتح داد دو کھری ٹائپ کا آدمی تھا۔ اپنے باپ کا ڈر نہ ہوتا تو نہ جانے وہ کیا کر گزرتا؟ کم از کم گاؤں کا چوہدری تو اب تک بن ہی چکا ہوتا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اپنی تمام تر چالاکی، بے باکی اور اکھڑ مزاجی کے باوجود وہ اپنے باپ سے دبتا اور "کنی مارتا" تھا، پھر بھی جہاں جہاں اس کا بس چلتا اپنی مرضی خوب چلاتا۔ بس ہاتھ ذرا ہولا رکھتا کہ کہیں باپ کو شکایت کا موقع نہ ملے۔ اسے پتہ تھا کہ باپ کے بعد اسے اس کے خواب کی تکمیل سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ دن رات یہی خواب اپنی آنکھوں میں سجائے وہ اپنی ایک الگ دنیا میں مگن و مست تھا۔ گاؤں کے چند آوارہ منش اس کے پیچھے پیچھے رہا کرتے تھے۔ اپنی اس چنڈال چوکڑی کے جلو میں وہ ذہنی طور پر گاؤں کے کسی چوہدری کی طرح علاقے میں چکراتا پھرتا تھا۔ اس کے چمچے کڑچھے اس کی خوشنودی کی خاطر اسے چوہدری جی کہہ کر مخاطب کرتے تو اس کا چوڑا چکلا سینہ اور زیادہ پھول جاتا۔ اپنی نوک دار مونچھوں کو خم دیتے ایک انوکھی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر رقص کرتی۔

☆......☆

پھر یکایک اسے یوں لگا جیسے کسی نے اسے گہری نیند سے بیدار کر دیا ہو۔ اس کا خمار جاتا رہا اور نشہ ہرن ہو گیا۔ یہ احساس اسے ایک دم سے تو ہرگز نہیں ہوا تھا۔ کئی سال تک وہ اسے اپنا وہم سمجھ کر جھٹلاتا رہا تھا، لیکن حقیقت کو وہم کہہ دینے سے وہ وہم تو نہیں بن جاتی نا۔ کوئی جتنا بھی اسے جھٹلائے وہ اپنا وجود منوا کر ہی رہتی ہے اور اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ ایک دن اس پر ادراک کے در وا ہوئے تو اسے وہ ساری آوازیں صاف دکھائی دینے لگیں جسے قبل ازیں وہ ذرہ برابر بھی اہمیت دینے پر تیار نہیں تھا۔ یہ دلاور تھا جس کی آمد "وہ آیا، اس نے دیکھا اور فتح کر لیا" ثابت ہوئی تھی۔ ایک ہی سال میں گاؤں کا ہر فرد اس کے گن گانے لگا تھا۔ پورے کا پورا گاؤں گویا اس نے تسخیر کر لیا تھا۔ سوائے کرم داد اور اس کے چیلوں کے، ہر شخص کے لبوں پر اس پراسرار ہیرو کی محبت بھرے تذکرے گونجا کرتے۔ تذکرے تو خیر ان کے ہاں بھی شب و روز اسی سورما کے ہی ہوتے لیکن ذرا مختلف طرز سے۔ دلاور تھا بھی تو کچھ ایسا پراسرار کہ اپنے پرائے جسے آسانی سے نظر انداز کر بھی کہاں سکتے تھے؟

وہ کہاں سے آیا، اس کے آگے پیچھے کون تھا، کوئی تھا بھی یا نہیں، کس ارادے سے آیا تھا، کیا کرنا چاہتا تھا، کوئی کچھ بھی تو نہیں جانتا تھا۔ کوئی جاننے کے لیے آگے بڑھتا بھی تو وہ بڑی سہولت سے طرح دے کر صاف بچ نکلتا۔ اس نے پہلا دھماکہ اپنی آمد کے چند ہی دنوں بعد کر دیا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب بابا جی کے عرس پر کھیلوں کے مقابلے جاری تھے۔ حسب سابق فتح داد ہوا میں دونوں ہاتھ بلند کیے فاتحانہ انداز سے مسکراتا ہوا میدان کا چکر لگا رہا تھا اور خوب داد سمیٹ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہرکارہ مسلسل اعلان کر رہا تھا۔

"فتح داد مرد میدان ہے، کوئی سورما اگر اس کے مقابلے میں آنا چاہے تو آگے بڑھے۔ اگر کوئی آگے نہ آیا

تو کرم داد کو اس بار بھی شہ زوری کا خاص انعام دے دیا جائے گا"۔ مجمع میں پراسرار خاموشی سی چھائی تھی اور پھر بہت سے لوگ یہ دیکھ کر حیرت سے گنگ ہو گئے کہ ایک اجنبی ہجوم کے درمیان سے اٹھا اور خراماں خراماں چلتا ہوا میدان کے وسط میں بنائے گئے اکھاڑے میں جم کر کھڑا ہو گیا تھا۔ لوگ حیرت کے جھٹکے سے باہر آئے تو تالیوں کی گونج نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ پچھلے کئی سال سے کسی میں ہمت نہ تھی کہ وہ اس کھلے چیلنج کو قبول کرتا۔ کرم داد کو بھی ایک جھٹکا سا لگا تھا، لیکن صرف ایک لمحے کے لیے اور اگلے ہی پل وہ بڑی رعونت سے چلتا ہوا اکھاڑے میں جا پہنچا۔ کچھ ہی دیر میں "کلائی چھڑانے" کا مقبول عام مقابلہ شروع ہونے والا تھا۔ جس کا فاتح ایک بھوری بھجھ (بھینس) بطور انعام پاتا اور سال کا رستم کہلاتا۔ مقابلہ شروع ہوا تو لوگوں نے سانس روک کر یہ منظر دیکھا کہ کرم داد کے فولادی ہاتھ اس اجنبی کی داہنی کلائی اپنی آہنی گرفت میں لے چکے تھے اور پھر جو ہوا کسی کی آنکھ اسے دیکھ کر بھی ماننے کو تیار نہ تھی۔ اجنبی نے اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے ہوئے اپنے سیدھے ہاتھ کی دو انگلیوں کو کسی لٹھ کی طرح فتح داد کی داہنی کلائی پر کچھ یوں مارا کہ اگلے ہی لمحے میں اس کی کلائی کرم داد کی گرفت سے آزاد ہو چکی تھی اور پھر ہجوم نے وہ تالیاں پیٹیں کہ فتح داد کا چہرہ غصے و خجالت سے سیاہ پڑ گیا۔ اب اجنبی کی باری تھی۔ اس نے اپنے مخصوص انداز میں مد مقابل کی کلائی اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ آج واقعی "ان ہونی" کا دن تھا۔ کرم داد نے اپنا سارا زور صرف کیا، ہر کوشش کر ڈالی لیکن کلائی نے چھوٹنا تھا نہ چھوٹی۔ فتح داد کے دانتوں تلے پسینہ آ گیا۔ وہ بار بار مچلتا اور اچھلتا رہا لیکن آج واقعی اس کا دن نہیں تھا۔ مقابلے کے اصولوں کے برخلاف اس نے درجنوں بار زور لگایا تھا لیکن فتح کی دیوی آج اسے دغا دی گئی تھی۔ بالآخر کرم داد آگے بڑھا اور اس نے دلاور کا ہاتھ ہوا میں لہرا کر اس کی فتح کا اعلان کر دیا۔ لوگ ڈھول پیٹتے، خوشی سے رقص کرتے آگے بڑھے اور انہوں نے دلاور کو اپنے کندھوں پر اٹھا لیا کہ اب دلاور ہی ان سب کا نیا ہیرو تھا۔ اپنی خوشی میں انہوں نے اپنے سابقہ ہیرو کی طرف ایک لمحے کے لیے بھی دیکھا گوارا نہ کیا تھا، سو انہیں خبر ہی نہ ہوئی کہ وہ کب میدان سے، گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہوا۔ اپنی شکست ماننا اور ہضم کرنا کوئی آسان کام تو نہیں ہوتا، لیکن یہ تو حرف آغاز تھا آگے بہت سے ذلتیں اس کا مقدر بننے والی تھیں۔

☆......☆

شرابیں شرابوں میں ملیں تو نشہ بڑھ جاتا ہے لیکن سواد جاتا رہتا ہے۔ آج سے پہلے اسے یہ احساس ایک بار بھی نہیں ہوا تھا کہ نشے کی کثرت اور تسلسل اسے بے کیف کر رہا ہے۔ وہ تو اپنی کھال میں خوش اور اپنی دنیا میں محو و مگن تھا۔ اس بات پہ خوش کہ اس کے سارے دکھ، سارے غم تنہائی کے اس نشے میں رل مل سے گئے ہیں۔ جس سے اس کی زندگی کسی حد تک جینے یا کم از کم زندہ رہنے کے قابل ہو گئی ہے، لیکن وہ بھی تو ایک آدم زاد ہی تھا سو چیخ کر رہ گیا۔ چوٹ پڑے تو پتھر تک چلا اٹھتے ہیں۔ وہ بھی چیخ اٹھا تھا۔ اتنی شدت سے کہ اگر اس کے لبوں سے خارج ہوتی تو آسمان میں شگاف ڈال دیتی، لیکن وہ تو اس کے اندر کہیں گھٹ کر رہ گئی تھی، سو نہ بلند ہوئی نہ کوئی سن پایا، حتیٰ کہ وہ خود بھی نہیں، لیکن خاموش چیخ کی اذیت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ انسان کے وجود کو اندر سے بکھیر کر رکھ دیتی ہے۔ اس کے اتنے ٹکڑے کر ڈالتی ہے کہ کوئی چاہے بھی تو آسانی سے جوڑ نہیں پاتا، سو وہ بھی بکھر کر رہ گیا تھا۔ دنیا جسے ایک فولادی انسان مانتی تھی، اندر سے پانی پانی ہو کر رہ گیا تھا۔ دنیا جسے ناقابل تسخیر کہتی تھی خود اپنے آپ سے ہار کر رہ گیا تھا۔ وہ کہ جس پہ کوئی وار کارگر نہ ہوتا تھا دھان پان سی ایک لڑکی کے ہاتھوں اپنا دفاع کیے بنا ہار گیا تھا۔ چھ ماہ کوئی بہت بڑا عرصہ نہیں ہوتا لیکن اسے تو یوں لگا جیسے اس کی زندگی کی ساری سانسیں عشق کی ان دیکھی چوٹ سہتے گزر گئی ہوں اور جو باقی تھیں وہ بھی اسی روگ کا سوگ مناتے گزریں گی۔ اسے اپنے بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ سچ ہے کہ عشق کی گلی کی دوسری جانب کوئی رستہ نہیں ہوتا۔ اس میں داخلے کا دروازہ تو ہوتا ہے۔ لیکن واپسی کا نہیں اور داخلی دروازہ بھی ایک بار ہی کھلتا ہے، پھر اس پر بھی بڑے بڑے نہ نظر آنے والے قفل پڑ جاتے ہیں، کہتے ہیں پیار انسان کو مضبوط کر دیا کرتا ہے۔ انسان

فرہاد بن کر پتھروں میں بھی "جوئے شیریں" کھود دیا کرتا ہے، لیکن یک طرفہ پیار کا اثر اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ ایسے میں انسان اتنا بزدل ہو جاتا ہے کہ اسے رسی بھی ڈس لیا کرتی ہے۔ اپنی ہی سوچ بچھو بن کر شب و روز ڈنگ مارنے لگتی ہے۔ ایک لڑکی جس نے چادر سے جسم کو چھپایا ہوا ہے، تانگے سے اترتی ہے تو اس کی چادر کا ایک کونا اس کے اپنے پاؤں سے یوں الجھتا ہے کہ اس کا صبیح چہرہ نمایاں ہو جاتا ہے۔ عین اسی لمحے اس کی نظر اس پر پڑتی ہے تو یوں لگتا ہے اس کی دنیا میں ایک انوکھا سورج طلوع ہو جاتا ہے، جسکی روشنی اس کی اندھی دنیا کو ایک دم روشن کر دیتی ہے۔ یوں جیسے تاریک رات میں اچانک پورا چاند اپنی تمام تر روشنی کے ساتھ ایک دم زمین پر اتر آئے اور دنیا یکسر بدل کر رہ جائے۔ بدلی کی اوٹ سے یہ چاند طلوع ہوتا ہے تو اگلے ہی لمحے دو روشن ہاتھ اس کی ساری روشنی اپنی ہتھیلیوں میں قید کر لیتے ہیں۔ وہ دو ہاتھ جس کا چہرہ چھپا لیتے ہیں اسے خود بھی اس بات کا احساس ہو چلا ہے کہ اسے دیکھ لیا گیا ہے اور یہ بھی کوئی اسے دیکھ کر کہیں کھو سا گیا ہے۔ شرم کی قوس قزح چہرے پر بکھرتی ہے اور وہ کومل وجود ایک دروازے کی اوٹ میں غروب ہو جاتا ہے۔ اس منظر کو مکمل ہونے میں زیادہ سے زیادہ دو منٹ لگے تھے لیکن نہ جانے کیوں اسے یوں لگا جیسے کائنات تھم سی گئی ہو۔ وقت، جو کبھی کسی کے لیے نہیں رکا، کم از کم آج رک سا گیا تھا۔ کہیں پردہ گر چکا تھا، کہیں حجاب اٹھ رہے تھے۔ وہ ماہ جبین تو ہوا کے گھوڑے پر سوار تھی، سو نہ اس آنے کا پتا چلا نہ جانے کا، لیکن وہ وہ تو یوں جم کر رہ گیا تھا جیسے زمین نے بڑی مضبوطی سے اس کے پاؤں جکڑ لیے ہوں۔ باقی رہا دل، تو وہ اسی لمحے سے لاپتا تھا جب وہ چاند اس کے ہر سو روشنی بکھیر کر دروازے کی اوٹ میں کہیں روپوش ہو گیا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر وہ محویت کے عالم میں وہاں بت بنا کھڑا رہا۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ گلی اس وقت سنسان تھی اور اس دوران وہاں سے کوئی بھی نہ گزرا تھا، ورنہ اس کا عشق اگلے ہی پل بے نقاب ہو جاتا، پھر کہنے کو تو وہ وہاں سے چلا آیا تھا، لیکن اپنا آپ اسی گلی، اسی منظر میں کہیں چھوڑ آیا تھا۔ دو پل کا یہ منظر ہی اب اس کی کل کائنات تھا۔ ایسی کائنات جس میں اس کا اپنا آپ جانے کہاں گم ہو کر رہ گیا تھا۔ اور ڈھونڈنے کا ہوش بھی کس کافر کو تھا۔ اس پر تو "تجھ سے ملنا خوشی کی بات سہی، تجھ سے مل کر اداس رہتا ہوں" کی سی کیفیت طاری تھی جس سے باہر نکلنا دشوار بھی اور اسے نامنظور بھی۔

☆......☆

اگلی بار وہ پھر مد مقابل آیا تو میدان ایک بار پھر دلاور کے ہاتھ رہا۔ ہر انفرادی مقابلے میں شکست کے بعد اس نے اجتماعی مقابلے کی ٹھان لی لیکن ہوا یہ کہ ہر بار دلاور ہی کی ٹیم مرد میدان رہی اور اس کے دل میں یہ خیال جڑ پکڑ گیا کہ وہ قیامت تک بھی اس سے مقابلہ کیوں نہ کرتا رہے، ہر بار اس کے حصے میں ہار ہی آنی ہے۔ بظاہر اس نے ہار نہیں مانی تھی اور مسلسل اس سے برسرِ آزما رہا، لیکن اس کے اندر کہیں ایک کونے میں یہ خیال بیٹھ گیا کہ وہ اس بلا سے کبھی جیت نہیں سکتا۔ رفتہ رفتہ یہ خیال اپنی جگہ بڑھتا چلا گیا اور وہ سوائے پیچ و تاب کھانے اور ہار جانے کے کچھ بھی تو نہ کر پایا تھا اور پھر وہ اس کی ضد بن گیا۔ گھی سیدھی انگلی سے نہ نکلا تو اس نے انگلی ٹیڑھی کر لی، لیکن وہ ہر بار مکھن سے بال کی طرح صاف بچ نکلتا۔

ایک دن بیٹھے بٹھائے اسے ایک خیال آیا تو وہ اچھل ہی پڑا، پھر اس پر جتنا غور کرتا گیا قائل ہوتا گیا۔

"دلاور کوئی انسان نہیں ہے۔ وہ تو کوئی بھوت پریت ہے۔ ہاں بھوت پریت" یہ خیال رفتہ رفتہ پختہ ہوتا چلا گیا اور دھیرے دھیرے اسے یہ یقین ہونے لگا کہ گاؤں کی سرداری کا خواب اب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوگا۔

"ایک انسان بھلا کسی چھلاوے، کسی آسیب سے مقابلہ کر بھی کیا سکتا ہے؟ اور اس سے جیتنا..... ناممکن..... بالکل ناممکن بات"۔ یہ سوچ اس کے اندر راسخ سی ہو گئی اور قرار لوٹتی چلی گئی۔

☆......☆

"فتح داد میری ایک بات مان لے یار۔"

"وہ کیا۔"

"تو نے دشمن پر اپنا ہر وار آزما لیا لیکن فتح کی دیوی تجھ پر مہربان نہیں ہوئی۔ تو نے سوچا آ کر اس کی وجہ کیا ہے۔"

"مجھے اس کا پتا ہوتا تو تجھے نہ بتاتا۔ ایک ہی تو تو یار ہے اپنا۔ میری سیدھی بات یہ ہے تو اور میری کوئی بات تجھ سے چھپی ہوئی تو نہیں ہے۔"

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اس کا مقابلہ ہمیشہ جذبات سے کیا ہے۔ کبھی عقل استعمال نہیں کی۔ میں نے جب جب تجھے اس بارے میں سمجھانا چاہا تو ہاتھ اٹھا کر مجھے کچھ کرنے سے روک دیا اور میں تیری وجہ سے رک جاتا رہا۔ اب تو میری ایک بات لے۔ اک بار تو عقل کا ہتھیار استعمال کر لینے دے، دیکھ وہ کیسے زیر نہیں ہوتا۔ نا وٹا دینا میرا، اگر کامیابی تیرے ہاتھ نہ لگے۔ ہاتھ کیا تیرے گلے لگ جائے، جھپیاں ڈالے گی.... بلکہ لڈیاں"۔ یہ شیدا تھا، فتح داد کا دست راست۔ ایک ٹھگنی سا شخص۔ جس کی ساری طاقت اس کی کھوپڑی میں بند تھی۔ ہاتھ سے زیادہ عقل کے استعمال کا عادی۔

"یار کہتا تو ٹھیک ہی ہے واقعی ہم نے کئی سال خوامخواہ ضائع کر دیے۔ سارے پنڈ کی ملامت بھی اٹھائی اور اپنا وقار بھی گنوایا۔ اب وقت ہے کہ تیری طرف دیکھا جائے، تیری بات سنی جائے، تیرے مشوروں پر دھیان دیا جائے" فتح داد نے گویا ہتھیار ڈال دیے تھے۔ شیدے اس طرح کا چہرہ خوشی سے جگمگا اٹھا تھا اور پھر اسی کے مشورے پر اس نے اپنے ہی گروپ کے ایک خاص مخبر کو اس پر ہر وقت نظر رکھنے اور اس کی معمولی سے معمولی حرکت نوٹ کرنا کا حکم دیا ساتھ ہی ان سے اس نے بڑے انعام کا وعدہ بھی کر ڈالا۔ "طیفا" جو یہ سب خاموشی سے سنتا رہا تھا، انعام کی موٹی رقم کے ذکر پر چونک اٹھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک ایک دم بڑھ سی گئی اور چہرہ جگمگا اٹھا۔ جو یہ ظاہر کرتا تھا کہ اسے انعام واکرام کا سن کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ انداز بتاتا تھا کہ وہ یہ موقع کبھی گنوانا نہیں چاہتا تھا۔

☆......☆

اس کی ساری زندگی کا حاصل بس وہی ایک منظر تھا۔ وہی منظر کہ جس نے خواب وخیال کی دنیا بڑی سہولت سے اپنے ہتھیالی تھی۔ سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے ایک ہی خیال زنجیر بن کر اسے اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔ فرار کی کوئی راہ اگر ہوتی بھی تو اسے کب گوارہ تھی؟

اس نے اپنی زندگی میں اتنا مختصر پردہ کب دیکھا تھا؟ دو سفید سفید ہاتھوں میں اس کی زندگی اس کی کائنات یوں چھپی تھی کہ ڈھونڈے نہیں ملتی تھی۔ اب ایسا نہیں تھا کہ اسے عورتوں سے نفرت ہو یا آج سے پہلے اس نے کوئی حسین عورت نہ دیکھی ہو۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ وہ ان سے ہمیشہ محفوظ فاصلے پر رہا تھا۔ اس نے ایسا کیا تھا تو اس میں بھی ایک شعوری کوشش کا دخل تھا۔ اس سب کے باوجود بھی یہ عجب اتفاق تھا کہ وہ اس مخلوق سے الگ تھلگ نہ رہ پایا تھا۔ اس کی ساری زندگی تو گھومتی ہی ایک ایسے وجود کے گرد تھی جو نحیف ونزار ہو کر بھی اس کی کل کائنات تھا۔ نانی اماں نہ ہوتی تو جانے کب کا بکھر چکا ہوتا۔

جانے کتنے برس اسے نانی نے پالا، کب اسے اٹھا کے لائی وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ خبر تھی تو فقط اتنی کہ اس کی والدین کے "قتل" کے بعد سے وہ نانی کے ساتھ تھا۔ دو سال کا بچہ کب جان پایا ہوگا کہ اس پر کیا قیامت بیت گئی تھی۔ شعور کی عمر کو پہنچا تو اپنے ماں باپ کا خیال رہ رہ کر اور بے انتہا شدت کے ساتھ اسے ستانے لگا۔ اس کے پے در پے اور مسلسل سوالات سے عاجز آ کر نانی اماں نے اس کے ماضی کا پردہ چاک کیا۔ "قتل کرنے والے کوئی غیر نہیں تھے تمہارے اپنے تھے۔ ماں باپ نے تیرے بابا کو اپنی کلاس فیلو سے شادی پر عاق کر کے گھر سے نکال دیا، جب کہ تیری ماں کے گھر والوں نے تیری ماں سے ہر طرح کا تعلق توڑ لیا۔ میں نہیں جانتی کہ پھر کیا ہوا؟ وہ اپنے گھر والوں سے چھپتے پھرے۔ تیرے دادا بڑے سخت گیر انسان تھے۔ تیرے نانا بھی کچھ کم نہ تھے۔ دونوں نے ٹھان لی تھی کہ انہیں مزا چکھا کر ہی دم لیں گے۔ جدی پشتی زمیندار تھے، آزادی کے ہرگز قائل نہ تھے۔ اتفاق سے تیری امی اور ابو خاندان بھر کے اکلوتے فرد تھے جنہوں نے بغاوت کی اور یونیورسٹی تک پہنچے تھے۔ وہ لاڈلے نہ ہوتے تو کبھی ایسا نہ کر پاتے اور پھر اتفاق کچھ ایسا ہوا کہ وہ یہ حرکت کر بیٹھے۔ جسے جارحیت سمجھا گیا۔ شاید جانتے تھے کہ ان کے والدین شادی پر کبھی راضی نہ ہوں گے۔ میں تیرے نانی کی دور پار کی رشتے دار تھی۔ شہر میں مقیم تھی اور بیوگی کے دن گزار رہی تھی۔ تیری ماں نے جب تجھے میری گود میں ڈالا تو

مجھے یوں لگا خدا نے مجھے اپنی اولاد سے نواز دیا ہو۔ میں جو شوہر کے ہوتے ماں نہ بن سکی تھی، اس کے جانے کے بعد ایک بیٹے کی ماں بن گئی۔ چند دن بعد مجھے اخبار کے ذریعے ایک ٹریفک "حادثے" میں ان دونوں کی ہلاکت کا علم ہوا تو میں سمجھ گئی کسی ایک کا وار چل گیا ہے، سو اسی دن مکان اونے پونے داموں بیچ دیا اور اس دور افتادہ گاؤں چلی آئی۔ میں اتنا دور آ گئی کہ کوئی بھی مجھے نہ ڈھونڈ پائے۔ اب تجھے اپنی قسم دیتی ہوں کہ اپنے ماضی کو بھول جاؤ۔ بس تم میرے بیٹے ہو۔ میری واحد کمائی۔ میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔ میرے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ کہ آئندہ کبھی مجھ سے اس بارے میں نہ تو کوئی سوال کرو گے نہ ہی کبھی لوٹ کر ماضی کی دنیا میں جاؤ گے"؟ اور اس نے نانی اماں کے سر پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ دونوں گلے لگ کر خوب روئے بھی تو تھے کہ ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ چکے تھے اور اب اندر ٹوٹ پھوٹ جاری تھی۔ اپنے پیاروں کا ماتم کون نہیں کرتا؟

☆......☆

ایک ہفتے بعد طیفے نے یہ رپورٹ پیش کی۔

"وہ ایک جھونپڑی میں مقیم ہے جس کے ارد گرد کئی شیشم کے درخت ہیں۔ چھڑا چھانٹ آدمی ہے سارا دن انہی درختوں کی چھاؤں میں پڑا رہتا ہے۔ میں نے کسی کو اس کے گھر آتے جاتے نہیں دیکھا۔ صبح بہت جلد اٹھ جاتا ہے اور کئی گھنٹے ڈنڈ پیلتا اور کسرت کرتا رہتا ہے۔ اس کے بعد سردائی بناتا ہے اور غٹا غٹ چڑھا جاتا ہے، پھر کھیتوں میں نکل جاتا ہے۔ کوئی دو گھنٹے کے بعد واپس لوٹتا ہے اور آ کر سو جاتا ہے۔ دوپہر کے وقت، اکرم کے ہوٹل پر روٹی کھانے چلا جاتا ہے اور وہیں ایک آدھ گھنٹہ بیٹھا رہتا ہے۔ کئی لوگ آ کر ملتے ہیں اور اپنا دکھ سکھ بیان کرتے ہیں۔ واپس آ کر پھر لیٹ جاتا ہے۔ شام کو گھر سے نکلتا ہے اور مغرب کے وقت پھر گھر لوٹ آتا ہے۔ کوئی کام وام بالکل بھی نہیں کرتا۔

میں حیران ہوں کہ اتنا جی دار آدمی، گاؤں کی دوشیزائیں جس پر جان دیتی ہیں، بھلا کیوں کر روکھی پھیکی زندگی گزارتا ہے۔ مجال ہے کسی کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔ جوانی کا اتھرا گھوڑا بڑے بڑوں کو اوندھے منہ گرا دیا کرتا ہے، مگر اس کے رنگ ڈھنگ ہی نرالے ہیں۔ پہلے میں بھی شک میں تھا لیکن اب تو میں بھی یہی کہوں گا کہ یہ کوئی انسان نہیں بھوت پریت ہے۔ پورا ہفتہ اس کے پیچھے سائے کی طرح لگا رہا ہوں، مجال ہے کہ اس کی مصروفیات میں ذرہ برابر بھی فرق آیا ہو۔ اگر آپ اسے کسرت کرتے دیکھ لیتے تو آپ بھی اسی نتیجے پر پہنچتے۔ خدا کی پناہ، وہ تو تھکنے کو نام ہی نہیں لیتا۔ جتنی سردائی وہ ایک وقت میں پی لیتا ہے، دس آدمی مل کر بھی نہ پی سکیں۔ آپ مانیں یا نہ مانیں، یہ بہرحال طے ہے کہ وہ ہم آپ جیسا کوئی انسان نہیں ہوائی مخلوق ہے۔ یاد ہے کتنی بار ہم اس سے الجھے، کتنی بار اسے گھیرے میں لیا، کتنی دفعہ اس پر بڑھ بڑھ کر وار کیے، لیکن اس جن کے بچے نے پکڑائی ہی نہیں دیا۔ اکثر حملے کے دن، گھر سے غائب پایا جاتا، کئی بار ملا بھی تو چھلاوے کی طرح غائب ہو گیا۔ کبھی چنگل میں آیا بھی تو ہمارے کئی جوانوں کو ایسا بھگایا کہ بیچارے کئی کئی دن بستر سے ہی نہ اٹھ سکے"۔ مار کے ذکر پر طیفے کا ہاتھ بے اختیار اپنی گدی کی طرف اٹھ گیا اور بے ساختہ سہلانے لگا تھا۔ طیفا اب تک دلاور کا "ہاتھ" نہیں بھولا تھا، جو دوران لڑائی اسے ایک بار پڑا تھا۔ "کسی کو اس کے آگے پیچھے کا کچھ پتا نہیں، زمین سے اگا ہے کہ آسمان سے اترا ہے، کسی کو خبر نہیں۔ تو کیا یہ باتیں یہ ثابت نہیں کرتیں کہ ایک پر اسرار شخص ہے۔ بالکل کسی بھوت پریت کی طرح"۔ وہ نہ جانے کیا کچھ کہتا رہا، فتح داد اس دوران ہوں، ہاں کرتا رہا۔ وہ کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔

☆......☆

اس نے نانی اماں سے وعدہ کر تو لیا تھا لیکن یہ وہی جانتا تھا کہ اس نے خود کو کیسے قابو میں رکھا۔ اسے خون کے رشتوں سے نفرت سی ہو گئی اور محبت سے خدا واسطے کا بیر۔ اسے بس دو رشتوں پر اعتماد تھا ایک نانی اماں اور دوسرا جگری یار دل نواز، جسے وہ دلبر کہہ کر مخاطب کیا کرتا تھا۔ دلاور اور دلبر گویا یک جان دو قالب تھے۔ وہ آگ اور پانی کا ملاپ تھا۔ دلاور جتنا گرم مزاج تھا، دلبر اس قدر ٹھنڈا ٹھار۔ پانی بالآخر غالب آیا۔ دلاور کی زندگی میں جو خلا تھا وہ دلبر نے کچھ یوں پر کیا کہ دلاور کسی آتش فشاں

پہاڑ میں بدل گیا۔ جس کی اوپری سطح دیکھ کر کوئی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ اس کے اندر لاوا پک رہا ہے۔ یہ لاوا محبت کے روپ میں یوں نکلا کہ اسے جلا کر بھسم کر ڈالا۔ اول اول تو اسے خود اپنی دماغی حالت پر شک ہوا۔ وہ اور عشق..... جس کی دنیا اسی عشق نے اجاڑ دی ہو، وہ بھلا کیوں کر اس کا شکار ہوتا۔ وہ کہ جس نے ساری عمر اس محرومی کے ساتھ گزار دیے تھے کہ وہ ایک بار بھی اپنے والدین کی صورت نہیں دیکھ پایا تھا، بھلا کیسے محبت کا متحمل ہو سکتا تھا؟ لیکن اس کی تمام تر کوششیں نقش بر آب ثابت ہوئیں۔ آخر کب تک جھٹلاتا، کبھی نہ کبھی تو اسے یہ یقین آنا ہی تھا کہ وہ بھی اب محبت کی قید میں ہے۔ یہ یقین آیا بھی تو تب، جب عشق کا وائرس اسے گھن کی طرح چاٹ چکا تھا۔ اب تک وہی ایک منظر اس کے عشق جاں خیز کی واحد سوغات تھا۔ نہ جانے کتنی بار وہ اپنی صاحباں کی گلی میں مرزاں یار کی طرح پھرتا رہا تھا، لیکن لگتا یہی تھا کہ "دیدار" کا اس نے پہلا اور آخری دیدار ایک ساتھ کیا تھا۔ گویا وقت وصال ہی دراصل اس کا وقت ہجر بھی تھا۔ پہلے بھی اس کا سینہ آتش دان ہوا کرتا تھا اور اب تو اس میں عشق کے شعلے بھی شامل ہو گئے تھے۔ وہ بے بسی کی انتہا پر تھا۔ ہار کر بھی جس کا اعلان اسے منظور کب تھا؟ کوئی چھ ماہ وہ سوچوں کی ادھیڑ بن میں رہا۔ بات جب برداشت کی سرحدیں توڑنے اور گھٹن سانس کی طنابیں کھینچنے لگی تو اسے دلبر یاد آیا۔ اسے لگا اسکا یار کوئی نہ کوئی حل ضرور ڈھونڈ نکالے گا۔

☆......☆

کوئی بیس پچیس منٹ گزرے تھے کہ بارش کا زور ٹوٹ گیا۔ ہلکی ہلکی پھوار اب بھی پڑ رہی تھی۔ اگلے دس منٹ میں مطلع بالکل صاف ہو گیا۔ شاید زمین کا پیٹ بھر گیا تھا یا پھر بادلوں کا دامن خالی ہو گیا تھا۔ خنکی اچانک بڑھ سی گئی تھی۔ بھیگے کپڑے نچوڑ کر بھی اسے سکون نہیں ملا تھا اور اب تو اس کے دانت بھی بجنے لگے تھے۔ تاہم یہ تسلی ضرور تھی کہ پیش قدمی کی راہ ہموار ہو رہی ہے، لیکن یہ سوچ کر اس کی امیدوں پر پانی پھر گیا کہ کچے راستے کیچڑ کا روپ دھار چکے ہوں گے۔ وہ ایک دم پریشان سا ہو گیا۔ اسے ہر حال میں اپنی منزل پر پہنچنا تھا۔ ناغے

کا مطلب تھا، عمل کا پھر سے آغاز اور اب یہ اس کے بس کی بات نہ رہی تھی۔ واپسی کا سفر بھی کبھی تو منزل سے بھی زیادہ کڑا ہوتا ہے۔ اس نے دل ہی دل میں خدا کو یاد کیا اور اس کی مدد چاہی۔ اچانک اس کے دماغ میں ایک جھماکا سا ہوا اور راہیں روشن ہو گئیں۔ سرنگ کا خیال آتے ہی اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔ اس کے دائیں طرف کوئی سو قدم دور ایک سرنگ تھی جو قبرستان تک جاتی تھی۔ پختہ اینٹوں سے بنی سرنگ پر کیچڑ کا بھلا کیا کام؟ خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے، اس نے جلدی سے اس جانب بڑھنا شروع کر دیا اور پھر تھوڑی ہی دیر میں وہ اپنی کوشش میں کامیاب رہا تھا۔ حسب توقع سرنگ کیچڑ سے محروم تھی اور سفر خاصا آسان۔ اس کا رخ قبرستان کے مرکزی دروازے کی طرف تھا۔ وگرنہ اب تک تو وہ شارٹ کٹ لگایا کرتا تھا۔ چونکہ یہ راستہ کچھ طویل تھا اور پرخطر بھی کہ کوئی دیکھ نہ لے، وہ پشت کی طرف سے چار دیواری پھلانگ کر قبرستان میں گھسا کرتا تھا۔ بابا جی کے وقت کی بنی پرانی، لیکن مضبوط چار دیواری نے قبرستان کو اپنی تحویل میں لے رکھا تھا۔ مرکزی دروازہ سنسان پڑا تھا۔ لوہے کے اس مقفل دروازے کو عبور کرنا اس کے لیے ہرگز دشوار نہ تھا۔ چند ہی لمحوں میں اس آخری رکاوٹ کو عبور کرتا ہوا قبور کے درمیان تھا، پھر اپنی مخصوص جگہ تک پہنچنے میں اسے یوں بھی آسانی ہوئی کہ وہ جگہ مرکزی دروازے سے کچھ زیادہ دور نہ تھی۔ کیچڑ تو ضرور تھی لیکن وہ دیوار کے سہارے وہاں تک پہنچا تھا۔ یہ بھی حسن اتفاق ہی تھا کہ وہ قبر دیوار کے پہلو میں تھی ورنہ وہ اتنی آسانی سے وہاں تک کبھی نہ پہنچ پاتا۔ ایک شکستہ سی قبر نے، جس کا دہانہ قدرے کھلا ہوا تھا، اس کے پاؤں روک لیے۔ یہی اس کی منزل تھی۔ قبرستان، تاریکی اور تنہائی... کوئی اور ہوتا خوف سے اس کی گھگھی بندھ چکی ہوتی، لیکن وہ بھی دلاور تھا، اسم با مسمیٰ۔ اس نے ٹارچ نکال کر آن کر لی تھی کہ اب خطرے کا کوئی امکان باقی نہ بچا تھا۔ دن کی روشنی میں بھی ایسی قبریں دم نکال دیا کرتی ہیں، لیکن وہ یوں بے خوفی میں اس قبر کے اندر اتر گیا جیسے کوئی دروازے کھول کر اپنے گھر میں داخل ہوتا ہے۔ قبر کا دہانہ کچھ ایسے رخ پر تھا کہ بارش کا پانی براہ راست اندر

نہیں جا سکتا تھا۔ روشنی کے ایک ہلکے سے دائرے نے البتہ یہ ضرور دکھا دیا کہ پانی نے اندر سے قبر کو نم آلود کر دیا ہے۔ اس نے ایک کونے میں چھپی پٹ سن کی بوری اٹھا کر درمیان میں بچھا دی اور اپنی انگلی سے دائرہ لگانے لگا۔ دم سے نشانات اب بھی موجود تھے جن پر انگلی پھیر کر اس نے انہیں مزید نمایاں کر دیا۔ ٹارچ آف کرنے کے بعد، اس نے اپنی آنکھیں موند لیں اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا۔ وہ اپنے گرد شاید کوئی حصار قائم کرنا چاہتا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد اس نے اپنے چاروں طرف پھونک مار دی، پھر مخصوص انداز میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا، آنکھیں بند کر لیں اور زیر لب وظیفے کے مخصوص کلمات ادا کرنا شروع کر دیے۔ اس کام میں کم از کم آدھ گھنٹہ لگتا تھا۔ ایک بار پڑھ چکتا تو ہاتھ میں پکڑی تسبیح کا ایک دانہ گرا دیتا۔ وہ موٹے دانوں کی تسبیح ساتھ لایا کرتا تھا تاکہ بھولنے کا احتمال نہ رہے۔ ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اسے اپنا وجود ایک دم بھاری ہوتا محسوس ہوا۔ اس قدر بھاری جیسے وہ یکایک گوشت پوست سے پتھر کی سِل میں تبدیل ہو گیا ہو۔ ذہن کے کسی تاریک گوشے میں یہ خیال ابھرا کہ کہیں وہ سچ مچ پتھر کا تو نہیں ہو گیا۔ شک مٹانے کے لیے اس نے اپنے وجود کو حرکت دینا چاہی تو یہ دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے کہ وہ اپنے وجود کو ہلکی سی بھی حرکت دینے میں ناکام رہا تھا۔ خوف کی ایک تیز سی لہر اس کے وجود میں اِدھر سے اُدھر دوڑتی چلی گئی تھی اور دل پسلیوں سے سر ٹکرانے لگا۔ دل کی دھڑکن نے البتہ اسے یہ احساس ضرور دلایا تھا کہ وہ زندہ ہے جبھی تو دل مسلسل حرکت میں ہے۔ سرشاری کی ایک لہر نے اسے روحانی خوشی سے سرشار کر دیا۔ خوف کی کیفیت ایک دم چھٹنے لگی، لیکن اسی لمحے ایک دھماکا سا ہوا اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے اسکا پورا وجود کرچیوں میں بٹ کر اڑتا ہوا فضا میں بکھر گیا ہو۔ دھماکا اس کے کہیں بہت قریب ہوا تھا یا شاید اس کے وجود کے اندر۔ ساتھ ہی ساتھ اس کے حواس پر اندھیرے کی دبیز تہ چڑھتی چلی گئی۔

☆......☆

دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ اس کی نانی اماں نے اسے بچانے کے لیے ہر وہ کام کیا جو اس کے بس میں تھا۔ شہر تو شہر اس نے صوبہ بدل دیا، پھر بھی اس کے دل سے خوف دور نہ ہوا۔ وہ اسے بینت بینت کر رکھتی رہی۔ نور پور سے باہر کبھی بھی نہ جانے دیتی تھی۔ اس نے تعلیم بھی وہیں رہ کر حاصل کی۔ میٹرک کے بعد یہ سلسلہ یوں رکا کہ وہاں ایک ہی ہائی اسکول تھا۔ کسی دوسرے شہر بھیجنے پر وہ رضامند نہ ہوئی، سو اسکا تعلیمی سفر میٹرک سے آگے نہ بڑھ سکا۔ دلبر نہ ہوتا تو شاید وہ بھی کولہو کا بیل نہ بنتا۔ دلبر تھا بھی تو بلا کا ذہین۔ اس کے اندر کی سرکشی دیکھتے ہوئے اس نے دلاور کو پہلوانی کی جانب راغب کیا۔ یوں دلاور کی ساری توانائی جسم بنانے پر صرف ہونے لگی۔ وہ خود تو دھان پان سا تھا لیکن اس کی کوششوں نے دلاور کو ایک فولادی انسان بنا ڈالا۔ نانی اماں کی وفات کے بعد اس نے اس علاقے کو خیر باد کہا اور فیض پور میں جا بسا۔ ایک کنال کا ٹکڑا خرید کر اس نے اپنی کٹیا بنائی اور اپنی ایک الگ دنیا بسا لی۔ کبھی کبھی تنہائی کا احساس کاٹ کھانے کو دوڑتا تو اپنے دلبر کے پاس بھاگا چلا آتا۔ آج بھی جب وہ اسے ملنے آیا تو دلبر اسے دیکھتے ہی کھل اٹھا۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ اپنے یار کو کہیں جانے ہی کب دیتا؟ دلبر نے اپنے یار کا بجھا بجھا چہرہ دیکھا تو بے اختیار چونک اٹھا۔ فطری چمک دمک سے عاری اس کا چہرہ، باسی گنڈیری جیسا ہو گیا تھا۔ آنکھیں کھوئی کھوئی، ہونٹ دانتوں تلے دبے ہوئے، گم صم سا دلاور اسے خاصا پراسرار سا لگا۔ سمجھ گیا کوئی خاص بات ضرور ہے۔ جانتا تھا کہ یہ کیفیت اس پر تب وارد ہوتی ہے جب اسے اپنا ماضی ڈسنے لگتا ہے۔ ایسے میں اس کے اندر کا سارا کرب اس کے چہرے پر سمٹ آیا کرتا تھا۔ دلبر نے کچھ دیر تک اس کے بولنے کا انتظار کیا، پھر اسے گم صم بیٹھا دیکھا تو رہ نہ پایا۔

"یار جانی، کیوں نخروٹی عورتوں کی طرح منہ بنائے بیٹھو ہو؟ کیا ہوا ہے، کچھ ہمیں بھی تو پتا چلے۔ کیا پھر گھر میں کوئی کھٹ پھٹ ہو گئی ہے؟"

دلبر باوجود کوشش کے اپنے لہجے میں شوخی نہ لا سکا تھا، لیکن یہ دیکھ کر اس کی تشویش میں اضافہ ہوا کہ دلاور نے ایک بار اپنا چہرہ اوپر اٹھایا، چند لمحے اس کی آنکھیں میں جھانکا اور پھر سر جھکا لیا۔ تاثرات ایسے تھے جیسے اسے

اپنی تکلیف کے اظہار کے لیے مناسب الفاظ نہ مل رہے ہوں۔ کبھی کہنے کو بہت کچھ ہوتا ہے، لفظ ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ آج دلاور کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھایا اور گویا ایک دھماکا کر دیا

"مجھے عشق ہو گیا ہے..... ایک ایسی عورت سے عشق جسے میں نے ایک ہی بار دیکھا ہے۔ اس عشق نے مجھے اندر باہر سے جلا ڈالا ہے، مار ڈالا ہے.... چاروں شانے چت کر دیا ہے۔ میری پشت زمین سے لگا دی ہے۔ مجھے ہرا ڈالا ہے۔"

دلبر کو یوں لگا جیسے اچانک آسمان اس پر آن گرا ہو۔ زمین کی گردش ایک دم تیز ہو گئی ہو۔ وہ واقعی چکرا کر رہ گیا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو گردن پیچھے پھینک کر اتنے زور سے قہقہہ لگاتا کہ در و دیوار ہل جاتے اور پھر بامشکل اپنی ہنسی روکتا ہوا کہتا۔

"یہ اس صدی کا سب سے بڑا لطیفہ ہے، سب سے بڑی جگت۔ تم اور عشق...... ہاہاہا"۔ لیکن وہ ایسا نہ کر پایا تھا۔ دلاور کے سارے دکھ درد اس کے چہرے پر جو لکھے تھے۔ وہ ویسے بھی کوئی اداکار تو تھا نہیں کہ اپنے چہرے پر غلاف چڑھا کر اپنے تاثرات چھپا پاتا۔ اس کا چہرہ اس کے دل کا آئینہ تھا، جو اس کے باطن کا ہر راز ہر بار فاش کر دیا کرتا تھا پھر دھیرے دھیرے، دلاور نے خود پر گزری ایک ایک کیفیت، اپنے یار غار سے کہہ سنائی۔ دلبر کی حالت دیکھنے والی تھی۔ وہ منہ کھولے پھٹی پھٹی نظروں سے اسے تکے جاتا تھا، لیکن جلد ہی اس نے خود پر قابو لیا کہ اپنے یار کی دل جوئی بھی تو اس کی کو کرنا تھی۔ تم نے خوامخواہ یہ سب مجھ سے چھپایا۔ پہلے بتا دیتے تو وہ سب تمہیں نہ سہنا پڑتا اور اب تک تو مسئلہ حل بھی ہو چکا ہوتا۔ آخر کیا کمی ہے تم میں، لاکھوں میں ایک ہو۔ جی دار آدمی ہو، پھر صاحب جائیداد بھی تو ہو۔ نانی نے اپنا سب کچھ تمہیں ہی تو سونپ دیا تھا۔ تمہاری زمین کی کمائی سے تو میرے گھر کی دال روٹی بھی چلتی ہے۔ ایک ہی تو جی ہو ہم جیسے مرد تو کسی بھی لڑکی کا خواب ہوتے ہیں۔ تم اچھی طرح جانتے ہو میں تمہیں دکھی دیکھ نہیں سکتا۔ تمہاری بھابھی کس مرض کی دوا ہے۔ دیکھ لینا منوا کر ہی آئیں گے۔ تمہیں جلد خوشخبری ملے گی۔ بس اب موڈ ٹھیک کر لو۔ ہنس کے دکھاؤ گے.. تو کھانا ملے گا، ورنہ بھوکوں مرو گے۔"

دلاور بے اختیار ہنس دیا۔ دلبر کو اپنی آنکھیں ٹھنڈی ہوتی محسوس ہوئیں

☆......☆

آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ دلبر کا چہرہ صاف بتا رہا تھا کہ اس کے پاس کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔ وہ اسی لیے اس کام سے گریزاں تھا کہ کہیں انکار ہو گیا تو امید کا دیا بجھ جائے گا۔ تاریکی میں جلتا اکلوتا چراغ بجھ جائے تو اندھیرے کا احساس اچانک بڑھ سا جاتا ہے اور آج اس کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا تھا۔ اس کے بدترین خدشات بالآخر درست ثابت ہوئے تھے۔ دوست نے کچھ نہ بتا کر بھی سب کچھ بتا دیا تھا۔ دلبر نے جب یہ کہا کہ لڑکی کی ماں نے سوچنے کے لیے وقت مانگا ہے تو وہ بخوبی سمجھ گیا کہ اسے خوبصورتی سا ٹالا گیا ہے۔ اتنا تو وہ بھی جانتا تھا کہ ماں بیٹی تنہا رہا کرتے تھے۔ لڑکی کا باپ اس بھری دنیا میں انہیں تنہا چھوڑ کر اپنی نئی بیوی کو پیارا ہو گیا تھا۔ گویا ماں بیوگی اور بیٹی یتیمی کے دن کاٹ رہی تھی۔ جاتے جاتے شوہر اپنی زمین بھی اونے پونے داموں بیچ گیا تھا۔ وہ تو بھلا ہو بستی والوں کا عین وقت پر ڈٹ گئے، ورنہ وہ تو مکان بھی بیچ دینے کا پروگرام بنا چکا تھا۔ بستی والوں کی مداخلت کام آئی، ورنہ وہ دونوں نہ جانے کہاں جاتے؟ کچھ دوسری عورت کا حسن اور کچھ بیٹے کی محرومی نے اس کی آنکھوں پر ایسی پٹی باندھی کہ وہ ظالم ایسا گیا کہ لوٹ کر آنے کی فرصت ہی نہ ملی۔ سچ ہے "مال پرائی، باپ قسائی"۔ جب گیا تھا تو بیٹی کوئی چھ برس کی تھی۔ اب اس کی عمر کوئی بیس برس تھی۔ پرائیوٹ میٹرک کرنے کے بعد "دیدار" نے گھر ہی میں سلائی کڑھائی میں ماں کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا۔ ماں کی کمر بھی دوہری ہو چلی تھی۔ سواسے بھی کچھ سکون اور آرام نصیب ہوا تھا۔ اب تو بیٹی کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر کھائے جاتی تھی لیکن حالت یہ تھی کہ نہ اسے کسی پر اعتبار آتا تھا نہ لڑکی کو۔ دونوں ایک مرد کے ہاتھوں ڈسی تھیں، ان کا بے اعتبار ہونا بنتا بھی تو تھا۔ کسی غیر مرد پر بھروسا کرنا۔ جس کا آگے پیچھے کوئی نہ ہو۔ ان کے لیے کوئی آسان کام ہرگز نہ تھا۔ دلاور یہ بات خوب

سمجھتا تھا۔ اس حوالے سے اسے ماں بیٹی سے ہمدردی بھی تھی۔ وہ ان کے لیے بہت کچھ کرنے کا ارادہ بھی رکھتا لیکن اعتماد کا فقدان اس کے راہ کی واحد دیوار تھا۔ دلبر نے اسے سوچوں میں غرق پایا تو اس مسئلے کا ایسا حل بتایا جو دلاور کو ہرگز منظور نہ تھا لیکن پھر دوست کے حد درجہ اصرار اور پیار نے اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیں۔ اس نے حالات کے پیش نظر سمجھوتا کرلیا تھا۔ اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ دیدار کو کھودینے کا تصور بھی اب تو اس کے لیے محال تھا۔

☆......☆

"تم برخوردار کے دوست ہو، اس لیے تمہارے لیے مجھے کچھ نہ کچھ تو ضرور کرنا ہی تھا۔ مجھے اس کے لیے ایک طویل عمل کرنا پڑا۔ اسی لیے مجھے کافی دیر لگی اور تم لوگوں کو بھی انتظار کرنا پڑا۔ میرے حساب سے تم دونوں کا جوگ مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا۔ میں علم رمل، نجوم اور اعداد سے بھی سمجھا، پھر میں نے عمل جفر سے مدد لی تو مجھے تمہارے اس مسئلے کا ایک حل ملا۔ جو بہت مشکل ہے لیکن لگن سچی ہو تو تیر بہدف سے کم نہیں۔ آج تک خطا نہیں گیا۔ یہ ہمارا خاص خاندانی عمل ہے۔ اپنے والد صاحب کی اجازت سے میں نے روحانیت کی دنیا میں قدم رکھنے سے قبل یہی عمل خود کیا۔ یہ سارا فیض جو تم دیکھ رہے ہو نا، بس اسی ایک عمل کا کرشمہ ہے۔" اس تمام تمہید کے بعد شاہ صاحب نے دلاور کی رضامندی دیکھی تو اسے اس عمل کا سارا طریقہ کار سمجھا دیا۔

"یاد رکھنا، اس عمل کی تکمیل کے دوران تمہیں شدید رکاوٹیں پیش آئیں گی۔ یہاں پر تمہارے عزم کا کڑا امتحان ہوگا۔ اگر گڑھے میں موجود رہے اور اسے توڑ کو باہر نہ بھاگے تو کامیاب ہوجاؤ گے۔ باہر نکل آئے تو پھر جو ہوگا اسے بہت بھیانک کہا جاسکتا ہے۔ میں نے جو بتانا تھا بتا دیا، اب تم جانو تمہارا کام جانے۔" آخر میں ان کا لہجہ پراسرار ہوگیا تھا۔ یہ سب کہہ کر شاہ صاحب اسے سوچوں کے گرداب میں گھرا چھوڑ کر اپنے حجرے میں تشریف لے گئے۔ دلاور کو سچ مچ اپنی حالت پر افسوس بھی ہو رہا تھا اور حیرت بھی۔ کیا وہ وہی جی دار تھا جس سے ایک خدائی کانپتی تھی؟ اس کے عزم وہمت کے آگے کسی کی جرأت ہی کب تھی کہ ٹھہر پاتا، لیکن آج وہ خود کو ایک بے بس کینچوے سے کہیں زیادہ بے بس پاتا تھا۔ اس کے پیار نے اسے اتنا مجبور کر ڈالا تھا کہ اس جیسا عملی انسان آج بے عملی کی راہوں پر گامزن تھا۔ تعویذات، چلّے اور جھاڑ پھونک کا تو وہ کبھی بھی قائل نہیں رہا تھا لیکن آج خود تسخیر کے ایک عمل کی انجام دہی پر مجبور تھا "واہ ری قسمت ....." اس کے منہ سے بے ساختہ ایک ٹھنڈی سانس خارج ہوئی تھی۔

☆......☆

وہاں سے آتے ہی اس نے اپنے کام کا آغاز کردیا تھا۔ عمل کے سارے لوازمات گاؤں میں دستیاب تھے۔ گاؤں کا قبرستان اس کی اقامت گاہ سے کوئی ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ قبرستان کے باہر چار دیواری تو تھی ہی، اندر کا ماحول بھی صاف ستھرا ہی تھا۔ شکستہ قبروں کی تعداد بھی کچھ خاص نہ تھی پھر بھی اس نے ایک ڈھونڈ ہی نکالی۔ یہ قبر پختہ دیوار کے ساتھ بکائن کے ایک درخت کے نیچے موجود تھی۔ اس درخت کی وجہ سے اس کی پہچان بھی آسان تھی۔ دیوار کا تعویذ کچھ ٹوٹا ہوا سا تھا، لیکن کچھ اس رخ پر ٹوٹا تھا کہ باہر سے دیکھنے کے لیے جھک کر اندر جھانکنا پڑتا تھا، پھر وہ آہستگی سے اس کے اندر اتر گیا۔ قبر خاصی پرانی سی تھی۔ مردے اور کفن کا نام ونشان تک نہ تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے اس کی کھدائی شروع کردی۔ وہ اس کے اندر کی جگہ کچھ اور بھی کشادہ کرنا چاہتا تھا۔ کچھ دیر میں ہڈیوں کی برآمدگی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ کچھ ہی دیر میں لاش کا سر بھی مل گیا۔ کسی بچے کی قبر تھی۔ اس نے تمام ہڈیوں کو ایک کونے میں دبا کر مٹی کی ڈھیری سی بنادی۔ قبر ممکن حد تک کشادہ ہوچکی تھی۔ اس کی نگاہوں نے قبر کا اندر باہر سے بخوبی جائزہ لیا تھا۔ یہ دیکھ کر اسے حد درجہ اطمینان ہوا کہ اس کے گرنے کے امکانات خاصے محدود تھے۔ اپنے پندرہ روزہ عمل کے لیے وہ اسے ہر لحاظ سے مناسب لگی تھی۔ شام کے سائے دھیرے دھیرے اپنے پر پھیلاتے جارہے تھے۔ اس کا مقصد پورا ہوچکا تھا۔ اب وہاں رکنا فضول تھا، سو وہ قبر سے باہر نکل آیا۔ قبرستان میں خاموشی چھائی تھی۔ اسے کوئی ذی روح دکھائی نہ دیا اور یہ ایک لحاظ سے اچھا ہی تھا۔ کوئی اسے وہاں دیکھ لیتا تو جانے اس کے متعلق کیا رائے قائم کرتا؟ آج چاند کی دس تاریخ تھی اس

کا عمل پندرہ سے شروع ہوتا تھا۔ نئے چاند کی پہلی تاریخ اس کے عمل کی آخری رات ہوتی۔ شاہ صاحب نے اسے ساری تفصیلات سمجھا دی تھی۔ آخری رات ایک موکل نے نمودار ہونا تھا جس سے عہد و پیمان کے بعد وہ اس کا غلام بے دام بن جاتا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے تسخیر قلوب کا ملکہ بھی حاصل ہو جاتا تھا، یعنی جس پر نظر ڈالتا اپنا مطیع کر لیتا۔ "پھر تو میں اپنی دیدار کو بھی با آسانی اپنا بنا لوں گا۔" یہ خیال آتے ہی خوشی کی اک لہر اس کے وجود میں اترتی چلی گئی اور اس کے قدم بے ساختہ محبوب کی گلیوں کی سمت اٹھتے چلے گئے تھے۔

☆......☆

رات بارہ بجے کے بعد اسے اپنے عمل کا آغاز کرنا تھا۔ اس کام کے لیے پہلی شب وہ کوئی گھنٹہ بھر پہلے چل پڑا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ پندرہ، بیس منٹ میں اپنی مطلوبہ جگہ پہنچ جائے گا لیکن یہ کیا؟ لگتا تھا جیسے کسی جادوگر نے اس کی منزل پر پھونک مار کر اسے دور کر دیا ہو۔ پاؤں الگ من من بھر کے ہو رہے تھے، اندر سے مسلسل ایک آواز راہ کی دیوار بن رہی تھی۔ یہ آواز اسے گویا سمجھا رہی تھی۔

"یہ منفی راہ ہے اس راہ پر مت چلو۔ اس جادوئی دنیا کی طرف قدم مت بڑھاؤ ورنہ گمراہی مقدر ٹھہرے گی۔ یہ وہ راہ ہے کہ ایک بار قدم اُٹھ گئے تو واپسی کا راستہ ڈھونڈے نہ ملے گا۔" لیکن وہ اس آواز کو دباتا ہوا آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ دیکھا بھالا، سیدھا سادھا راستہ، چڑھائی لگ رہا تھا۔ سانس الگ پھول پھول جاتی تھی، یہ چاند کی پندرہ تاریخ تھی، نیلگوں روشنی نے چیزوں کو نورانی بنا دیا تھا۔ حشرات الارض کی آوازوں کے درمیان وہ کسی آوارہ بدروح کی طرح بھٹکتا پھر رہا تھا۔ کوئی دیکھ لیتا تو خوف سے تھرا اُٹھتا۔ بھلا گاؤں میں آدھی رات کو بھی کوئی باہر نکلتا ہے اور وہ بھی قبرستان کی راہ پر۔ یہ پُر خار و پُر خطر راستہ تو اچھے اچھوں کو دن میں ہولناک لگا کرتا ہے، لیکن وہ بڑی بے جگری سے آگے اور آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ بارہ بجنے سے کوئی دس منٹ پہلے وہ چار دیواری کی جنوبی دیوار سے اندر کود گیا۔ گرنے سے ہلکی سی آواز پیدا ہوئی جو قبرستان کے سناٹے میں گونج اٹھی۔ کچھ دیر چوروں کی طرح دبکا بیٹھا رہا۔ جیسے اسے خطرہ ہو کوئی اسے دیکھ نہ لے، لیکن وہاں کوئی ہوتا تو سامنے بھی آتا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس شکستہ قبر کے کنارے پہنچ گیا جو اس نے اس خاص عمل کے لیے منتخب کی تھی۔ جیب سے ٹارچ نکال کر اسے آن کیا تو اس کی ہلکی سی روشنی نے قبر کو اور واضح کر دیا۔ قبر کا اندرونی منظر دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ وہ خالی ہے۔ صفائی تو وہ پہلے ہی کر چکا تھا، سو بے خطر اس میں یوں اتر گیا جیسے کوئی ماہر تیراک دریا میں اترتا ہے۔ ایک کونے میں پڑی پٹ سن کی بوری جھاڑ کر قبر میں بچھائی اور اس کے گرد اپنے ہاتھ سے ایک دائرہ سا لگا دیا۔ اسے کڑا لگانا تھا جو اس عمل میں مرکزی اہمیت رکھتا تھا۔ خدا اور رسول کو یاد کرتے ہوئے اس نے عزیمت پڑھنا شروع کی اور پھر چاروں طرف پھونک مار کر خود کو ورد کے حصار میں لے لیا۔ اب کوئی ہوائی مخلوق اس دائرے میں داخل ہو کر اسے تنگ نہ کر سکتی تھی۔ تسبیح ہاتھ میں تھام کر ورد پڑھنا شروع کیا تو ابتدائی چند لمحات خیریت سے گزرے تھے کہ اچانک جی گھبرانے لگا۔ دل کرتا تھا کہ وہ اٹھے اور بھاگ کر اپنی کٹیا میں جا چھپے۔ بھاگنے کی اتنی شدید خواہش کہ اسے دہاتے دانتوں پسینہ آ گیا، لیکن اس شدید کشمکش میں بھی اس نے ورد پڑھنا ترک نہ کیا، جانتا تھا جب تک عمل کی تکمیل نہیں ہوتی یہ کشمکش جاری رہے گی، سو وقت ضائع کرنے سے بہتر تھا کہ وہ سو بار اپنا ورد پڑھ کر مکمل کرتا اور بھاگ جانے کی خواہش سے چھٹکارہ پا لیتا۔ شاہ صاحب نے اس عمل کو بہت مشکل کہا تھا تو دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔ کب جانتا تھا کہ یہ طلسماتی دنیا اس کے لیے لوہے کا چنا ثابت ہوگی۔ پہلے دن یہ عمل کوئی پون گھنٹے میں مکمل ہوا۔ اس کا اندازہ پچیس منٹ کا تھا۔ اب یہ تو وہی جانتا تھا کہ پون گھنٹہ اس نے کس کرب میں گزارا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو پہلے ہی دن اپنی جان چھڑا کر حصار سے باہر نکل آتا اور جان سے جاتا کہ حصار سے نکلنے کا مطلب تھا، گردن کا ٹوٹنا، پاگل ہو جانا یا ایسے ہی کسی اور حادثے کا شکار ہو جاتا۔ یہ جلالی عمل اپنے اندر رجعت کی ایسی زبردست طاقت کا حامل تھا کہ ان سب میں سے کسی ایک کا وقوع پذیر ہونا ایک یقینی امر تھا۔ پہلی رات کے عمل نے اس سرکش کو بھی یہ سب ماننے پر مجبور کر دیا تھا، ورنہ تو اس

کے ذہن نے رجعت کے اثرات کو تسلیم کرنے سے یکسر انکار کر دیا تھا۔ وہ جو سرکشی میں بے مثال تھا ایک ہی رات میں سیدھا ہو گیا تھا۔ اسے پتا چل گیا تھا یہ عمل بندہ لے کے دے گا۔ یا "جان" ہاتھ آئی یا اپنی جان ہاتھ سے گئی۔ وہ آہستگی سے چلتا ہوا قبرستان سے باہر آیا اور گھر کی راہ لی۔ سارا راستہ اسے یہی لگا جیسے وہ اکیلا نہ ہو۔ کوئی نادیدہ وجود دبے پاؤں اس کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہو۔ کئی بار رک کر اس نے سن گن بھی لی لیکن کسی کی موجودگی کا احساس نہ ہوا۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے سے وہ یوں بھی خود کو باز رکھا تھا کہ اس نے سن رکھا تھا۔

"پیچھے مڑ کر دیکھنے والے اکثر پتھر کے ہو جایا کرتے ہیں"۔ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنی کٹیا میں پہنچا تو تب اسے یقین آیا کہ اب وہ محفوظ ہے۔ جسم دکھن سے ٹوٹ رہا تھا، درد ہڈیوں میں سرایت کر گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ برسوں مسلسل چلتا رہا ہو پھر چارپائی پر گرتے ہی اسے نیند نے آلیا۔ رات بھر نیند میں بھی اسے چین نصیب نہ ہوا۔ خواب میں ڈراؤنی شکلیں اسے بے چین کرتی رہیں۔ صبح کافی تاخیر سے اس کی آنکھ کھلی تو کافی دیر چارپائی پر بے سدھ پڑا رہا۔ کہیں جانے کو جی نہیں چاہتا تھا، سو دوپہر تک گھر ہی میں رہا۔ ہوٹل سے روٹی کھا کر وہاں بیٹھنے کی بجائے جلد گھر لوٹ آیا۔ وہ کسی سے سامنا نہیں چاہتا تھا، بہتر تھا دوران عمل وہ تنہائی میں وقت گزارتا، سو اس خیال سے اس نے گھر کی راہ لینا مناسب سمجھا تھا۔ شاہ صاحب نے اس جلالی عمل کے لیے پرہیز جلالی کی خاص تاکید کی تھی، گوشت، پیاز، انڈہ، دودھ وغیرہ سے مکمل دوری۔ انہوں نے کہا تھا "ترک حیوانات سے انسان کی حیوانیت کم ہو جاتی ہے اور روحانیت بہت قوی۔ تسخیر کے یہ سارے عمل روحانیت ہی کے سہارے کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہیں۔" اگلی رات طریقہ واردات مختلف تھا۔ اب آوازوں کی باری تھی، یہ سماعت کو متاثر کرنے اور اعصاب کو توڑ کر حصار سے باہر لانے کی ایک کوشش تھی، عجیب و غریب خوفناک پُراسرار آوازیں کبھی مدھم تو کبھی بے انتہا تیز، لیکن وہ ڈٹا رہا۔ آہستہ آہستہ ورد جاری رہا اور بالآخر چالیس منٹ میں دوسری رات کا عمل ختم ہوا۔ ایک دو بار اسے یوں لگا جیسے کوئی اسے اٹھا کر دائرے سے باہر پھینک دے گا۔ خصوصاً دھماکے جیسی آوازیں جیسے کہیں زوردار بجلی گری ہو۔ اس کا دل دہلاتی رہی لیکن وہ آنکھیں بند کر کے خود کو تھامتے ہوئے ڈٹا رہا۔ آنکھیں بند کیے عمل جاری رکھا اور دوسرا امتحان بھی پاس کر لیا۔ دو دن کی آزمائش سے اتنا حوصلہ تو اسے ہو گیا تھا کہ اگر اس نے عزم و ہمت کا مظاہرہ کیا تو وہ ان تمام آزمائشوں سے سرخ رو ہو کر نکلے گا۔ اپنے آپ کو تیار کرنے اور اگلے دن کے عمل کے لیے خود کو مضبوط بنانے کے لیے دن کے اوقات میں اس نے درود شریف کا ورد جاری رکھا۔ یہ اس کی برسوں پرانی عادت تھی کہ تنہائی میں کثرت سے درود شریف پڑھا کرتا تھا۔ جبھی تو وہم و خدشات اس کے وجود کی سرحد پار نہ کر پاتے اور اگر کبھی نکلتے تو انہیں کہیں پناہ نہ ملتی اور ناکام ہو کر باہر کی راہ لیتے۔ تیسرا دن شاید اس کے مشاہدے کے امتحان کا دن تھا۔ نہ جانے کون کون سی صورتیں اس نے اپنے ارد گرد دیکھیں کچھ تو ایسی بھی تھیں کہ خارجی دنیا سے ان کا تعلق بالکل بھی نہ تھا۔ شیر، چیتے اور بھیڑیے دانت نکالے نگاہیں جمائے خوفناک آوازیں نکالتے ہوئے اس کی جانب لپکتے اور اس پر جھپٹتے ہوئے محسوس ہوتے۔ اس کے جسم کا رواں رواں کانپ اٹھتا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کا دم نکل گیا ہوتا، خوفناک ترین لمحہ وہ تھا جب دو بھیڑیے لڑتے ہوئے قبر کے ٹوٹے تعویذ سے اڑتے ہوئے اس کے سامنے آن گرے۔ اس جھٹکے سے اسے یوں لگا جیسے اس کا دل اچھل کر اس کے حلق میں آن پھنسا ہو۔ سانس لینے میں دشواری ہوئی تو اس نے اپنے تنفس کو بحال رکھنے کے لیے اسے کافی دیر تک منہ کھول کر لمبی لمبی سانسیں لینا پڑیں۔ بالآخر جیسے تیسے تیسری رات کا عمل بھی پورا ہو گیا۔ امید کی روشنی کچھ اور تیز ہو گئی تھی۔ اگلی رات حشرات الارض اور بلاؤں کی باری تھی۔ سانپ، اژدھے، بچھو اور نہ جانے کیسی کیسی منحوس صورت چیزیں اسے ڈرانے کے لیے لپکتی رہیں، لیکن وہ آنکھیں بند کر کے ان سے نبرد آزما رہا، پھر بھی ان کی خوف ناک آوازیں اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیتیں اور وہ اس ڈر سے آنکھیں کھول دیتا کہ کہیں وہ آنکھیں بند کیے موت کے منہ میں نہ چلا جائے۔ اس لمحے وہ خود کو اس کبوتر کی طرح پاتا تھا جو بلی کو دیکھ کر آنکھ بند کر لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ خطرہ ٹل گیا ہے۔ جس منظر نے اس

رات اس کا دل دہلا یا وہ اس کے قد کے برابر اژدہا تھا جو منہ کھولے پھنکارتا ہوا اس کی جانب لپک رہا تھا۔ خوف سے اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں لیکن وہ زیادہ دیر تک انہیں بند نہ کر سکا۔ آنکھیں کھلنے پر اس نے جو منظر دیکھا وہ اس کے وجود کو کپکپا دینے کے لیے کافی تھا۔ دائرے کے بالکل قریب اژدہا اپنا بڑا سا پھن پھیلائے اسے قہر آلود نظروں سے گھور رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی ان دیکھی طاقت اسے آگے بڑھنے سے روک رہی ہے، ورنہ اس کا بس چلتا تو اسے زندہ نگل جاتا۔ اس نے عمل کی رفتار تیز کر کے بدقت تمام اس رات کا عمل مکمل کیا۔ سارا وقت اژدہا اس کے سامنے موجود رہا۔ قبرستان سے گھر آتے ہوئے بھی اسے یوں لگا جیسے اژدھوں کی پوری ایک ٹیم، خوفناک آوازیں نکالتی، اس کے پیچھے بھاگی چلی آتی ہے۔ ایسے میں درود شریف کا ورد اسے غنیمت لگتا تھا جو اس کے اندر مضبوطی کے اثرات پیدا کر دیا کرتا تھا۔ عمل مکمل کرنے کے بعد سارا سارا دن، وہ رات کے عمل میں گزرنے والے واقعات پر غور کرتا رہتا۔ اس دوران اسے بہت سی باتیں معلوم ہوئیں۔ کچھ عجیب طرح کے انکشافات ہوئے، مثلاً یہ کہ جب کوئی آسیبی حملہ ہوتا تو اس کے ذہن سے یہ بات سرے سے نکل جاتی کہ وہ حصار میں بند ہے اور کوئی بھی چیز اسے توڑ کر اسے نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ جب جب اسے کوئی خوفناک چیز دکھائی دیتی تو اتنی نمایاں ہوتی جیسے دن نکل آیا ہو اور ہر چیز روشن ہو گئی ہو۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے سامنے کوئی بہت بڑی سکرین روشن ہو گئی ہو اور وہ مناظر اس بڑی اسکرین پر دیکھ رہا ہو۔ یہ اسکرین اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہوتی۔ ہر رات مختلف طریقوں سے اسے تنگ کیا جاتا۔ کبھی ارادے کو توڑنے کی کوشش کی جاتی تو کبھی تصور اور تصویر سے خوفزدہ کیا جاتا۔ کبھی خوفناک بلائیں اسے ڈراتیں تو کبھی درندے کاٹ کھانے کو دوڑتے۔ سب سے عجیب بات یہ تھی کہ یہ ساری چیزیں ایک ساتھ نہیں آتی تھیں۔ ہر رات کسی خاص طرز سے اسے ڈرایا دھمکایا جاتا۔ کوئی ہفتہ بھر بعد اس کے اندر یہ اعتماد جڑ پکڑ چکا تھا کہ اسے بس حصار کے اندر رہنا ہے۔ ان سب کو شکست دینے کا یہی پہلا اور آخری گر تھا کہ وہ قدم باہر نہ نکالتا اور مسلسل پڑھائی کرتا رہتا۔ اب اسے یہ پہچان بھی ہو گئی تھی کہ اسے رات کو کس طرح تنگ کیا جائے گا۔ پہلے منظر سے ہی یہ بات روشن دن کی طرح نمایاں ہو جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ اگلی رات اپنی نانی اماں کو تڑپتے ہوئے دیکھ کر اسے یقین ہو گیا تھا کہ آج اسے اندر سے کمزور کیا جانا مقصود ہے۔ اپنی نانی کو دیکھ کر وہ واقعی تڑپ اٹھا تھا۔ زخموں سے چور چور اس کی نانی، پانی کے لیے بلک رہی تھی، مسلسل تڑپ رہی تھی اور وہ سنگدل بنا دائرے کی قید میں بیٹھا رہا۔ کئی بار محسوس ہوا کہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے پُر ہو گئیں ہیں، لیکن خود کو یہ یقین دلاتے ہوئے وہ ڈٹا رہا کہ اس کی نانی اماں کو اس دنیا سے گئے تو دس سال بیت گئے ہیں۔ مرے ہوئے لوگ واپس کب آیا کرتے ہیں؟ اس کے اندر کوئی کہہ رہا تھا "آنکھ بند کر لو اور سکون سے بیٹھے رہو۔ جلدی سے پڑھائی ختم کر لو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا"۔ کچھ ہی دیر بعد ایک اور منظر نے اس کی آنکھیں کھول دیں اس نے اپنے دلبر دوست کو دیکھا جو بہت تیزی سے اس کی جانب بھاگا چلا آ رہا تھا۔ غور کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کا جانی دشمن فتح داد اس کے پیچھے خون آلود تلوار اٹھائے بھاگ رہا ہے۔ لگتا تھا کہ اس کے کئی ایک وار کارگر ثابت ہوئے تھے۔ دلبر کا لباس خون آلود تھا۔ حالت بتاتی تھی کہ اب گرا کہ تب۔ وہ مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ رو رہا تھا۔ مگر دلاور کسی سنگدل کی طرح چپکا بیٹھا رہا۔ یہ تو وہی جانتا تھا کہ اس کے دل پر کیا بیت رہی ہے؟ آخری حملہ اس سے بھی شدید تر تھا۔ اس کی "رانی" ننگے سر، ننگے پاؤں روتی پیٹتی اس کے پاس دوڑی چلی آتی تھی۔ وہ چیخ رہی تھی، سر پیٹ رہی تھی۔ "دلاور خدا کے لیے مجھے تنگ مت کرو، تمہارے اس شیطانی عمل نے میرے اندر آگ بھڑکا دی ہے، میرا سارا وجود جل رہا ہے، میری ماں الگ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ گھر کی دیوار گر پڑی اور وہ اس کے نیچے دب کر شدید زخمی ہو گئی تھی۔ گاؤں والے اسے اٹھا کر اسپتال لے گئے ہیں۔ خدا کے لیے اپنے اس عمل سے باز آ جاؤ۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں، پاؤں پڑتی ہوں.... باز آ جاؤ۔ اچھا میں ہاری تم جیتے۔ مجھے تم سے شادی منظور ہے۔ یہی چاہتے تھے نہ تم........ اب تو عمل چھوڑ دو کہ تمہاری مراد پوری ہوئی۔ تمہارا عمل کامیاب رہا۔ تمہارا وار چل گیا" مگر وہ پتھر بنا اس کی فریادیں سنتا اور مچلتا رہا۔

ڈھیٹ بنا دائرے میں بیٹھا رہا، پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی رانی کے کپڑوں میں آگ لگ گئی اور اس کی چیخوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ خود کو مضبوط کرتے ہوئے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے ذہن میں بس ایک ہی دھن سوار تھی کہ یہ ساری تکلیفیں، سارے دکھ اس وقت دور ہوں گے جب وہ عمل مکمل کرے گا۔ خدا خدا کر کے عمل مکمل ہوا تو اس نے سکھ کا سانس لیا۔ اگلی دو راتیں بھی اس پر بہت بھاری رہیں۔ اندر اور باہر جنگ چھڑی تھی اور اس کا وجود میدان جنگ بنا ہوا تھا۔ خود کو ایک خستہ حال کشتی کی طرح پاتا تھا جو گہرے سمندر میں ادھر سے ادھر چکراتی اور سر پٹختی پھرتی تھی، یہ تو اسی کا حوصلہ اور عزم و ہمت تھی کہ وہ اس کام سے باز نہ آیا تھا اور وہ حصار سے باہر بھی نہیں آیا تھا، اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو کب کا ناکام ہو کر اپنے انجام کو پہنچ چکا ہوتا۔

☆......☆

لیکن یہ احساس صرف چند لمحوں کے لیے پیدا ہوا تھا۔ اوسان بحال ہوئے تو یہ دیکھ کر اسے بے انتہا خوشی ہوئی کہ وہ دائرے کے اندر پڑا ہوا تھا۔ تسبیح اب بھی اس کے ہاتھ میں موجود تھی اور جسم اتنا ہلکا پھلکا ہو گیا تھا جیسے وہ ہوا کا بنا ہوا ہو۔ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرنے لگا کہ وہ بے سدھ ہو کر دائرے کے باہر نہیں گرا ورنہ جانے اس کا اب تک کیا حشر ہو چکا ہوتا؟ اس نے خود کو سنبھالا اور پھر سے خود کو وظیفہ پڑھنے پر مائل کرنے لگا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے بیس بار ورد پڑھا تھا۔ تسبیح پھیرنے کے ساتھ ساتھ وہ دل ہی دل میں تعداد گنتا بھی جاتا تھا۔ آج شاہ صاحب کی یہ ہدایت کام آ گئی تھی۔ اس نے ایک بار پھر خدا کا شکر ادا کیا کہ اس ہدایت پر عمل کے نتیجے میں اس نے اپنے عمل کو ضائع ہونے سے بچا لیا تھا۔ بھول جاتا تو اگلے ماہ پھر سے عمل کا آغاز کرنا پڑتا اور اتنی ہمت کم از کم اب اس میں نہیں تھی کہ یہ سب پھر سے کر پاتا۔ اس نے پھر پڑھائی شروع کر دی۔ آج کا عمل گزشتہ راتوں کی نسبت کچھ زیادہ ہی مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ رہ رہ کر اس کے اندر سے یہی آواز آتی تھی کہ آج کچھ نیا ہونے جا رہا ہے۔ یہ رات اس کو بڑی بھاری پڑے گی۔ اپنے تمام تر منفی خیالات کو جھٹکتا ہوا وہ پوری یکسوئی سے ورد پڑھنے لگا۔ تسبیح کے دانے نیچے کی جانب پھسلتے ہوئے اس کی مٹھی میں گم ہوتے جا رہے تھے۔ جسم پر کبھی بوجھ بڑھتا اور کبھی اچانک کم ہونے لگتا تھا۔ یکایک اسے شدت سے یہ احساس ہوا کہ خاموشی حد درجہ بڑھ گئی ہے۔ ہو نہ ہو یہ کسی طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہو گی۔ وقت کی نبضیں تھم سی گئی تھیں، پھر ایک زوردار دھماکا ہوا اس کے اعصاب جھنجھنا اٹھے۔ یوں لگا جیسے وہ بہرہ ہو گیا ہو۔ ابھی دھماکے کی بازگشت تھمی نہ تھی کہ تیز ہواؤں نے اس کا استقبال کیا۔ اس قدر تیز ہوائیں کہ اسے لگا جیسے اس کا وجود کسی تنکے کی طرح اڑ کر گڑھے سے باہر جا گرے گا۔ وہ خود کو تھام کر بیٹھا رہا۔ توجہ بدستور عمل پر لگی ہوئی تھی۔ آج واقعی اماوس کی نہیں قیامت کی رات تھی۔ عمل تھا کہ طویل سے طویل تر ہوتا جا رہا تھا۔ یہ حملہ بھی ناکام ہوا تو کچھ لمحے سکون سے گزرے، پھر اسے قدموں کی چاپ سنائی دی تو وہ چونک اٹھا۔ قدموں کی آواز برابر آ رہی تھی، اس کے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ چلی گئی۔ وہ جو کوئی بھی تھا، اسی کی سمت بڑھا چلا آ رہا تھا۔ ایک لمحے کیلیے وہ لرز کر رہ گیا۔ ”کہیں یہ قبر میرے لیے چوہادان نہ بن جائے“ ذہن کے کسی تاریک گوشے سے یہ خیال ابھرا تو وہ بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گیا۔ پہلے پہل اس نے اسے اپنا وہم جان کر اس خیال کو جھٹکنا چاہا تھا لیکن کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ آواز اب اور بھی نمایاں ہو چلی تھی۔ غور کیا تو معلوم ہوا آنے والے افراد کم از کم دو ہیں۔ وہ دو آدمی بڑی آہستگی سے اس کی جانب بڑھ رہے تھے، پھر قبر کے کہیں پاس آ کر وہ لوگ رکتے ہوئے محسوس ہوئے۔ قدم رکتے ہی سرگوشیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بڑی دھیمی آواز میں گفتگو جاری تھی۔ غور کرنے پر بھی کوئی لفظ پلے نہ پڑ رہا تھا۔ مکھی کی بھنبھناہٹ جیسی آوازیں اب اتنی واضح ہو گئی تھیں کہ اس نے جان لیا وہ دو لوگ ایک جنس سے متعلق نہ تھے۔ ایک ان میں یقیناً کوئی خاتون تھی۔ وہ گومگو کی کیفیت میں دم سادھے بیٹھا تھا۔ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کا اگلا قدم کیا ہو گا؟ پہلی بار ایک مختلف صورت حال درپیش تھی۔ ایسا پہلے کب ہوا تھا کہ اسے صرف آواز سے ڈرایا جاتا۔ کوئی منظر پر بھی نہیں تھا اور بے چینی تھی کہ دم نکالے دے رہی

تھی۔ اچانک دونوں نے تیز تیز آواز میں بولنا شروع کر دیا۔ شاید ان کا کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا۔ مرد کی آواز کچھ زیادہ نمایاں تھی۔ عورت کا لہجہ کچھ دبا دبا سا تھا۔ اچانک ایک بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔

مرد کو یکا یک غصہ آ گیا۔

"اس نامراد کو کیوں ہوش آ گیا؟ کیا دودھ نہیں پلایا تھا اسے تم نے" مرد تیز آواز میں پوچھ رہا تھا۔

"نن۔ نن۔ نہیں۔ یہ۔ یہ۔ س۔ س...... سو رہا تھا۔ م...... میں جلدی میں پپ۔ پلانا بھول۔ بھول گئی" وہ ہکلائی تھی۔

"پاگل ہو تم بھی، سارے کیے کرائے پر پانی پھیرنا چاہتی ہو۔ کسی نے آواز سن لی تو اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی لے ڈوبو گی۔ بستی والے مار مار کر حلیہ بگاڑ دیں گے ہم دونوں کا۔ پاگل کی بچی تو نے تو اپنے ساتھ مجھے بھی مصیبت میں ڈال دیا۔ میرے سارے منصوبے پر پانی پھیر دیا۔ اب کھڑی میرا منہ کیا دیکھتی ہے۔ جلدی سے برتن سیدھا کر۔ خبردار خون کا ایک قطرہ بھی باہر نہ گرنے پائے۔ ابھی تو اس مٹکے کو کسی پرانی قبر میں دفن بھی کرنا ہے۔ تو آج مجھے مروا کر ہی دم لے گی، جاہل کہیں کی" مرد کا بس چلتا تو وہ اسے نوچ ڈالتا۔ لگتا تھا لڑکے نے جاگ کر اس کا سارا پلان چوپٹ کر ڈالا تھا۔ جبھی تو اس کا غصہ سنبھالے نہ سنبھلتا تھا۔

"خبردار ایک بھی قطرہ باہر گرا تو عمل ناکام ہو جائے گا۔ چھری مجھے پکڑا، برتن زمین پر لگا دے، ہلنے نہ پائے، جلدی کر جلدی" اور اسے یوں لگا جیسے کوئی بارودی سرنگ پھٹی ہو، وہ سمجھ گیا تھا، کوئی عامل کسی عورت کے ساتھ بچے کی قربانی دینے آنکلا ہے۔ الجھن یہ تھی وہ اسے سچ سمجھے یا طلسم۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا، بچے کی چیخیں بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھیں۔ کسی بھی لمحے اس کے گلے پر چھری پھر سکتی تھی۔ وہ ایک دوراہے پر آن کھڑا تھا۔ ایک طرف محبت تھی تو دوسری جانب فرض۔ عمل کو مکمل کرنے میں ابھی دس منٹ اور درکار تھے، لیکن اتنا انتظار بچے کے لیے جان لیوا ثابت ہوتا۔ گویا یہ دو کام ایک ساتھ ممکن نہ تھے۔ اسے محبت یا فرض میں سے کسی ایک کا فوراً انتخاب کرنا تھا۔ اس کے پاس بچے کو بچانے کے لیے گنتی کے چند لمحے رہ گئے تھے۔ اندرونی کشمکش بڑھتی جا رہی تھی۔ سب سے بڑا خطرہ یہ درپیش تھا کہ حصار سے باہر آنے پر بھی وہ شاید بچے کی مدد نہ کر پاتا۔ دائرے سے نکلنے کی سزا اسے ازبر تھی، لیکن اس کے اندر کا دردمند انسان اسے مجبور کر رہا تھا۔

"بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ تمہیں ہر حال میں بچے کو بچانا ہے، دیر مت کرو۔ جلدی کرو۔ جلدی جلدی جلدی" آخر وہ باہر کودنے پر آمادہ ہوا۔ جلدی سے خود پر آیت الکرسی پڑھی اور درود شریف پڑھتے ہوئے حصار سے باہر نکل آیا۔ فضا میں دو چیخیں ایک ساتھ بلند ہوئیں اور خاموشی کا سینہ چیرتی چلی گئیں۔

☆......☆

حصار سے باہر نکلتے ہی دو باتیں ایک ساتھ وقوع پذیر ہوئیں، ایک تو یہ کہ اس کے جسم کو شدید جھٹکا لگا جیسے اس نے کسی طاقتور برقی تار کو اچانک چھو لیا ہو۔ شدید گرمی کے احساس کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ اس کے کپڑوں میں اچانک آگ بھڑک اٹھی، لیکن حیرانگیز طور پر اس آگ نے نہ کپڑے جھلسائے تھے نہ جسم۔ آن کی آن وہ شعلے بجھے تو جلن کا احساس بھی ساتھ لیتے گئے۔ اس نے جان بوجھ کر چیخ ماری تھی تاکہ انہیں اپنی موجودگی کا احساس دلا کر اس دہشت گردی کو روک سکے۔ دوسری چیخ صاف ظاہر ہے بچے کی رہی ہو گی۔ اس شور نے عامل کے حواس مختل کر ڈالے۔ ادھر دلاور کو نہ جانے کیا ہوا تھا کہ یکا یک قبر کے اندر ہی سے زور سے چیخ اٹھا۔

"رک جاؤ۔ رک جاؤ... میں کہتا ہوں رک جاؤ...."

یوں لگا جیسے شیر دھاڑا ہو۔ پھر اسے خود بھی یہ پتا نہ چلا کہ وہ کب چھلانگ لگا کر قبر سے باہر آ گیا تھا۔ باہر دو انسانی ہیولے صاف دکھائی دیے۔ ایک نسوانی وجود زمین پر بیٹھا تھا تو دوسرے کے ہاتھ میں ایک ننھا وجود مچل رہا تھا۔ شدید اندھیرے میں بھی اسے یہ منظر صاف دکھائی دیا۔ اس کی دھاڑ نے ساری گیم الٹ کر رکھ دی۔ عامل کا ہاتھ جس میں چھری دبی تھی، بچے کی گردن پر جیسے جم کر رہ گیا تھا۔ چھری کے دباؤ سے بچے کی چیخ ضرور بلند ہوئی تھی، لیکن وہ بہرحال اب بھی محفوظ تھا۔ اگر چند سیکنڈز کی تاخیر ہو جاتی تو وہ معصوم اپنی زندگی کی بازی ہار جاتا۔ "شکر ہے میرے خدا، تو نے بچے کو بچا لیا"۔ اس کے منہ سے بےساختہ شکر کے کلمات ادا ہوئے۔

☆......☆

"دلاور خان میں تمہیں سرداری کی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہارے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ فتح داد کی باتوں میں آ کر میں نے تمہیں ایک ایسے عمل میں پھنسا دیا جس سے بچ نکلنا شاید کسی کے بس میں نہ تھا۔ جس دن تم دلبر کے ساتھ میرے آستانے پر آئے، فتح داد پہلے ہی سے وہاں موجود تھا۔ اس کے مخبر اسے یہ خبر دے چکے تھے کہ تم ایک لڑکی کے چکر میں ہو۔ اس نے مجھے تمہارے بارے میں طرح طرح کی باتیں بتا کر اس عمل کے لیے راضی کر لیا۔ میں دوستی میں مارا گیا، اسے انکار نہ کر پایا۔ میں نے عمل تو ٹھیک بتایا تھا لیکن ترکیب میں ایک خرابی رکھ چھوڑی تھی۔ تسخیر کے عمل کبھی بھی ڈھلتے چاند کے میں نہیں کیے جاتے، تمہیں ظاہر ہے ان باتوں کا کیوں کر پتا ہوتا؟ سو تم مان گئے۔ میرا منصوبہ یہ تھا کہ دوران عمل تمہیں اتنا ڈرا دیا جائے کہ تم خود ہی اپنے انجام کو پہنچو۔ ڈھلتی تاریخوں میں رجعت کے اثرات بے انتہا بڑھ جاتے ہیں، لیکن آفرین ہے تمہاری ہمت پر کہ تم ڈٹے رہے۔ فتح داد کی بے چینی عروج پر تھی، آخر اس کے بے انتہا مجبور کرنے پر میں نے اماوس کی رات اپنا موکل بھیج کر تم پر ایک شدید وار کیا، لیکن یہ دیکھ کر میں حیرت سے اچھل پڑا کہ تم صاف بچ گئے تھے۔ اس سے بڑھ کر حیرت کی بات یہ تھی کہ موکل نے بھی کانوں کو ہاتھ لگا کر یہ اعلان کیا، کہ تم پر دوبارہ حملہ کرنا اس کے بس میں نہیں۔ تمہیں تمہاری روحانی قوت بچا گئی، جس کا تمہیں خود بھی اندازہ نہیں تھا۔ درود شریف کی کثرت نے تمہیں روحانی قوت سے مالا مال کر رکھا تھا۔ اسی لیے جب بچے کو بچانے کے لیے کڑے سے باہر آئے تو تمہیں پھر بھی کچھ نہ ہوا...... میں نے تم پر سچ واضح کر دیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم مجھے معاف کر دو گے۔ میں تمہاری جی داری کو سلام پیش کرتا ہوں" دلاور نے آگے بڑھ کر شاہ صاحب کو گلے سے لگا لیا تھا۔

☆......☆

دلاور نے راتوں رات اس خاتون کو اس کے گھر پہنچا دیا تھا۔ وہ اسی گاؤں کے ایک معزز شخص کی بیوی تھی۔ اپنے شوہر کو بیٹا نہ دے سکی تو شوہر نے دوسری شادی کر لی۔ اتفاق سے اس نے پہلے ہی سال بیٹے کو جنم دیا تو گھر میں اس کی توقیر اور بڑھ گئی۔ پہلی بیوی سے شوہر کچھ کھچا کھچا سا رہنے لگا۔ وہ یہ سب برداشت نہ کر پائی، پھر اتفاق ایسا ہوا کہ وہ اس جھوٹے عامل کے ہتھے چڑھ گئی۔ جس نے کچھ ایسا جال بچھایا کہ باہر نہ نکل پائی۔ یہ راہ بھی اسی عامل نے دکھائی تھی کہ قتل میں قربانی کے لیے کیوں نہ اس کی سوکن ہی کا بچہ کام آئے۔ ایک تیر سے دو شکار کی یہ راہ اس عورت کو اچھی معلوم ہوئی۔ مشترکہ گھر تھا، سو اس عورت کا داؤ چل گیا۔ اس نے دودھ میں نیند کی گولیاں ملا کر سب کو بے ہوش کیا اور خود اس عامل کے ساتھ قبرستان چلی آئی۔ عامل نے وہاں کچھ اور ہی منصوبہ بنا رکھا تھا۔ وہ اسے بے آبرو کر کے اپنے دام کھرے کرنا چاہتا تھا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ بچے کی آنکھ کھل گئی۔ وہ چونکہ دودھ پلانے سے پہلے سو چکا تھا، سو عورت اسے بے ہوش کرنا بھول گئی۔ اس کی یہی غلطی ان دونوں کی جان بچا گئی۔ دلاور نے ان دونوں کو ان کے گھر پہنچا کر نشہ آور دودھ پلا دیا تاکہ کہانی کو اپنی مرضی کا رنگ دیا جا سکے۔ گھر کے سارے افراد اس وقت بھی بے ہوش ہی تھے، سو دلاور کا منصوبہ کامیاب رہا تھا۔ عورت نے ناک رگڑ کر توبہ کی تو دلاور اسے بچانے پر آمادہ ہوا تھا۔ دل کی بری نہ تھی۔ بس حالات کے ہاتھوں کی ستائی ہوئی تھی، سو اس عامل کے ہتھے چڑھ گئی۔ اس کی عزت بچانا تو بنتا ہی تھا، باقی رہا عامل تو اس کی خوب ٹھکائی کر کے دلاور نے اسے راتوں رات گاؤں سے نکل جانے پر مجبور کر دیا۔ وہ تو خود بھی موقع کی تاک میں تھا، ایسا بھاگا کہ پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔

اب پتا نہیں یہ اس عمل کا اثر تھا یا اس کی کوئی نیکی کام آ گئی کہ اگلے ہی دن کرم داد نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اس کے ہاں آ کر سرداری کی پگ اس کی سر پر رکھ دی تھی۔ فتح داد پیچ و تاب کھانے کے علاوہ کچھ بھی نہ کر پایا۔ کچھ ہی روز میں اس کی "دیدار" بھی اس کی رانی بن کر اس کی دنیا میں آن بسی تو اسے یوں لگا جیسے اس کے رب نے چند ہی دنوں میں اس کی ساری محرومیاں ختم کر دی ہوں۔ اس کا دل اپنے رب کے حضور بے اختیار جھکا جاتا تھا۔ سچ ہے وہ ستر ماؤں سے بڑھ کر پیار کرتا ہے۔ اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔

☆......☆

مکھنی



ارشد علی ارشد

لاعلمی سے خیال اور حقیقت کی قید سے آزاد دوشیزہ کی ایک حیرت انگیز، ناقابلِ فراموش سرگزشت

ایک مافوق الفہم اسرار بھری عجوبہ داستان

قسط نمبر 16

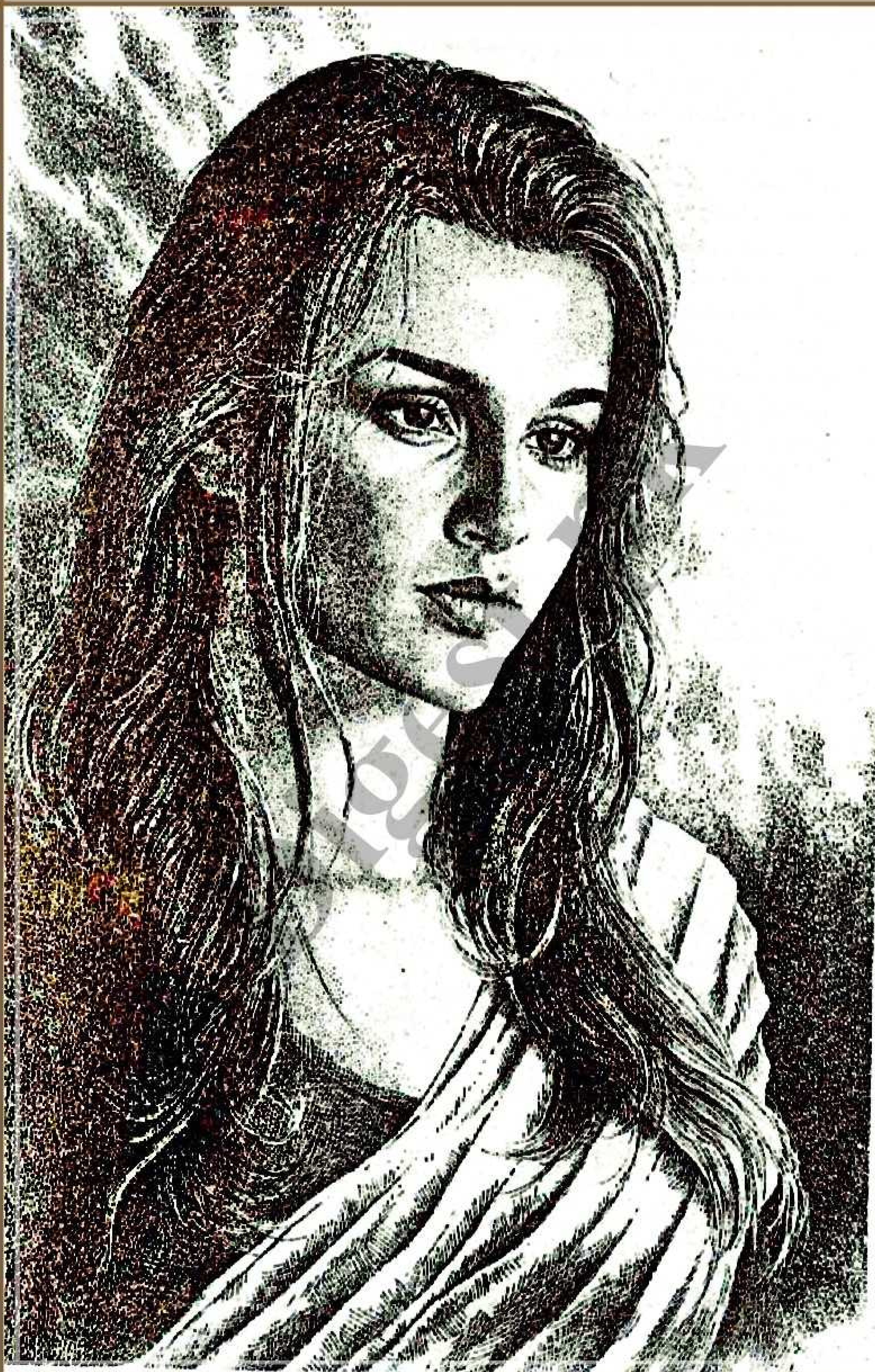
گزشتہ اقساط کا خلاصہ

مکھنی ایک نہایت ذہین و سمجھ دار، اوروں سے مختلف سوچ، خیالات، نظریات اور غیبی طاقت رکھنے والی گاؤں کی ایک لڑکی ہے جو اپنے ماں باپ، دو بھائیوں اظہر اور مظہر، ایک بہن سکھاں اور محبت میں ناکام، غیر شادی شدہ پھپھو ذکیہ کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے۔ سکھاں کو اپنے کالج فیلو سانول سے محبت ہو گئی ہے۔ مکھنی محبت اور عشق کے حوالے سے باتیں کرتے ہوئے اپنی بہن سکھاں کو سفید چونے کی دیوار کو اپنی غیبی طاقت سے پردۂ اسکرین بنا کر ماضی میں مجاہدین اسلام کا ایک لشکر دکھاتی ہے:

محبت اور عشق کی باتیں کرتی، گتھیاں سلجھاتی اور مسلمانوں کے عظیم ماضی و اسلاف کے کارنامے بتاتی اور دکھاتی مکھنی، سکھاں سے وعدہ کرتی ہے کہ وہ سانول سے اس کے رشتے کے سلسلے میں گھر والوں سے بات کرے گی۔ مکھنی کے بھائی اظہر کی دبئی روانگی سے پہلے شادی کر دی جاتی ہے۔ مکھنی اسی دوران میں سانول کے گھر اُس سے ملنے جاتی ہے۔ ایک روز سکھاں کالج سے لوٹ رہی ہوتی ہے تو چوہدری اللہ رکھا کا بیٹا چوہدری راحیل اُسے روک کر پریشان کرتا ہے اور پھر ایک روز جب سکھاں اپنی ماں کے ساتھ جا رہی ہوتی ہے تو چوہدری راحیل دوبارہ وہی حرکت کرتا ہے۔ اس دوران میں سکھاں کا باپ اس کی منگنی فاطمہ خالہ کے دیور سے کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ ایک روز یوں بھی ہوتا ہے کہ چوہدری اللہ رکھا، مکھنی کا راستہ روک لیتا ہے۔ مکھنی اس کو برا بھلا کہتی ہے تو وہ اسے تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہے لیکن مکھنی اس کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے۔ چوہدری اللہ رکھا اپنے کارندوں کے سامنے اس بے عزتی پر مکھنی کو دھمکی دیتا ہے کہ اب میرے حجرے میں تیرا ناچ ہوگا اور پھر ایک روز چوہدری اللہ رکھا کے کارندے مکھنی کو اغوا کر کے اس کی کوٹھری کی شکل میں موجود حجرے میں پہنچا دیتے ہیں۔

چوہدری اللہ رکھا کے حجرے میں مکھنی اس کی خواہشات پوری کرنے کی بجائے موقع ملتے ہی چوہدری اللہ رکھا کی رائفل سے اسے قتل کر دیتی ہے۔ مکھنی کو چوہدری کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا جاتا ہے اور پھر سکھاں تھانے میں آ کر بتاتی ہے کہ چوہدری اللہ رکھا کے بڑے بیٹے چوہدری مشتاق نے اسے پیغام بھیجا ہے کہ اگر سکھاں کے لیے چوہدری راحیل کا رشتہ قبول ہے تو ہم مکھنی کو معافی کے بعد دیت کے قانون سے رہائی دلوا سکتے ہیں۔ اسی دوران میں لیڈی انسپکٹر شبانہ کو مکھنی سے تفتیش کے لیے بلایا جاتا ہے۔ مکھنی اُسے دیوار پر محمد بن قاسم کا نظارہ کر کے دہلا دیتی ہے اور وہ تھانے دار کے گھر تک پہنچ جاتی ہے۔ مکھنی کے معاملات سے خائف ہو کر تھانے دار اُسے لے کر گاؤں آتا ہے جہاں مکھنی کے قاتل ہونے کے گواہ اپنے بیان سے مکر جاتے ہیں۔ مکھنی تھانے دار سے رہائی حاصل کرنے کے بعد اپنے گھر آتی ہے۔

گھر آ کر اسے پتا چلتا ہے کہ اس کا ابا فالج کے باعث چارپائی سے لگ گیا ہے۔ پھر کچھ دن بعد اس کے ابا کا انتقال ہو جاتا



ہے، جبکہ اس کا بھائی سانپ کی موت سے پہلے ہی دفن چلا جاتا ہے۔ اسی دوران میں اس کی شادی بلاول سے ہو جاتی ہے۔

مکھنی اور بلاول نے اپنے بیٹے کا نام معاویہ رکھا ہے، معاویہ چار سال کا ہو گیا ہے لیکن باتیں بہت ذہانت کی کرتا ہے۔

مکھنی کے ساتھ اکثر ایسا ہوتا ہے، کبھی وہ کہیں ہوتی ہے اور پھر غیر محسوس طریقے سے ماورائی قوت کے تحت وہاں سے کوسوں دور جا پہنچتی ہے۔

جب مکھنی کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ خود کو انتہائی آرام دہ بیڈروم میں پاتی ہے۔ کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوتی ہے اور کمرے میں ایک وجیہ نوجوان ادھیڑ عمر کی باوقار سی ایک خاتون اور جینز اور جیکٹ میں ملبوس ایک خوب صورت لڑکی اندر داخل ہوتے ہیں۔

آہستہ آہستہ کمرے میں لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور وہ سب قطار میں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

امن مکھنی سے وہ سارے حالات و واقعات بیان کرتا ہے کہ کس طرح وہ لوگ لاہور میں دریائے راوی کے کنارے موجود تھے اور مکھنی انہیں بے ہوشی کی حالت میں ملی تھی۔ مکھنی امن سے کہتی ہے کہ وہ مسلمان ہے۔ مکھنی کو اپنا شوہر بلاول اور بچہ معاویہ یاد آتا ہے وہ سوچتی ہے خاندان والوں کے بارے میں جاننے کے لیے اس کا لاہور کا سفر ضروری ہے۔ لیکن اس سے پہلے وہ امن کے خاندان کے لوگوں کے دل و قلوب میں اہم پیغام پہنچانا چاہتی تھی اور اس کے لیے وہ اس دن کے انتظار میں تھی جب تمام لوگ خاص اہتمام کے ساتھ اکٹھے ہو کر اس کے روبرو پیش ہوتے تھے اس کے لیے مکھنی کو ایک خالی سفید پیپر چاہیے تھا جب سب لوگ اکٹھے ہو گئے تو مکھنی انہیں ہندو مذہب کے بارے میں سمجھاتی ہے کہ سمجھ نہیں آتا کہ پڑھے لکھے لوگ جانوروں مثلاً گھوڑا، پیپل تلسی وغیرہ کو کیسے مقدس سمجھتے ہیں۔ دنیا کے سارے عقیدے توحید پر مبنی ہیں پھر وہ انہیں اسلام کی بات سمجھاتی ہے اور ان لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتی ہے۔ مکھنی کی بات سے وہاں ہلچل مچ جاتی ہے اور وہ لوگ اس کے مخالف ہو جاتے ہیں، جب امن مکھنی کو گھر چھوڑنے کا کہتا ہے، کیوں کہ وہ لوگ اسے قتل کرنا چاہتے ہیں۔ مکھنی وہاں سے فرار ہو کر نکل نسیم کے گھر پہنچ جاتی ہے۔

نسیم مکھنی کو اس کے گاؤں مہرداد گڑھ چھوڑ آتے ہیں۔ مکھنی کو گاؤں میں کوئی نہیں پہچانتا وہ اپنے گھر پہنچتی ہے تو وہاں تالا لگا ہوا تھا۔ مکھنی یہ دیکھ کر پریشان ہو جاتی ہے، جب وہ پڑوس میں رہنے والے فردوس چاچا سے ان کے متعلق پوچھتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ مکھنی وہی کو چوہدریوں نے اٹھا لیا تھا۔ رحیم اللہ کا بیٹا بھی اس کی طرح غیرت مند تھا، اس نے چوہدری کے گھر میں گھس کر اسے مار ڈالا خود تو پنڈی جیل میں ہے اور گھر والوں کو راتوں رات پتا نہیں کہاں بھیج دیا۔ یہ سن کر مکھنی رو پڑتی ہے اور وہاں سے چل پڑتی ہے۔ راستے میں وہ سانول کے کھیتوں کے قریب ٹھوکر کھا کر گر جاتی ہے۔ سانول جیسے ہی اسے اٹھانے کے لیے آگے بڑھتا ہے۔ مکھنی کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ سانول مکھنی کو اپنے گھر لے جاتا ہے، سانول کا باپ مکھنی کو گھر سے نکل جانے کو کہتا ہے کہ کہیں اس کی وجہ سے کوئی مصیبت ان پر نہ آ جائے۔ سانول مکھنی کو روکنے کی کوشش کرتا ہے مگر مکھنی انکار کر دیتی ہے اور اپنے گھر پہنچ جاتی ہے۔

مکھنی کو نیند میں احساس ہوتا ہے کہ گھر کا دروازہ بری طرح پیٹا جا رہا ہے۔ وہ بھاگ کر کمرے سے باہر نکل آتی ہے اور سمجھ جاتی ہے کہ مہرداد گڑھ والوں کو اس کے لوٹ کے آنے کی اطلاع مل چکی ہے۔ گاؤں کے لوگ دروازہ توڑ کر گھر میں داخل ہو جاتے ہیں اور مکھنی کو گھیر لیتے ہیں۔ وہ تمام لوگ مکھنی کے دیکھے بھالے تھے، مگر اس وقت ان کے چہروں پر اجنبیت اور سفاکی تھی۔ وہ لوگ اس سے کہتے ہیں کہ تو یہاں کیوں آئی ہے؟ تیری وجہ سے کتنے گھر تباہ ہو گئے۔ وہ کہتے ہیں کہ بہتر یہی ہے کہ اسے دھکے دے کر مہرداد گڑھ سے باہر نکال دیا جائے۔ مکھنی کا دل لوگوں کی باتیں سن کر لہولہان کر رہا تھا، مگر وہ جانتی تھی کہ اس وقت چپ رہنا ہی دانشمندی تھی۔

مکھنی پر بے تحاشا تشدد کیا جاتا ہے مگر اس نے زبان پر چپ کا تالا لگایا ہوا تھا۔ اسی وقت چوہدری مشتاق وہاں پہنچ جاتا ہے۔ وہ مکھنی کو دیکھ کر خوش ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ آج تو مہرداد گڑھ کے بھاگ جاگ اٹھے ہیں، یہاں رحیم اللہ ترکمان کی وہی مکھنی آ گئی ہے۔

چوہدری کے ارادے اور تیور دیکھ کر مکھنی خوف زدہ ہو جاتی ہے۔ مکھنی کو رسیوں سے باندھ کر گھوڑے کے ساتھ دوڑایا جاتا ہے۔

مکھنی زمین پر گھسیٹے جانے سے بری طرح زخمی ہو جاتی ہے۔ اچانک رسی ٹوٹ جاتی ہے اور مکھنی قلابازیاں کھاتی ہوئی بے ہوش ہو جاتی ہے۔

مکھنی کو جب ہوش آتا ہے تو وہ ایک جنگل میں ہوتی ہے۔ وہ ہمت کر کے اٹھتی ہے اور ایک سمت چلنے لگتی ہے۔ جب وہ کچھ لوگوں کو کنواں کھودتے ہوئے دیکھتی ہے۔ پانی نکل آنے پر وہ لوگ خوش ہو رہے تھے۔ اچانک مکھنی کے ذہن میں خیال آتا ہے کہ وہ پانی زہر آلود ہے۔ وہ ہانپتی کانپتی وہاں پہنچتی ہے اور لوگوں سے کہتی ہے کہ یہ پانی زہر آلود ہے، لوگ اس کی بات پر یقین نہیں کرتے۔ مکھنی کے کہنے پر جب وہ پانی جانوروں کو پلایا جاتا ہے تو وہ ہلاک ہو جاتے ہیں۔ لوگ مکھنی کے شکر گزار ہوتے، مکھنی ایک جگہ کی نشاندہی کرتی ہے کہ یہاں کنواں کھودو، یہ مٹی نرم ہے اس کا پانی بھی ٹھنڈا اور میٹھا ہوگا۔ مکھنی کا دل مطمئن تھا وہ سوچتی ہے کہ یہ جو میں ایک جگہ سے دوسری جگہ بلا روک ٹوک پہنچ رہی ہوں، یہ اللہ تعالیٰ کی منشا ہے۔ حالات جس نہج پر لے چلیں چلنا ہوگا۔ تب مکھنی

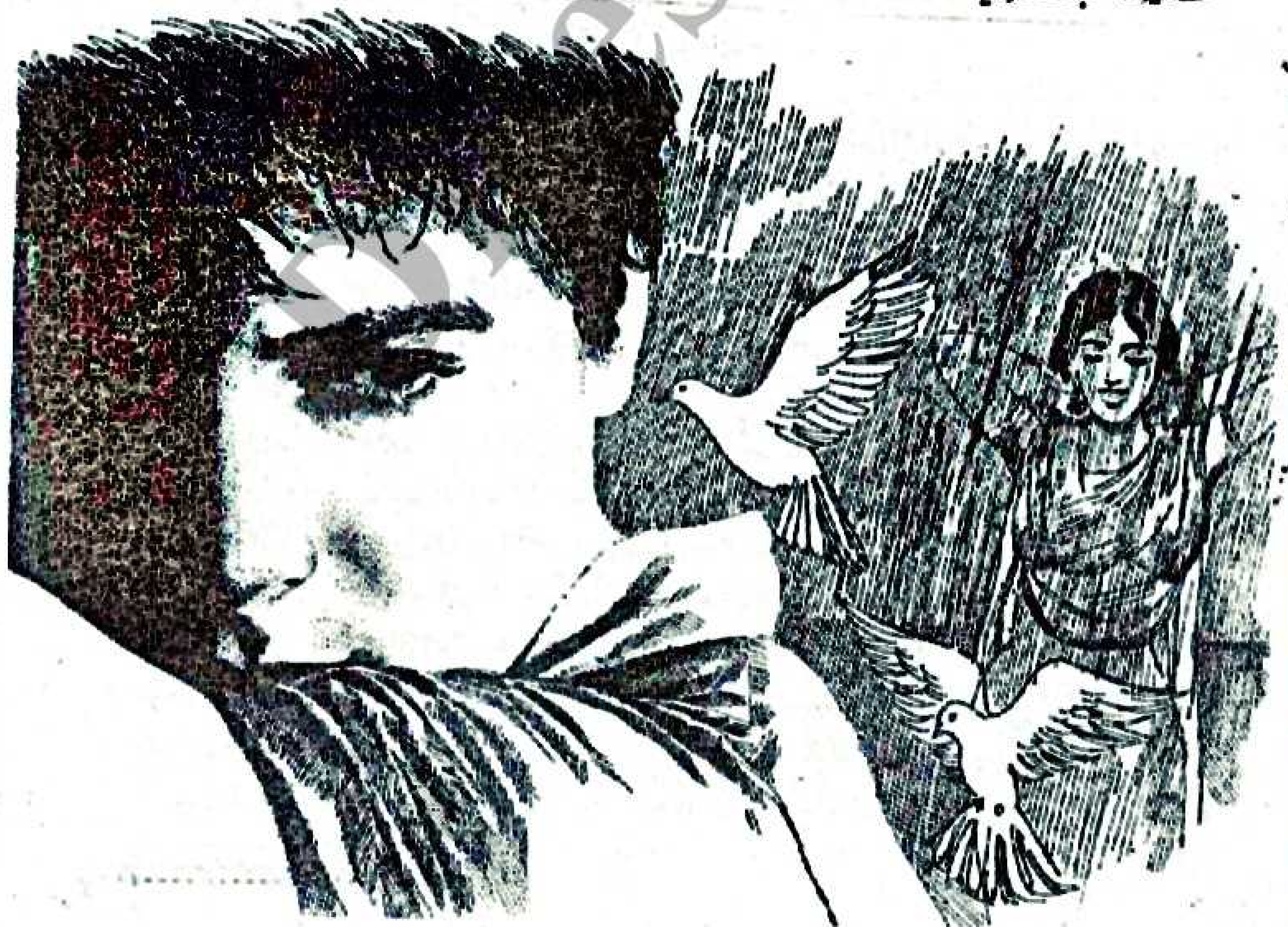
کا ذہن حسب بھرتا ہے اور عکسی پیر سید مہر علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر واقع گولڑہ شریف میں خود کو موجود پاتی ہے۔

(اور اب آگے پڑھیے)

"جی جی ضرور۔" سب نے یک زبان کہا۔ ان کی پراشتیاق نگاہیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔ پتا نہیں کیوں مجھے یہ احساس نہیں تھا کہ میں غیر مردوں کے سامنے بیٹھی ہوئی ہوں اور ان کی توجہ کا مرکز بھی ہوں۔ میں نے لوگوں سے کہا۔ میں آپ لوگوں کو کچھ بتانا چاہتی ہوں، میری باتوں پر توجہ دینا اور سمجھنے کی کوشش کرنا۔

آپ میں سے کوئی شخص حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے بارے میں کچھ جانتا ہے، میرے سوال پر باہم کھسر پھسر ضرور ہوئی مگر مجھے کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔

نامور بزرگ، امداد اللہ مہاجر مکیؒ نانوتہ ضلع سہارنپور میں یکم جنوری 1818ء میں پیدا ہوئے اور 19 اکتوبر 1899ء میں وفات پائی۔ مولانا رحمت اللہ کی قبر کے ساتھ جنت المعلیٰ سعودی عرب میں مدفون ہیں، آپ کا تاریخی نام ظفر احمد ہے، والد گرامی نے امداد حسین نام رکھا تھا۔ امداد اللہ کے نام سے مولانا محمد اسحاق محدث دہلوی نے نوازا تھا۔ علوم میں آپ نے چند مختصرات فارسی اور کچھ صرف و نحو کی تحصیل کی۔ مولانا محمد قلندری محدث جلال آبادی سے تقریباً ایک ربع مشکوٰۃ شریف اور مولانا عبدالرحیم نانوتوی سے حصن حصین اور فقہ اکبر پڑھیں۔ حضرت میاں جیوؒ کی خدمت میں رہتے ہوئے ریاضت و مجاہدہ کے بعد سلوک کی تکمیل کی اور خلافت عطا ہوئی۔ 1859ء میں آپ مستقلاً سعودی عرب چلے گئے۔ مکہ مکرمہ میں زندگی کے باقی 41 سال بسر کیے۔ مکہ شریف میں اس دور میں بہت سے قابل قدر مشائخ مقیم تھے، مگر امداد اللہ مہاجر مکیؒ کو ان سب سے نمایاں مقام حاصل تھا۔ فیوض باطنی کے لیے بہت سے مشائخ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ جب پیر مہر علی شاہؒ حج کے لیے مکہ مکرمہ گئے تو وہ بھی حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ میں نے تھوڑا سا توقف کیا۔ چند لوگوں کو آخری بات پر چونکتے دیکھا۔ میں نے دوبارہ کہا۔ "جی ہاں خواجہ پیر مہر علی شاہؒ نہ صرف حاجی امدادؒ کے ہاتھ بیعت ہیں، بلکہ پیر صاحبؒ نے مکہ مکرمہ میں مستقل رہنے کی خواہش بھی ظاہر کی تھی، مگر امداد اللہ مہاجر مکیؒ نے پیر صاحب سے فرمایا۔



"ہندوستان میں عنقریب ایک فتنہ اٹھنے والا ہے۔ یہ فتنہ بہت پرزور ہوگا۔ اس کا قلع قمع کرنے کے لیے آپ کا ہندوستان میں ہونا ضروری ہے۔ آپ وہاں خاموش بیٹھے رہیں۔ آپ کی موجودگی ہی ان کے لیے ڈر اور خوف کا باعث بنے گی۔"

حاجی امداد اللہ، پیر مہر علی شاہؒ کے مرشد تھے۔ انہوں نے پیر صاحب کو سلسلہ چشتیہ صابریہ میں اجازت سے نوازا تھا۔ پیر مہر علی شاہ نے حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے کشف سے تعبیر کیا۔

قادیانی فتنے کو انگریزوں کی حمایت حاصل تھی۔ وہ اسلام کے خلاف نت نئی سازشیں بننے لگے۔ مرزا غلام احمد قادیانی اس وقت زور شور سے ثابت کرنے کے جتن میں تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام وفات پا چکے ہیں اور کشمیر میں ان کی قبر بھی موجود ہے۔ 1849ء میں پیر مہر علی شاہؒ نے بھرپور دلائل کے ساتھ حیات مسیح پر ایک کتاب شمس الھدایہ لکھی۔ کتاب نے مرزا قادیانی کے حضرت عیسیٰ السلام کے بارے میں بیہودہ دلائل کو مکمل طور پر تہس نہس کر دیا۔

مرزا قادیانی نے پیر صاحب کو مناظرے کا چیلنج دیا جسے پیر صاحبؒ نے بخوشی قبول کیا۔ اگست 1900ء میں چند دوسرے علماء اور اپنے رفقاء کے ساتھ مقررہ مقام پر پہنچ گئے۔ جھوٹے مرزا قادیانی کو اپنی شکست فاش کا بخوبی علم تھا اس لیے سامنے آنے کی جرأت نہ کر سکا اور لاہور بادشاہی مسجد کا میدان خالی رہا۔ جھوٹے مرزا قادیانی نے 1900ء کے آخر میں تفسیر اعجاز المسیح کے نام سے عربی زبان میں سورۃ فاتحہ کی تفسیر لکھ کر بیہودہ دعویٰ کیا کہ یہ الہامی ہے۔ جواباً دو سال بعد پیر مہر علی شاہ نے مرزا کی جھوٹی الہامی تفسیر کا جواب سیف چشتیائی لکھ دیا۔ اس میں پیر صاحب نے مرزا کی عربی دانی کی قلعی کھول دی اور ان عبارات کی بھی نشاندہی کی جو مرزا نے مختلف قدیم عربی کتابوں سے نقل کی تھی۔ میں نے تھوڑا سا توقف کیا اور چند لمبے سانس لیے۔ مجمع میں سے آواز آئی۔

واہ بیٹی واہ۔ تو ایسے بول رہی جیسے تیسرے دماغ میں کوئی مشین فٹ ہے اور اس اقدس میں پیر مہر علی شاہؒ کے حالات زندگی محفوظ ہیں۔ میں نے جواباً کہا۔

آپ لوگوں سے یہی استدعا ہے، دیکھا دیکھی وہ کام نہ کریں جن کا اسلام سے دور دور کا واسطہ نہیں۔ جو کچھ یہاں ہو رہا ہے یہ پیر مہر علی شاہؒ کی تعلیمات کے منافی ہے۔ پیر صاحب سے محبت کا حق یہ ہے کہ ان کی تعلیمات پر عمل کیا جائے۔ ان کی حالات زندگی پڑھیے اور ان کی کتب سے سیکھنے کی کوشش کریں۔

"کیا آپ ہمیں ان کی لکھی ہوئی کتابوں کے نام بتا سکتی ہیں۔"

کیوں نہیں۔ چند کتب کے نام مجھے ضرور یاد ہیں۔ الفتوحات الصمدیہ، تحقیق الحق فی کلمۃ الحق، شمس الھدایہ، سیف چشتیائی، تصفیہ مابین سنی وشیعہ۔ کچھ مزید بلند پایہ کتب بھی ہیں مگر فی الفور مجھے ان کے نام یاد نہیں آرہے۔

آپ لوگوں کو اندازہ ہے میں نے یہ اتنی لمبی تمہید کیوں کر باندھی ہے۔

جی ہاں آپ کا مقصد ہمیں پیر مہر علی شاہؒ کے حالات زندگی سے آگاہی دینا ہے۔

اس کے علاوہ بھی میرا ایک مقصد ہے، یہ انتہائی اہم مقصد میں آپ لوگوں کے دل و دماغ میں راسخ کرنا چاہتی ہوں۔

"اہم مقصد؟"

"جی ہاں۔" مگر ہاتھ جوڑ کر ایک التماس کرتی ہوں۔ میری باتیں سن کر بیخ پا نہ ہونا، بلکہ ان پر غور و خوض اور فکر کرنا۔ میری بات سن کر لوگوں نے ایک بار پھر باہم کھسر پھسر کی اور پہلے کی طرح چپ سادھ لی۔ میں نے کہا دو اہم شخصیات کے بارے میں مختصراً بات کرتی ہوں، تاکہ میرا مقصد پورے سیاق و سباق کے ساتھ آپ لوگ سمجھ سکیں برصغیر کے ایک عہد ساز خطیب، بے باک اور نڈر مجاہد، قافلہ آزادی کے عظیم رہنما سید عطا اللہ شاہ بخاریؒ ہیں۔ شاہ صاحب کو امیر شریعت کا خطاب بھی دیا گیا۔ آپؒ 1891ء میں پٹنہ بھارت میں پیدا ہوئے اور 21 اگست 1961ء میں ملتان میں وفات پائی۔ سید عطا اللہ شاہ بخاریؒ کے ہاتھ پر کئی بڑے علماء نے بیعتِ جہاد کیا تھا۔ آپؒ نے انگریز اور ان کے آشیرباد پر پلنے والے قادیانیوں کی تمام سازشوں کا شیرازہ بکھیر دیا تھا۔ ایسے غضب کے خطیب تھے کہ جہاں تقریر کرنے پہنچ جاتے وہاں کسی اور خطیب کی جرأت نہ ہوتی کہ وہ تقریر کر سکے۔ سید صاحبؒ کی دہشت سے انگریز اور ان کے حاری قادیانی تھر تھر کانپتے

تھے۔ سید صاحبؒ کو انگریز سرکار سے بغاوت پر متعدد بار قید با مشقت کاٹنا پڑی، مگر جیل کی سلاخیں انہیں اپنے مشن سے باز نہ رکھ سکیں۔ سید صاحبؒ اُس دور کے سب سے بڑے خطیب تھے۔ فصیح و بلیغ دماغ اور ولولہ انگیز تقاریر سے بلند پایہ شہرت پائی تھی۔ کھدر کا کپڑا بکثرت پہنتے تھے۔ یہ کپڑا ایسے مقبول عام ہوا کہ کپڑے کا نام بخاری کھدر پڑ گیا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے 1915 میں اپنی روحانی تربیت کے لیے پیر مہر علی شاہؒ کے ہاتھ بیعت کی تھی۔

حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نقشبندی، چشتی۔ قادری اور سہروردی چاروں سلسلوں سے منسلک تھے۔ حاجی صاحبؒ کے ہاتھ پیر مہر علی شاہؒ اور مولانا قاسم نانوتویؒ بیعت ہیں۔ اسی طرح پیر شریعت سید عطا اللہ شاہ بخاری دارالعلوم دیوبند سے متاثر ہیں، مگر پیر مہر علی شاہ صاحبؒ کے ہاتھ بیعت ہیں۔ آپ لوگ مجھے جواب دیجیے، جن کے پیر و مرشد ایک ہوں، ان کی سوچ اور تعلیمات کیسے جدا جدا ہو سکتی ہیں؟

بی بی آپ کا مقصد ہمیں سمجھ نہیں آیا۔ ایک شخص نے کہا۔ اس کی بات پوری ہوئی تو دوسرا بولا۔

''آپ کیا کہنا چاہتی ہیں۔''

میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ ہمارے اکابر اوپر سے ایک تھے، وہ ایک ہی پیر و مرشد کے ہاتھ بیعت تھے۔ تو آج ہم کیوں بٹے ہوئے ہیں۔ ہم دھڑوں میں میں منقسم کیوں ہیں۔ ہم اس قدر ایک دوسرے سے دور ہیں کہ ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے روادار نہیں ہوتے۔ ایک مسلک والا دوسرے کی مسجد میں نماز ادا نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ ایک دوسرے کے گھر میں رشتے نہیں کرتے۔ آج کے چند مفاد پرست مولوی اللہ کے گھر میں منبر رسول ﷺ پر بیٹھ کر دوسرے مسلک والوں کو گالیاں دیتے ہیں۔ فرقہ وارانہ جذبات کو ہوا دیتے ہیں اور اپنے نام کی دکان چمکاتے ہیں۔ یہ علماء سُو ہیں۔ جن کی پہچان ہمیں کرنی ہے، میں دعویٰ سے کہتی ہیں۔ الفاظ کے ایسے ماہر مولویوں کے جلسوں میں جذباتی تقریر سننے والے مجمع میں سے آدھے سے زیادہ لوگوں کو نماز جنازہ، غسل کے فرائض، ایمان مفصل اور ایمان مجمل کا پتا نہیں ہوتا۔ بجائے ہم اسلام کی بنیادی باتیں سیکھنے کے منفی پہلو پر تقاریر سنتے ہیں اور دل کے اندھے لوگ ایسے مولویوں کے لیے زندہ باد کے نعرے لگے پھاڑ پھاڑ کر لگاتے ہیں۔

افسوس صد افسوس کی بات ہے کہ جو مولوی حضرات حق اور سچ کی بات بتاتے ہیں، لوگ ان سے دور بھاگتے ہیں۔

''میں آپ لوگوں کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں، خدا اسلام کو سمجھیے اور پہچانیے۔'' میری بات مکمل ہو چکی تھی، مجھ پر سکتے کی کیفیت تھی، میں خاموشی سے اُٹھ کر باہر نکل آئی۔ وہاں سے چلتے ہوئے مجھے اللہ تعالیٰ کا پاک کلام یاد آنے لگا تھا۔

''اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور تفرقے میں نہ پڑو۔''

☆......☆

میں شکستہ دل اور مضمحل قدموں سے چل رہی تھی، ایک انجان سی اُداسی دل میں بھر گئی تھی، حالاں کہ یہ بارونق راستہ تھا۔ لوگ جوق در جوق پیر مہر علی شاہؒ کے مزار کی طرف جا رہے تھے، واپس پلٹنے والوں کی تعداد بھی سیکڑوں میں تھی۔ میرے ذہن پر وہاں کے مناظر بوجھ ڈال رہے تھے۔ مجھے انتہائی افسوس ہو رہا تھا، ہم نے آج تک نہ اسلام کو سمجھا نہ اپنے اکابر اور نہ ہی ان کی تعلیمات کو...... میں سوچ جاری تھی، یہ کس قبیل کے لوگ ہیں، چراغ راہ کو داغ دار کرنے پر کمر بستہ ہیں۔ میری سوچوں کی لڑی لوگوں کے شور کے سبب ٹوٹی، میں نے چونک کر دیکھا۔

یہاں راستے میں ایک موڑ تھا جس کی وجہ سے یہاں لوگوں کی کافی بھیڑ تھی۔ میں نے شور کا منبع سمجھنے کی کوشش کے لیے ادھر اُدھر دیکھا۔ موڑ سے تھوڑا پہلے ایک شخص گھٹنوں میں سر دبائے خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ قریب سے گزرنے والے ایک من چلے نوجوان نے چلتے ہوئے اس کے سر کے بال کھینچ لیے تھے، اس کا یہ فعل اس کے لیے از راہِ مذاق تھا۔ اس کی یہ حرکت ایک دوسرے شخص نے دیکھ لی تھی، وہ نوجوان کو ڈانٹتے ہوئے بولا۔

''کیا کر رہے ہو۔ تمہیں شرم نہیں آتی ایک فقیر کو چھیڑتے ہو۔''

فقیر کو چھیڑ رہے تھے تمہیں تو کچھ نہیں کہا۔ جواباً نوجوان نے ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا۔ تم کیوں سیخ پا ہو رہے ہو۔ اس لیے کہ تم پیر مہر علی شاہؒ کے مزار پر جا رہے ہو۔ مزار پر جانے والوں کو ایسی اوچھی حرکت زیب نہیں دیتی۔

"اوئے بڑے میاں اپنا راستہ ناپو۔" نوجوان اس کے سامنے سرتن کر کھڑا ہو گیا۔ ان کی نوک جھونک سن کر بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح میں بھی رُک گئی۔ لوگوں میں سے ایک توانا جسم کا مالک شخص نوجوان کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"تمہیں بڑوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں۔ وہ ٹھیک کہہ رہے ہیں، تم یہاں مزار پر آئے ہو یا تماشا کرنے۔"

"تماشا میں نہیں تم لوگ کر رہے ہو۔ میں نے کیا کیا ہے۔ چلتے ہوئے ایک کوڑھ زدہ شخص کو ہاتھ لگا دیا بس......"

نوجوان کا لہجہ بھی تلخی سے پُر تھا۔ وہ ہار ماننے والا نہیں تھا۔ میں اس کی بات سن کر چونک پڑی۔

"کوڑھ زدہ شخص۔"

میں نے اس شخص کو دیکھنا چاہا جسے نوجوان نے چھوا تھا، مگر لوگوں کی بھیڑ میں دیکھ نہ سکی۔ وہ لوگوں کے عقب میں بیٹھا ہوا تھا۔ نوجوان کے ساتھ لوگوں کی تُو تُو میں میں جاری تھی۔ قریب تھا کہ نوبت ہاتھا پائی تک چلی آتی چند بڑی عمر کے لوگوں نے بیچ بچاؤ کراتے ہوئے معاملہ رفع دفع کر دیا۔ لڑکے نے زمین پر زور سے پیر پٹخا اور کچھ بڑبڑاتے ہوئے چل پڑا۔

لوگ منتشر ہونے لگے۔ رش چھٹا تو میں نے اُس طرف دیکھا۔ وہ شخص اپنی سابقہ پوزیشن میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے کپڑے پھٹے پرانے اور میلے کچیلے تھے۔ وہ جس انداز میں بیٹھا ہوا تھا اس سے اس کا چہرہ چھپ گیا تھا۔ سر کے بال گرد آلود تھے۔ ہاتھوں اور پاؤں پر مٹی جمی ہوئی تھی۔ اس کی خستہ حالی بتا رہی تھی کہ کئی دنوں سے نہ تو وہ نہایا ہے اور نہ ہی کپڑے بدلے ہیں۔ وہ وقفے وقفے سے کبھی دائیں اور کبھی بائیں ہاتھ سے جسم کھجلا رہا تھا۔ یقیناً اسے کھجلی کی بیماری بھی تھی۔ میں راستے کے اس جانب کھڑی ہوئی تھی، جبکہ وہ دوسری جانب موجود تھا۔ میں چند ساعتیں اسے دیکھتی رہی اور سوچتی رہی کہ اس کے پاس جاؤں یا نہیں۔ ہمارے درمیان لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ کوئی بھی اس کی طرف توجہ نہیں دے رہا تھا۔ میں ہچکچاہٹ کا شکار تھی، تاہم ضمیر کے ملامت کرنے پر اس کے پاس چلی گئی۔ اسے میری موجودگی کا قطعاً کوئی احساس نہیں ہوا، لیکن جسم کھجانے کے لیے جب اس نے ہاتھوں کو حرکت دی اور سر اوپر اٹھایا تو میں کانپ اٹھی۔

میں نے پہلے دھیان نہیں دیا تھا۔ اب چہرہ دیکھ کر نوجوان کی بات کی تصدیق ہو گئی تھی۔ اسے واقعی کوڑھ (جذام) لگا ہوا تھا۔ جذام سے اس کے ہاتھ، پاؤں اور چہرہ بری طرح متاثر ہوئے تھے۔ کوڑھ اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ زخموں سے سفید پانی ٹپک رہا تھا۔ اس کے بار بار کھجلی کرنے سے میں سمجھ گئی وہ دوہرے عذاب کا شکار ہے۔ کوڑھ میں کھاج بندے کو دردناک عذاب دیتا ہے۔ میں اس کے سامنے ایک میٹر کے فاصلے سے بیٹھ گئی۔ اس نے میری طرف درد بھری آنکھوں سے دیکھا۔ ہماری نظروں کا ٹکراؤ ہوا تو ہم دونوں ہی چونک پڑے۔ جیسے مجھے اس شخص کو یہاں اس حالت میں دیکھ کر حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا، ویسے ہی اسے میری موجودگی حیران کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی سانسوں کے اُتار چڑھاؤ میں تیزی آ گئی تھی۔ میں خود اسے دیکھ کر اپنی جگہ ساکت و جامد رہ گئی تھی۔ میں نے محسوس کیا مجھ پر ہلکی سی کپکپی طاری تھی۔ میرا ذہن تیز مدار میں چکرا رہا تھا۔

کچھ کہنے کے لیے اس کے لب تھرتھرا رہے تھے۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر کہہ نہیں پایا۔ اس کے بھیانک چہرے پر اذیت کے آثار بڑھ گئے تھے۔ میں نے قابلِ رحم نظروں سے اسے دیکھا۔ میرا دل اندر سے کانپ اُٹھا۔

میرے اللہ یہ کتنی بڑی اذیت میں مبتلا ہے، میں نے تاسف سے اسے دیکھا۔ اب کی بار اس کی سرخ آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے چمکنے لگے تھے۔ چند منٹوں کے قلیل عرصے میں، میں سمجھ گئی وہ اس وقت انتہائی دردناک عذاب سے گزر رہا ہے۔ درد اپنے تلفظ میں بھی عجیب ہے، اسے سیدھا لکھا جائے یا الٹا درد، درد ہی رہتا ہے۔ جو لفظ میں اتنا عجیب ہے وہ کسی ذی روح پر حملہ آور ہو تو اس کی تکلیف کا اندازہ ماسوائے مدعی کے کوئی دوسرا شخص نہیں لگا سکتا۔ اس نے حتی الوسع کوشش سے میرے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ انداز معافی مانگنے والا تھا۔ میں نے ایک سرد آہ کھینچی۔

وہ اس وقت انتہائی قابلِ رحم حالت میں تھا۔ میں نے تسلی دینے کی غرض سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھنا چاہا، مگر قریب کھڑے ہوئے شخص نے سختی سے منع کرتے ہوئے کہا۔

"کیا کر رہی ہو۔ پاگل تو نہیں ہو، لوگ اس سے دور بھاگتے ہیں۔ اسے پانی تک دینا گوارہ نہیں کرتے اور تم اسے

چھوڑ ہی دو۔ اسے چھوت کا مرض ہے، یہ تمہیں بھی ساتھ لے ڈوبے گا۔" میرا بڑھتا ہوا ہاتھ بے اختیار رک گیا۔ جس شخص نے مجھے روکا تھا، اس کی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی۔ چہرے پر سفید داڑھی، سر پر ٹوپی اور ہاتھ میں تسبیح تھی۔

"بابا! میں اسے..... مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کہوں۔" تھوڑے سے توقف کے بعد میں نے پوچھا۔

"یہ شخص یہاں کب آیا۔"

"ہم اسے پچھلے ایک ہفتہ سے دیکھ رہے ہیں۔ پتا نہیں کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ متعدد بار اسے کئی لوگ کہہ چکے ہیں یہاں شاہ صاحب کا مزار ہے۔ چلے جاؤ اللہ کرم کرے گا، لیکن یہ وہاں جاتا ہی نہیں یا پھر شاید جا نہیں پاتا۔"

"آپ کی آخری بات سمجھ میں آتی ہے۔" میں نے تاسف سے کہا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ اسے چند بندے اٹھا کر وہاں تک لے جائیں۔ میں نے تجویز پیش کرتے ہوئے کہا۔

"کیا کہہ رہی ہو تم۔ دیکھتی نہیں ہو اسے کوڑھ لگا ہوا ہے۔ تم تو اس کے قریب بیٹھ گئی ہو، لوگ اس سے دور بھاگتے ہیں۔ اس کے قریب سے گزرنا بھی گوارا نہیں کرتے چہ جائے کہ اسے اٹھا کر مزار پر لے جائیں۔ ذرا لوگوں کا مشاہدہ تو کرو۔" اس کی بات سن کر کوڑھ زدہ شخص کے پرتپش تنفس میں تیزی آ گئی تھی۔ میں نے نوٹ کیا بڑی عمر کے شخص بھی تفصیل بتاتے ہوئے کافی دور ہٹ کے کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"بابا مجھے ایک پانی کا بھرا ہوا کٹورا مل سکتا ہے۔"

"پانی کا بھرا ہوا کٹورا" اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا، پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "وہ کیا کرنا ہے۔"

"پانی ہر دم کرنا ہے۔" میری بات سن کر اس نے تعجب سے مجھے دیکھا۔

"تم دم کرو گی۔" اب بار اس کی حیرت میں کئی گنا اضافہ ہو چکا تھا۔

"جی ہاں تا کہ یہ پانی اس شخص کو پلایا جائے اور اس کے زخموں کو دھویا جائے۔" وہ بدستور مجھے حیران نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے بڑے میاں سے پوچھا۔

"اس میں اتنی حیران ہونے والی کون سی بات ہے۔" میرے سوال پر وہ جز بز ہو گیا۔ جلدی سے بولا۔

"نہیں۔ نہیں ایسی کوئی بات نہیں، میں جاتا ہوں۔" وہ عجلت میں جانے لگا تو میں نے کہا۔

"پانی مزار سے لائیے گا۔" میری بات سن کر چند لمحے وہ ٹھٹکا اور پھر چل پڑا۔

بڑے میاں کے علاوہ کسی دوسرے شخص نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی، حالاں کہ ہر آنے والا شخص ایک نظر ہماری طرف دیکھتا ضرور تھا۔ میرے ذہن میں خیال آیا کہ کیوں نہ ہم مزار کی طرف چلیں، راستے میں جہاں پانی والا شخص مل گیا وہیں بیٹھ کر پانی پر دم کر لوں گی، میں نے کوڑھ زدہ شخص کو اپنا مدعا بتایا۔ وہ سن کر بولا۔

"میں وانا تاتا ہوں پل وا نہیں پاتا۔ (میں جانا چاہتا ہوں پر جا نہیں پاتا)" ان کی بات سن کر مجھے دھچکا لگا۔

"اس کی زبان کو کیا ہوا؟ یہ تو تلا پن کیسے آیا؟" میں نے پریشان نظروں سے اسے دیکھا۔ پھر میں نے سوچا شاید زخموں کی تکلیف کے باعث وہ ٹھیک طور سے بول نہیں پا رہا ہے۔ میں نے کہا۔ "چلیں ہم کوشش کرتے ہیں۔ اللہ ہماری مدد کرے گا۔" وہ ہمت کر کے اُٹھا اور میرے ساتھ چل پڑا۔ چند قدم آگے چل کر بولا۔

"آپ میلی بہن ہو میلا ہاتھ پکلو ولنہ میں گل جاؤں گا۔" (آپ میری بہن ہو میرا ہاتھ پکڑو ورنہ میں گر جاؤں گا) میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہم راستے کے کنارے چلنے لگے۔ جیسے کوئی بچہ بوڑھے شخص کا ہاتھ پکڑ کر اسے راہ دکھاتا ہے ویسے ہی میں اسے چلا رہی تھی۔ میں نے چلتے ہوئے پوچھا۔

"یہ سب کیسے ہوا؟" وہ مجھے بتانے لگا۔

"میں گھر میں سویا ہوا تھا۔ اتفاق سے اس رات میرے پاس کوئی دوسرا فرد نہیں تھا۔ دفعتاً مجھے احساس ہوا میں گھر کی بجائے گھنے جنگل میں کھڑا ہوں۔ درختوں کے بیچ میں لوہے کی سلاخوں والے تین بڑے پنجرے رکھے ہوئے تھے۔ ایک پنجرا اتنا بڑا تھا جتنا بڑا سرکس میں موت کا کنواں ہوتا ہے۔ تینوں پنجروں کا درمیانی فاصلہ آٹھ دس میٹر کا تھا۔ میں ایک

پنجرے میں قید تھا۔ دوسرے پنجرے میں رحیم اللہ ترکھان کی بیٹی ملکھنی قید تھی۔ تیسرے پنجرے میں چمکتے دمکتے ہیرے جواہرات کے ڈھیر اور روپوں کے بنڈل پڑے ہوئے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا میرے اور ملکھنی کے پنجرے کو بڑے بڑے تالے لگے ہوئے ہیں، جبکہ مال و دولت سے لبالب بھرے ہوئے تیسرے پنجرے کا دروازہ بند ضرور تھا مگر اسے تالہ نہیں لگا تھا۔ اس کا مطلب ہے میں یا ملکھنی جو بھی رہائی پائے گا دولت اسے ملے گی۔ میں مرد ہوں اور ملکھنی نازک اندام لڑکی، میں نے سوچا میں اُس پر سبقت حاصل کرلوں گا۔ میں نے دروازے کے قریب جا کر تالے کو ہاتھوں میں ٹٹولا۔ نہتے ہاتھوں سے بھاری بھرکم تالا توڑنا بظاہر ناممکن دکھائی دیتا تھا۔

''کیا کرنا چاہتے ہو۔'' میرے کانوں میں ملکھنی کی آواز گونجی۔

''رہائی چاہتا ہوں یہاں سے۔''

''کس لیے؟''

''پاگل لڑکی رہائی آزادی کے لیے پائی جاتی ہے۔''

''مجھے نہیں لگتا تم آزادی کے لیے ایسا کر رہے ہو۔''

''تو پھر؟''

''تمہارے من میں لالچ ہے۔ تم اس پنجرے کی دولت ہتھیانا چاہتے ہو، جبکہ یہ دولت میری ہے۔''

''ہاہا۔'' میں نے بلند قہقہہ لگایا۔ ''تم جانتی ہو کہ تم کون ہو۔''

''ہاں میں رحیم اللہ ترکھان کی بیٹی ملکھنی ہوں۔''

''پاگل لڑکی ترکھانوں کے مقدر میں اتنی دولت نہیں ہوتی۔ تم اتنی دولت دیکھ تو سکتی ہو اسے چھو نہیں سکتی ہو۔''

''چھو تو تم بھی نہیں سکتے۔ اس وقت ہم برابر ہیں، یعنی زمین و آسمان یکجا ہیں۔''

''غلط کہہ رہی ہو۔ زمین و آسمان کبھی یکجا نہیں ہو سکتے۔ تم لڑکی ہو جبکہ میں مرد ہوں، طاقت میں تم سے بڑا ہوں۔''

''میں تالا توڑ سکتا ہوں اور تم ساری عمر لگی رہو مگر اسے نہیں توڑ سکتی ہو۔''

''یہ شوق بھی پورا کرلو۔'' ملکھنی کے انداز میں طنز اور چیلنج تھا۔ مجھے اس پر بہت غصہ آیا، میں نے کرخت لہجے میں کہا۔

''میں اسے ضرور توڑوں گا۔ تب تم اپنی خیر بھی منانا۔ یہ گھنا جنگل خونخوار جانوروں سے بھرا پڑا ہے۔ یہاں ہم دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا وجود نہیں جو تمہاری مدد کر سکے۔'' میری بات سن کر ملکھنی نے بلند قہقہہ لگایا۔

''ہاہاہا۔'' میں نے حیرت و غصے سے اسے گھورا۔ وہ بولی۔ ''اب تم بھول رہے ہو۔ ہمارے علاوہ بھی کوئی ہے یہاں۔''

''کون ہے؟'' میں نے بے اختیار اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ملکھنی بولی۔

''اِدھر اُدھر مت دیکھو اوپر دیکھو۔'' میں نے فوراً اوپر دیکھا۔ درختوں کے خوشے پنجرے کے اوپر جھکے ہوئے تھے، میں نے ملکھنی کی طرف دیکھا۔ وہ بولی۔

''نہیں سمجھے؟ جسے بھلا دیا جائے وہ یوں با آسانی یاد نہیں آتا۔ ہمارے درمیان ہمارا اللہ موجود ہے۔''

''اللہ ہاں موجود ہے، مگر اسی اللہ نے مجھے طاقت دی ہے تمہیں نہیں۔ اب جو میں چاہوں گا وہی ہوگا۔''

''مشرکانہ الفاظ مت استعمال کرو۔ اللہ کی پکڑ میں آجاؤ گے۔''

میں نے کندھے اچکتے ہوئے کہا۔ ''دیکھا جائے گا۔'' ملکھنی خاموش ہوگئی۔ میں نے پنجرے سے باہر کا نظارہ کیا، جن سلاخوں سے پنجرے بنائے گئے تھے ویسی ہی ایک موٹی سلاخ میرے پنجرے کے باہر پڑی ہوئی تھی۔ میں نے ہاتھ باہر نکالا مگر وہ پہنچ سے دور تھی۔ تب میں نے بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے سلاخوں کو تھاما اور ٹانگ باہر نکالی۔ جس حد تک ممکن تھا میں نے پاؤں دراز کیا۔ میرا جوتا سلاخ کو ٹکرایا، میں نے بوٹ کی ٹو سے اسے اپنی طرف کھینچا تو سلاخ تھوڑی سی ہل گئی، میں نے آگے ہو کر اس کی پوزیشن چیک کی اور پھر سے بوٹ کی ٹو سے اسے اپنی طرف کھینچا۔ اس بار سلاخ دو تین انچ میری طرف سرک گئی۔ مجھے امید کی کرن نظر آنے لگی، میں دھیرے دھیرے دس پندرہ منٹوں میں سلاخ ہاتھ کی پہنچ میں

لے آیا۔ جب سلاخ میرے ہاتھوں میں آئی تو میں نے فخریہ نگاہوں سے مکھنی کی طرف دیکھا۔ وہ مجھ ہی کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے تالے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے بتایا۔ "اب دیکھنا اس کا کیا حشر ہوگا۔" مکھنی خاموش رہی۔ میں تالا توڑنے کی کوشش میں لگ گیا۔ لوہے کی سلاخ کافی مضبوط اور موٹی تھی بس آدھا گھنٹے میں، میں اپنی کوشش میں کامیاب ہوگیا۔ میں پنجرے سے باہر نکل آیا۔ میری گردن فخر سے تن گئی تھی، میں نے مکھنی کے قریب جا کر کہا۔

"دیکھ لو مکھنی میری بات سچ ثابت ہوئی یا تمہاری۔" میں نے ٹوٹے ہوئے تالے کو ہوا میں اچھالا۔ مکھنی چل کر سلاخوں کے قریب آئی، اس نے دونوں ہاتھوں سے سلاخیں پکڑ کر کہا۔ "گردن نیچے کرو، تمہیں پتا نہیں اللہ تعالیٰ کو فخر سے تنی ہوئی گردنیں پسند نہیں۔" مکھنی کا لہجہ بے حد سخت تھا جو مجھے گراں گزرا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "عنقریب تباہی ہونے والی ہے۔ اس تباہی میں سب کچھ ملیا میٹ ہو جائے گا۔ امریکہ کا Statue Of Liberty بھی منہ کے بل زمین پر گرے گا اور پاش پاش ہو جائے گا۔"

"ہاہاہا۔" میں نے فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ "تم تو گئی کام سے مکھنی۔ تیرا دماغ چل گیا ہے۔ تو فکر نہ کر میں کہہ دوں گا تمہارے ابا رحیم اللہ کو۔ وہ تمہیں آ کر لے جائے گا اور یہ بھی کہہ دوں گا وہاں سے سیدھا تمہیں پاگلوں کے اسپتال لے جائے۔ ہاں، مگر میری ایک بات تو مانو گی تو تمہارا تالا بھی توڑ دوں گا۔ میں نے اپنی گردن معنی خیز انداز میں مسلتے ہوئے کہا۔

"مجھے یہاں رہنا پسند ہے تم اپنا کام کرو۔" مکھنی نے رکھائی سے جواب دیا۔ میں نے کہا۔

"کام تو اپنا ہی کروں گا مکھنی، پہلے یہ دولت سمیٹ لوں اس کے بعد تمہیں سمیٹ لوں گا۔" میں نے خوش گوار قہقہہ فضا میں چھوڑا۔ مکھنی چپ رہی۔ میں تیسرے پنجرے میں چلا گیا۔ اندر ہیرے جواہرات کی اس قدر چمک تھی کہ میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ میں نے حیران نظروں سے دولت کے انبار دیکھے۔ مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ میں اتنی زیادہ دولت کا مالک بن گیا ہوں۔ میں نے انہیں چھو کر دیکھا۔ واقعی یہ حقیقت تھی کہ میں ہیروں کے ڈھیر پر کھڑا ہوا تھا۔ میں نے ہیرے کا ایک ہار اٹھا کر فضا میں بلند کیا۔ اس کے لشکارے سے اردگرد کا سارا ماحول روشن ہوگیا۔ اوہ۔ میرے منہ سے حیرت بھرا ہنکارا نکلا۔ یہ میرے تصور سے بھی زیادہ قیمتی ہیں۔ میں اپنی خوشی میں مگن تھا۔ میرے عقب میں کیا ہو رہا ہے مجھے احساس ہی نہیں ہوا۔ کھٹک کی آواز کانوں میں پڑی تو میں نے بدک کر مڑ کر دیکھا۔ عقب کا نظارہ دیکھ کر میں اپنی جگہ ساکت و جامد رہ گیا۔ مکھنی کے پنجرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے دھیان دیا تو یہ انکشاف ہوا کہ میرے پنجرے کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ میں بھاگ کر دروازے کے قریب گیا۔ باہر سے مکھنی نے تالا لگا دیا تھا۔ میں نے حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ مکھنی کے ہاتھوں میں چابیوں کا گچھا تھا۔ وہ چابیاں میرے سامنے لہراتے ہوئے بولی۔

"بے وقوف انسان جنگل میں جتنے بھی پنجرے ہیں ان سب کے تالوں کی چابیاں میرے پاس ہیں۔ میں نے تمہارے اس پنجرے کو منتقل کر دیا ہے، اب باہر نکل کر دکھاؤ۔" میں اس کی بات سن کر فوراً پلٹا تاکہ جواہرات کے ڈھیر میں سے کوئی ایسی چیز مل جائے جس سے تالا توڑا جا سکے، مگر پیچھے مڑتے ہی مجھے زمین نے پکڑ لیا۔ ہیرے جواہرات اور دولت کے بنڈل نے آگ پکڑ لی تھی۔ میں نے حیران نگاہوں سے مکھنی کو دیکھا۔ وہ تینوں پنجروں کے درمیان اطمینان سے کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے پریشان نظروں سے آگ کو دیکھا۔ اوہ، یہ آگ تو مسلسل بڑھ رہی ہے۔ آگ کا حجم بتدریج پھیل رہا تھا۔ اس کی تپش میں اضافہ ہو چکا تھا، میں نے گھبرا کر دروازے کی سلاخوں کو پکڑا اور زور سے چلایا۔

"مکھنی دروازہ کھولو۔ دروازہ کھولو مکھنی خدا کے لیے یہ ظلم نہ کرو۔" میں نے گھبرا کر آگ کو دیکھا، پھر مکھنی کو دیکھا۔ وہ ہنوز اطمینان سے کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے چلا کر کہا۔ خدا کے لیے مکھنی دروازہ کھولو۔ م...... میں مر جاؤں گا، میں نے دیکھا آگ میری طرف بڑھنے لگی تھی۔

"م...... مکھنی...... تمہیں اللہ کا واسطہ، دروازہ کھول دو۔" آگ کی تپش مجھے جسم پر محسوس ہونے لگی تھی۔ مکھنی میری طرف بڑھی، مجھے ڈھارس بندھی کہ وہ دروازہ کھولے گی، مگر وہ چند میٹر پیچھے ہی رک گئی تھی۔ "م...... م...... مکھنی...... میں...... دیکھو خدا کے لیے مجھے بچا لو۔"

"بس خدا کا واسطہ مت دو جس پر تمہیں یقین نہیں۔"

"مکھنی! میں تجھ سے معافی مانگتا ہوں۔ تم جو کہو گی کروں گا۔ تمہارا غلام بن کر رہوں گا۔" دروازہ کھولو۔ میں باقاعدہ چیخنے لگا۔ آگ کے بھڑکتے شعلے مجھے اپنی لپیٹ میں لینے لگے تھے۔ میرے منہ سے بھیانک چیخیں بلند ہونے لگیں۔ میں مچھلی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ اب مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں پورے پنجرے میں اِدھر اُدھر پاگلوں کی طرح بھاگنے لگا تھا۔

آگ کی جولانیاں چاروں اور برابر تھی۔ میں بھاگتے ہوئے دروازے کے قریب آیا، مکھنی کہہ رہی تھی۔

"میں نے کہا تھا نا کہ تمہی ہوئی گردنیں اللہ کو پسند نہیں۔"

"ہاں ہاں۔ میں سمجھ گیا ہوں، میں مان گیا ہوں۔ میں توبہ کرتا ہوں، خدا کے لیے مجھے باہر نکالو۔" میری چیخ پکار کا کسی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ میرا چہرہ جلنے لگا تھا۔ مجھے خود جلن کی بدبو محسوس ہونے لگی۔ میں درد سے بلبلا اٹھا۔ میں نے ایک اور چیخ بلند کی اور اُٹھ کر بیٹھ گیا، کراہتے ہی جیسے کسی نے میرے جسم سے روح کھینچ لی تھی۔ مجھ پر لرزہ طاری ہو گیا۔ میں خواب دیکھ رہا تھا مگر اتنا بھیانک اور لرزہ خیز خواب تھا کہ میں چیختے ہوئے جب بیدار ہوا تو میرے ساتھ دو اچھوتے کام ہوئے۔ میری زبان میرے دانتوں تلے اتنے زور سے دبی کہ زبان کی نوک کٹ گئی۔ زبان کے کٹنے کا بے کراں درد اور خون کا بے تحاشہ رساؤ۔ مجھ پر ایسا وحشت کا حملہ ہوا کہ میں خواب کو حقیقت کو سمجھ بیٹھا اور چیختا چلاتا باہر کی جانب دوڑ لگا دی۔ بھاگتے ہوئے بھی مجھے ہر طرف آگ کی لپٹیں اٹھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ ہم پر آگ کی تپش اور زبان کا اذیت ناک کٹاؤ۔ میری حالت غیر کرتا چلا جا رہا تھا۔ میرا منہ خون سے بار بار بھر رہا تھا۔ میں جتنا تھوکتا خون دگنا ہو کر بہنے لگتا۔ میں مسلسل اذیت کا شکار رہا۔ درد و تکلیف سے چھٹکارے کے لیے میں بھاگتا ہی جا رہا تھا۔ رفتہ رفتہ آگ کی تپش میں کمی واقع ہوئی اور زبان کی تکلیف بھی قابلِ برداشت ہوئی تو میں اپنے آپ کو دیکھ کر ڈر گیا۔ بھاگتے ہوئے تکلیف کی شدت سے میں نے بے اختیار اپنا منہ نوچا تھا۔ میرے چہرے پر جابجا خراشیں پڑ گئی تھیں۔ کپڑے خون آلودہ تھے۔ بھاگتے ہوئے مجھے قطعاً احساس نہیں ہوا کہ میں کتنا بھاگ چکا ہوں۔ رات کی تاریکی میں میرے خون آلود کپڑے اور چہرے سے ٹپ ٹپ گرتے لہو نے مجھے بے حد پراسرار بنا دیا تھا۔ زخموں سے خون کا رساؤ ابھی تک جاری تھا۔

میرا جس طرف رُخ ہوا، منہ اٹھائے بھاگتا رہا، حتیٰ کہ صبح کا سفیدہ پھیل گیا۔ میں نہیں جانتا کہ میں کتنا بھاگا اور کتنا چلا، صبح مجھے اتنا پتا چلا کہ میں ایک اجنبی علاقے میں آ گیا ہوں۔ لوگ مجھے دیکھ کر خوف سے دور بھاگنے لگے۔ میں پوچھتا جا رہا تھا کہ میں کس علاقے میں ہوں، مگر کوئی میرے پاس رکتا تبھی کچھ بتاتا۔ بچوں نے پاگل سمجھ کر پتھروں سے تواضع کی۔ میں احساسِ شرمندگی سے زمین میں دھنستا جا رہا تھا۔ خون آلود کپڑے دیکھ کر کسی نے پولیس بلوالی۔ انہوں نے میری حالت دیکھی تو بلا مبالغہ اٹھا کر تھانے میں پھینک دیا۔ میں ذہنی طور پر اتنا اپ سیٹ تھا کہ پولیس والوں سے الجھ پڑا۔ شاید ایک دو کو کے بھی مارے تھے۔ جواباً انہوں نے مجھے مار مار کے ادھ موا کر دیا۔ انہوں نے میری ایسی درگت بنائی کہ میرا جوڑ جوڑ ہل گیا۔ حرکت کرنے کی کوشش کرتا تو منہ سے بے اختیار چیخیں نکل جاتیں۔ میں عجیب حالت میں گرفتار تھا۔ پولیس والوں نے مجھے غیر قانونی طریقے سے تھانے میں ایسے بند کیا کہ مڑ کر کوئی خبر نہیں لی۔ مجھے ابتدائی طبی امداد کی اشد ضرورت تھی مگر وہ مجھے اسٹور میں پڑے کباڑ کی طرح بھول گئے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ میرے زخموں میں پیپ پڑنا شروع ہو گیا۔ رفتہ رفتہ پورے جسم پر آبلے نمودار ہونے لگے۔ جب پولیس والوں کو ہوش آیا تو مرض بہت بڑھ چکا تھا۔ زخم جذام کی شکل اختیار کر گئے تھے۔ میری تکلیف میں بے تحاشہ اضافہ ہو چکا تھا۔ میرے خلاف کوئی کیس یا ایف آئی آر تو تھی نہیں، لہٰذا پولیس نے جان چھڑائی۔ جیسے اندر پھینکا تھا ایسے ہی اٹھا کر باہر پھینک دیا۔ میں یونہی دربدر بھٹکتا رہا۔ حالات نے مجھے سنگِ راہ کی طرح ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ میں نے بھی خود کو وقت کے بے رحم ہاتھوں میں دے دیا، آخر بھٹکتے بھٹکتے یہاں تک چلا آیا۔

یہ ساری روداد اس نے مجھے توتلی زبان میں سنائی تھی۔ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

میری بات دھیان سے سنو۔ اللہ کے پیارے نبی اور رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہونے کے لیے گئے تو پیچھے سامری جادوگری نے مٹی کا ایک بچھڑا بنایا۔ ہوا چلنے سے بچھڑا رانبھنے لگا جس سے سامری نے لوگوں کو باور کروایا کہ یہی ہمارا خدا ہے۔ اس کی عبادت کرو۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام واپس آئے تو بنی اسرائیل بچھڑے کو خدا بنا بیٹھے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے حکم دیا انہیں قتل کردو، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں قتل کرنے کا فرمان جاری کردیا۔ اس کی قوم بولی، اے اللہ کے نبی ہم انہیں کیسے قتل کریں، یہ بھی تو ہم ہی سے ہیں۔ کہیں باپ ہے کہیں بھائی، کسی کے سامنے ماں اور کسی کے سامنے بہن یا بیٹا۔ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ستر آدمیوں کو لے کر کوہِ طور پر گئے اور ان کی طرف سے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی۔ جواب ملا۔

اے موسیٰ تیرے قوم کی سزا تو قتل ہی ہے، ہاں البتہ تیرے بعد ایک نبی کی امت آئے گی۔ وہ ایک بار توبہ کرے گی میں اُس کے سارے گناہ معاف کردوں گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ اے اللہ وہ امت مجھے دے دے، اللہ تعالیٰ نے جواب دیا نہیں موسیٰ وہ میرے حبیب حضرت محمد ﷺ کی امت ہے، میں وہ امت کسی دوسرے نبی کو نہیں دے سکتا۔

"میری بات بھی آپ نے" میں نے اس سے پوچھا۔ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ایک اور سنو۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے جنت کے پانی کی خوبیاں بتائیں۔ اے میرے پیغمبر عیسیٰ جنت کا پانی ایسا ہے کہ اس کا ایک قطرہ انگلی پر لگا لو تو اس کی خوشبو سے سارا جہاں معطر ہو جائے گا۔ ایک گھونٹ پی لو تو ساری زندگی پیاس نہ لگے گی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ اے میرے رب وہ پانی مجھے پلا دے۔

اللہ تعالیٰ نے جواب دیا۔ جب تک میرا حبیب حضرت محمد ﷺ یہ پانی نہ پی لے دوسرے تمام انبیاء پر حرام ہے اور جب تک میرے حبیب کی امت نہ پی لی سارے امتوں پر حرام ہے۔

اس بار کوڑھ زدہ شخص بولا۔ ہم اتنے ڈناوار (گناہگار) ہیں اول (اور) اللہ تعالیٰ ہمیں اتنی عظمت دے رہا ہے۔

بالکل...... میں نے کہا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کا ایک اور عبرت ناک واقعہ سنو۔

"وی (جی) سنائیں۔"

پہلے یہ جان لو کہ ہماری زکواۃ ڈھائی فیصد ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم پر دس فیصد زکواۃ کا حکم ہوا، قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کا امیر ترین شخص تھا۔ کہا جاتا ہے تین سو خچر اس کے خزانوں کی چابیاں اٹھانے پر مامور تھے۔ قرآن مجید میں سورۃ مومن میں قارون کے بارے میں بتایا گیا۔

ترجمہ! ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی کھلی دلیل کے ساتھ فرعون، ہامان اور قارون کے پاس بھیجا، مگر انہوں نے کہا کہ یہ (موسیٰ علیہ السلام) ایک جادوگر ہے سخت جھوٹا۔

قارون کا ذکر بائبل کتاب میں موجود ہے۔ بائبل میں قارون کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چچا زاد بتایا گیا ہے۔

قرآن مجید میں ہی بتایا گیا کہ قارون بنی اسرائیل میں تھا، مگر فرعون کے ساتھ جا ملا تھا۔

فرعون کے بعد جن دو افراد نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شدید مخالفت کی تھی ان میں ایک قارون تھا۔

قارون کے بارے میں قرآن مجید کی سورۃ القصص میں تفصیلی ذکر ملتا ہے۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو دس فیصد زکواۃ کا بتایا تو قارون کو شدید جھٹکا لگا۔ اس نے ایک فاحشہ عورت کو روپے دیے اور کہا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام وعظ فرما رہے ہوں گے تو تم اس پر فحاشی کی تہمت لگانا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام منبر پر وعظ فرما رہے تھے۔ قارون نے کھڑے ہو کر پوچھا۔

"اے اللہ کے نبی موسیٰ! ہم میں سے کوئی شادی شدہ شخص بدکاری کرے تو اس کی کیا سزا ہوگی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا۔

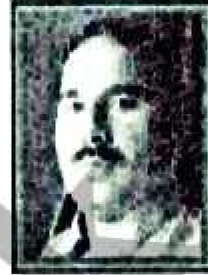
ایسے شخص کو سنگسار کر دیا جائے۔
"یہ قانون بلا امتیاز ہر شخص پر یکساں لاگو ہے۔"
موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ "جی ہاں اگر میں بھی ایسا کروں تو سنگساری کی سزا پاؤں۔"
ان کی بات سن کر قارون نے فوراً فاحشہ عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
اے موسیٰ اس عورت کی سنو یہ کیا کہتی ہے۔ قارون کے اشارے پر فاحشہ عورت کھڑی ہو گئی۔
لوگوں کی نظریں عورت پر جم گئیں۔ فاحشہ عورت نے کھڑے ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے چہرہ مبارک کی طرف دیکھا۔ وہاں نبوت کا نور جھلک رہا تھا۔ عورت پر رعشہ طاری ہو گیا۔ وہ دہشت سے کانپنے لگی۔ اس کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ اللہ کے نبی پر جھوٹی تہمت لگائے۔ وہ کپکپاتی آواز میں بولی۔
مم۔ میں کچھ نہیں کہتی۔ میں پہلے ہی حد درجہ گنہگار ہوں، میں اتنا بڑا گناہ کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔ اے اللہ کے نبی مجھے اس قارون نے پیسے دیے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر فاحشی کی تہمت لگانا۔
اللہ کی بات سن کر حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حضور سجدے میں گر گئے۔ اے میرے رب میں تیرا نبی ہوں اور تیرے نبی پر جھوٹی تہمت لگائی جا رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔
اے میرے پیارے موسیٰ آج زمین تیرے تابع ہے۔ جو حکم دو گے یہ مانی گی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اٹھ کر زمین کو حکم دیا۔
قارون بد بخت کو پکڑ لے۔ زمین پھٹی اور قارون کے پاؤں اندر دھنس گئے۔ لوگ اللہ کے نبی کا معجزہ دیکھ رہے تھے اور قارون گڑگڑانے لگا تھا۔
اے موسیٰ مجھے معاف کر دے۔
موسیٰ علیہ السلام نے زمین کو حکم دیا اسے اور اندر لے جا۔ قارون گھٹنوں تک اندر چلا گیا۔
وہ پھر معافیاں مانگنے لگا اے اللہ کے نبی مجھے معاف کر دے۔
موسیٰ نے کہا۔ "اے زمین اسے اور اندر لے جا۔" وہ کمر تک زمین میں دھنس گیا۔
قارون نے پھر گڑگڑا کر معافی مانگی۔ اے موسیٰ علیہ السلام معاف کر دے۔
حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اور اندر لے جا۔ اس بار قارون پورے کا پورا زمین میں زندہ دفن ہو گیا۔ میں خاموش ہو گئی، کوڑھ زدہ شخص مجھے سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔
"اس سارے قصے کا مقصد پتا ہے کیا؟"
"نہیں آپ بتاؤ نا۔"
جب قارون زندہ دفن ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا۔
اے موسیٰ تجھ سے معافیاں مانگتا رہا مگر تو معاف نہ کر سکا۔ مجھے اپنی عظمت کی قسم ہے۔ مجھ سے ایک بار بھی معافی مانگتا تو میں معاف کر دیتا۔
"سبحان اللہ۔" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ میں نے دیکھا اس کے چہرے اور آنکھوں میں ایک نئی چمک ابھر آئی ہے۔ میں نے کہا۔ کیا ہم قارون سے بھی برے ہیں۔ ہمیں تو امتِ محمدﷺ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ہمارے پیچھے حضرت محمدﷺ کا سہارا ہے۔ جو اللہ، مہربان اللہ قارون کو معاف کرنے کے لیے تیار بیٹھا ہو اور غفور الرحیم رب اپنے حبیب کی امت کو کیسے معاف نہیں کرے گا۔ بس ہمیں صدق دل سے معافی مانگنی چاہیے۔

☆......☆

(اس حیرت انگیز اور اسرار بھرے ناقابلِ فراموش سلسلے کی اگلی کڑی آئندہ ماہ پڑھیے)



نادیدہ روح



ملک صفدر عباس اعوان

رونگٹے کھڑے کر دینے والی حیرت و اسرار سے پُر، خاص کہانی

وہ ایک قبرستان تھا، مگر بہت ہی بڑا اسرار سے پُر، جو کہ گھٹا ٹوپ اندھیرے سے بھرا ہوا تھا، رات کا عالم تھا۔ آسمان پر چار سو سیاہ بادلوں کا بسیرا تھا، جیسے کسی حسینہ کی سیاہ کالی زلفیں فضا میں بکھری ہوئی ہوں، لیکن حسینہ کی گہری سیاہ زلفوں میں تو خوف کی بجائے کشش کا سماں ہوتا ہے، پر یہاں تو ہر طرف خوف کا عالم تھا۔ اس ماحول میں تو کسی کالی سیاہ ڈائن کا ہی خیال آتا تھا، جیسے وہ اپنے کالے وجود کو پھیلائے کھڑی ہو اور ہر طرف تاریکی بکھیر رہی ہو۔ حالاں کہ رات تو چودھویں کی تھی، لیکن اماوس کی رات لگ رہی تھی۔ سیاہ بادلوں نے چاند کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا، جیسے چاند نے اپنی شکل تھوڑی بہت بھی دکھائی تو کہیں اسے نظر ہی نہ لگ جائے، لیکن شاید چاند اس قید و بند سے عاجز تھا اس لیے تو وہ سیاہ بادلوں میں سے نکل کر تھوڑا سا اپنا منہ دکھا دیتا اور پھر غائب ہو جاتا، لیکن اس کے اس تھوڑے سے جلوے سے قبرستان میں ہر سُو چاندنی سی بکھر جاتی تھی۔

قبرستان میں کسی ذی روح کا نام و نشان تک نہیں تھا، قبروں میں بس بے جان مردے سوئے ہوئے تھے، جو اس کے خوف ناک ماحول سے بے خبر پڑے ہوئے تھے۔

کتوں کے بھونکنے کی آوازیں، کسی الو کی منحوس آواز، یا کسی بھیڑیے کی خوفناک "آہو" کرنے کی آواز اکثر کسی قبرستان کے ماحول کا ایک حصہ ہوتے ہیں، اس وقت بھی قبرستان میں مکمل خاموشی تھی، اتنی خاموشی کہ اگر ارد گرد کے درختوں کی ٹہنیاں یا پتے، کسی ہوا کے نرم جھونکے سے تھوڑا بہت بھی ہلتے تو آواز بخوبی سنائی دیتی تھی کہ اچانک...... قبرستان میں ہل چل سی ہوئی، کچھ لوگ جن کی تعداد بامشکل چھ تھی، قبرستان کا چھوٹا سا لوہے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ ان میں سے چار افراد نے ایک جنازے کو کاندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ لگ رہا تھا وہ اس کو رات کے اندھیرے میں دفنانے آئے ہیں۔

دو افراد کے ہاتھ میں قبر کھودنے والی کدالیں تھیں۔

وہ لوگ جنازہ اٹھائے ہوئے آہستہ آہستہ قبروں کے بیچ میں سے ہوتے ہوئے آگے جانے لگے۔ ان میں دو افراد آگے آگے چلتے ہوئے راستے کو بخوبی دیکھ رہے تھے۔ تاریکی نے قبروں کو بھی نگل لیا تھا، اس لیے دیکھ بھال کر چلنا بہت اہم تھا کہ کہیں کسی قبر سے ٹکرا کر کوئی نیا مسئلہ ہی پیش نہ آ جائے۔

چلتے چلتے وہ تقریباً قبرستان کے درمیان میں رک گئے۔ یہاں قبر کھودنے کے لیے کافی جگہ خالی پڑی تھی۔ انہوں نے جنازہ والی چارپائی نیچے زمین پر رکھ دی اور دو افراد جو ماہر گورکن تھے، وہ زمین کا معائنہ کرنے لگے کہ آیا یہ

جگہ قبر کھودنے کے لیے ٹھیک بھی ہے یا نہیں۔ بہت زیادہ نرم مٹی قبر کے لیے صحیح نہیں رہتی، اس لیے پہلے انہوں نے زمین کو دیکھا بھالا اور پھر جلدی سے قبر کھودنا شروع کردی۔ یہ زمین قبر کے لیے موزوں تھی، مٹی نہ تو زیادہ نرم تھی اور نہ ہی زیادہ سخت۔ قبر جلدی تیار ہوسکتی تھی، ان کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے، باقی چاروں بندے خاموشی سے ان کو یہ سب کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے، ان کی اور تھی، مردے کو دفنانے کا کام نہ ہوتا تو ان میں سے کسی کے آنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا، یہاں تک کہ گورکن بھی۔

وہ اس قبرستان میں دن کے وقت ہی قبر کھودنے کا کام کرتے تھے، مگر پیٹ بھی بڑی پاپی شے ہے اور اگر پیٹ بھوکا ہو، گھر میں بیوی بچے کھانے کو مانگیں تو پیسوں کے لیے بندہ کچھ نہ کچھ کرتا ہی ہے۔

ان گورکنوں کا بھی یہی حال تھا، تقریباً ہفتہ سے اوپر



ہو گیا تھا کسی قبر کو تیار کیے ہوئے۔ یہ دونوں صبح قبرستان آتے اور شام اندھیرے خالی ہاتھ خالی جیبیں لیے گھر واپس چلے جاتے۔ آج اتنے دنوں بعد کام ہاتھ لگا تھا تو وہ بھی رات کو، مجبوراً منع کرنے کے بعد بھی منع نہ کر سکے، اگر منع کرتے بھی تو اس پیٹ کے دوزخ کو کیسے بھرتے۔

گورکنوں کو بھی قبرستان کی اس دل ہلا دینے والی قبر کھودنے والے گورکنوں کی بھی کوشش تھی کہ جلد از جلد اس کام کو نمٹا کر اپنے گھروں کا رُخ کیا جائے۔

☆......☆

وہ لوگ بہت زیادہ خوف زدہ تھے قبرستان میں پھیلے اندھیرے اور پراسرار خاموشی کی وجہ سے قبرستان میں ذرا سی بھی آواز ان کے رونگٹے کھڑے کردینے کے لیے کافی

تاریکی اور خوف ناک ماحول کا اندازہ تھا۔ وہ بھی اپنا کام جلد از جلد نمٹا کر بھاگ جانا چاہتے تھے۔ ان کی کدالیں مارنے کی آوازیں قبرستان میں گونج رہی تھی کہ اچانک قبرستان میں کسی ذی روح کے کھانسنے اور قبرستان کے اردگرد کھڑے لمبے لمبے درختوں کے نیچے گرے خشک پتوں پر کسی کے چلنے کی آواز نے ان سب کو چونکا دیا۔

گورکنوں کی چلتی کدالیں یک دم رک گئیں، انجانے خوف سے ان کی سٹی گم ہوگئی، ان سب نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھنا شروع کردیا، لیکن گہری تاریکی میں قبروں کے ہیولوں کی سوا ان کو کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔

"چوکیدار ہوگا شاید۔" ایک شخص بولا۔

"ہاں وہی ہوگا، اس کے علاوہ اس وقت اس جگہ بھلا اور کون ہوسکتا ہے؟"

دوسرے ساتھ کھڑے بندے نے کہا اور سب نے تائید سے گردنیں ہلائیں۔

"اے...... کون ہے وہاں؟"

ایک گورکن نے ہمت کی اور زور سے بولا۔

"جو کوئی بھی ہے سامنے آ......"

گورکن کا بولنا تھا کہ یک دم ہی خاموشی چھا گئی۔

وہ کافی دیر تک اِدھر اُدھر دیکھتے رہے، گورکنوں نے دوبارہ اپنا کام شروع کردیا، اس بار ان کے ہاتھ اور تیزی کے ساتھ چل رہے تھے، ساتھ ہی ہاتھوں اور پورے جسم پر کپکپی طاری تھی، پورا بدن پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔

"ہاں بھئی میرے باپ کی بھی توبہ کہ اب رات کو کبھی قبر کھودی۔" دوسرا بولا۔

"چاہے جتنی بھی مجبوری ہو، بھوکا مرجاؤں گا، مگر اس وحشت زدہ ڈراؤنے ماحول میں پل پل مرنا مجھے منظور نہیں۔"

وہ دونوں آپس میں باتیں کرتے رہے اور ساتھ ساتھ قبر کو بھی کھودنا جاری رکھا۔ اس خوف اور ڈر سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ ان کے ہاتھوں میں بجلی سی تیزی آگئی اور تیز تیز ہاتھ چلانے کی وجہ سے قبر جلد ہی وقت سے پہلے تیار ہوگئی۔

"لو بھئی قبر تیار ہوگئی، اب ہمارا کام ختم۔" ایک گورکن ان باقی چار افراد کی طرف کپڑے جھاڑتے ہوئے مڑا۔

"ہاں لیکن مردہ کو دفن کرنے میں تو ہماری مدد کرو۔

اتنی جلدی کس بات کی ہے۔" چار میں سے ایک بندہ تیزی سے بولا۔

"وہ تم جانو اور تمہارا کام۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ میں تو جارہا ہوں، تم اس سے پوچھ لو۔" اس نے دوسرے گورکن کی طرف اشارہ کیا۔

"کیوں منگلے! ان کے ساتھ مردہ دفنائے گا تو۔"

"نا با با نا...... میرے باپ کی بھی توبہ۔" اس نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

"سرکار ہم آپ کے ساتھ آگئے قبرستان میں رات کے وقت اور آپ کے ایک بار کہنے پر آپ کو اس وقت قبر تیار کردی، یہی بہت ہے۔"

"تم۔ تم۔ لوگ بہت مطلب پرست اور کمینے ہو۔" ایک شخص جوان چاروں میں سے علیحدہ ہو کر ایک قبر پر بیٹھا ہوا تھا، غصے سے بولا۔

"ہاں بھئی...... دنیا مطلب کی ہے، مطلب تک ہی ساتھ دیتی ہے۔"

"آپ لوگوں نے پیسے دیئے تھے قبر کھودنے کے، وہ ہم نے کام کردیا۔ آپ نے ہمارا معاوضہ دے دیا، بس آپ کا اور ہمارا رابطہ اب ختم۔"

"مگر...... آخر سنو تو۔" وہ چاروں بیک وقت بولے۔

ان کو اندازہ تھا کہ اگر یہ چلے گئے تو، پھر مردہ کو دفنانا شاید ان کے بس کی بات نہیں تھی، ان چاروں نے کبھی پہلے کسی مردے کو دفنایا ہی نہیں تھا۔

ان کے لاکھ جتن کرنے کے باوجود گورکن تیزی سے وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

وہ چاروں یک دم پریشان ہوگئے، ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مردے کو یہیں اسی حالت میں چھوڑ کر بھاگ جائیں، جس طرح وہ گورکن بھاگے تھے، لیکن شاید ان کا اس مردے سے کوئی رشتہ تھا اور پھر سب سے بڑھ کر اسلام ہمارا مذہب بھی اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا۔

"اب کیا کریں۔" ایک بولا۔

"کیا کرنا ہے، میت کو اٹھائیں گے، قبر میں رکھ دیں گے اور اوپر سے مٹی ڈال دیں گے۔" دوسرا بولا۔

"لیکن یہ کام اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ جتنا تم سمجھ رہے ہو۔" تیسرا بولا۔

"تو پھر کیا میت کو لے کر یہیں قبرستان میں کھڑے رہیں گے، آخر ہمیں ہی کچھ کرنا ہوگا۔" چوتھا تیز لہجے میں بولا۔

"وعقل کے ناخن لو، ہوش کرو۔ یہ تاریکی، یہ پر اسرار رات اور وہ بھی قبرستان میں اور ساتھ میں ایک لاش اور تم لوگوں کو آپس میں تکرار کی پڑی ہوئی ہے۔"

چوتھے شخص کی بات باقی تینوں کے ذہن میں جا بیٹھی، تبھی تو وہ سب میت کو اٹھانے کی غرض سے آگے بڑھے اور میت کو اٹھا کر احتیاط سے قبر میں اُتارنے لگے، میت کو قبر میں رکھ کر پہلے کچی اینٹیں جو اِدھر اُدھر پہلے ہی بکھری پڑی تھیں، اس سے اور اوپر سے مٹی سے قبر کو بھرنا شروع کردیا۔ وہ اپنے کام میں مگن سارے ماحول سے بے خبر ہوگئے تھے کہ پاس ہی کسی کتے کی تیز غراہٹ نے ان کو خوف سے تھر تھر کانپنے پر مجبور کردیا۔ ان چاروں کو اپنی جگہ سے تھوڑی ہی دیر ایک پکی قبر پر ایک کتا کھڑا نظر آیا جو کہ بار بار غراہٹ کے ساتھ ان کی ہی طرف دیکھ رہا تھا۔

"ارے یہ کتا ہے، ہمیں بھلا اس سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

ایک شخص نے پکی اینٹ کا ایک ٹکڑا اٹھا کر کتے کی طرف پھینکا، تا کہ وہ بھاگ جائے مگر اینٹ کا پھینکنا تھا کہ کتا اب تیز تیز غرانے لگا اور ان کی طرف آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔

"ارے یہ تو ہماری طرف ہی آرہا ہے۔" وہی شخص بولا میں جس نے اس کتے کو اینٹ ماری تھی، باقی تین جو کہ قبر میں مٹی ڈالنے میں مصروف تھے، انہوں نے بھی چونک کر کتے کی جانب دیکھا، وہ تینوں کھڑے ہوگئے، انہوں نے کوشش...... کوشش کر کے کتے کو بھگانا چاہا کہ وہ سیاہ رنگ کا کتا تیزی سے ان کی طرف بھاگا، جیسے وہ ان کو کاٹ کھانا چاہتا ہو، ان چاروں نے جب یہ حالت دیکھی تو وہ سب قبروں کے اوپر سے چھلانگیں لگا کر گیٹ کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے، آدھی قبر جو کہ ابھی مٹی سے بھری تھی، وہیں چھوڑ گئے اور قبروں کو مسمار کرتے اندھا دھند بھاگنے لگے۔ ان کو اپنا ہوش تک نہیں تھا۔ رات کے اندھیرے میں ان کو کچھ صاف نظر بھی نہیں آرہا تھا کہ ایک شخص ان میں سے ایک پکی قبر سے ٹکرا کر گرا اور دوسرے آدمی کی ٹانگ ایک کچی قبر میں جا دھنسی۔

وہ سیاہ کتا کسی آسیب کی طرح ان کے پیچھے تھا کہ اس نے چھلانگ لگا کر اس آدمی کو جا دبوچا جس کی ٹانگ کچی قبر میں جا دھنسی تھی۔ کتے نے اس زور سے اس کے بازو پر کاٹا کہ وہ درد کی شدت سے بلبلا اُٹھا، باقی تینوں نے اپنے ساتھی کا یہ حشر دیکھا تو بجائے اس کے کہ اس کی مدد کرتے۔ وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے اور وہ شخص مدد کے لیے چلاتا رہا۔

اس سیاہ کتے نے اب کی بار اس کا بازو چھوڑ کر اس کی ٹانگ کو تیز دانتوں میں دبالیا اور ایک گوشت کا ٹکڑا اُچک لیا۔ نیچے پڑا شخص درد سے بے حال ہوگیا۔ اچانک کسی نے کتے کو زور کا ایک ڈنڈا رسید کیا تو کتا غوں غوں کی آواز نکالتا وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔

☆......☆

قبر پر پڑے شخص نے کراہ کر اٹھنے کی کوشش کی اور اپنے محسن کی شکل دیکھی۔ وہ قبرستان کا چوکیدار تھا جو اس کے چلانے کی آواز اور اس کے ساتھیوں کو بھاگتے دیکھ کر ادھر آیا تھا۔ گھبراؤ نہیں میں قبرستان کا چوکیدار ہوں۔ اگر میں نہ آتا تو وہ خونخوار کتا تمہاری جان لے لیتا۔ کم بخت بڑا خوں خوار اور طاقتور ہے۔ اسی قبرستان میں نجانے کہاں سے رات کے وقت آجاتا ہے، کئی بار بھگایا ہے، مگر جان ہی نہیں چھوڑتا، کئی انسانوں پر حملہ کر چکا ہے۔ تم خوش قسمت ہو کہ بچ گئے، اگر میں نہ آتا تو اللہ جانتا ہے کیا ہوتا۔ چوکیدار نے اس شخص کو سہارا دے کر اُٹھایا۔

"تمہیں یہاں سے نکلنا چاہیے تم زخمی ہو، تمہاری پٹی وغیرہ بھی کروانی پڑے گی، تمہارا خون اسی طرح رستا رہا تو خطرناک ہوگا۔ اس شخص کے زخموں سے کافی خون نکل رہا تھا اور پھر وہ کتا...... کہیں دوبارہ نہ آجائے۔" چوکیدار نے تشویش ظاہر کی۔

وہ آدمی بامشکل تکلیف سے آہستہ آہستہ چلنے لگا۔

"لیکن تم رات کو قبرستان میں آئے ہی کیوں تھے۔"

"وہ......وہ۔ میں اور میرے ساتھی ہم لوگ میت دفنانے آئے تھے کہ یہ آفت آن پڑی۔"

"اچھا۔ وہ جو بھاگ رہے تھے وہ تمہارے ساتھی تھے۔"

"ہاں ذلیل...... مجھے موت کے منہ میں چھوڑ کر

بھاگ گئے۔" وہ دونوں آہستہ آہستہ اندھیرے میں احتیاط سے قدم اٹھاتے ہوئے قبرستان کے داخلی دروازے تک پہنچے تھے کہ کتے کے بھونکنے کی آواز نے سارے قبرستان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

"اس خون خوار کتے کا کچھ کرتے کیوں نہیں، یہ تو انسانی جان سے کھیلنے والی بات ہے، اس کو گولی ماردو یا زہر مار گولیاں دے کر اس سے با آسانی جان چھڑائی جاسکتی ہے۔" وہ آدمی کراہ کر بولا۔

اس کی تکلیف آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔

"ہاں تب نا، جب یہ دن کو نظر آئے، نجانے کہاں غائب ہوجاتا ہے اور رات کو اکثر اس کی غرانے اور بھونکنے کی آوازیں آتی ہیں، لیکن یہ تو رات کو بھی پکڑائی نہیں دیتا۔ کچھ لوگ رات کو بھی اس کو مارنے آئے، مگر کچھ تو صبح کو مردہ حالت میں پائے گئے۔ کچھ قبرستان کے ماحول اور اس کے پھیلے خوف سے اتنا ڈر گئے کہ دوبارہ پھر قبرستان جانے کی ہمت نہ کرسکے۔" وہ کہہ رہا تھا کہ اب تو اس کتے نے قبروں کو بھی نہیں بخشا، ایک دو ماہ سے تقریباً ایسا ہی ہو رہا ہے کہ ہفتے میں ایک دو بار کوئی نہ کوئی لاش ادھ کھائی ہوئی قبر سے باہر دکھائی دیتی رہتی ہے۔ یہ اس کتے کے علاوہ اور بھلا کس کا کام ہوسکتا ہے۔"

"وہ چوکیدار اس آدمی کو آہستہ آہستہ لڑکھڑاتے ہوئے لے کر قبرستان سے باہر سڑک پر لے آیا، تاکہ کوئی سواری ملے اور اسے اسپتال لے کر جائے۔

"اتنے بڑے واقعات ہو رہے ہیں، ابھی تک کسی نے پولیس میں اطلاع کیوں نہیں دی۔ پولیس کو تو بتانا چاہیے تھا۔"

"پولیس کو۔" چوکیدار ہنسا۔ "پولیس بھلا کیا کرتی ہے، بس تماشا دیکھتی ہے۔ اس سے اور بھلا ہو ہی کیا سکتا ہے۔"

"لیکن پھر بھی۔" وہ آدمی کراہ اٹھا، درد اس کی برداشت سے باہر ہو رہا تھا، کپڑے خون سے آلودہ تھے۔ ٹانگ والی جگہ پر زخم تو اور بھی گہرا تھا، گوشت کا بڑا سا ٹکڑا جو کتے نے کاٹ لیا تھا۔ وہ سڑک پر چوکیدار کے سہارے بمشکل کھڑا تھا۔

"تمہاری حالت دیر بہ دیر بگڑتی جارہی ہے۔ اللہ کرے کوئی سواری مل جائے۔" چوکیدار کسی سواری کے انتظار میں کھڑا بس یہی دعا مانگ رہا تھا کہ کوئی سواری مل جائے تو اس آدمی کو جلد از جلد اسپتال پہنچادوں، وہ اس کی حالت دیکھ کر اب تو خاصا فکر مند ہوگیا تھا۔ دور سے سڑک پر گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سن کر چوکیدار کو تسلی سی ہوگئی، اسے یقین تھا کہ یہ وہ تانگے والا ہوگا، جو کہ اکثر رات کے کسی پہر قبرستان والی سڑک سے گزرتا تھا۔

گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز آہستہ آہستہ اس کے قریب آنے لگی اور پھر جیسے ہی قریب آیا تو چوکیدار نے دیکھا کہ اس کا اندازہ بالکل ٹھیک تھا۔ وہ تانگا ہی تھا۔ تانگا جیسے ہی اس کے قریب آیا، چوکیدار نے اسے آواز دی۔

"اے تانگے والا، ذرا روکو۔ ایک سواری ہے، اس کو اسپتال پہنچانا ہے، کافی زخمی حالت میں ہے۔"

چوکیدار کے یوں روکنے اور آواز دینے پر تانگا یک دم ہی ان کے قریب آکر رک گیا۔ گھوڑا زور سے ہنہنانے لگا۔

چوکیدار اس تانگے والے کو بغور دیکھنے لگا، مگر گھپ اندھیرا جو تھا جس سے کچھ خاص دکھائی نہیں دے رہا تھا اور دوسرا اس تانگے والے نے کسی سیاہ کپڑے کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا جس سے اس کا چہرہ بھی ڈھکا ہوا تھا۔ وہ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی کپڑوں کی گٹھڑی سی ہو۔

"ہم سواری کے انتظار میں کھڑے تھے وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ تمہارا ادھر سے گزر ہوگیا۔ بس اس زخمی آدمی کو اسپتال پہنچانا ہے۔"

"ٹھیک ہے! بٹھادو اسے۔" تانگے میں بیٹھے ہوئے اس شخص کے منہ سے عجیب سی رقت آمیز آواز آئی۔

چوکیدار کو لگا جیسے وہ کسی گہرے کنویں میں سے بول رہا ہو۔

"یہ زخمی ہے، اس کی حالت بہت خراب ہے، اس لیے لے جاتا ہوں، ویسے بھی میرا کام سواری اٹھانا ہے، مگر میرے بھی کوئی قوانین ہیں بھائی صاحب۔ رات کے اس پہر میں کسی سواری کو کم ہی اٹھاتا ہوں، البتہ آخری پہر کی بات کچھ اور ہی ہے۔ وہ ہی میرے اصل دھندے کا ٹائم ہوتا ہے۔"

چوکیدار اس کی بات کو سمجھ نہ پایا۔ اس کو جلدی تھی کیوں کہ اس زخمی شخص کو اسپتال پہنچانا تھا، جو مسلسل تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ اس لیے اس نے اس کی بات کو سنی ان سنی

کرتے ہوئے سہارا دے کر اس کو پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا۔
"تانگے والے اس کو احتیاط سے اسپتال پہنچا دینا۔ میں بھی ساتھ چلا جاتا مگر میری مجبوری ہے میں قبرستان کا چوکیدار ہوں، آج کل قبرستان کے کیا بلکہ پورے شہر کے حالات خراب ہیں، تمہیں تو اس بات کا اندازہ ہوگا ہی اور پھر مجھے اپنی ڈیوٹی بھی تو دینی ہے۔"
"فکر نہ کرو۔" اس سیاہ لبادے میں سے آواز آئی۔
"اس کو تو میں منزل تک پہنچا ہی دوں گا، ویسے میرا کام بھی یہی ہے۔"
تانگے والے نے گھوڑے کو ایک چابک رسید کر کے اس کو چلنے کا اشارہ دیا۔ گھوڑے کو ایڑ لگائی اور وہ سڑک پر دوڑنے لگا۔
وہ زخمی شخص پچھلی سیٹ پر لیٹ سا گیا۔ اس کو تو بس ایک ہی فکر تھی، کہ آخر کب اسپتال آئے گا۔
وہ چاہتا تھا کہ تانگے والا اس کو جلد از جلد اسپتال پہنچا دے، کیوں کہ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا، بے تحاشا خون بہنے سے اس کی حالت خراب اور درد میں شدت آ رہی تھی، اس نے اپنی ٹانگ سیٹ پر پھیلا رکھی تھی اور تانگے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی ٹانگ سے خون بہ کر سیٹ اور نیچے پائیدان پر گر رہا تھا۔
اچانک ہی تانگے کی رفتار میں تیزی آ گئی، تو اس کو ایک زبردست جھٹکا لگا۔ اس نے بمشکل اپنے آپ کو سنبھالا۔ اگر وہ اس وقت احتیاط سے کام نہ لیتا تو نیچے زمین پر اوندھے منہ جا گرتا۔
"اے بھائی...... ذرا آہستہ آہستہ چلاؤ۔ میری حالت کا اندازہ ہے تمہیں۔" اس کو لگا جیسے تانگے والا اس کی بات سن کر رفتار آہستہ کر دے گا۔ مگر...... تانگے والے کے کان پر جوں تک نہ رینگی، بلکہ اس کی رفتار میں اور بھی تیزی آ گئی، جس کی وجہ سے پیچھے بیٹھا وہ شخص پریشان ہو گیا۔
"اے تانگے والے تم سن نہیں رہے ہو کیا۔" بہرے ہو گیا۔ میں کہتا ہوں تانگے کی رفتار آہستہ کرو۔"
وہ تقریباً چلا اُٹھا، مگر تانگے والا تو یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اس کو کسی شے کا ہوش ہی نہ ہو، وہ تانگے کو تیزی کے ساتھ بھگائے جا رہا تھا۔ آخر اس نے اس کو اسی حالت پر چھوڑ دیا۔ مرتا کیا نا کرتا، مگر...... یک دم ہی زخمی شخص کے ذہن میں کئی خیالات نے جنم لینا شروع کر دیا۔ بعض دفعہ مشکل وقت میں انسان کو بہت کچھ یاد آ جاتا ہے، نجانے کیوں اس کی عقل ٹھیک کام کرنے لگتی ہے۔
تانگا نجانے کتنی دیر سے تیزی سے بھاگ رہا تھا مگر اسپتال ابھی تک نجانے کیوں نہیں آیا تھا، حالاں کہ قبرستان سے اسپتال کا راستہ اتنا زیادہ لمبا تو نہیں تھا، صرف چند کلومیٹر کا ہی تو فاصلہ تھا۔ اس نے ارد گرد چلتے ہوئے تانگے سے نظریں دوڑائیں، ہر سو پھیلی جھاڑیاں، سنسان علاقہ، دور دور تک کسی آبادی کا نام و نشان نہیں، اسپتال والا یہ راستہ تو نہیں تھا۔
وہ یک دم ہی خوف زدہ ہو گیا، ایک سرد لہر اس کے بدن میں اُتر گئی، وہ بہت ڈر سا گیا۔ یہ تانگے والا اسے کہاں لے جا رہا ہے۔
"تانگے والے، یہ کون سا راستہ ہے، تم راستہ بھول تو نہیں گئے، کہاں جا رہے ہو؟"
اس نے ہاتھ بڑھا کر اس تانگے والے کے کاندھے کو جھنجھوڑ دیا، مگر اسے یوں لگا جیسے اس نے کسی گوشت پوست کے انسان کی بجائے کسی خالی ہڈیوں والے ڈھانچے کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ اس کے کاندھے پر صرف ہڈیاں ہی تھیں، اس نے جلدی سے ہاتھ کھینچ لیا۔
ایک تو تیز رفتار تانگا، اوپر سے وہ پراسرار تانگے والا اور نامعلوم منزل، وہ خوف اور دہشت سے سمجھ ہی نا پایا کہ آخر وہ کیا کرے۔
کیا چھلانگ مار کر تیز رفتار تانگے سے اُتر جائے یا، مگر...... اتنی رفتار والے تانگے سے چھلانگ مارنا۔ کسی بڑی چوٹ کا خدشہ ہونا لازمی امر تھا اور اوپر سے اس کی حالت بھی ایسی نہیں تھی، ہاں البتہ وہ ٹھیک ہوتا تو یہ اور بات تھی، ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ یک دم ہی کسی کتے کی غراہٹ نے اس کے رہے سہے اوسان خطا کر دیے۔
اسے لگا جیسے یہ آواز بہت قریب سے آ رہی ہو، غراہٹ کو سن کر اس کو قبرستان میں اپنے ساتھ پیش آنے والا واقعہ اس کی آنکھوں میں جیسے دوبارہ گھومنے لگا۔
اس نے چلتے تانگے سے اِدھر اُدھر نیچے زمین پر نظریں دوڑائیں، مگر وہاں کوئی شے تو کیا کسی شے کا ہیولا

تک نظر نہیں آیا۔ اندھیرا تو تھا مگر کسی نہ کسی شے کے وجود کا احساس تو ہو ہی سکتا تھا، پھر کتے کے بھاگنے کی آواز تو لازماً ہی آنی تھی، مگر یہاں تو ایسی کوئی بات نہیں تھی، لیکن ساتھ ساتھ کتے کے غراہٹ کی آواز تیز سے تیز ہوتی جارہی تھی، وہ پاگلوں کی طرح کبھی ادھر کبھی اُدھر بار بار دیکھنے لگا، پھر اس نے اندازہ لگایا کہ آواز شاید تانگے میں سے ہی آرہی ہے۔ اس کو انجانا سا احساس ہوا کہ سیٹ کے نیچے کوئی چیز ہے۔ اس نے بڑی مشکل سے دل کو قابو کرتے ہوئے گردن جھکا کر نیچے کی طرف دیکھا تو ایک لمحے کے لیے تو اس کا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا، وہ سیاہ رنگ کا کتا تھا جو سیٹ کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔

ارے یہ تو وہی قبرستان والا کتا ہے، جو سیٹ کے نیچے بیٹھا میری طرف دیکھ رہا ہے۔ یہ دیکھ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ایک آدم خور کتے کی موجودگی کا احساس، وہ بھی اتنے قریب، اس کی زبان تالو سے چپک کر رہ گئی، اس نے چاہا کہ تانگے والے کو خبردار کرے، مگر وہ کوئی لفظ بول نہ سکا۔ ایک دم کتے نے غراہٹ کے ساتھ تیز آواز میں بھونکنا بھی شروع کر دیا۔ تانگے والے نے اچانک ہی مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر اوپر گرا ہوا سیاہ کپڑا اتر گیا تھا۔ زخمی شخص کی نگاہ جیسے ہی اس پر پڑی تو اس کی خوف سے چیخ نکل گئی، پھر اچانک ہی اسی سیاہ کتے نے سیٹ سے نکل کر اس پر حملہ کر دیا اور اس کی گردن کو جا دبوچا۔

اس شخص کے منہ سے ایک اور دلخراش چیخ نکلی، جو کافی زوردار تھی، مگر وہ اس تانگے والے کے ایک زوردار قہقہے میں دب کر رہ گئی۔

تھوڑی دیر بعد تانگے کی رفتار آہستہ ہو کر بالکل ختم ہو گئی۔ اندھیرے میں تانگے کے اندر ہڈیاں کڑکڑانے کی آوازیں آنے لگیں اور کچھ دیر بعد وہ بھی ختم ہو گئیں اور ماحول میں جیسے سکون ہی سکون ہو گیا۔ ہر طرف پراسرار خاموشی چھا گئی تھی کہ کسی بھیڑیے کی ایک زوردار طاقتور "آہو" کی آواز نے ماحول کو پھر منتشر کر دیا۔ وہ سیاہ کتا غوں غوں کی آواز نکالنے لگا، ایسے جیسے وہ بھی اس بھیڑیے کی آواز سے خوف زدہ سا ہو گیا ہو۔ اس نے تانگے سے چھلانگ لگائی اور تاریکی میں نجانے کہاں غائب ہو گیا۔

☆......☆

رات تقریباً آدھی سے زیادہ گزر گئی تھی، قبرستان میں بدستور خوف کے سائے اور گہری خاموشی کا راج تھا۔ کالے بادلوں اور چاند کی آنکھ مچولی بھی جاری تھی، البتہ اب چاند بھی بادلوں کی اوٹ سے نکلتا تو پھر کافی دیر تک چھپنے کا نام نہ لیتا تھا، اس لیے جب چاند کی چاندنی نے قبرستان میں قدم رکھا تو اس میں پھیلے اندھیرے نجانے کہیں دور بھاگ گئے۔ قبرستان کا چوکیدار قبرستان کے ایک طرف بنے ہوئے ایک مٹی کے چبوترے پر ایک چارپائی پر دنیا جہاں سے بے خبر سو رہا تھا۔ آدھی رات تک جاگنے کے بعد جب نیند نے زبردستی اس کو آ گھیرا تو وہ نیند کا آنچل لیے خواب خرگوش کے مزے لینے لگا۔

قبرستان والی سڑک پر ایک بار پھر گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز ابھری، یہ شاید وہی تانگا تھا، جو قبرستان کے ارد گرد کھڑے لمبے گھنے درختوں کے سائے میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا قبرستان کے چھوٹے سے آہنی سلاخوں والے گیٹ کے کچھ فاصلے پر آ کر رک گیا تھا۔ تانگے میں سے ایک ہیولا نمودار ہوا جو تانگے سے باہر چاند کی صاف روشنی میں بخوبی نظر آنے لگا تھا۔ وہ سیاہ لباس میں ملبوس کوئی شاید بوڑھا شخص ہی تھا۔ جس نے کمر کو ایک طرف جھکا رکھا تھا۔ ہاتھ میں ایک ڈنڈا تھا جس کے سہارے وہ تانگے سے باہر اترا تھا۔ اس کا چہرہ چوں کہ کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا اور وہ کپڑا اس کی تھوڑی تک آ رہا تھا اس لیے اس کے چہرے کو دیکھنا ممکن نہ تھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر تانگے کی پچھلی سیٹ سے ایک کپڑے کا بنا ہوا تھیلا اٹھایا، جس میں کچھ سامان تھا۔ اس نے اسے کاندھے پر لادا اور ڈنڈے کے زور پر آہستہ آہستہ چلتا ہوا قبرستان کا گیٹ کھول کر اس میں داخل ہو گیا۔

قبرستان میں چوں کہ چاندنی سی پھیلی ہوئی تھی، اس لیے ہر طرف روشنی کا راج تھا، وہ اس روشنی میں باآسانی قبروں میں سے گزرنے لگا، ساتھ ساتھ ہر قبر کو غور غور سے دیکھتا بھی جاتا، جیسے اس کو کسی قبر کی تلاش ہو۔ ہر طرف بنی ہوئی لاتعداد قبروں میں شاید وہ اپنی مطلوبہ قبر کو دیکھنے کا حامی تھا، وہ ڈنڈے کو زمین پر مارتا ہوا قبرستان کے دائیں طرف سے لے کر بائیں اور پھر ارد گرد

اطراف میں بنی ہوئی قبروں کو دیکھتا ہوا قبروں کے بالکل درمیان میں آ گیا، پھر اس نے اپنے قدموں کے نیچے دیکھا۔ ایک ادھ بنی ہوئی قبر اس کے قدموں سے کچھ فاصلے پر تھی، یہ شاید وہی قبر تھی، جس کو وہ چند افراد ڈر کے مارے خالی چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ اس نے جھک کر ہاتھ سے قبر کی مٹی اٹھائی، مٹی کی تازگی اور نرمی اس بات کا ثبوت تھا کہ یہ ابھی چند گھنٹے پہلے ہی بنی تھی۔ اس نے اس مٹی کو اپنی ناک کے قریب لا کر سونگھا اور مٹی دوبارہ نیچے پھینک دی۔ مٹی سونگھنے کا مطلب بھی یہی تھا کہ یہی اس کی مطلوبہ قبر تھی، جس کی تلاش میں وہ اس قبرستان میں آیا تھا، اس نے ہاتھ میں پکڑا ڈنڈا ایک طرف رکھا اور کاندھے سے بیگ اتار کر قبر کے قریب نیچے زمین پر جا بیٹھا، پھر اس نے ہاتھ تھیلے میں ڈال کر ایک بیلچہ نکالا جو کہ زمین کھودنے کے لیے استعمال ہوتا ہے، اس سے اس قبر کو ایک طرف سے کھودنا شروع کر دیا۔ قبر چوں کہ مکمل مٹی سے بھری ہوئی نہیں تھی، تھوڑی بہت ہی مٹی قبر میں موجود تھی۔ اس لیے مٹی کو ہٹانے میں اس کو زیادہ تگ و دو نہیں کرنا پڑی۔ اس کے ہاتھوں میں بجلی کی سی پھرتی تھی، وہ اس کام میں ماہر معلوم ہو رہا تھا۔ جلد ہی اس نے قبر کی تمام مٹی نکال لی، پھر اس نے کچی اینٹیں ہٹائیں تو مردہ اس کے سامنے تھا۔ اسے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر پراسراری مسکراہٹ آ گئی۔ وہ قبر میں داخل ہوا اور دونوں ہاتھوں سے جیسے تیسے زور لگا کر کھینچ تان کر مردے کو قبر سے باہر نکال ہی لیا۔

سفید کفن میں لپٹا وہ مردہ اس کے سامنے زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اس نے دوبارہ تھیلے میں ہاتھ ڈالا اور ایک بڑا سا تیز دھار والا خنجر نکال لیا۔ اس خنجر سے اس نے پہلے پہل مردے کا سارا کفن پھاڑ ڈالا۔ کفن ہٹا کر اس نے خنجر کی تیز نوک مردے کے سینے میں اتاری اور ناف تک زور سے ایک لکیر کھینچی۔ خون کے ساتھ ہی مردے کا سینہ چاک ہو گیا، پھر وہ خنجر سے اس کے سینے کے اندر زور زور سے ضربیں لگانے لگا اور پھر اپنا ہاتھ ڈال کر سینے میں سے مردے کا دل نکال لیا۔ بوڑھے کے دونوں ہاتھ خون سے آلودہ ہو گئے تھے۔ اس نے مٹی کی طرح دل کو بھی ناک کے قریب لا کر سونگھا اور اپنے دانتوں میں دبا کر چکا چک کھانے لگا۔

اس بوڑھے کی اس درندگی اور انسانیت سوز حرکت کو دیکھ کر قبروں میں پڑے ہوئے مردے بھی شاید اس کے انسان ہونے پر شرمندہ ہوں گے، جانور بھی کبھی اپنے ساتھی جانور کو مردہ حالت میں نہیں کھاتے لیکن ایک انساں کا یوں ایک مردے کو کھانا، عقل سے فارغ ہونے والی بات لگتی تھی، انسان تو انسان اگر کوئی حیوان بھی یہ منظر دیکھتا تو ایک منٹ کے لیے وہ بھی اپنی آنکھیں بند کر لیتا اور وہ بھی شاید یہ منظر برداشت نہ کر پاتا، لیکن وہ بوڑھا ان تمام باتوں اور ماحول سے بے خبر مردے کے مختلف اعضاء کھانے میں مصروف تھا۔ دل، انتڑیاں، گردے اور نجانے کیا کیا...... کہ نجانے کہاں سے وہی سیاہ کتا وہاں آن دھمکا اور بوڑھے کے قریب آ کر غوں غوں کرنے لگا اور پھر زور زور سے اپنی دم ہلانے لگا، ایسے جیسے وہ کتا اس بوڑھے کا فرماں بردار ہو، اس کا پالتو ہو۔ ”تو بھی میرے پیچھے پیچھے آن دھمکا ہے ذلیل۔“ وہ بوڑھا گردے کا ایک ٹکڑا چباتا ہوا بولا۔

”لگتا ہے میری طرح تیرا بھی پیٹ ابھی تک ایک شکار سے نہیں بھرا۔ لے کھا لے، مر......“ اس نے انتڑیوں کا ایک حصہ اس سیاہ کتے کے آگے ڈال دیا اور وہ اس پر جیسے ٹوٹ پڑا، پھر اس بوڑھے کے ساتھ وہ بھی گوشت کو یوں کھانے لگا جیسے صدیوں سے بھوکا ہو۔

ایک بار پھر بوڑھے نے خنجر اٹھا کر اس مردے کے ماتھے پر سیدھا رکھا اور پاس پڑی ایک اینٹ سے خنجر پر دو تین زور کی ضربیں لگائیں کہ مردے کی کھوپڑی اس کے سر سے علیحدہ ہو گئی، دماغ کا سارا حصہ صاف نظر آنے لگا، پھر وہ کھوپڑی کو ہاتھوں میں اٹھا کر اس میں اپنا منہ ڈال کر چپڑ چپڑ کھانے لگا اور پھر وہ خالی کھوپڑی اس سیاہ کتے کے آگے پھینک دی جو انتڑیاں کھا کر اسی انتظار میں شاید کھڑا تھا کہ اس کا مالک اور کوئی چیز اب ڈالے گا۔ یکا یک قبرستان میں کسی بھیڑیے کی آہو نے ہل چل سی مچا دی، یوں لگا جیسے قبرستان میں ہی کہیں کوئی بھیڑیا آوازیں نکال رہا ہو، بوڑھے کی توجہ بھی اس طرف ہو گئی۔

”مجھے پتا ہے تو یہیں کہیں ہے، آج کی رات تو پھر جاگا ہے، ملے گا تجھے بھی حصہ ملے گا میرے بچے، تو بھی تو بھوکا ہے۔“

بوڑھا زور زور سے سر کو ہلا کر بولا۔

قبرستان کا چوکیدار جو بڑے مزے سے چارپائی پر پڑا آرام سے سو رہا تھا کہ گیٹ کے پاس کھڑے ہوئے اس تانگے والے گھوڑے کے زور زور سے ہنہنانے کی وجہ سے اس کی آنکھ یک دم ہی کھل گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا، اس نے جلدی سے اپنی چپلیں پہنیں اور قبرستان کی دیوار کے پاس آ کر باہر گیٹ کی سمت دیکھنے لگا کہ اس کی نگاہ سیدھی ایک تانگے اور گھوڑے پر جا پڑی، وہی گھوڑا زور زور سے ہنہنا رہا تھا۔ چوکیدار نے غور سے دیکھا کہ یہ تو وہی گھوڑا تھا، جو اکثر رات کے پہر یہاں اس سڑک سے گزرتا تھا اور پھر ابھی تو اس نے اسی تانگے پر اس زخمی بندے کو سوار کرایا تھا اور یہ تو اسے لے کر روانہ بھی ہو گیا تھا، پھر یہ یہاں کیا کر رہا ہے۔

فوری نیند کی وجہ سے چوکیدار کو یہ پتا ہی نہ چل سکا کہ زخمی شخص کو روانہ کیے ہوئے تین گھنٹے سے زیادہ ہو گیا تھا۔

چوکیدار نے ارادہ کیا کہ گیٹ کھول کر اس تانگے کی طرف جائے، ابھی وہ اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہناتا کہ قبرستان میں کتے کے بھونکنے کی اور ساتھ ہی ہڈیاں بھنبھوڑنے کی آواز نے اس کی توجہ قبرستان کی طرف مبذول کرادی۔

''لگتا ہے وہ حرامی کتا پھر قبرستان میں آ دھمکا ہے۔ ٹھہر جا ابھی اس کی خبر لیتا ہوں۔'' چوکیدار نے چارپائی کے پاس پڑا ایک موٹا سا ڈنڈا جس کو اس نے اپنی حفاظت کے لیے رکھا ہوا تھا، اُٹھایا اور قبرستان میں احتیاط سے داخل ہو گیا۔

کتے کی بھونکنے کی آواز سے اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ قبرستان کے درمیان میں ہی موجود ہے، پھر چاند کی چاندنی میں اس نے سیاہ کتے کو بھی دیکھ لیا جو واقعی وہیں کھڑا نجانے کیا کھا رہا تھا۔ کتے کے منہ میں کوئی ہڈی ہی تھی، جس کے کھانے کی آواز چوکیدار کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ چوکیدار نے ڈنڈا فضا میں بلند کیا۔

''ٹھہر جا۔ بدبخت حرامی کے پلّے آج میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تجھے آج مار کے ہی دم لوں گا۔'' چوکیدار نے بلند آواز میں جیسے نعرہ لگایا اور کتے کی سمت بھاگا۔ ہڈی کھاتے کتے نے ایک دم کھانا چھوڑ کر اس کی سمت دیکھا۔ چوکیدار جو اپنی ہی دھن میں کتے کو دیکھ کر اس کو مارنے کے لیے بھاگتا چلا آ رہا تھا کہ یک دم ہی اس کی نگاہ قبر پر کتے کے ساتھ بیٹھے ہوئے کسی انسانی وجود پر پڑی، چوکیدار نے دیکھا۔ وہ انسانی وجود سیاہ رنگ کے کپڑے میں ملبوس پشت کیے ہوئے بیٹھا تھا۔

اسے دیکھ کر ایک دم ہی چوکیدار کا سانس پھولنے لگا اور اس کے ہاتھوں میں کپکپی طاری ہو گئی۔ وہ تو صرف کتے کو مارنے چلا تھا، مگر وہاں اکیلا صرف کتا تو نہ تھا۔ چند لمحے چوکیدار تو ساکت کھڑا یہ جائزہ لیتا رہا کہ آخر وہ ہے کیا چیز، پھر وہ ہمت کرتے بول ہی پڑا۔

''اے...... کون ہے وہاں، سامنے آ۔'' وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔

چاند کی کافی روشنی تھی، قبر پر بیٹھے ہوئے اس انسانی وجود نے فوراً چوکیدار کی سمت منہ پھیرا، اس کے چہرے پر کپڑا نہیں تھا اور چاندنی میں اس کا چہرہ واضح نظر آ رہا تھا۔ انتہائی ہیبت ناک اس کی شکل تھی، اس کا چہرہ کسی جھلسے ہوئے چمڑے کی طرح تھا، جس پر بے تحاشا خاردار لکیریں اُبھری ہوئی تھیں، ضرورت سے زیادہ لمبی ٹیڑھی ناک، پچکے گال، اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں جن میں ایک آنکھ کانی تھی اور دوسری بھی انسانی آنکھ سے مختلف تھی، ٹیڑھے میڑھے دانت، جن میں دو دانت باہر کی طرف نکلے ہوئے تھے، منہ سے ٹپکتا انسانی خون، چوکیدار کے لیے یوں یہ اچانک نظر آنے والا منظر نا قابلِ یقین تھا۔ خوف و دہشت سے اس کی چیخ نکل گئی۔ ہاتھ سے ڈنڈا چھوٹا اور نیچے زمین پر جا گرا۔ اس نے وہاں سے بھاگنا چاہا مگر...... پاؤں ایسے جیسے من من کے بھاری ہوں، ان میں سکت ہی نہ ہو چلنے کی، پھر اچانک چوکیدار کو جیسے ہی ہوش آیا، اس نے دیوانہ وار پیچھے کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ بھونکتا ہوا سیاہ کتا کسی سائے کی طرح اس کے پیچھے لگ گیا۔ چوکیدار چیختا چلاتا قبروں کے اوپر سے بھاگنے لگا۔ اس کو کوئی ہوش نہ تھا، ہوش تھا تو بس اتنا کہ قبرستان سے فوری نکل جائے، جیسے تیسے گرتے پڑتے اس نے قبرستان کا گیٹ عبور کیا اور اس نے چاہا کہ یا تو وہ تانگے میں بیٹھ کر بھاگ جائے یا پیدل ہی کسی سمت نکل پڑے۔ اتنے میں پیچھے سے بھاگتے ہوئے

کتے نے چھلانگ لگائی اور اس کو لیتا ہوا نیچے زمین پر جا پڑا۔ سیاہ کتا کہ ابھی اس کو کاٹ کھاتا کہ قریب ہی بھیڑیے کی خوف ناک آواز نے کتے کو جیسے ڈرا دیا۔ کتا بھاگ کر دور جا کھڑا ہوا۔ چوکیدار نے چاہا کہ بھاگ جائے، مگر قبرستان کی دیوار سے کسی بہت بڑی شے نے زقند بھری اور تانگے کے قریب آ کر کھڑی ہوگئی۔

چوکیدار نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ چھ سات فٹ پر بھاری بھرکم لمبے لمبے بالوں اور خونخوار بڑے دانتوں والا کوئی بھیڑیا تھا۔ خونی جانور چوکیدار نے زندگی میں اتنا بڑا بھیڑیا نہیں دیکھا تھا، گھوڑا ایک بار پھر زور زور سے ہنہنانے لگا، جیسے وہ بھی ایک دیو قامت جانور کی موجودگی سے خوف زدہ ہو۔

اپنے قریب موت کو دیکھ کر چوکیدار کا منہ کھلا اور آنکھیں پھیل گئیں۔ اس بھیڑیے کی آنکھیں کسی موتی کی طرح چمک رہی تھیں، اس نے سر آسمان کی طرف کیا اور اپنی گرج دار آواز میں "آہو" کیا۔ جب بھیڑیے کی اس کی طرف سے توجہ ہٹی تو وہ اٹھا اور آگے کی سمت سرپٹ بھاگا، لیکن بھیڑیے نے ایک اور جست لگائی اس کے اوپر اور اپنے لمبے نوکیلے دانتوں سے اس کا جسم ایک ہی جھٹکے میں ادھیڑ دیا۔ ایک دلخراش چیخ چوکیدار کے منہ سے نکلی، جو کہ اس کی زندگی کی آخری چیخ تھی۔

☆......☆

رات آہستہ آہستہ ڈھل سی گئی تھی، رات بیتی تو ساتھ ہی رات کی تاریکی بھی بھاگ گئی۔ سورج نمودار ہوا اور ہر طرف دن کا اجالا پھیل گیا، سورج نے آنکھ اٹھا کر زمین کی طرف دیکھا۔ ایسے جیسے اب زمین پر راج کرنے کا اس کا وقت ہو، صبح ہوتے ہوئے قبرستان والی سڑک جو سنسان اور خالی تھی، آہستہ آہستہ ٹریفک کا ہجوم ہونے لگا۔ کاروں، موٹر سائیکلوں، رکشوں اور سائیکلوں کے چلنے کی آواز بڑھنے لگی۔ لوگ اپنی ہی دھن میں اپنے اپنے کام دھندوں پر جانے کے لیے بھاگم بھاگ کر رہے تھے۔ ان کو اس بات کا کوئی ہوش نہ تھا کہ اردگرد کیا ہے، کوئی انہونی تو نہیں ہوگئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک سائیکل سوار کی نظر قبرستان کے گیٹ پر پڑی، جہاں اس نے ایک ادھ کھائی ہوئی لاش کو دیکھا، منظر اتنا خوف ناک تھا کہ سائیکل سے وہ تقریباً نیچے سڑک پر جا گرا۔

لاش کی آنکھیں اور منہ بہت سے سوالات کے جوابات دے رہے تھے۔ اس کی آنکھیں خوف و دہشت سے پھٹی ہوئی اور منہ بے تحاشا کھلا ہوا تھا۔ وہ واپس سائیکل سنبھالتے ہوئے اپنی بستی کی طرف بھاگا، جو بستی قبرستان کے قریب ہی آباد تھی۔

تیز تیز سائیکل چلاتے ہوئے اس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا کہ کس طرح وہ وہاں پہنچے اور بستی والوں کو اس واقعے کی اطلاع دے۔

اس کے بستی میں پہنچتے ہی یہ خبر اس بستی کیا، پورے شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور ساتھ ہی شہر کے لوگوں میں دہشت بھی پھیلتی گئی، جائے وقوع پر پولیس آئی، فوٹو گرافروں نے تصویریں کھینچیں، قبرستان کا مکمل جائزہ لیتے ہوئے جلد ہی ایک ایسی کھلی ہوئی قبر ملی۔ جس کا مردہ بھی باہر بڑی بری حالت میں پڑا ہوا تھا اور چند ہڈیوں کے علاوہ اس کے باقی اعضاء کا نام و نشان تک نہیں تھا۔

قبرستان میں باقی قبروں کی تسلی کر کے ان دو بچی کچھی لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دیا گیا، حالاں کہ پولیس جانتی تھی کہ ان لاشوں کا اس عمدگی سے پوسٹ مارٹم ہوا ہے کہ اب مزید اس بات کی گنجائش نہیں تھی، لیکن...... یہ کم بخت سرکاری ڈیوٹی۔

قبرستان میں ایک جم غفیر تھا۔ جس کسی نے اس واقعے کے متعلق سنا، وہ قبرستان ہی کی طرف بھاگا چلا۔ ہر کوئی ان لاشوں کو دیکھنے اور ان کے متعلق جاننا چاہتا تھا۔ ہجوم اتنا بڑھا کہ پولیس کو منتشر کرنا پڑا۔ موقع پر پولیس کے آفیسر نے بلند و بانگ دعوے کیے کہ ہم قاتل کو جلد ہی پکڑ کر عبرت ناک سزا دیں گے۔ وہ ہمارے ہاتھوں سے زیادہ دیر تک بچ کے کہیں جا سکتا اور پھر بپھری ہوئی خوف زدہ مشتعل عوام کو جھوٹی تسلیاں دیتے ہوئے جلد ہی سارے پولیس والے وہاں سے رخصت ہوگئے، تو قبرستان میں اور اس کے باہر پھیلے ہجوم نے بھی اپنے اپنے گھروں کا رخ کیا۔

یہ اس شہر میں اس طرح کا پہلا واقعہ تو نہیں تھا، بلکہ دو تین بار پہلے بھی اس طرح کا واقعہ ہو چکا تھا۔ شہر کے سنسان علاقے، آبادی سے دور جگہیں اور پھر قبرستان

میں اس طرح تین چار ادھ کھائی ہوئی لاشیں ملی تھیں۔
شہر کی عوام کے ساتھ شہر کی پولیس بھی کشمکش و پیچ میں مبتلا تھی کہ آیا یہ کوئی جنونی قاتل ہے یا کوئی جانور۔ پولیس بھی اس بات کا پتا چلانے میں ناکام رہی تھی کہ لوگوں نے قبرستان میں کسی ایسے کتے کا بھی ذکر کیا جو کہ آدم خور تھا، بلکہ کئی لوگ تو پہلے ہی اس کو مارنے کے لیے قبرستان آئے تھے، مگر کچھ تو قبرستان کے خوف و دہشت سے خود ہی دم توڑ گئے اور کئی جو بچ نکلے، ان میں سے چند نے پولیس میں رپورٹ درج کروادی۔ پہلے پہل تو پولیس نے کوئی کارروائی نہ کی، مگر اس واقعے کے بعد شہر کے کتوں، گن گن کر مارا جانے لگا۔

کتوں کو زہر کی گولیاں، گوشت اور کھانے کی چیزوں میں ڈال کر دی جانے لگی۔ قبرستان میں بھی پھرتے آوارہ کتوں کو گولی ماردی جاتی، اس طرح کرنے کرانے سے ایک ہفتے میں ہی کتوں کی لاتعداد نظر آنے والی فوج میں کمی خاصی کمی نظر آنے لگی، شہر کے چوراہوں، گلیوں میں بھی بہت ہی کم کتے نظر آنے لگے۔

پولیس اصل قاتل کو پکڑنے میں کیا بلکہ اس کا سراغ لگانے میں بھی ابھی تک ناکام ہو رہی تھی۔ اس طرح کے واقعات کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ پورے شہر میں تقریباً ویرانی سی چھا گئی۔ لوگ گھروں میں ہی دبک کر رہ گئے، خصوصاً رات کو تو شہر میں ہُو کا عالم ہو گیا۔ سڑکیں، گلیاں ویران، کاروباری لوگ اپنی دکانیں شام ہونے سے پہلے ہی بند کر دیتے۔ بازاروں، گلیوں میں تو بے رونقی سی چھا گئی، البتہ بسوں کے اڈوں اور ریلوے اسٹیشن پر ہجوم پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گیا، اس کی وجہ ایک یہ بھی تھی کہ لوگ اس شہر سے نقل مکانی کرنے لگے تھے، کتنی لوگوں نے اپنا بوریا بستر لپیٹا اور دوسرے شہروں کی راہ لے لی تھی اور اب ان کا شاید اس وقت تک دوبارہ اس شہر میں آنے کا پروگرام نہیں تھا، جب تک اس شہر کے حالات دوبارہ نارمل نہ ہو جاتے۔ لوگوں کو پروا تھی اپنی جانوں کی، اپنے بچوں کی، کیوں کہ شاید ان کو اندازہ تھا کہ جان ہے تو جہان ہے، اسی لیے شہر کے اس بڑے اسٹیشن پر بھی عوام کا بے تحاشا رش تھا۔ لوگوں کی اپنا اپنا سامان اٹھائے ادھر سے اُدھر بھاگم دوڑ جاری تھی۔ گاڑی ابھی کافی لیٹ تھی، مگر پھر بھی کچھ لوگوں کو ٹکٹوں کی فکر تھی، کچھ کو گاڑی میں موجود برتھ کی کہ برتھ والی جگہ ان کو مل جائے۔ ٹکٹیں خریدنے والے حضرات کی جلد بازی کچھ یوں بھی صحیح تھی کہ ہجوم زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ کہیں ٹکٹوں سے اور پھر گاڑی میں سیٹ سے محروم ہی نہ ہو جائیں، جنہوں نے ٹکٹیں خریدی نہیں تھیں ان میں گاڑی کے جلد از جلد اسٹیشن پر آنے کی بے چینی تھی۔

ان افراد کے ہجوم میں اسٹیشن پر دائیں سائیڈ پر ایک بنچ پر ایک دبلا پتلا لڑکا اپنا بیگ لیے ہوئے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا نام اکرم تھا، وہ بھی اپنے آبائی گاؤں اپنے والدین کے پاس واپس جا رہا تھا۔ وہ دو سال قبل ملازمت کی تلاش میں اس شہر میں آن بسا تھا۔ وہ زیادہ تو پڑھا لکھا نہیں تھا، بس واجبی سی تعلیم تھی، کیوں کہ اس کا گاؤں نہایت پسماندہ تھا جہاں تعلیم حاصل کرنے کے مواقع نہ ہونے کے برابر تھے اور نہ ہی روزی کمانے کا کوئی ٹھیک ذریعہ تھا، اسی لیے تو وہ گاؤں چھوڑ کر شہر میں آ گیا تھا۔ یہاں اس کی جلد ہی اچھی تو نہیں مگر گزارے لائق نوکری مل گئی تھی اور تنخواہ بھی مناسب ہی تھی، اس نے شروع شروع میں اس کو ہی غنیمت جانا اور نوکری کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے تعلیم کا سلسلہ بھی نہیں ٹوٹنے دیا اور پھر اپنا پسندیدہ مشغلہ مصوری پر بھی وہ نوکری اور پڑھائی سے وقت ملنے پر پوری پوری توجہ دیتا تھا۔ مصوری کا اس کو بچپن سے ہی شوق بڑا تھا۔ جلد ہی وہ اس کے رازو رموز سے کافی حد تک واقف ہو گیا۔ اس کی یہ پُرسکون زندگی شاید اسی ڈگر پر چلتی رہتی، مگر صرف دو ماہ میں شہر کے حالات ایسے خراب ہوئے کہ شہر کے باقی لوگوں کی طرح وہ بھی خوف زدہ سا ہو گیا۔ اس شہر کی یہ ہولناک خبریں آہستہ آہستہ دوسرے علاقوں میں بھی پہنچنے لگی تھیں۔ اس کے ماں باپ کو جیسے ہی علم ہوا کہ جہاں ان کا بیٹا ملازمت کرتا ہے اس شہر کے حالات اس حد تک خراب ہو چکے ہیں کہ کسی بھی وقت جان کی کوئی گارنٹی نہیں ہے تو انہوں نے خط لکھ کر اسے فوراً واپس آنے کا حکم دیا کہ اکرم بیٹا ہمیں پتا چلا ہے کہ شہر کے حالات بہت زیادہ اچھے نہیں، کسی جنونی قاتل کے ہاتھوں لوگوں کی جانیں محفوظ نہیں ہیں۔ ہمارا خط جیسے ہی تم کو ملے، سب کام

چھوڑ کر پہلی فرصت میں ہی تم واپس آنے کی کوشش کرو۔

یہ خط جیسے ہی اس کو ملا۔ اس نے فوراً ہی واپس اپنے گھر جانے کا ارادہ کرلیا۔ ویسے بھی وہ اس شہر کے دہشت زدہ ماحول میں مزید اب نہیں رہنا چاہتا تھا۔ دوپہر سے شام ہوگئی، لیکن اسٹیشن پر گاڑی کا کہیں نام و نشان تک نہیں تھا۔ دوسرے مسافروں کی طرح اس کی بھی شدید خواہش تھی کہ جیسے ہی گاڑی آئے وہ فوراً اس شہر سے روانہ ہوجائے لیکن گاڑی کا یہ شدید انتظار آہستہ آہستہ کوفت اور پریشانی میں تبدیل ہوتا جارہا تھا۔ جوں جوں گاڑی لیٹ ہوتی جارہی تھی اسٹیشن پر موجود ہر شخص میں بے چینی کا عنصر بھی تیز ہوتا جارہا تھا، لیکن جلد ہی اُن سب کی مشکل حل ہوگئی۔ ریلوے اسٹیشن پر لاؤڈ اسپیکر سے ایک نسوانی آواز اُبھری۔

”خواتین وحضرات! ہمیں بڑے افسوس سے یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ نے اتنی دیر انتظار کی زحمت اٹھائی، مگر اب آپ کو مزید انتظار کی کوفت اٹھانے کی بجائے یہ جان کر خوشی ہوگی کہ گاڑی جلد ہی اسٹیشن پر آنے والی ہے۔ آپ لوگوں سے التماس ہے کہ آپ لوگ اپنے سامان اور اپنے بیگ وغیرہ کی حفاظت رکھیں اور اگر کہیں مشکوک افراد نظر آئیں تو فوراً ہی ہمیں اطلاع کریں۔ شکریہ۔“

گاڑی کے آنے کا سن کر مسافروں کے چہرے خوشی سے کھل اُٹھے۔ کاندھے پر بیگ لٹکائے بنچ پر بیٹھے ہوئے اکرم کو بھی سکھ کا سانس ملا۔ جلد ہی گاڑی ہارن بجاتی ہوئی اسٹیشن پر آرکی، مسافر گاڑی کی طرف دوڑ پڑے اور نشست کے لیے جلد ہی مسافروں میں دھکم پیل شروع ہوگئی۔ گاڑی سے اترنے والے مسافر تو چند ہی تھے، مگر وہاں سے جانے والے گنتی میں شمار نہیں ہوسکتے تھے۔ ہر عورت مرد کو جلدی تھی کہ کسی طرح وہ ڈبے میں پہنچ جائے، اسٹیشن کا حال اکھاڑے کی کشتی جیسا ہوگیا، جس میں ہر فرد دوسرے سے سبقت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اسٹیشن کے عملے نے صورت حال کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی مگر بے سود...... لوگ تو کسی سانڈ کی طرح بپھرے ہوئے تھے۔ یہ عالم اس وقت تک رہا، جب تک اسٹیشن پر موجود تمام مسافر گاڑی میں سوار نہ ہوگئے، اکرم بھی اس جم غفیر میں بڑی مشکل سے ایک ڈبے تک پہنچنے کی کوشش میں کامیاب ہوگیا۔ ڈبے میں رش تو تھا، مگر اس کو سیٹ ڈھونڈنے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی، ورنہ اس کا خیال تھا کہ اتنے رش میں اس کو کھڑے ہوکر ہی سفر کرنا پڑے گا۔ سیٹ پر بیٹھ کر جیسے اس نے سکون سا محسوس کیا۔

تھوڑی ہی دیر میں گاڑی نے روانگی کا ہارن بجایا تو ڈبے میں ایک باریش بزرگ جو کہ مکمل سفید کپڑوں میں ملبوس تھے داخل ہوئے۔ اکرم کی ان پر نگاہ پڑی، سفید کپڑوں کی طرح ان کی داڑھی اور بالوں کا رنگ بھی سفید تھا، ان کا چہرہ زرد اور سپاٹ تھا، جس میں کوئی لالی نظر نہیں آرہی تھی، جو کہ زندگی کی علامت ہوتی ہے۔

وہ بزرگ ڈبے میں آکر کھڑے ہوگئے۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر ڈبے میں موجود سارے مسافروں کو غور سے دیکھنے لگے، مگر حیرت کی بات تھی کہ اکرم کے علاوہ ڈبے میں موجود کسی بھی مسافر نے ان پر کوئی توجہ ہی نہ دی۔ توجہ تو چلو دور کی بات، بزرگ کو ایک نگاہ دیکھنے کی بھی کوشش نہ کی۔

وہ سب ان سے ایسا برتاؤ کر رہے تھے کہ نجانے جیسے وہ انہیں دیکھ ہی نہ رہے ہوں۔

بزرگ کافی دیر یونہی کھڑے رہے۔ وہ شاید کسی

اچھی باتیں

☆ میں نے شجر علم کا میوہ توڑ لیا ہے، جس میں لکھا ہے کامیابی ان کے لوگوں کے لیے ہے جو کوشش کرتے ہیں۔

☆ طویل گفتگو ایک تو متکلم کی حیثیت سے پردہ اٹھا دیتی ہے دوسرے سننے والے کی دلچسپی ختم کردیتی ہے اس لیے حسن کلامی یہی ہے کہ کم اور ٹھوس ہو۔

☆ ایسی چیز پر تکبر کرنا جو نہ تمہارے پاس رہے گی نہ تم اس کے پاس، جہالت و نادانی ہے۔

☆ لوگوں سے اس طرح میل جول رکھو کہ تم سے ملیں تو خوش ہوں اور تم مرجاؤ تو تمہارے لیے روئیں۔

☆ کچھ لوگ نگاہ کی طرح ہوتے ہیں وہ ہمارے ساتھ ہوں تو اندھیروں میں بھی راستے مل جاتے ہیں۔

(رضوانہ کوثر۔ لاہور)

سیٹ کے متلاشی تھے۔ اکرم کو ان پر ترس آیا کہ اس بڑھاپے میں وہ کھڑے ہو کر کیسے سفر کریں گے۔ نجانے ان کو کہاں جانا ہو۔

کوئی شخص ان کو دیکھ تک نہیں رہا تھا تو پھر بھلا کوئی اپنی سیٹ کہاں دینے والا تھا۔

"بابا جی ادھر آجائیے۔" اس نے بزرگ کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اکرم کے پاس اتنی جگہ تھی کہ اگر وہ ذرا سمٹ کر بیٹھ جاتا تو ایک شخص کے بیٹھنے کی جگہ با آسانی بن سکتی تھی۔ اکرم نے خود کو سمیٹ کر ان کے لیے جگہ بنائی، تو بزرگ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے اس کے پاس جا بیٹھے۔

بزرگ کا جسم اس کے جسم سے ٹکرایا تو اکرم کو یوں لگا جیسے ان کا جسم گوشت پوست کا نہیں کسی نرم روئی سے بنا ہوا ہو۔ بزرگ کا جسم روئی کی طرح نرم تھا۔

"تمہارا شکریہ نوجوان، تم نے میرا خیال کیا۔" بزرگ نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"نہیں بابا جی۔ کوئی بات نہیں اویسے بھی بزرگوں کا خیال کرنا نیکی کا کام ہے۔" اکرم نے بزرگ کے چہرے کی طرف نگاہ ڈالی، تو اس کی نگاہ چہرے پر سے ہوتے ہوئے آنکھوں پر جا ٹھہری۔ اس کو بوڑھے کی آنکھیں بے نور سی لگیں۔

"ہاں۔ مگر آج کل نیکی کا کون سوچتا ہے۔ آج تو بس ہر طرف ہی بدی کا راج ہے۔ برائی کا بول بالا ہے، بدی ہی بدی...... دنیا اس میں اس قدر جکڑ کر رہ گئی ہے کہ شاید کبھی اس سے آزاد نہ ہو سکے۔"

"نہیں بابا۔" نیکی کرنے والے نیک گزار لوگ بھی تو دنیا میں موجود ہیں اور پھر انہی لوگوں کی وجہ سے دنیا قائم ہے۔ بدی کے لاکھ اندھیرے سہی مگر نیکی کی ایک چھوٹی سی کرن ہی ان اندھیروں کو دور کرنے کے لیے کافی ہے۔"

"ہوں۔" اس بزرگ نے ہنکار بھری، "پڑھے لکھے، روشن دماغ، روشن دل کے لگتے ہو۔ ایسے ہی لوگوں کی اس دنیا کو ضرورت ہے۔ کبھی بدی کے یہ گھپ اندھیرے چھٹ سکیں گے، سچائی حق کی فتح کبھی ہو سکتی ہے۔"

"میں بھلا بابا اس قابل کہاں ہوں۔"

"میں جو دیکھ رہا ہوں لڑکے وہ تم نہیں دیکھ رہے۔" بزرگ کا لہجہ بڑا سپاٹ تھا۔

"میری نگاہیں کبھی دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ مجھے لگتا ہے کہ جس بندے کی تلاش میں، میں بھٹکتا پھر رہا تھا، آج وہ تلاش میری مکمل ہو گئی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"تم اتنی آسانی سے نہیں سمجھو گے۔ بس یہ کہ تم میں وہ طاقت اور وہ قابلیت ہے، جس سے تم وہ کچھ کر سکتے ہو، جو کہ کئی سو افراد مل کر بھی نہیں کر سکتے۔"

"بھلا مجھ میں ایسی کون سی طاقت ہے بابا۔ آپ کھل کر بات کریں مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا ہے۔" اکرم واقعی الجھن کا شکار ہو گیا تھا۔

"میں نے کہا نہ کہ تم ابھی نہیں سمجھ سکتے۔ وقت تمہیں ہر چیز یاد کرا دے گا اور ہر چیز اپنے وقت پر ہی اچھی لگتی ہے۔"

"مگر......!" وہ اس الجھن کو سلجھانا چاہتا تھا۔

"کچھ تو بتائیں۔"

"بہت جلد باز ہو، لیکن کبھی کبھی جلد بازی اچھے اثرات لے کر نمودار ہوتی ہے۔ اس دنیا میں انسان دوسرے انسان کو مار رہا ہے۔ انسان کا گوشت نوچ رہا ہے۔ زندہ درگور کر رہا ہے، مگر یہ سب انسانیت کے کام تو نہیں، انسان تو اشرف المخلوقات ہے، مگر اتنا بڑا اشرف ٹھکرا کر نجانے کیوں وہ انسان سے حیوان بننے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔" بولتے بولتے وہ بزرگ چند لمحے کو رکے۔

"لیکن اگر انسان حیوان کی ایک جھلک بھی دیکھ لے تو شاید خوف سے ہی مر جائے۔ تب ہی جا کر انسان کو پتا چلے گا کہ وہ جو کچھ بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ اپنے اصل روپ میں کتنی بھیانک دہشت ناک مخلوق ہے وہ جو حیوانی مخلوق ہمارے ہی ارد گرد موجود ہے۔ آسانی سے دکھائی نہیں دیتی، لیکن ہمارے ساتھ ساتھ اس طرح رہتی ہے کہ تمہیں خبر تک نہیں ہوتی اور جب خبر ہوتی ہے تو بہت دیر ہو جاتی ہے۔"

"حیوانی مخلوق۔ ہمارے ارد گرد، بابا کیسی باتیں کر رہے ہیں، ایسی کون سی مخلوق ہے۔" اکرم کسی صورت بھی ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"تم مانو یا نا مانو اور پھر بھلا تمہارے نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے۔ تمہارے نہ ماننے سے ان کا وجود کیا ختم

ہو جائے گا۔ یہ وہ مخلوق ہے جو کئی روپ دھارے ہوئے گوشت اور خون کی طلب کرتی ہے۔ رات کے سیاہ اندھیرے میں اِدھر اُدھر بھٹکتی رہتی ہے۔ انسان ان کے چنگل میں ایک بار پھنس جائے تو بچنا مشکل ہو جاتا ہے۔"

اکرم کو لگا جیسے بابا کی دماغی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ بڈھے کا دماغ کمزور ہے بھی تو اول فول بولے جا رہا ہے۔ وہ سوچ کر رہ گیا۔

"کس سوچ میں پڑ گئے ہو۔" بزرگ اس کو یوں کسی سوچ میں ڈوبے دیکھ کر بولے۔

"نہیں کچھ نہیں۔" اب وہ اس کو کیا بتاتا کہ وہ اس کے بارے میں کیا خیال آرائی کر رہا ہے۔

"مجھے پتا ہے کہ تم یہی سوچ رہے ہو کہ میری دماغی حالت خراب ہے۔" اکرم نے چونک کر اس بڈھے کی طرف دیکھا اس کو کیسے اندازہ ہوا کہ میں یہی سوچ رہا ہوں۔

"میں سب جانتا ہوں۔"

"اچھا چلو مان لیں کہ حیوانی مخلوق کا وجود ہے، جو انسانوں کو اپنا شکار بناتی ہے، مگر......" وہ کچھ دیر ٹھہر کر بولا۔ "آپ کو کس طرح پتا چلا، کیسے معلوم ہوا۔ آپ کا ان سے کیا واسطہ ہے۔"

اکرم ایک ساتھ کئی سوالات پوچھ کر اس بڈھے کو الجھا کر اصلیت معلوم کرنے کے چکر میں تھا کہ آیا وہ بزرگ کتنا سچا ہے۔

"میں نے تمہیں پہلے بھی کہا ہے مجھے سب معلوم ہے اور پھر واسطہ......! تمہیں کیا لگتا ہے؟" اس بڈھے نے الٹا اس سے سوال کر ڈالا۔

"میں۔ میں بھلا کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"اگر میں یہ کہوں...... کہ میں بھی کبھی ان میں سے ایک تھا تو۔؟"

اکرم جیسے چونک سا گیا۔ اس کو اس جواب کی توقع نہیں تھی۔

"حیوانوں کو تو مر کر بھی چین نہیں ملتا جیسے میں......"

اس بزرگ نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا اور یکا یک ہی اس کا وجود ہوا میں تحلیل ہو گیا۔

اکرم ہکا بکا اس خالی جگہ کو دیکھتا رہا جہاں ابھی بوڑھا براجمان تھا۔ یہ سب اچانک کیسے ہوا؟ اس نے اپنی آنکھیں ملیں کہ کہیں وہ کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا ہے، مگر یہ حقیقت تھی۔ اٹل حقیقت۔

"ارے وہ بوڑھا کہاں چلا گیا؟" وہ خوف زدہ ہو کر جیسے چلا اٹھا۔

"کون بوڑھا۔" اس کے ساتھ سیٹ پر بیٹھا ہوا ایک آدمی اسے یوں چلاتے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ڈبے میں موجود باقی افراد بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"وہی بوڑھا آدمی جو میرے ساتھ اس سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا، مجھ سے ابھی باتیں کر رہا تھا کہ پتا نہیں اچانک کہاں چلا گیا۔"

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ تمہارے ساتھ تو میں بیٹھا ہوں، یہ بوڑھا کہاں سے آ گیا۔"

"پر وہ میرے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔" اکرم بضد تھا۔

"ہم جب سے ڈبے میں آ موجود ہوئے ہیں، کسی بوڑھے آدمی کو ہم میں سے کسی نے بھی نہیں دیکھا۔" دوسری سامنے والی سیٹ پر بیٹھا ہوا ایک شخص بولا۔

"کیا۔" اکرم ششدر ہو کر رہ گیا۔

"وہی پاگل لگتا ہے یہ لڑکا۔" ایک موٹی سی عورت ڈبے میں موجود باقی افراد کو متوجہ کرتے ہوئے بولی۔

"کب سے دیکھ رہی ہوں، خود سے اکیلے ہی باتیں کیے جا رہا تھا۔"

اکرم کو ایسے لگا جیسے اس کا دماغ سُن سا ہو کر رہ گیا، اسے کچھ بھی سمجھ نہیں لگ رہی تھی کہ آخر اس کے ساتھ ہوا کیا ہے؟ وہ سر کو پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ڈبے میں موجود افراد اس کی طرف ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

تقریباً دو گھنٹے کی مسافت کے بعد اچانک ہی گاڑی کو بریک لگ گیا، گاڑی آہستہ آہستہ چلتے چلتے رک گئی، کوئی اسٹیشن تھا، گاڑی کھڑی ہوئی، تو ڈبے میں موجود افراد ڈبے کی کھڑکیوں سے باہر کی طرف دیکھنے لگے۔ جن کی منزل مقصود آن پہنچی تھی، انہوں نے سامان سنبھالا اور ڈبوں سے اُترنے لگے۔ کچھ مسافر ویسے ہی چہل قدمی کے لیے اتر آئے، اکرم نے بھی بیگ اُٹھایا اور نیچے اُتر آیا۔ ابھی اس کی منزل دور تھی، اس نے مزید سفر کرنا تھا، مگر نجانے کیوں اب اس کو اس ڈبے سے خوف محسوس ہونے لگا تھا، دوسرے ڈبے میں سفر کا سوچ

کر ہی اس نے اپنا بیگ اُٹھایا تھا۔

وہ اسٹیشن پر اُترا تو شام اب رات میں تبدیل ہو چکی تھی۔ پورے چاند کی رات تھی، چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ اکرم نے دیکھا وہ چھوٹا سا اسٹیشن تھا، لیکن خاصا قدیم لگ رہا تھا۔ رات میں تو وہ اور بھی پراسرار اور کھنڈر نما عمارت کی شکل میں دکھائی دے رہا تھا۔ اسٹیشن پر اکا دکا افراد چہل قدمی کے لیے نکلے ہوئے تھے یا پھر گاڑی میں چڑھنے کے لیے چند مسافر تھے۔ زیادہ تر افراد تو ٹرین کے ڈبوں میں ہی دبکے ہوئے بیٹھے تھے۔ اسٹیشن پر ہر سو خاموشی پھیلی ہوئی تھی، دفعتاً کسی اُلو کی منحوس آواز نے اس خاموشی کے قفل توڑ دیے۔ اسٹیشن کے احاطے کے آخری حصے میں ایک بڑا سا پیپل کا درخت تھا، جس کے نیچے پانی کا ایک نل لگا ہوا تھا۔ اکرم ہاتھ منہ دھونے کی غرض سے اس کی طرف جا نکلا۔ اس نے بیگ نل کے پاس رکھا اور جھک کر نل کو کھولنے لگا۔ نل میں پانی زیادہ نہیں تھا۔ بس ایک باریک پانی کی دھار بہنے لگی کہ اس کے بامشکل صرف ہاتھ ہی گیلے ہو سکے تھے۔ اس نے گیلے ہاتھ ہی منہ پر پھیرنے کا ارادہ کیا، مگر اس کے ہاتھ جیسے ہی ناک کے قریب لگے، اس کو ہاتھوں سے عجیب سی بدبو کا احساس ہوا۔ وہ چونک گیا کہ اس کے ہاتھوں سے بو کیوں آرہی ہے۔ یہ بو پہلے تو نہیں تھی، غور کرنے پر اس نے محسوس کیا کہ نل کے پانی میں خرابی ہے۔ یہ چیک کرنے کے لیے اس نے نل کے پانی کو ایک بار پھر سونگھا۔ اس میں شدید ناگوار قسم کی بدبو آرہی تھی۔ اس کا شک صحیح تھا، وہ فوراً گھبرا کر سیدھا ہو گیا۔ الو کی تیز آواز ایک بار پھر اسٹیشن پر گونجی۔ یکا یک کوئی بڑی سی اُڑتی ہوئی چیز اس کے چہرے پر چمٹ گئی، اکرم کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے نوکیلی سوئیاں اس کے چہرے میں گاڑ دی ہوں۔ اسے شدید درد کا احساس ہوا۔ وہ چیز مسلسل اس کے چہرے پر چمٹی ہوئی اسے کاٹ رہی تھی، اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ زور لگا کر اس شے کو اپنے چہرے سے ہٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ یکا یک اس شے نے اس کے چہرے کو چھوڑا اور اس کے ہاتھوں سے نکل کر اوپر آسمان کی طرف اُڑ گئی۔ اکرم نے فوراً مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک بہت بڑی کالی سیاہ رنگ کی چمگادڑ تھی۔ اتنی بڑی چمگادڑ اس نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ خوف زدہ سا گیا۔ اس چمگادڑ نے اس کے ماتھے پر کاٹنے کی کوشش کی تھی اس کے ماتھے سے خون نکل کر اس کے چہرے پر گرنے لگا تھا۔ اکرم نے جیب سے رومال نکال کر پہلے اس خون کو صاف کیا اور پھر ماتھے پر کس کے پٹی کی طرح رومال کو باندھ دیا۔ اس طرح کرنے سے جلدی خون رک گیا۔ اسے فضا میں ایک بار پھر پروں کے پھڑ پھڑانے کی آواز آئی۔ اس نے بے اختیار اوپر کی طرف دیکھا چمگادڑ منڈلا رہی تھی کبھی وہ اُڑتے ہوئے اس کے دائیں جانب جاتی تو کبھی بائیں جانب۔ وہ دوبارہ حملہ کرنے کے موڈ میں دکھائی دے رہی تھی۔ اکرم اس آفت پر حواس باختہ ہو گیا۔ یہ نئی مصیبت اس کے گلے میں آن پڑی تھی۔ وہ خونی چمگادڑ کسی بھی وقت اس پر دوبارہ حملہ کر سکتی تھی اور دوسرا حملہ کافی کارگر بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ اس لیے اب اس کا یوں کھڑے رہنا بھی ٹھیک نہیں تھا اور نہ چلتے رہنا موزوں تھا، بس وہاں سے تیزی کے ساتھ بھاگنا ہی چمگادڑ سے بچ نکلنے کا آسان عمل تھا۔ اس درخت سے گاڑی کا فاصلہ تو زیادہ تھا، مگر اسٹیشن کے بڑے کمرے تک پہنچنا آسان تھا۔ وہ تیزی سے بیگ سنبھالتا ہوا اسٹیشن کے اس بڑے کمرے کی طرف بھاگا۔ فضا میں پرواز کرتی ہوئی وہ بڑی چمگادڑ فوراً اس کے پیچھے لپکی۔ یہاں تک کہ وہ تیزی سے دوبارہ اس پر جھپٹ پڑتی، وہ کمرے میں داخل ہو چکا تھا۔ چمگادڑ اپنے بڑے بڑے پر پھڑ پھڑاتی ہوئی شمال کی جانب اُڑ گئی۔ کمرے میں کھڑا اکرم اس کو اتنی دیر تک دیکھتا رہا جب تک کہ وہ اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔ اکرم نے دیکھا اس بڑے کمرے میں کوئی مسافر نہیں تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ گرمیوں کے دن تھے۔ اس لیے اس ٹھنڈی رات کا لطف لینے کے لیے مسافر باہر اسٹیشن پر ہی خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اکرم دوبارہ اسٹیشن پر جانے کی بجائے اسٹیشن کی پچھلے حصے کی جانب مڑ گیا۔ اسٹیشن کے پچھلا حصہ بیابان اجاڑ قسم کا تھا۔ دور دور تک کسی آبادی کا نشان نہیں تھا۔ سامنے ہی کچی سڑک تھی جو اسٹیشن سے

ہو کر شہر سے جا ملی تھی۔
کافی دیر وہاں کھڑے رہنے کے بعد اکرم نے واپس جانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اس کی نگاہ شمال کی جانب اٹھ گئی، وہ کیا دیکھتا ہے کہ ایک نوجوان لڑکی بھاگتے ہوئے ادھر ہی آ رہی تھی، جہاں وہ کھڑا تھا۔ لڑکی کافی خوب صورت تھی، اس کے کالے گھنے بال تھے، جو اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ لڑکی کافی پریشان اور خوف زدہ لگ رہی تھی۔ بھاگتے بھاگتے وہ اس سے ٹکرا گئی، یوں اس کے ٹکرانے سے اکرم لڑکھڑایا ضرور مگر فوراً اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا، ورنہ وہ نیچے زمین پر اوندھے منہ جا گرتا۔
"وہ۔ وہ۔ مجھے ماردے گا۔ مجھے بچالو۔" لڑکی اپنی خوب صورت سریلی آواز میں چلا اٹھی۔
"کون۔" اکرم اچانک اس صورت حال پر بوکھلا سا گیا، لیکن لڑکی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا، بلکہ تیزی سے جنوب کی طرف بھاگ نکلی، جہاں بے تحاشا درختوں کی بہتات تھی۔ اکرم اس کو یوں بھاگتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔ اس نے دو بار اس کو آواز بھی دی اور اس کو روکنے کی کوشش بھی کی، مگر وہ لڑکی سرپٹ بھاگ رہی تھی۔
اکرم نے سوچا، لڑکی کسی مصیبت میں گرفتار معلوم ہوتی ہے، اس کی جان کو خطرہ ہے۔ اسے اس کی مدد کرنی چاہیے۔ مگر کیسے.....؟
ایک دم ہی اس کو اس پولیس والے کا خیال آیا، جو کہ اسٹیشن پر موجود تھا۔ وہ تیزی سے واپس اسٹیشن کی طرف بھاگا۔
اسٹیشن پر موجود ایک موٹے سے پولیس والے نے یوں اسے بھاگتے ہوئے دیکھا تو اسے آواز دے کر روک لیا۔
"اے لڑکے، کیا بات ہے۔" پولیس والا اونچی آواز میں بولا۔
اکرم بھاگتے ہوئے اس کے پاس جا پہنچا۔ "وہ، وہ ادھر اسٹیشن کے پچھلی طرف ایک لڑکی کی جان کو خطرہ ہے۔"
"لڑکی کی جان کو خطرہ۔" پولیس والا چونک گیا۔
"تم سچ کہہ رہے ہونا۔"
"ہاں۔ وہ لڑکی کافی خوف زدہ تھی۔ کوئی مارنے کے لیے اس کے پیچھے لگا ہوا ہے، مجھے مدد کا کہہ کر وہ جنوب کی جانب بھاگ نکلی۔ میرے خیال میں ہمیں جلد از جلد اس کی مدد کرنے کے لیے اس کے پیچھے جانا ہوگا۔ کہیں کوئی اسے مار ہی نہ ڈالے، میں اس ہی لیے آپ کے پاس فوری بھاگ کر آیا ہوں۔" اکرم اکھڑی ہوئی سانسوں کو بحال کرتے ہوئے تیزی سے بولا۔
"اچھا۔" پولیس والے نے ہنکارا بھری۔
"چلو میری ساتھ۔ مجھے دکھاؤ وہ کس طرف بھاگی ہے۔"
"جی چلیں میرے ساتھ۔" اکرم نے فوراً ہامی بھری۔
وہ تیزی سے بھاگتے ہوئے اس سمت کی طرف مڑے، جہاں سے لڑکی تیزی سے بھاگ نکلی تھی، کافی دیر بھاگتے بھاگتے وہ اس جگہ جا پہنچے جہاں درختوں کی بہتات تھی اور ارد گرد مٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹیلے تھے، جن پر خاردار نوکیلی کانٹوں والی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔
"کہاں ہے وہ لڑکی۔ تم تو کہہ رہے تھے کہ وہ ادھر کی ہی طرف بھاگی ہے، یہاں تو کسی بھی لڑکی کا نام ونشان نہیں ہے۔" پولیس والا غصیلے لہجے میں اس سے گویا ہوا۔
"میں نے ادھر ہی اس کو بھاگتے ہوئے دیکھا تھا، نجانے کہاں چلی گئی۔" اکرم کو بھی حیرت تھی کہ وہ لڑکی آخر چلی کہاں گئی۔
"میرا یقین کریں صاحب۔"
"اگر وہ لڑکی ادھر ہوتی تو نظر نہ آجاتی۔ میرا دماغ خراب ہو گیا تھا کہ فضول میں ٹائم برباد کرنے یہاں چلا آیا۔ اپنے دماغ کا علاج کراؤ لڑکے، بے وقوف کہیں کا۔" پولیس والا ابھی کچھ اور کہتا کہ درختوں کے جھنڈ میں کسی نسوانی رونے کی آواز نے دونوں کو چونکا دیا۔
"میں نے کہا نا کہ لڑکی ادھر ہی آئی ہے۔ میرے خیال میں وہ خوف زدہ ہو کر رو رہی ہے۔" اکرم تیز لہجے میں بولا۔
پولیس والے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اب اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا۔ لڑکی ادھر ہی موجود تھی۔
وہ دونوں اس رونے کی آواز کا پیچھا کرتے ہوئے درختوں کے جھنڈ کے اندر داخل ہو گئے۔ ان کو زیادہ مشقت نہیں کرنا پڑی۔ ایک بڑے کیکر کے درخت کے

تنے کے ساتھ گھٹنوں میں سر دیے وہ ان دونوں کو نظر آ گئی۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے لڑکی کے قریب جا پہنچے، پورے چاند کی رات تھی، مگر گھنے درختوں کی وجہ سے چاند کی روشنی اس جگہ پر نہیں پہنچ رہی تھی۔ ہلکا ہلکا سا اندھیرا چھایا ہوا تھا، وہ لڑکی مسلسل بین کرنے کے انداز میں روئے جا رہی تھی۔

"دیکھو تم نے مدد کرنے کا کہا تھا نا، میں خود پولیس والے کو لے آیا ہوں۔"

"تم ہمارے ہوتے ہوئے محفوظ ہو۔" اکرم اس لڑکی کو دلاسا دینا چاہتا تھا تا کہ وہ یوں رونا بند کر دے۔

"ہاں تم کو کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔" پولیس والا اس کے قریب آن بیٹھا، مگر وہ مسلسل ہی روئے جا رہی تھی۔

"تم یہ رونا بند کرو اور ہمیں بتاؤ۔ کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ، کون تم کو مارنا چاہتا تھا......شاباش، حوصلہ کرو۔"

پولیس والے کا شاید یہ دلاسا تھا کہ لڑکی روتے روتے اچانک چپ کر گئی۔ اکرم اور پولیس والے کی نظریں اس پر تھیں۔ لڑکی نے ایک دم ہی گھٹنوں میں سے سر اٹھا کر اپنے ساتھ بیٹھے پولیس والے کو دیکھا تو پولیس والے کو ایک زبردست جھٹکا لگا۔ بے انتہا خوف کا جھٹکا۔ وہ بوکھلا کر پشت کے بل پیچھے زمین پر گر پڑا۔ اکرم کی بھی جونہی اس پر نظر پڑی، اس کی بھی حالت غیر ہونے لگی۔

اس لڑکی کا چہرہ انسانی نہیں تھا، کسی چمگادڑ سے مشابہ تھا۔ اس کی آنکھوں کی جگہ دو گہرے گڑھے تھے اور اس کے منہ کا دہانہ بہت بڑا تھا۔ جس میں انگلیوں انگلیوں جتنے لمبے دانت باہر کی طرف جھانک رہے تھے۔ وہ پر اسرار مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ پھیلاتے نیچے زمین پر گرے پولیس والے پر جھپٹ پڑی۔ اس نے اپنے لمبے نوکیلے دانتوں اور ناخنوں سے پولیس والے کی گردن دبوچ لی۔ پولیس والے کی فلک شگاف چیخ کے ساتھ ہی اس کی گردن سے ایک خون کا ابلتا ہوا فوارہ نکلا اور وہ اس کی گردن پر اپنا بھیانک منہ رکھ کر اس کے خون کو غٹاغٹ پانی کی طرح پینے لگی۔ وہاں کھڑے اکرم کے لیے یہ سب ناقابل برداشت تھا۔ اس کو سمجھنے میں ذرہ برابر بھی دیر نہ لگی کہ وہ جس لڑکی کو ڈھونڈنے یہاں آئے تھے وہ لڑکی نہیں بلکہ کوئی خوں آشام بدروح تھی۔ اکرم نے چاہا کہ وہاں سے بھاگ جائے، مگر اسے لگا جیسے اس کے پاؤں زمین میں دھنس گئے ہیں۔ وہ بھاگنے کی کوشش کرنے کے باوجود بھی بھاگ نہیں سکتا تھا، اس کے پاؤں میں اتنی سکت ہی نہیں تھی۔ وہ تو کسی سحر زدہ حالت میں اس پولیس والے کے اس عبرت ناک انجام کو دیکھے جا رہا تھا کہ اچانک اس بدروح نے لاش کا خون پیتے پیتے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اکرم کو یوں لگا جیسے اس کی موت کا وقت آن پہنچا ہے، لیکن مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہے، یکا یک کسی کتے کی زوردار بھونکنے کی آواز نے بدروح کی توجہ دوسری طرف مبذول کرا دی۔

سحر زدہ حالت میں کھڑے اکرم تو جیسے ہوش میں آ گیا۔ اس نے آہستہ آہستہ پیچھے کی طرف قدم بڑھائے۔ ایک سیاہ رنگ کا کتا اس خون پیتی بدروح کی جانب منہ کر کے زور زور سے بھونکنے لگا۔ پہلے پہل تو وہ یونہی بھونکتا رہا، پھر یکا یک کتے نے جست بھری اور اس بدروح پر جھپٹنا چاہا، مگر وہ بدروح چمگادڑ بن کر فضا میں فوراً اڑ گئی اور کتا منہ اٹھائے اس کو دیکھ کر کافی دیر تک بھونکتا رہا۔ اکرم جو اب پورے ہوش حواس میں آ چکا تھا اس کا اب یہاں کھڑے رہنا اس کے لیے موت کے مترادف تھا۔ اس نے واپس اسٹیشن کی سمت برق رفتاری کے ساتھ بھاگنا شروع کر دیا۔ وہ سیاہ کتا جو چمگادڑ کی طرف کافی دیر سے متوجہ تھا، اکرم کے یوں تیزی سے بھاگنے کی وجہ سے اس کتے کا دھیان اس پر جا ٹھہرا اور وہ بھونکتا سیاہ کتا چمگادڑ کو چھوڑ کر اس کی جان کے درپے ہو گیا۔ وہ کسی سائے کی طرح اس کے پیچھے لگ گیا تھا۔ بھاگتے ہوئے اکرم نے جو اپنے پیچھے اس خوف ناک کتے کو دیکھا تو اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ وہ اور تیزی سے بھاگنے لگا۔ جتنی اس کی ہمت تھی، اس سے کہیں زیادہ، مگر اس کی یہ برق رفتاری اس بھاگتے ہوئے کتے کے مقابلے میں بہت کم تھی، کتے اور اس کے درمیان فاصلہ آہستہ آہستہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ اسٹیشن ابھی کافی فاصلے پر تھا۔ اکرم کو یقین تھا کہ وہ اسٹیشن پر پہنچنے سے پہلے ہی اس کتے کی خوراک بن جائے گا۔ اس نے اسٹیشن پر جانے کی بجائے اس ایریے کا انتخاب کیا۔

جہاں ٹیکسی، کار، موٹر رکشا، تانگے وغیرہ مسافروں کو اٹھانے کے لیے کھڑے ہوتے تھے۔ اکرم نے دیکھا اس وقت سوائے ایک تانگے کے باقی جگہ خالی تھی۔ اس کے لیے تو تانگا ہی غنیمت تھا۔ اسے یقین سا تھا کہ تانگے والا ضرور اس کی مدد کرے گا۔ تانگے میں محفوظ بیٹھ کر وہ اس خونی کتے سے بچ سکتا ہے۔ تانگا اس سے کوئی زیادہ دور نہیں تھا۔ سامنے ہی پکی سڑک تھی، جس پر وہ کھڑا تھا۔ اکرم نے بلا کی تیزی تو دکھائی اور اپنے بیگ کو سنبھالے جیسے تیسے کر کے پہنچ ہی گیا اور تانگے کی پچھلی سیٹ پر جا بیٹھا۔ سیاہ کتا تانگے کی طرف دیکھ کر بھونکنے لگا۔

"کہاں جانا ہے بابو۔" ایک عجیب سی آواز اکرم کو چونکنے پر مجبور کر گئی۔ اکرم کی ساری توجہ اس خوفناک سیاہ کتے پر تھی۔ آواز سن کر اس نے بے اختیار اپنے سامنے دیکھا۔ اس کے پاس ہی ایک سیاہ کپڑوں میں ملبوس کوئی شخص کھڑا تھا جس نے اپنے چہرے کو بھی سیاہ کپڑے سے ڈھانپ رکھا تھا، اس طرح کہ چہرے کا کوئی بھی حصہ نمایاں نہیں تھا۔

"نن۔ نن۔ نہیں۔ میں نے تو......" اکرم بوکھلا سا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ سیاہ کتا مسلسل اس کو دیکھ کر بھونک رہا تھا۔

"یہ سیاہ کتا کب سے میرے پیچھے لگا ہوا ہے، مجھے کاٹنے کے در پے ہے۔" اکرم نے اس شخص کی توجہ اس کتے کی طرف دلائی۔

"ارے یہ کتا۔ بھلا کیا کہہ سکتا ہے۔" وہ شخص ایسے بولا جیسے اس کا مذاق اڑا رہا ہو کہ جوان ہو کر ایک کتے سے ڈر گیا ہے۔

اس شخص نے شش کہہ کر کتے کو بھگایا۔ حیرت انگیز طور پر وہ کتا وہاں سے فوراً رفو چکر ہو گیا۔ اکرم کو یقین نہیں ہو رہا تھا کہ وہ خونی جان کا دشمن کتا آسانی سے بھاگ جائے گا۔

"لو۔ بھاگ گیا نا۔" وہ شخص اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"تم نے جانا کہاں ہے۔"

میں۔ میں، میں نے کہیں نہیں جانا۔" تانگے میں شدید قسم کی سڑی بسی گوشت کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ اکرم کو ایسے لگا کہ اگر وہ تانگے میں زیادہ دیر تک بیٹھا رہا تو اس کو متلی ہونے لگی تھی، وہ بیگ اٹھائے تانگے سے فوراً نیچے اتر آیا۔

"جانا نہیں تھا تو پھر بیٹھے کیوں تھے؟" وہ شخص عجیب سے انداز میں بولا۔

اکرم نے اس کو کوئی جواب نہیں دیا اور وہ آگے کی طرف بڑھ گیا۔

"تم جہاں چاہو گے میں تمہیں پہنچا دوں گا۔" وہ تانگے والا بضد تھا۔

"میں نے کہا نہ کہ مجھے کہیں نہیں جانا۔" اکرم کو خار سی ہونے لگی تھی اس کپڑوں میں چھپے شخص سے۔

"دیکھو پیسے نہ دینا۔" وہ شخص اکرم کے سامنے آ گیا۔

"تم کو ایک پارسائی نہیں دیتا، میں نے کہیں نہیں جانا۔"

"جانا کیوں نہیں ہے۔ میں تمہیں ایسے نہیں جانے دوں گا۔" اس شخص نے اس کو زبردستی پکڑ لیا۔

"ارے یہ کیا کر رہے ہو۔ زبردستی ہے کوئی، چھوڑو مجھے۔" اکرم اس ساری صورت حال سے گھبرا گیا۔

"نہیں ایسے نہیں جانے دوں گا۔" اس شخص نے اور زور سے اکرم کو پکڑ لیا اور اکرم اپنے آپ کو اس سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس اثناء میں اس تانگے والے کے منہ سے وہ سیاہ کپڑا ہٹ سا گیا۔ چاند کی روشنی میں اکرم کی اس پر نظر پڑی تو اکرم کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ وہ کوئی بوڑھا تھا جو اس بدروح کی طرح نہایت ہی ہیبت ناک تھا۔ اکرم الٹے قدم اسٹیشن کی طرف بھاگا۔ وہ بوڑھا بھی اس کی طرف لپکا۔ "نہیں جانے دوں گا۔" بوڑھا لنگڑا ہونے کے باوجود بھی برق رفتاری کے ساتھ اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔

اکرم شاید کہ اس بوڑھے کے ہاتھ لگ ہی جاتا، مگر کسی نادیدہ طاقت نے اس کا ہاتھ تھاما اور اس کو اڑاتے ہوئے اسٹیشن تک لے آئی۔ اسٹیشن پر پہنچ کر اس نے بے اختیار اپنے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہاں کسی بھی بوڑھے کا نام و نشان نہیں تھا۔ اکرم زور زور سے ہانپتا ہوا آگے بڑھ کر بنچ پر جا بیٹھا۔

ریل گاڑی ویسے ہی اسٹیشن پر کھڑی تھی۔ اس کے انجن میں شاید کوئی خرابی ہو گئی تھی، جس کو ٹھیک کیا جا رہا تھا۔

اچانک اکرم کو محسوس ہوا کہ اس کے پاس کوئی اور بھی آ بیٹھا ہے۔ اکرم نے فوراً رخ پھیرا تو اسی ڈبے والے باریش بزرگ کو بنچ پر بیٹھے پایا۔ وہ کب یہاں آن

موجود ہوا تھا۔ اکرم کو اس کی خبر تک نہ ہوئی تھی۔

"آپ۔ آپ۔" اکرم اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"آخر آپ ہیں کون۔ انسان یا کوئی نادیدہ روح۔"

میں نے کہا تھا نا تم کو حیوان ہوتے ہیں جو ہمارے اردگرد ہی بھٹکتے پھرتے ہیں۔ ان کا اصل روپ کتنا وحشت ناک ہے، اس کا تمہیں بخوبی اندازہ لگ گیا ہوگا۔

"لیکن وہ بابا میرے ہی پیچھے کیوں؟" اکرم خوف زدہ لہجے میں بولا۔

"ان کو خبر ہو گئی ہے کہ تم ہی وہ انسان ہو جو ان کا خاتمہ کر سکتے ہو۔ حیوانوں نے تجھے پہچان لیا ہے۔ اب تجھے وہ نقصان پہنچانے کے لیے وہ تیرے پیچھے لگ گئے ہیں۔"

"میرے پیچھے۔" اکرم کو یقین نہ ہوا۔

"ہاں۔ اب تیرے پاس کوئی اور راستہ نہیں سوائے اس کے کہ ان کا خاتمہ تجھے اپنے ہاتھوں سے کرنا ہوگا، ورنہ وہ تم پر حاوی ہو جائیں گے، تم جہاں بھی جاؤ گے تمہارے پیچھے آئیں گے، تم دنیا کے کسی کونے میں بھی چھپ نہیں سکتے۔"

"میں۔ میں کیسے ان حیوانوں کو مار سکتا ہوں۔" اکرم ایک دم گھبرا گیا۔

"یہ سب تمہیں اپنی عقل ذہن سے سوچنا ہوگا۔ اپنی طاقت استعمال کرنا ہوگی۔ میں تمہاری کوئی خاص مدد تو نہیں کر سکتا، کیوں کہ میں خود مجبور ہوں۔ تم کو اکیلے ہی ان حیوانوں سے لڑنا ہوگا۔ پر ہاں جگہ جگہ میں تمہیں نشان دہی کرتا رہوں گا، تا کہ تم بھٹک نہ جاؤ۔ یاد رکھنا ان کا اگلا وار ان سب واروں سے بھاری ہوگا۔ ہمت اور طاقت سے کام لینا۔" اکرم یہاں تک کہ کچھ بولتا۔ بنچ اس بزرگ کے وجود سے خالی تھا۔

اکرم اتنی دیر بنچ پر ہی بیٹھا اپنے انجام کے بارے میں سوچتا رہا کہ جب تک گاڑی نے روانگی کی سیٹی نہ بجادی، وہ بیگ اٹھائے مردہ قدموں سے ڈبے کی طرف بڑھا اور ایک خالی سیٹ پر جا بیٹھا۔ ڈبے میں تھوڑے بہت ہی افراد تھے، جو پرے والی سیٹوں پر پڑے اونگھ رہے تھے۔

اکرم نے اپنی سامنے والی سیٹ پر نگاہ دوڑائی تو وہاں بھی خود کی طرح ایک ہی بندے کو بیٹھا ہوا پایا۔ وہ کوئی خوش شکل خوبرو لڑکا تھا، جو جینز کی پینٹ شرٹ میں ملبوس تھا اور اکرم کی ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ اکرم نے اس کے چہرے پر دو انوکھی چیزیں نوٹ کیں۔ ایک تو اس کی تیز آنکھیں جن میں بلا کی چمک تھی، ایسے جیسے کسی جانور کی ہو اور دوسرا اس کے ہونٹ بہت زیادہ لال تھے۔ خون سے بھرے معلوم ہو رہے تھے اور اس کے جسم پر بال بھی بہت تھے۔ بھورے رنگ کے بال، یہاں تک کہ اس کی ہتھیلی پر بھی بال اُگے ہوئے تھے۔ اس لڑکے نے اکرم سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ کوئی اخبار پڑھنے میں مصروف تھا۔ اکرم پہلے تو ویسا ہی بیٹھا اپنے آنے والے حالات کے بارے میں سوچتا رہا، پھر وہ اپنے بیگ میں سے سارا سامان نکال کر اس کو درست طریقے سے رکھنے لگا۔ یوں اندھا دھند بھاگنے کی وجہ سے اس کا سارا سامان بے ترتیب سا ہو گیا تھا۔ اس سامان میں اس کی بنائی ہوئی تصویریں بھی تھیں۔ اکرم نظر دوڑانے کے لیے ان کو باری باری دیکھنے لگا۔ اس اثناء میں سامنے سیٹ پر بیٹھے ہوئے خوبرو نوجوان کی ان تصویروں پر نظر پڑ گئی۔

"آپ پورٹریٹ بھی بناتے ہیں۔" اس نے اکرم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔" یہ میرا شوق بھی ہے اور آمدنی کا معقول ذریعہ بھی۔"

"اچھا! تو پھر میری تصویر بنائیں گے، مجھے تصویر بنوانے کا بڑا شوق ہے۔ پلیز۔" اکرم کا دل نہیں چاہ رہا تھا مگر اس کے اصرار پر وہ راضی ہو گیا اور بیگ سے صاف بڑا سا کاغذ اور پنسل نکال کر اس کی تصویر بنانے لگا۔

وہ لڑکا بڑے انہماک سے تصویر بنوا رہا تھا۔ اکرم کے ہاتھ بھی تیزی سے چل رہے تھے کہ اچانک ڈبے میں اندھیرا سا چھا گیا۔ ڈبے کا بلب جلنا بند ہو گیا تھا اور پھر ڈبے کی کھڑکیاں بھی بند تھیں۔ اکرم نے پاس ہی ڈبے کی کھڑکی کو ہاتھ بڑھا کر کھولنا چاہا۔ کھڑکی تو کھل گئی لیکن کھڑکی کی لوہے کی نوک اس کی ہتھیلی کو زخمی کر گئی۔ چاند کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ اس کی ہتھیلی سے خون نکل رہا ہے۔ اکرم نے خون روکنے کی کوشش تو بہت کی مگر خون رک نہیں رہا تھا۔ اس اثنا میں وہ لڑکا اس کے قریب آن بیٹھا۔ اس نے اکرم کی ہتھیلی کو منہ میں ڈال کر چوسنا شروع کر دیا۔ اکرم کے جسم سے ایک ٹیس سی نکل گئی۔ اسی

اثناء میں چاند بادلوں کی اوٹ میں جا چھپا اور اچانک ہی وہ لڑکا اکرم پر جھپٹ پڑا، اس نے چیخ کر کھڑا اکرم کرتے ہوئے اکرم کو جگہ جگہ سے کاٹنا شروع کر دیا۔ اکرم کا درد سے برا حال ہو گیا، اس نے ٹانگوں سے لڑکے کو ایک زور دار دھکا دیا تو وہ دور جا گرا۔ یکا یک ہی چاند دوبارہ بادلوں کی اوٹ سے باہر نکل آیا۔ ڈبے میں روشنی پڑی تو اکرم نے فوراً سامنے کی طرف دیکھا۔ اس لڑکے کی حالت بڑی خوف ناک ہو رہی تھی۔ اس کی زبان باہر کی طرف لٹک رہی تھی اور آنکھیں خون کا انگارہ ہو رہی تھیں، مگر جیسے ہی چاند کی روشنی اس لڑکے پر پڑی، اس کے منہ سے خوف ناک چیخ نکلی۔ یکا یک اس کا جسم اکڑنے لگا اور گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ اس کا لباس پھٹنے لگا۔ اس کا قد چھ فٹ تک بڑھ گیا اور ایک لمبی سی تھوتھنی اس کے منہ پر نمودار ہو گئی اور ایک مکمل بھیڑیا کی شکل میں آیا کہ اچانک پھر اندھیرا ہو گیا۔

ٹرین کی رفتار آہستہ آہستہ ہوتے ہوئے اب کچھ رکنے کے قریب تر ہو گئی، کوئی کراس تھا، جس کی وجہ سے ٹرین کو رکنا پڑ گیا تھا۔ ڈبے میں گھپ اندھیرا تھا، ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اکرم کو کچھ اندازہ نہیں تھا کہ وہ کس طرح اس موت کے ڈبے سے زندہ باہر نکلے۔ اس نے سوچا کہ ڈبے سے کسی طرح چھلانگ لگائی جائے۔ ڈبے کی کھڑکیاں اتنی چوڑی اور بڑی نہ تھیں کہ بندہ آسانی سے ان میں آ جائے، صرف ایک ہی راستہ تھا ڈبے سے فرار کا، وہ تھا اس کا دروازہ۔ ڈبے میں مکمل خاموشی اور اندھیرا بکھرا پڑا ہوا تھا۔ اس خوف ناک خونی بھیڑیے کی غراہٹیں بھی معدوم سی ہو گئی تھیں، لیکن اکرم کو یقین تھا کہ وہ خونی بھیڑیا ڈبے میں ہی اندھیرے کی چادر اوڑھے چھپا بیٹھا ہے اور چاند کے دوبارہ نکلنے کا انتظار کر رہا ہے۔ وہ چاند جو بادلوں کی اوٹ میں چھپا موت اور زندگی کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ حالاں کہ اکرم کو بھیڑیا نظر نہیں آ رہا تھا۔ مگر اس کے رونگٹے کھڑے کرنے کے لیے یہی کافی تھا کہ وہ اب بھی ڈبے میں موجود تھا۔

اکرم نے اندھیرے میں دروازے کی صحیح سمت کا اندازہ لگایا۔ دروازہ تو چند قدم کے ہی فاصلے پر تھا۔ یہ جان کر جیسے اسے بہت حوصلہ ہوا۔ چند لمحے وہ کھڑا اپنے آپ کو تیار کرتا رہا۔ اس ہمت کے لیے جو اس نے اب کر کے دکھائی تھی۔ اس نے دل میں اللہ کا نام لیا اور بغیر کچھ سوچے سمجھے ڈبے کے دروازے کی طرف بھاگا۔ دو چھلانگ میں ہی اس نے فاصلہ طے کر لیا۔ اس نے جلدی سے دروازہ کھولنے کی کوشش کی، مگر وہ اتنی مضبوطی سے بند تھا کہ کھلنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ رکی ہوئی ٹرین ایک بار پھر چلنے کو تیار تھی، اس آفت زدہ ماحول میں اس وقت اس کی رہی سہی کسر بھی جواب دے گئی جب چاند بادلوں سے نکل کر دوبارہ اپنی شکل دکھانے لگا تھا۔ ڈبے میں روشنی آہستہ آہستہ پھیلی تو بھیڑیے کی غراہٹیں پھر سنائی دینے لگیں۔ ڈبے میں زوردار "آہو" کی آواز گونجی۔ وہ درندہ چاند دوبارہ نکلنے پر جاگ گیا تھا۔ ڈبے میں رہ کر بچنا اب ناممکن تھا۔

مگر یہ دروازہ...... اکرم میں جتنی طاقت تھی اس نے دروازہ کو لاتوں سے پیٹنا شروع کر دیا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ دروازہ توڑ دے۔ ہاتھوں اور لاتوں سے کی گئی کوشش جلد ہی رنگ لے آئی، اور دروازہ کھل گیا۔ ٹرین آہستہ آہستہ چلنے لگی تھی۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ چلتی ہوئی ٹرین سے نیچے چھلانگ لگا دی اور گھٹنوں کے بل زمین پر جا گرا۔ کچی زمین تھی، مگر پھر بھی اس کو چوٹ لگنے کی شدت کا اندازہ ہوا۔ اس کے دونوں گھٹنوں میں درد کی ایک ٹیس سی ابھری۔ وہ بلبلا اٹھا۔ اس کا جسم پہلے ہی زخموں سے چور تھا۔ جگہ جگہ جسم پر کاٹنے کی وجہ سے زخم ہو گئے تھے، جن سے خون رس رہا تھا۔ وہ جیسے ہی زمین سے کراہتے ہوئے اُٹھا، اس کے کانوں میں ایک آواز گونجی۔

"نوجوان تم نے ہمت کی اور بچ نکلے، مگر ابھی مشکلیں اور بھی راہوں میں پڑی ہیں، جو تم نے سہنی ہیں۔ آگے بھی اسی طرح ہمت سے کام لینا۔ فتح تمہارا مقدر ہوگی۔"

اکرم کو آواز جاننے میں کوئی دیر نہ لگی، یہ انہی بزرگ کی آواز تھی۔

وہ منہ کی سمت کر کے آگے کی جانب بے تحاشا بھاگنے لگا۔ اس کو خبر نہیں تھی کہ وہ کہاں اور کس جانب بھاگ رہا ہے۔ خاردار جھاڑیاں جگہ جگہ اُگی ہوئی تھیں، جن کے نوکیلے کانٹے بھاگنے کی وجہ سے اس کے ننگے پاؤں میں چبھنے لگے تھے۔ کانٹوں کی وجہ سے اس کے

پاؤں میں بھی خون رسنے لگا تھا اور وہ نڈھال ہو کر کئی بار لڑ کھڑایا بھی تھا، مگر بزرگ کی کہی ہوئی بات پر اس نے ہمت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا تھا۔

وہ منہ اُٹھا کر ایک سمت کی طرف بھاگتا ہی چلا گیا۔ چاند بادلوں کی اوٹ سے ایسا نکلا کہ اب دوبارہ چھپنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ وہ شاید یوں ہی بھاگتا رہتا، مگر وہی خوف ناک "آہو" کی آواز نے اس کے قدم جیسے روک لیے۔ اس کے لاکھ درجے بھاگنے کے باوجود وہ بھیڑیا اس کے آس پاس ہی کہیں موجود تھا۔ اب مزید اس میں بھاگنے کی سکت نہ تھی اور شاید اب بھاگنا گویا بھیڑیے کو یہ احساس دلانا تھا کہ وہ ادھر ہی موجود ہے۔ موت کا خوف اس کے دل میں سمایا ہوا تھا اس کے قدم آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ایک گھنی جھاڑی میں ایسے الجھے کہ وہ اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا اور جھاڑی میں ہی جا گرا۔ پہلے تو وہ سنبھل ہی نہ سکا، مگر اس نے محسوس کیا کہ جھاڑی کافی گھنی ہے۔ اگر وہ یونہی چھپ کر ادھر ہی پڑا رہے تو آرام کرنے کے ساتھ ساتھ موت سے بھی بچ سکتا ہے، جو اس کو تلاش کرتے ہوئے بھیڑیے کی صورت میں ادھر ادھر منڈلا رہی تھی۔ جلد ہی اس کو بھیڑیے کے قدموں کی آواز آنے لگی، جو آہستہ آہستہ اس کے قریب تر آ رہی تھی۔ وہ دم سادھے جھاڑی ہی میں کسی بے جان کی طرح پڑا رہا، مگر اس کی آنکھیں وہ سب بخوبی دیکھ رہی تھیں۔ بھیڑیا چلتے چلتے جھاڑی کے اتنا قریب آن پہنچا کہ اس کی تیز غراہٹ، نتھنوں سے نکلتی سانس اور منہ سے تیز انسانی خون کی بدبو اس کو صاف محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں یہ منظر دیکھ کر خوف سے پھیل سی گئیں۔ اکرم کو یوں لگا جیسے ابھی کہ ابھی وہ درندہ اس تک پہنچ جائے گا۔

اس درندے نے آسمان کی طرف منہ کر کے ایک بار پھر زوردار "آہو" کی آواز نکالی اور آگے کی طرف بڑھ گیا۔ دم سادھے اکرم کو اپنی قسمت پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ یوں موت کے منہ میں آتے آتے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ وہ کافی دیر وہیں بے جان سا پڑا رہا۔ بھیڑیا چلتے چلتے نجانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ اب اس نے آہستگی سے سر اٹھا کر اردگرد کا جائزہ لیا، لیکن

بھیڑیے کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ وہ علاقہ خاردار بڑی بڑی جھاڑیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اِکا دُکا درخت ہی کھڑے تھے، جن کی لمبائی آسمان کو چھو رہی تھی۔ پہلے پہل اس نے سوچا کہ یہیں پڑے ہوئے رات بتا دی جائے، پھر دن کے اُجالے میں وہ باآسانی یہاں سے نکل سکتا ہے، مگر یہاں زمین پر بے تحاشا رینگتے ہوئے کیڑوں مکوڑوں اور زہریلے حشرات کی بھرمار تھی۔ جھاڑی میں پڑے ہوئے کچھ کیڑے مکوڑے تو اس کے بدن پر چڑھ گئے تھے، جو کہ اس کے زخموں پر نمک پاشی کا کام کر رہے تھے۔ اس نے کئی بار جسم پر کیڑوں کو صاف کرنے کی کوشش کی، مگر وہ جہاں جس جھاڑی میں پڑا تھا، وہاں تو لاتعداد ایسے کیڑوں کی آماجگاہ تھی، جو برابر اس کے جسم پر ڈنک مار رہے تھے اب یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ صبح تک اسی جھاڑی میں ہی پڑا رہے۔ صبح تک تو کیڑے اس کا گوشت تک نوچ ڈالتے۔ اس نے سوچا کہ وہ یہاں سے بھاگ جائے، مگر اس کے یوں بھاگنے کی آواز بھیڑیے کو دوبارہ متوجہ کرنے کے لیے کافی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اب وہ پکڑا گیا تو موت سے بچ نہیں سکتا، لیکن وہ اب جائے کہاں، زمین پر نہیں مگر...... اچانک اس کی سامنے ایک بڑے درخت پر نظر پڑی تو جیسے اس کی ساری مشکل حل ہو گئی۔ درخت پر چڑھ کر رات بسر کرنا ہر طرح سے مناسب خیال تھا۔ درخت اور جھاڑی کے درمیان چند فرلانگ کا ہی تو فاصلہ تھا۔ وہ دوڑ کر آسانی سے یہ فاصلہ طے کر سکتا تھا، مگر اس کی کیا گارنٹی تھی کہ وہ بھیڑیا اس کو دوبارہ نہ دیکھ لے، ہاں البتہ رینگ کر جانا کسی خطرے سے بچنے کا کام کر سکتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ پیٹ کے بل رینگ کر درخت کی اوٹ میں جانے لگا۔ زمین کی مٹی نرم اور بھربھری تھی، اس لیے اسے یوں کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ تھوڑی ہی کوشش سے وہ درخت تک جا پہنچا۔ درخت کے نیچے سوکھے ہوئے پتوں کا ڈھیر ادھر اُدھر بکھرا پڑا تھا، جس پر آہستگی سے چلنا ہی بہتر تھا۔ سوکھے پتوں کی ہلکی سی آواز بھی بھیڑیے کو اس کی طرف متوجہ کر سکتی تھی۔ درخت کے پاس پہنچ کر اور اس کے اوپر چڑھنے میں اسے زیادہ وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ جلد ہی وہ درخت کے ایک موٹے تنے پر جا بیٹھا۔

ابھی اس نے بیٹھ کر اپنی سانس درست ہی کی تھی کہ ایک تانگا تیزی سے دوڑتا ہوا عین درخت کے نیچے آ کر رک گیا۔ تانگے سے ایک ہیبت ناک قسم کا بوڑھا اترا۔ اکرم نے دیکھا کہ یہ تو وہی بوڑھا تھا جو اسٹیشن پر اس کو تانگے سمیت ملا تھا۔ اس بوڑھے کے ساتھ ہی تانگے میں سے ایک سیاہ کتے نے چھلانگ لگائی۔ اکرم کے لیے وہ کتا بھی اجنبی نہیں تھا۔ اس بوڑھے نے تانگے کے پچھلی سیٹ کے نیچے سے ایک انسانی لاش نکالی اور اس کو ہاتھ سے گھسیٹتے ہوئے درخت کے نیچے رکھ دیا۔ لاش پولیس والے ہی کی تھی، اس بوڑھے نے تھیلے میں سے ایک کلہاڑا نکالا اور لاش کو ٹانگوں سے کاٹنا شروع کر دیا۔ منظر اتنا دردناک تھا کہ اکرم کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا کہ مبادا اس کی آواز سے وہ بوڑھا خبردار ہی نہ ہو جائے۔

بوڑھا گوشت کاٹنے میں مصروف تھا کہ پتا نہیں بھیڑیا کہاں سے جست لگا کر اس کے قریب آن پہنچا۔ بھیڑیا بوڑھے کے قریب ہی دم پھیلا کر بیٹھ گیا۔

”مجھے پتا ہے میرے بیٹے تجھے بھوک لگی ہوئی ہے، تیرے لیے تو میں یہ لے کر آیا ہوں۔“ بوڑھا اس بھیڑیے کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

بوڑھے نے کاٹے ہوئے انسانی ٹکڑے اس کے آگے رکھ دیے، وہ بھیڑیا ان گوشت کے ٹکڑوں کو اچک اچک کر کھانے لگا۔ دوسری سائیڈ پر کھڑا سیاہ کتا یہ سب دیکھ کر گوشت پر جھپٹا، تو بھیڑیے نے غصے سے ہاتھ مار کر اس کو دور پھینک دیا۔ کتا غوں غوں کی آوازیں نکالنے لگا۔

”نا۔ نا۔ یہ بھی ہمارا وفادار ہے، اس کو بھی حصہ ملنا چاہیے۔“ بوڑھے نے ایک گوشت کا ٹکڑا کتے کے قریب پھینک دیا۔ کتا جیسے اس ٹکڑے پر جھپٹ پڑا، وہ بوڑھا بھی گوشت کو منہ میں لیے زور زور سے چبانے لگا۔ اس اثناء میں فضا میں پروں کے پھڑپھڑانے کی آواز گونجنے لگی۔ اکرم کے ساتھ ہی اس بوڑھے نے بھی اوپر فضا کی طرف دیکھا۔ وہی کالی سیاہ بڑی سی چمگادڑ اوپر پرواز کر رہی تھی۔

بوڑھے نے لاش میں سے بہتے خون سے ہتھیلی کا پیالہ بنا کر اسے خون سے بھرا اور ہاتھ اوپر اُٹھا کر چمگادڑ کو اس کی طرف متوجہ کیا، اوپر اڑتی چمگادڑ تیزی سے نیچے اُتر کر بوڑھے کے ہاتھوں پر بیٹھ گئی اور ہتھیلی سے خون پینے لگی۔ خون جیسے ہی ختم ہوا وہ دوبارہ اوپر اُڑنے لگی۔

”جا کسی دوسرے شکار کی خبر لے کر آ...... جا اُڑ جا۔“ بوڑھا اُڑتی ہوئی چمگادڑ سے مخاطب ہوا۔

اکرم یہ سب دیکھ کر بے ہوش ہونے کی کیفیت میں تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا، ورنہ وہ زور زور سے چلانے لگتا۔ بھیڑیے نے جیسے ہی گوشت کے ٹکڑے نگلے۔ اس نے ایک جست بھری اور دور بھاگ گیا۔

اکرم کو اندازہ تھا کہ یہ سب اپنا اپنا کام کر کے یہاں سے روانہ ہو جائیں گے، مگر یہ اس کی بھول ثابت ہوئی، گوشت کا ٹکڑا کھاتے ہوئے کتے کی اچانک اس پر نظر پڑ گئی۔ سیاہ کتے کی چمکتی آنکھیں اس پر جیسے ٹھہری گئیں۔ اکرم کا دل حلق میں اٹک کر رہ گیا۔ دفعتاً اس سیاہ کتے نے اس کو دیکھ کر زور زور سے بھونکنا شروع کر دیا، یوں کتے کے بھونکنے پر اس بوڑھے نے بھی نگاہ اُٹھا کر درخت کی جانب دیکھا۔

اس کو یوں درخت پر موجود دیکھ کر بوڑھے کا چہرہ ایسا ہو گیا، جیسے کوئی جانور اپنا شکار سامنے دیکھ کر خوش ہو جاتا ہے۔

”تو اب تک ہم سے بچتا آیا ہے مورکھ۔ اب نہیں بچے گا، تیری موت تجھے یہاں لے کر آئی ہے۔“ بوڑھے نے پاس پڑا ہوا کلہاڑا اٹھایا اور درخت کی جانب بھاگا۔ اکرم کا یہ حال تھا کہ کاٹو تو جسم میں خون نہیں۔

وہ بوڑھا کسی چھپکلی کی طرح درخت پر کلہاڑا لے کر چڑھنے لگا، ساتھ ساتھ زور زور سے کلہاڑا درخت پر مارتا جاتا۔ اکرم کو لگا اگر وہ اسی طرح یہیں درخت پر بیٹھا رہا تو بوڑھا جلد ہی اس تک پہنچ جائے گا، لیکن یوں درخت سے چھلانگ لگاتا، وہ سیاہ کتا بھی درخت کے نیچے ہی کھڑا تھا جو اس کی طرف دیکھ کر بھونک رہا تھا۔ اوپر بھی موت کے سائے منڈلا رہے تھے اور نیچے بھی جان کو خطرہ تھا۔ وہ تنے پر ہی پیچھے پیچھے ہٹنے لگا۔ بوڑھا جلد ہی اس تنے پر پہنچ گیا تھا۔ جہاں اکرم موجود تھا۔ بوڑھا ہاتھ لہرا لہرا کر کلہاڑے سے اس پر وار کرنا چاہ رہا تھا، مگر اکرم آہستہ

آہستہ پیچھے ہٹنے کی وجہ سے ابھی تک وہ اس کی کسی بھی ضرب سے بچا ہوا تھا۔

"کہاں مجھ سے بھاگ کر جائے گا۔" "حرام خور" وہ ایک دم دانت پیس کر غرایا اور پھر وہ اس تنے پر کھڑے ہو کر اس کی طرف بڑھنے لگا اور اس کے قریب پہنچ گیا اور اس نے اکرم کو مارنے کے لیے کلہاڑا فضا میں بلند کیا۔

"مرنے کے لیے تیار ہو جا۔" بوڑھے نے زور سے قہقہہ لگایا، اکرم کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ وہ تو بے ہوش ہونے کی کیفیت میں تھا، لیکن اچانک اس کو یوں لگا جیسے کوئی اس کو جھنجھوڑ کر ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا ہے۔ بوڑھا کلہاڑے سے وار کرنے کے لیے تیار تھا کہ اکرم نے ایک بھرپور لات بوڑھے کے پیٹ پر ماری، ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ اپنا توازن تنے پر برقرار نہ رکھ سکا اور کلہاڑے سمیت وہ نیچے زمین پر دھڑام سے جا پڑا۔ بوڑھے نے نیچے گر کر کوئی حرکت نہ کی۔ گرتے ہی اس کا جسم ساکت ہو گیا۔ بوڑھے کے گرنے کی آواز سے ہی نیچے درخت کے پاس کھڑا سیاہ کتا نجانے کیوں ایسا ڈرا کہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔

اکرم کے لیے اس سے اچھا اور کوئی موقع نہ تھا یہاں سے نکلنے کا۔ وہ فوراً درخت سے احتیاط کے ساتھ نیچے اتر آیا۔ بوڑھا ویسے ہی بے ڈھنگے طریقے سے نیچے زمین پر ساکت پڑا ہوا تھا۔ اکرم کو لگا جیسے یہ مر گیا ہے اور پھر اتنی بلندی سے نیچے گرنے سے اس کا بچنا ممکن ہی نہیں تھا۔

تھوڑی دیر تک وہ بوڑھے کے اس خوف ناک وجود کو دیکھتا رہا، پھر اس کے کریہہ چہرے پر تھوک کر آگے بڑھا ہی تھا کہ نیچے لیٹے ہوئے بوڑھے نے ہاتھ بڑھا کر اس کی ٹانگ کو زور سے پکڑ لیا۔ اکرم نے بے اختیار پیچھے مڑ کر دیکھا تو بوڑھے کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ ہوش میں تھا۔ اکرم کے لیے یہ سب غیر متوقع تھا کہ بوڑھا ابھی تک زندہ تھا، مرا نہیں تھا۔

"تو کیا سمجھا تھا کہ میں مر گیا ہوں۔ یہ تیری بھول تھی۔" بوڑھے نے اس کو ٹانگوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیا۔ اکرم نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش تو بہت کی، مگر بوڑھے کی پکڑ جیسے فولادی تھی۔

"چھوڑ مجھے کمینے بڈھے۔" وہ اپنی دوسری ٹانگ سے بوڑھے کو زور زور لاتیں مارنے لگ گیا۔ یوں اس انداز سے زور زور سے مار کھانے پر بوڑھے کی ہاتھ کی گرفت کمزور پڑتے ہی چھوٹ گئی۔ ٹانگ جیسے ہی چھوٹی، اکرم نے اندھا دھند بھاگنا شروع کر دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اب بوڑھے کے چنگل میں دوبارہ پھنس جائے۔ اس کو یوں بھاگتے ہوئے دیکھ کر بوڑھے نے زور کی چیخ ماری اور پاس پڑے کلہاڑے کو اٹھا کر پیچھے اس کی طرف بھاگا۔ یوں ہاتھوں سے شکار نکلتا دیکھ کر بوڑھا غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔ نجانے وہ سیاہ کتا کہاں سے دوبارہ آنکلا اور بوڑھے کے ساتھ وہ بھی تیزی سے اس کی طرف بھاگنے لگا۔

"ٹھہر جا، ٹھہر جا۔ کہاں تک بھاگے گا...... تو میرے ہاتھ سے بچ نہیں سکتا۔"

بھاگتا بوڑھا زور زور سے چلانے لگا۔ اکرم کو محسوس ہوا کہ اب وہ مزید بھاگ نہیں سکتا۔ رات کے نجانے کون سے پہر سے وہ بھاگ بھاگ کر تھک گیا۔ اس کی ٹانگیں درد اور تکلیف سے کانپنے لگی تھیں، بھاگتے بھاگتے بے حال ہوتے ہوئے اکرم نے دیکھا کہ سامنے کوئی بڑی ندی تھی، جو پوری روانی سے بہ رہی تھی، اس نے سوچا اگر وہ ندی تک پہنچ جائے تو اس بڈھے سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔"

بوڑھا اور کتا بدستور اس کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ اکرم نے چند لمحے کھڑے ہو کر ہمت اکٹھی کی اور ندی کی طرف دوڑ لگا دی، اس کی یہ ہمت اور کوشش ہی تھی کہ وہ جلد ہی ندی تک جا پہنچا۔ وہ بوڑھا کلہاڑا اٹھائے اس کے قریب آن پہنچا تھا۔ اکرم نے ایک بار مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا اور ندی میں چھلانگ لگا دی، بوڑھا ندی کے کنارے کھڑا زور زور سے چلاتا رہا اور وہ سیاہ کتا بھونکتا رہا۔ ندی کا بہاؤ خاصا تیز تھا، لیکن وہ آہستگی سے تیرتا ہوا کافی دیر بعد ندی کے دوسرے کنارے پر جا پہنچا۔

تھکن، زخموں سے چُور جسم نے اس کو اتنی مہلت ہی نہ دی کہ وہ کنارے پر اٹھ کر بیٹھ ہی سکے، کنارے پر پہنچتے ہی وہ زمین پر گرا اور ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا۔ اس کو خبر ہی نہ ہوئی کہ وہ کتنی دیر وہاں بے ہوش پڑا رہا کہ اچانک تانگا چلنے کی آواز اس کو ہوش کی دنیا

میں واپس لے آئی۔ پہلے پہل تو وہ کافی دیر یہ سمجھ ہی نہ سکا کہ آخر وہ ہے کہاں۔ اس کی آنکھوں کے گرد ابھی تک اندھیرا چھایا ہوا تھا، اس نے کئی بار ذہن کو جھٹکا دے کر اندھیرا دور کرنے کی کوشش کی، مگر وہ پوری طرح کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ جلد ہی اس کو یہ محسوس کرنے میں زیادہ دیر نہ لگی کہ وہ کسی تانگے میں پڑا ہوا ہے۔ تانگے کا خیال آتے ہی اس کے ذہن میں جھرجھری سی آنے لگی۔ کہیں یہ اسی بوڑھے والا تانگا تو نہیں ہے۔ تانگا پوری رفتار سے بھاگا جا رہا تھا۔

اکرم نے اپنے آپ کو سیدھا کرنے کی کوشش کی، مگر اس کا سارا جسم رسی میں جکڑا ہوا تھا، ہاتھ پاؤں تک مضبوطی سے بندھے ہوئے تھے۔

اس کے یوں ہلنے جلنے پر آگے بیٹھے ہوئے تانگا چلاتے ہوئے کوچوان نے پیچھے مڑ کر دیکھا، وہ کوئی اور نہیں وہی بوڑھا خبیث تھا۔

اکرم جو پہلے ہی خالی الذہن یہ سوچ رہا تھا کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ میں تو ندی کے کنارے پر تھا، یہاں اس تانگے میں کیسے آ گیا۔ وہ تو اس تانگے چلانے والے کو بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کی طرف پشت کیے بیٹھا تانگا چلا رہا تھا کہ یوں جو اچانک پیچھے مڑ کر دیکھا تو اکرم کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکل گئی۔ اکرم نے اچانک اس ردعمل کا سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ دوبارہ بوڑھے کے ہاتھوں میں آ گیا ہے۔

"میں چھوڑوں گا نہیں تجھے، تو نے بہت ستایا ہے مجھے۔" بوڑھے نے اپنا ایک ہاتھ پیچھے کر کے اس کو گلے سے پکڑ لیا، اس کے لمبے ناخن اکرم کی گردن میں چبھنے لگے تھے۔

"چھوڑ دو مجھے خدا کے واسطے چھوڑ دو۔" وہ کانپ اٹھا، اس کی آنکھوں کے سامنے ابھی وہ منظر تازہ ہی تھا، جب اس بوڑھے نے لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کیے تھے۔ پولیس والے کے انجام کی طرح اسے یقین تھا کہ وہ بھی اسی طرح مرے گا، یہ بوڑھا اس کو چھوڑے گا نہیں۔

اس کے اس طرح خوف سے چلانے پر بوڑھے نے زور سے قہقہہ مارا۔

"چھوڑ دوں۔ ہاتھوں میں آیا ہوا شکار چھوڑ دوں۔

گر کی باتیں

☆ ایک عورت اپنے بیٹے کو عقلمند بنانے کے لیے 20 سال لگاتی ہے دوسری عورت اسے صرف 20 منٹ میں بے وقوف بنا دیتی ہے۔

☆ غریب ایک طرح کے ہوتے ہیں اور امیر ہر طرح کے۔ غریب کے بچے اور امیر کے رشتہ دار زیادہ ہوتے ہیں۔

☆ خدا سے صلح رکھو تا کہ آخرت سلامت رہے۔ لوگوں سے صلح رکھو تا کہ دنیا برباد نہ ہو۔

☆ دنیا ایک بازار ہے جو عنقریب بند ہو جائیگا۔

☆ دنیا میں لوگ بہت زیادہ لیکن انسان نہایت کم ہیں۔

☆ ایک باپ اپنے سات بیٹوں کی پرورش کرتا ہے لیکن افسوس سات بیٹے ایک باپ کی خدمت نہیں کر سکتے۔

(مرسلہ: کامران خان۔ اسلام آباد)

تیرے ساتھ تو میں وہ حشر کروں گا کہ...... کہ خود تیری روح بھی کانپ اٹھے گی، تڑپا تڑپا تیرا گوشت نوچوں گا۔"

بوڑھا غصے میں بولا اور اس نے گھوڑے کی پشت پر چابک مار کر تانگے کی رفتار اور تیز کر دی۔ سر پر منڈلاتی موت پر بندے کو کب ہوش رہتا ہے، بس بے بسی سے ہاتھ پاؤں مارنے لگتا ہے۔ اس نے بھی زور زور سے ہاتھ پاؤں مارے اور جسم کو رسی سے آزاد کرانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے دونوں ہاتھ ایک دوسرے سے بندھے ہوئے تھے۔ گانٹھ سخت تھی، لیکن اس کے ذہن میں ایک دم جھماکا ہوا۔ وہ دونوں ہاتھ منہ کے قریب لا کر رسی کی بندھی ہوئی گانٹھ کو دانتوں میں دبا کر کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ کام بڑا مشکل تھا، اب اس کے دانتوں میں درد ہونے لگا تھا۔

شروع شروع میں تو اس کو محسوس ہوا کہ وہ کوشش بیکار ہی کر رہا ہے مگر...... وہ دانتوں کے درد کی پروا کرنے کی بجائے مسلسل گانٹھ کو کھولنے میں مصروف رہا کہ جلد ہی اس کی کوشش رنگ لے آئی اور گانٹھ کھل گئی۔ اس نے جلدی سے ہاتھوں، جسم اور پیروں کو رسی سے آزاد کیا۔

تانگا اپنی رفتار سے چلتا رہا۔ بوڑھا اس بات سے بے خبر تھا کہ اس کا شکار بھاگنے کے لیے تیار ہو گیا ہے، مگر نجانے کیسے اس کی اس حرکت نے بوڑھے کو چوکنا کر دیا۔ بوڑھے نے گردن موڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا اور اس کو یوں رسیوں سے آزاد بیٹھا دیکھ کر وہ غصے سے لال پیلا ہو گیا۔

"کم بخت...... تو نے خود کو رسیوں سے تو آزاد کروا لیا، مگر مجھ سے نہیں تو جان چھڑا سکتا۔ چاہے جتنی کوشش کر لے۔"

بوڑھے نے اس کو ہاتھ سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تاکہ وہ تانگے سے چھلانگ نہ لگا سکے۔ بوڑھے کے ہاتھ میں اس کا گریبان تھا، بوڑھے کے ہاتھ میں نجانے کیا طاقت تھی کہ اس کو کھینچ تان کر آگے والی سیٹ پر لے آیا۔ اکرم کا آدھا دھڑ اگلی سیٹ پر اور ٹانگیں پچھلی سیٹ پر پڑی تھیں، بوڑھے نے اپنے لمبے لمبے دانتوں سے اس کی گردن پر زور سے کاٹنا چاہا۔ قریب آتے ہوئے بوڑھے کے منہ سے اتنی شدید بدبو آ رہی تھی کہ اس کو اُبکائی آنے لگی، اکرم نے ایک زوردار گھونسا اس کے منہ پر دے مارا۔ گھونسا زوردار تھا اور بوڑھا اس کے لیے تیار ہرگز نہیں تھا۔

بوڑھے کے منہ سے ایک تیز چیخ نکلی اور اکرم کی گردن اس سے چھوٹ گئی، یوں اچانک بوڑھے کے گردن چھوڑنے پر اکرم اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا اور تانگے سے اگلی سیٹ پر پھسلا اور پھر نیچے سڑک پر جا پڑا۔ بوڑھے نے بھاگتے گھوڑے کی باگیں اتنے زور کی کھینچیں کہ گھوڑا اپنے قدموں پر ہی ٹھہر گیا۔ تانگے سے چھلانگ لگا کر بوڑھے نے نیچے پڑے اکرم کو جا لیا۔ بوڑھے نے اپنے کالے چوغے سے ایک تیز نوک والا خنجر نکالا اور اس پر حملہ کرنے لگا۔ خنجر سے بچنے کے لیے نیچے پڑے پڑے اکرم ہر ممکن کوشش کرنے لگا۔ بوڑھا اس کو مارنے کے در پے تھا۔ اکرم نے تین چار گھونسے اور اس کے منہ پر جڑ دیے اور اس کے جسم پر سوار بوڑھا سڑک پر پشت کے بل گرا، پھر تو اکرم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ مار مار کر بوڑھے کو ادھ موا کر دیا، مگر اتنی مار کھانے کے باوجود بھی وہ بوڑھا ویسے کا ویسا ہی تازہ دم تھا۔

اکرم اس کو مارتے مارتے تھک گیا، مگر وہ بڈھا!!

اکرم نے سوچا بڈھے کو یہیں چھوڑ کر تانگے پر بیٹھ کر فرار ہو جائے کہ اس اثناء میں اس کے کانوں میں بزرگ کی آواز آئی۔

"بھاگنے سے تو ان حیوانوں سے جان نہیں بچا سکتا، خود کو بچانے کے لیے تجھے ان کو مارنا ہی ہوگا۔"

"مگر میں۔ میں، کیسے مار سکتا ہوں، یہ تو کسی صورت بھی مر نہیں رہے، نہیں یہ بڈھا تو......"

"میں جانتا ہوں۔" بزرگ کی سرگوشی گونجی، یہ حیوان ایسے نہیں مرے گا، تو اس خنجر سے اس کے دل پر وار کر، یہ ختم ہو جائے گا۔

بزرگ کی سرگوشی ختم ہی ہوئی تھی کہ اکرم خنجر لے کر اس بوڑھے پر چڑھ دوڑا۔ بوڑھے نے اپنے آپ کو بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں بہت مارے، مگر اکرم نے تاک کر خنجر کا وار عین اس کے دل پر کر دیا، بوڑھے کے منہ سے ایسی دلخراش چیخ نکلی کی جیسے آسمان پھٹ جائے گا، بوڑھا کسی ذبح کیے ہوئے بکرے کی طرح تڑپنے لگا اور جلد ہی اس کا جسم ساکت ہو کر غائب ہو گیا، سڑک پر اب صرف خنجر ہی پڑا ہوا تھا۔ اس نے خنجر اٹھایا ہی تھا کہ فضا پر تیز پروں کی پھڑپھڑاہٹ کی وجہ سے چونک کر اس نے آسمان کی طرف دیکھا، وہی کالی سیاہ بڑی چمگادڑ اوپر پرواز کر رہی تھی۔ اکرم کو خبر تھی وہ اس پر حملہ ضرور کرے گی۔ وہ تیزی سے بھاگ کر تانگے پر چڑھ گیا اور گھوڑے کو چابک مار کر تیزی سے بھگانے لگا۔ وہ بڑی خونی چمگادڑ پرواز کرتے ہوئے پیچھے سے تیزی سے آئی اور اس کی کمر پر چمٹ گئی۔ اس کے نوکیلے دانت اس کے گوشت میں پیوست ہو گئے۔ شدید درد کے ساتھ اکرم بے حال سا ہو گیا۔ اس نے چمگادڑ کو پروں سے اتنی زور سے کھینچا کہ اس کی کھال بھی ادھڑ گئی، اس کے نوکیلے دانت اس کے جسم میں گڑے ہوئے تھے۔ چمگادڑ جیسے ہی اس کے ہاتھ میں آئی اس نے زور سے اس کو نیچے سڑک پر پٹخ دیا۔ وہ سڑک پر کچھ دیر تڑپی اور پھر اُڑ گئی۔ وہ دوبارہ حملہ کرنے کے لیے تیار تھی، اکرم بھی پیچھے گردن موڑ کر دیکھتا اور کبھی دائیں بائیں دیکھنے لگتا۔ وہ کسی بھی سمت سے وار کر سکتی تھی۔

"چمگادڑ کو مارنے کے لیے تجھے اس کو دو حصوں

میں تقسیم کرنا ہوگا، نہیں تو یہ تجھے یہاں سے کسی صورت بھی جانے نہیں دے گی۔" بزرگ کی دوبارہ آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

اس نے تانگے کی رفتار مزید تیز کر دی۔ اب اردگرد تیزی سے نظریں پھیرتے ہوئے اس نے پیچھے سڑک پر دیکھا، وہی سیاہ کتا طوفان کی طرح تانگے کی جانب بھاگ رہا تھا۔ یہ کب آن پہنچا تھا، اکرم کو خبر نہ ہوئی تھی۔

اس نے تانگے کی رفتار مزید تیز کر دی کہ اچانک اس چمگادڑ نے سامنے سے اس پر حملہ کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ اس کے چہرے پر چمٹ گئی۔ سیٹ پر پڑا خنجر اٹھا کر اکرم نے زور سے چمگادڑ پر دے مارا، چمگادڑ کے منہ سے تیز درد ناک نسوانی چیخ بلند ہوئی۔ تیز دھار خنجر نے چمگادڑ کو درمیان سے دو حصوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ وہ تڑپتی ہوئی سڑک پر دو علیحدہ حصوں میں گر پڑی اور تانگے کے پہیوں کے نیچے آ کر کچلی گئی، اور پھر جلد دھواں بن کر اڑ گئی۔

چمگادڑ تو ماری گئی، مگر وہ سیاہ کتا اب بھی دیوانہ وار اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ تانگے کی رفتار مزید تیز کرتے کرتے وہ اتنا آگے نکل گیا کہ وہ خطرناک علاقہ ہی ختم ہو چکا تھا۔ اس نے دوبارہ پیچھے مڑ کر دیکھا تو کتے کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ اتنی دیر بعد اس نے سکھ کا سانس لیا تھا، سڑک ختم ہوئی تو سامنے اسٹیشن تھا، وہی ریلوے اسٹیشن جہاں پر پہلی دفعہ اس کو حیوانوں سے پالا پڑا تھا۔

"ارے یہ تو وہی اسٹیشن ہے۔" وہ بے اختیار چونک گیا۔

اس نے تانگے کو ایک جگہ پر کھڑا کیا اور خود نیچے اتر آیا۔ رات کا تقریباً آخری پہر تھا اور اسٹیشن پر ہر طرف سناٹا ہی سناٹا تھا۔ چاند اب بھی بڑی آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ اس کا سارا جسم زخموں سے چور چور تھا۔ وہ بمشکل لنگڑاتے ہوئے اسٹیشن کے وسط تک پہنچا۔ پورا کا پورا اسٹیشن ہی خالی تھا۔ نہ کوئی مسافر نہ کوئی گاڑی۔ بس اسٹیشن ماسٹر تھا، جو اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا، مگر یوں ایک زخمی نوجوان کو دیکھ کر وہ رک گیا۔

"یہ کون ہے، جو زخمی حالت میں یہاں موجود ہے۔"

اسٹیشن ماسٹر کے ذہن میں فوراً پہلا سوال یہی ابھرا۔

اکرم جو نڈھال ہو کر گرنے کے قریب تھا۔ اسٹیشن ماسٹر نے آگے بڑھ کر اس کو تھام لیا اور اسے بنچ پر لے جا کر بٹھایا۔

"نوجوان کون ہو تم۔ اس حالت میں کہاں سے آ رہے ہو۔" وہ اس کے زخموں سے بھرے جسم کو دیکھتے ہوئے بولا، جس سے خون رس رہا تھا۔

"جی میں" اکرم نے بتانا چاہا، مگر اس سے کچھ بولا ہی نہ گیا۔

"تمہاری حالت تو بہت خراب ہے، تم کو تو فوراً طبی امداد کی ضرورت ہے۔" اسٹیشن ماسٹر کو اسے اس حالت دیکھ کر تشویش ہوئی۔

"نہیں نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔" اکرم کراہ کر بولا۔

"کیا۔ تم نے اپنی حالت دیکھی ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ ٹھیک ہوں، تمہاری حالت یہ کس نے کی ہے؟ کہیں ایکسیڈنٹ یا کسی سے لڑائی وغیرہ تو نہیں ہوئی۔" اسٹیشن ماسٹر کو یہی لگ رہا تھا۔

"اگر آپ کو بتا دوں تو آپ میری مدد کریں گے۔" اکرم نے اس کی طرف دیکھا۔

"ارے کیوں نہیں نوجوان، مجھے تمہاری مدد کر کے خوشی ہوگی۔"

"اچھا....." اکرم چند لمحے ٹھہر سا گیا، پھر اس نے اپنے ساتھ بیتی ہوئی ساری کہانی سنا دی کہ وہ کس طرح حیوانوں کے چنگل سے بچ کر نکلا ہے۔ اسٹیشن ماسٹر کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، وہ بے یقینی کی کیفیت میں اکرم کو کافی دیر دیکھتا رہ گیا۔

اکرم نے اس کی یہ حالت دیکھی تو بولا۔ "میرے خیال میں آپ کو کوئی شک ہے۔"

"ہاں بھلا کسی ذی ہوش انسان کو یقین آ بھی کیسے سکتا ہے۔ جب تک ان سے کسی کا واسطہ نہ پڑ جائے۔"

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں، تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو، روز اخباروں میں ادھ کھائی ہوئی انسانی لاشوں کا پڑھ پڑھ کر یقین کرنے میں کسی بھی شخص کو دیر نہیں لگ سکتی اور پھر اس اسٹیشن پر بھی کئی لاشیں مل چکی تھیں۔" اکرم اس کی طرف دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"میرے خیال میں پولیس کو خبر کر دینی چاہیے۔ وہ کب سے اس معاملے کو سلجھانا چاہتی تھی۔" اسٹیشن ماسٹر

نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"پولیس۔" اکرم بے اختیار بولا۔

"نہیں، ان کو بتانے کا بھلا کیا فائدہ۔ وہ کیا کرے گی؟ سوائے مجھ سے تشویش کرنے کے۔ نجانے کب تک مجھے تھانے میں رکنا پڑے اور ان کے سوالوں کا جواب کون دے گا، مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے؟"

"لیکن" اسٹیشن ماسٹر بولا۔

"آپ مجھ پر ایک مہربانی کریں کہ مجھے کسی ریل گاڑی میں بٹھا دیں۔ میں جلد از جلد اپنے گاؤں جانا چاہتا ہوں، میرے ماں باپ میرا انتظار کر رہے ہوں گے، پلیز...... آپ میرا یہ کام کر دیں۔ اکرم ملتجانہ لہجے میں گویا ہوا تو اسٹیشن ماسٹر کو اس پر ترس آ گیا۔

"ابھی کوئی ایک گھنٹہ پہلے گاڑی یہاں سے گزری ہے، دوسری گاڑی کے آنے میں زیادہ وقت تو نہیں ہے، جیسے ہی وہ آئی میں تم کو اس میں بٹھا دوں گا۔"

"آپ کی بہت مہربانی ہوگی، مگر......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"کیا؟" اسٹیشن ماسٹر نے اس کی طرف دیکھا۔

"میرے پاس ٹکٹ کے پیسے نہیں ہیں، آپ ٹکٹ چیکر سے بات کر لیں تو یہ آپ کا احسان ہوگا۔"

"ارے تم اس بات کی فکر ہی نہ کرو۔ میں نے کہا نا کہ میں تم کو گاڑی میں بٹھا دوں گا، بس تم یہاں بیٹھ کر آرام کرو، میں تمہارے لیے پانی لے کر آتا ہوں۔"

ٹھنڈے پانی کی بوتل حلق سے اس نے اتاری، تو اسے ایسا لگا جیسے جسم کے اندر لگی ہوئی بھڑکتی آگ بجھ سی گئی ہو۔

اسٹیشن ماسٹر اس وقت تک اس کے پاس بیٹھا رہا، جب تک اسٹیشن پر ریل گاڑی نہ آن رکی، گاڑی آئی اور اسٹیشن ماسٹر ٹکٹ چیکر سے بات کر کے اس کو پچھلے ڈبے کی طرف لے گیا۔ اگلے سارے ڈبوں پر رش تھا، اگلے ڈبوں میں بیٹھنے کے لیے سیٹ تو مل جاتی، مگر بیٹھ کر سفر کرنے کے لیے اس کی حالت موزوں نہیں تھی۔ ٹکٹ چیکر کے کہنے پر ہی اسٹیشن ماسٹر اس کو آخری ڈبے کی طرف لے گیا۔ جہاں اس کو لیٹنے کے لیے پوری سیٹ مل سکتی تھی۔ اسٹیشن ماسٹر نے اس کو احتیاط سے ڈبے پر چڑھا دیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا ڈبے میں چلنے لگا۔ ڈبے میں مکمل اندھیرا تھا، بلب بھی بند تھا اور ڈبے کی ساری کھڑکیاں بھی۔ وہ احتیاط سے چلتا ہوا سامنے سیٹ پر جا بیٹھا۔ اسٹیشن ماسٹر نے اس کو بتایا تھا کہ اس ڈبے کی حالت ایسی تو نہیں تھی کہ لوگ اس میں بیٹھ کر سفر کر سکیں۔ ریل گاڑی کے پٹڑی سے اترنے کی وجہ سے یہ ڈبا ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ ڈبے کی سیٹیں تک اکھڑی ہوئی تھیں، اسی لیے تو کسی بھی مسافر نے اس ڈبے کا انتخاب نہیں کیا تھا۔ اسٹیشن کے عملے کا ارادہ تھا کہ گاڑی کے منزل مقصود تک پہنچ جانے پر اس ڈبے کو علیحدہ کر لیا جائے۔ اس لیے اس نے خیال کیا کہ وہ ڈبے میں اکیلا ہی ہے، مگر اس کی یہ خیال آرائی یک دم ہی ہوا ہوگئی، کیوں کہ ڈبے میں بجے ہوئے باتھ روم سے کسی انسان کی موجودگی کا احساس ہوا۔

"دودھ کا جلا ہوا تو چھاچھ بھی پھونک کر پیتا ہے۔"

کسی انسان کی اس طرح موجودگی اس کے رونگٹے کھڑے کر گئی۔ وہ اپنی سیٹ پر اور سمٹ کر بیٹھ گیا۔ انسانی قدموں کے چلنے کی آواز ساتھ کسی ٹارچ کی روشنی، یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ آخر وہ ہے کون؟

جلد ہی اس کی یہ مشکل حل ہوگئی، اس نے ایک لڑکے کو ٹارچ اٹھائے ڈبے میں آتے ہوئے دیکھا، لڑکا سادہ کپڑوں میں ملبوس تھا، اس نے آنکھوں پر عینک لگائی ہوئی تھی۔ ڈبے میں ٹارچ کی روشنی جیسے ہی پھیلی، اس لڑکے نے اکرم کی طرف دیکھا۔

شکر ہے کوئی اور بھی سامنے ادھر آ موجود ہوا ہے، ورنہ میں تو سمجھ رہا تھا کہ مجھے اکیلے ہی سفر کرنا پڑے گا۔

وہ لڑکا اس کا سلام لیتے ہوئے بولا۔

"اتنا بڑا سفر تنہا گزارنا کافی مشکل کام ہے۔" اکرم نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا، لیکن وہ لڑکا کافی باتونی تھا۔ وہ اس سے باتوں میں ایسا لگا کہ چپ ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ اکرم کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ ٹارچ کی روشنی ڈبے میں چار سو پھیلی ہوئی تھی، اکرم نے ڈبے میں نگاہ دوڑاتے ہوئے اچانک اپنے سامنے سیٹ والی اوپری برتھ کی جانب دیکھا تو وہاں بھی کوئی

موجود تھا، جو منہ پر اخبار رکھے لیٹا ہوا تھا۔

"کتنی گھٹن محسوس ہو رہی ہے، میرے خیال میں ڈبے کی ایک کھڑکی تو کھول ہی دینی چاہیے۔" اکرم جو اس اوپری برتھ کی طرف ہی دیکھ رہا تھا، اس لڑکے کے اس کی طرف دیکھے اور اس کا کوئی جواب سنے بغیر آگے آ کر ڈبے کی ایک کھڑکی کھول ڈالی۔ کھڑکی میں سے تازہ ہوا ڈبے کے اندر آنے لگی تھی۔ اکرم نے دیکھا کہ اس ہوا کی وجہ سے برتھ پر لیٹے ہوئے شخص کے منہ سے اخبار ہٹ گیا تھا، وہ چمکتی تیز خوں خوار آنکھیں اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ یہ دیکھ کر اکرم کو اس قدر زور کا جھٹکا لگا کہ جیسے اس کی جان ہی نکل گئی ہو۔ برتھ پر وہ آدم خور بھیڑیا نما انسان لیٹا اس کی ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے خون سے بھری لال ہونٹوں پر پُر اسرار مسکراہٹ تھی۔

گاڑی ابھی تک تو نہیں چلی تھی، مگر اس کی جان چلے جانا کا خدشہ ضرور تھا۔

اس کو یہ خبر نہ تھی کہ وہ کس طرح سیٹ سے اُٹھا اور کس طرح ڈبے سے باہر آیا۔ وہ لڑکا اس کو پاگلوں کی طرح بھاگتے ہوئے دیکھ کر اس کو رکنے کے لیے آوازیں دینے لگا، مگر وہ یہ آوازیں کب سن رہا تھا۔

ڈبے سے تیزی کے ساتھ اُترنے سے اس کا پاؤں پھسلا اور وہ سیدھا نیچے فرش پر جا گرا۔ اسٹیشن پر کھڑے پولیس انسپکٹر، جس کو اسٹیشن ماسٹر نے ہی فون کر کے بلوایا تھا، اسٹیشن ماسٹر کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا۔ اس کو یوں ڈبے سے باہر گرتا ہوا دیکھ کر وہ دونوں تیزی سے اس کی طرف لپکے۔

گاڑی آہستہ آہستہ چلنے لگی تھی۔

"نوجوان کیا ہوا تمہیں۔ تم یوں ڈبے سے باہر کیوں آ گئے ہو۔" اسٹیشن ماسٹر اس کو سنبھالتا ہوا بولا۔

"ہاں نوجوان۔ اسٹیشن ماسٹر نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے، جو تمہارے ساتھ بیت چکا ہے، تم تو اپنے گھر روانہ ہو رہے تھے، پھر یوں یہ سب......"

پولیس انسپکٹر اس سے گویا ہوا۔ "سب ٹھیک تو ہے نا۔" پولیس انسپکٹر کو لگا جیسے کوئی خطرہ ضرور ہے۔

"وہ۔ وہ۔ ڈبے کے اندر....." وہ ہکلا رہا تھا۔

"کیا ہے اس ڈبے کے اندر۔" اسٹیشن ماسٹر کے ساتھ پولیس انسپکٹر بھی چونک گیا۔

"وہ درندہ آدم خور بھیڑیا اس ڈبے کے اندر ہے۔ وہ اس نوجوان کو مار ڈالے گا۔ جو ڈبے میں موجود ہے۔"

"کیا۔" وہ دونوں ششدر ہو کر رہ گئے۔

"گاڑی کو رکواؤ، ورنہ گاڑی میں شاید کوئی بھی نہیں بچے گا۔ وہ حیوان سب کو مار دے گا۔" اکرم ہذیانی انداز میں چیخ اُٹھا۔

گاڑی جو آہستہ آہستہ چلتے چلتے اسٹیشن کو پار کرنے والی تھی، جلد ہی اس کو روک لیا گیا۔ ڈبوں میں موجود تمام مسافر اسٹیشن پر آ موجود ہوئے، وہ سب حیران تھے کہ آخر معاملہ کیا ہے۔

پولیس انسپکٹر نے اپنی نفری بلالی، جلد ہی کئی پولیس والے اس ڈبے کے ارد گرد جمع ہو گئے، جس میں وہ آدم خور حیوان موجود تھا۔ ڈبے میں مکمل خاموشی تھی۔ اس باتونی نوجوان کی بھی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی، لگتا یوں تھا جیسے وہ اس حیوان کا شکار بن چکا ہو۔

"تم جو کوئی بھی ہو باہر نکل آؤ۔ تم ہمارے گھیرے میں ہو بچ کر نہیں جا سکتے۔" پولیس انسپکٹر نے پستول تانے بلند آواز میں کہا۔

"بہتر یہی ہے کہ باہر نکل آؤ۔"

جلد ہی ڈبے میں غراہٹیں اور ہڈیاں توڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ پولیس انسپکٹر کے اشارے پر ایک پولیس والا ڈبے کے نزدیک پہنچ کر اندر دروازے میں جھانکنے لگا۔ ابھی وہ کچھ دیکھتا کہ ڈبے میں بھاری وجود اس کو لیتا ہوا اسٹیشن پر آ گرا۔

اسٹیشن پر موجود تمام مسافروں سمیت پولیس والوں کی چیخیں نکل گئیں، لوگ خوف سے تھر تھر کانپنے لگے تھے۔

ریچھ جیسی شباہت والا ایک بھورے رنگ کا خوف ناک بھیڑیا ان کے سامنے کھڑا تھا۔ پولیس انسپکٹر بھی ایک لمحے کے لیے ڈگمگا گیا اس حیوان نے پلک جھپکتے ہی اس پولیس والے کو ادھیڑ کر رکھ دیا۔ اسٹیشن پر موجود تمام افراد کے لیے یہ منظر ناقابل برداشت تھا۔ ان کی نظر سے کبھی ایسا منظر گزرا ہی نہیں تھا۔ کئی لوگ تو چیخیں مار کر بھاگنے لگے۔ آدم خور بھیڑیے نے جست بھری اور دو عدد لوگوں کو جا لیا اور

اپنے تیز دھار آری جیسے دانتوں اور ناخنوں سے ان کا گوشت پھاڑ ڈالا۔

پولیس انسپکٹر تو سکتے کے عالم میں پہلے پہل یہ سب کچھ دیکھتا رہا، پھر انسانی چیخوں کی آواز سن کر ہوش میں آیا اور اس بھیڑیے پر فائر کھول دیا۔ نشانہ خطا گیا، لیکن پولیس انسپکٹر بھیڑیے کی نظر میں آ گیا۔ بھیڑیے نے ایک جست بھری اور پولیس انسپکٹر کو شکار بنانا چاہا تھا کہ اس اثناء میں پولیس انسپکٹر نے دوسری گولی چلا دی۔ اب کی بار نشانہ خطا نہیں گیا، گولی سیدھی بھیڑیے کے سر کے عین وسط میں پیوست ہو گئی۔

فضا میں جست بھرتے ہوئے بھیڑیا اوندھے منہ نیچے فرش پر آن گرا۔ یہاں تک کہ وہ دوبارہ اُٹھتا، پولیس والوں نے تین چار گولیاں ایک ساتھ چلا کر اس کا کام تمام کر دیا۔ غراہٹیں نکالتا بھیڑیا ایک دم ہی ساکت ہو گیا۔ گولیاں لگنے سے اس کا اتنا خون نکلا، جیسے کسی نے کوئی گائے ذبح کی ہو۔ اسٹیشن پر موجود تمام افراد کو ایک اور جھٹکا لگا کہ جہاں بھیڑیے کی لاش پڑی تھی، اب وہاں ایک خوبرو نوجوان لڑکا مرا ہوا پڑا تھا۔ چار سو خاموشی سی پھیل گئی، انسپکٹر جو نیچے فرش پر گرا پڑا تھا، وہ وردی جھاڑتے ہوئے اُٹھا کہ اسٹیشن ماسٹر پر بھونکتے اس سیاہ کتے نے اس پر حملہ کر دیا۔ کتا اس کو لیے نیچے فرش پر جا پڑا۔

پولیس انسپکٹر اس آفت پر بوکھلا سا گیا۔ یہاں تک کہ وہ سیاہ کتا اس کو کاٹتا۔ اکرم نے انسپکٹر کی پستول اٹھا کر اس کتے پر اتنے فائر کیے کہ جب تک وہ تڑپ کر مر نہ گیا۔

پولیس انسپکٹر کے ساتھ باقی سب افراد مشکور نظروں سے اکرم کی طرف دیکھنے لگے۔

"تم بہت بہادر ہو نوجوان کہ تم نے اکیلے ہی اتنا سب کچھ برداشت کیا۔ ان حیوانوں سے جان چھڑانے کے لیے یوں ہماری مدد کی اور انسانیت کو ان حیوانوں کے چنگل سے پاک کیا۔ ویلڈن نوجوان ویلڈن۔" پولیس انسپکٹر نے اس کو شاباش دی۔

"تم جیسے بہادر لوگوں کو پولیس میں ہونا چاہیے، پولیس کو تم جیسے نوجوان کی اشد ضرورت ہے، مجھے پتا ہے کہ تم پڑھے لکھے ہو۔ ڈھنگ کی نوکری نہیں ہے تمہارے پاس، کیا تم پولیس جوائن کر سکتے ہو۔"

"پولیس کی نوکری۔" اکرم کے لیے یہ کسی بھی اعزاز سے کم نہیں تھا۔ اس کے لیے اور اس کے والدین کے لیے کتنے فخر کی بات تھی۔

"میں آج ہی ہیڈ ڈپارٹمنٹ سے تمہارے متعلق بات کرتا ہوں، تم نے جس طرح یہ جان لیوا مسئلہ حل کیا ہے، تم کو انعام و اکرام سے بھی نوازا جائے گا۔"

اکرم کی مسرت کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ خوشی سے ناچنے لگے۔

"میں نے کہا تھا نا کہ تم ان حیوانوں کو مار سکتے ہو۔" اکرم کے کانوں میں اچانک سرگوشی ہوئی، اکرم نے گردن اُٹھا کر سامنے دیکھا وہ باریش بزرگ اس کے سامنے کھڑے مسکرا رہے تھے۔

"مجھے خوشی ہے تم نے یہ کام آخر کر دکھایا۔" بزرگ بولے۔

"تم واقعی بہت بہادر ہو۔"

"بابا آپ نے بھی میری بہت مدد کی ہے، سچ تو یہ ہے کہ اگر آپ نہ ہوتے تو میں کبھی بھی یہ کام نہ کر سکتا تھا۔" اکرم یہ ساری کامیابی صرف اپنے ہی سر نہیں لینا چاہتا تھا۔

"ہاں میں نے بس وہ کیا جو میرے بس میں تھا، ورنہ باقی تو سب تمہارے ذہن اور طاقت کا کمال ہے۔"

"میرے پاس اب زیادہ وقت نہیں ہے، جو کام میرے ذمے تھا۔ وہ بخوبی سرانجام پا گیا ہے۔ بس اب میرا کام بھی ختم ہوا اور اس دنیا سے ناتا بھی۔"

بزرگ بولتے بولتے اچانک ہی غائب ہو گئے۔

"کس سے باتیں کر رہے ہو، یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔" پولیس انسپکٹر نے یوں اس کو اکیلے میں بولتے ہوئے دیکھا تو بولا۔

"نہیں کچھ نہیں۔" اکرم مسکرا کر بولا۔

اب وہ پولیس انسپکٹر کو بھلا کیا بتاتا کہ اس سارے واقعے پر ایک نادیدہ روح نے اس کی قدم قدم پر مدد کی تھی اور ان کی رہنمائی کے ذریعے ہی وہ اس کامیابی سے ہم کنار ہوا تھا۔

☆......☆



ناجاں

زیبا مصطفیٰ

ایک ایسی لڑکی کی کہانی جس نے نادیدہ مخلوق سے شادی کرلی اور پھر......

زندگی میں نجانے کتنے ہی انوکھے، عجیب و غریب اور پراسرار واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں، جن پر سوچو تو عقل حیران اور وجود بے یقین سا رہتا ہے۔ سب کچھ ایک خواب تماشا سا لگتا ہے۔ اب میں آپ کو



جو بچی کہانی سناؤں گی وہ میری آنکھوں دیکھی ہے۔

یہ عرصہ پندرہ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ ہم آٹھ بہنیں تھیں، جن میں سے ایک کا انتقال ہو گیا اور اب ہم سات بہنیں اور دو بھائی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اتنی زیادہ جس کی بہنیں ہوں تو اُسے کوئی سہیلی بنانے کی ضرورت نہیں ہوتی، لیکن میری ایک سہیلی تھی جس کا بچپن ہمارے ساتھ کھیلتے کودتے گزرا۔ آپ اسے میری سب سے اچھی دوست کہہ سکتے ہیں۔ اس کا نام نادرہ تھا لیکن پیار سے سب اسے ناجاں کہتے، وہ بہت خوب صورت تھی۔ اپنی خوب صورتی کی وجہ سے وہ اپنے خاندان میں نمایاں مقام رکھتی تھی۔ بقول اس کے خاندان والوں کے مجید احمد کی بیٹی نادرہ کو خدا نے خوب فرصت سے بنایا ہے۔ یہ اونچا لمبا قد، بڑی بڑی غلافی آنکھیں، ستواں ناک، گلابی ہونٹ، گھنگھریالے بال، بس وہ خوب صورتی کا مجسمہ تھی۔ وہ تین بہنیں اور ان کا ایک بھائی تھا۔ ناجاں ان میں سب سے بڑی تھی۔ ان کے گھر کے حالات بھی ٹھیک تھے۔ یہ سب جوائنٹ فیملی میں رہتے تھے۔ ان کا گھر تین منزلہ تھا۔ سب سے اوپری منزل میں یہ لوگ رہتے تھے۔ دو کمرے تھے، کچن اور باتھ روم سے آگے صحن تھا۔ ان کے گھر کے سامنے بہت بڑا صابن کا کارخانہ تھا۔ کارخانے کے احاطے میں ایک دیو قامت پیپل کا بہت پرانا درخت تھا۔ جو ان کے صحن سے صاف نظر آتا تھا۔ رات کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی بہت بڑا دیو کھڑا ہو۔ میں اور ناجاں بہت اچھی سہیلیاں تھیں، چوں کہ میں بھی بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی اور وہ بھی۔ اس لیے ہماری آپس میں خوب بنتی تھی، اس کی امی میری امی کی دوست تھیں، اس لیے ہم ایک دوسرے کے گھر بلا ضرورت چلے جاتے تھے۔ وہ اکثر ہمارے گھر آجاتی۔ ہم خوب باتیں کرتے اور ساتھ اچھی اچھی چیزیں بھی منگوا کر کھاتے۔ ہم اگر آپس میں لڑ پڑتے تو وہ صلح میں پہل کرتی، وہ کسی کا دل نہیں دکھاتی تھی۔ وہ ایک حساس قسم کی لڑکی تھی۔ سب اسے محبت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اُسے انار اور سیب بہت پسند تھے۔

ایک دن ناجاں مجھ سے کہنے لگی کہ پروین چل پشاور چلیں۔ وہاں جا کر سیر و تفریح کریں گے اور خوب سیب کھائیں گے، پھر دیکھنا رنگ ہمارے اور بھی سرخ و سفید ہو جائیں گے۔ میں اس کی باتیں ہنسی میں ٹال دیتی۔ ایک دن وہ نہا کر نئے کپڑے پہن کر آئی اور کہنے لگی۔

"چلو تصویر اتروانے چلیں۔" میں نے حیرانگی سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

"خیر تو ہے آج قیامت کس پر ڈھانے کا ارادہ ہے۔" وہ ہنسنے لگی اور کہنے لگی۔

"پروین میں اپنی امی سے اجازت لے کر آئی ہوں، چل تو جلدی سے تیار ہو جا۔" میں نے اپنی امی سے کہا اور جلدی سے تیار ہو کر ہم تینوں یعنی میں نادرہ اور میری امی تصویر کھنچوانے فوٹو اسٹوڈیو چلے گئے۔ وہ ہی ایک تصویر ہے جو اس کی یادگار میرے پاس ہے۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کے پاس بہت ساری دولت ہو اور وہ ساری دنیا کی سیر کرے۔ دوسرے اس کے خاندان والے بہت امیر تھے اور یہ لوگ ان کے مقابلے میں غریب۔

میرے نانا نے میری امی سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ پروین نسیم جو کہ مجھ سے چھوٹی تھی، ان کا رشتہ میری خالہ کے لڑکوں سے ہو جائے۔ میری امی نے میرے ابا سے بات کی کہ خالہ ہم دونوں بہنوں کا رشتہ مانگ رہی ہیں۔ ابو بھی اس رشتے سے راضی ہو گئے، اس طرح ہم دونوں بہنوں کی منگنیاں ہو گئیں اور ایک سال بعد شادی قرار پائی۔ اُدھر ناجاں کی پھوپھو، جو کہ بہت ہی امیر تھیں، اپنے بڑے بیٹے کے لیے اس کا رشتہ لے کر آئیں۔ اس کے والدین کو اور کیا چاہیے تھا کہ ان کی بیٹی کی دلی خواہشات پوری ہو رہی ہیں۔ انہوں نے اس رشتے کی فوراً حامی بھر لی، ناجاں بہت خوش تھی اس نے سب سے پہلے یہ خبر مجھے سنائی، وہ مجھ سے کہنے لگی۔

"دیکھ ہم دونوں کی دلی مرادیں پوری ہو رہی ہیں۔ اُدھر تیری شادی، اِدھر میری۔ پروین خدا نے میری دعا سن لی اب میری ہر خواہش پوری ہو گی میں بہت خوش ہوں، چل آج کوئی ہلا گلہ کریں۔" پھر ہم سب نے مل کر ایک چھوٹی سی پارٹی کی۔ ناجاں کی اماں اور ابا بہت سیدھے سادے تھے۔ اس کی منگنی کو دو سال گزر گئے، لیکن اس کی پھوپھو شادی کرنے پر آمادہ نہیں تھیں۔ ایک دن اس کی پھوپھو آئیں اور کہنے لگیں۔

"بھائی جان میں آپ سے معذرت کرنے آئی ہوں۔ آپ مجھے ملامت سمجھیں۔ میں یہ منگنی توڑ رہی ہوں۔ ناجاں صرف خوب صورت ہے، جبکہ نہ تو وہ قرآن پڑھی ہوئی ہے اور نہ ہی اسکول۔ ہم ایسی خوب صورتی کا کیا کریں جو کسی کام کی ہی نہیں۔ آپ میری طرف سے انکار ہی سمجھیں اور میں نوید کا رشتہ رشید احمد کی بیٹی سے کر رہی ہوں اور ہاں آپ لوگ پریشان نہ ہوں، میں نے ناجاں کا بھی رشتہ طے کر دیا ہے، مرید احمد کے بیٹے کے ساتھ۔" اس کے والدین سیدھے سادے تھے۔ مجید احمد نے بہن کے فیصلے پر سر جھکا دیا۔ ناجاں کو جب ان سب باتوں کا پتا چلا تو وہ بہت روئی۔ وہ بھی شریف ماں باپ کی اولاد تھی۔ اس نے زہر کا گھونٹ پی لیا اور خاموشی اختیار کر لی۔ بہت دن ہو گئے تھے اسے ہمارے گھر آئے ہوئے، آخر ایک دن میں ہی اس کو ملنے اس کے گھر چلی گئی۔ جب میں اسے ملنے کے لیے گئی تو وہ بستر پر لیٹی چھت کو گھور رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"کیا بات ہے آج آرام ہو رہا ہے، خیر تو ہے۔ لگتا ہے نوید صاحب کچھ زیادہ ہی یاد آ رہے ہیں۔" جب اس نے مجھے دیکھا تو ایک دم اُٹھ بیٹھی۔ وہ رو رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔

"کیا ہوا۔" تو وہ میرے گلے لگ کے اور رونے لگی۔ میں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پوچھا۔ "کیا بات ہے مجھے بتاؤ تو سہی۔" پھر اس نے مجھے وہ سب کچھ بتایا جو اس کی پھوپھو نے ان کے ساتھ کیا تھا۔ ناجاں کہنے لگی۔

"دیکھ پروین میرے والدین نے مجھے نہیں پڑھایا تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔" وہ چند دنوں میں بہت کمزور ہو گئی تھی۔ اب وہ سب سے کم ہی بولتی تھی اگر کوئی کچھ پوچھتا تو ہوں، ہاں میں جواب دیتی تھی۔ گھنٹوں اکیلی بیٹھی رہتی اور خود سے باتیں کرتی رہتی۔ اب تو وہ دوپہر کے وقت پیپل کے درخت کی طرف ٹکٹکی باندھے رکھتی۔ کوئی پوچھتا کہ تم ادھر کیا دیکھتی رہتی ہو تو خاموش رہتی اور اپنے کمرے میں جا کر لیٹ جاتی، پھر میری شادی کے دن قریب آ گئے تو میں اپنی شادی کا کارڈ خود اسے دینے کے لیے گئی۔ مجھے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئی۔

اس کی ماں نے جب اسے دیکھا تو پوچھا۔

"ناجاں پتر ایسے ہی ہنستی بولتی رہا کر، تیری خاموشی میرا دل چیرتی ہے۔ دیکھ پروین پتر اس کو سمجھاؤ۔ جب سے اس کی منگنی ٹوٹی ہے یہ تو دنیاداری بھول ہی گئی ہے۔ تو ہی اس کو سمجھا۔"

میں نے کہا۔ "خالہ جی آپ فکر نہ کریں میں اسے سمجھاؤں گی۔ میری پیاری ناجاں تجھے کیا ہو گیا ہے، تو کیوں اس طرح اُداس رہتی ہے۔ نوید نہ سہی اور سہی تو اپنا دل چھوٹا نہ کر۔ دیکھ تیری ماں کا کیا حال ہو گیا ہے۔ ان ہی کا کچھ خیال کر لے۔"

میرے سمجھانے پر وہ کچھ ٹھیک ہوئی آتے ہوئے میں نے اس سے کہا۔

"اچھا اب میری شادی پر منہ لٹکا ہوا نہ ہو، دیکھ تو ہی میری سہیلی ہے اور آنا ضرور تھی۔ اچھا اب میں چلتی ہوں۔" یہ کہہ کر میں اُٹھ گئی، تو وہ ناراض ہونے لگی۔

"تھوڑی دیر اور بیٹھ جا۔"

میں نے کہا۔ "نہیں بہت دیر ہو گئی ہے اب مجھے چلنا چاہیے۔" میں نے اسے پیار کیا اور گھر آ گئی۔ گھر آ کر بھی نجانے کیوں میرا بار بار دھیان اسی کی طرف چلا جاتا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے بہت رونا آ رہا تھا۔ وہ ہنستی کھیلتی ناجاں نجانے کہاں کھو گئی تھی۔ میری مہندی پر ناجاں اور اس کے گھر والے سب آئے، وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ ڈھولکی بج رہی تھی اور لڑکیاں شادی بیاہ کے گیت گا رہی تھیں، لیکن وہ چپ تھی۔ وہ میرے پاس ہوتے ہوئے کہیں اور کھوئی ہوئی تھی۔ میں نے پیار سے اس کے بازوؤں کو پکڑ کر ہلایا۔

"ناجاں کیا بات ہے کیوں اُداس ہو۔" وہ تو جیسے پتھر کی مورت بنی ہوئی تھی بالکل خاموش۔ سبز کپڑوں میں وہ حور لگ رہی تھی۔ بغیر میک اپ کے ہی وہ اتنی حسین لگ رہی تھی کہ پوچھو مت۔ کچھ دیر وہ بیٹھی رہی، پھر مجھ سے کہنے لگی۔

"میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے میں گھر جانا چاہتی ہوں۔" پھر وہ اپنی امی کے ہمراہ گھر چلی گئی۔

"وہ میری بارات میں بھی نہ آئی۔ میری شادی ہو گئی اور میں بیاہ کر دوسرے شہر روانہ ہو گئی۔ جب میں

میکے آئی رہنے کے لیے تو وہ اپنی امی کے ساتھ مجھ سے ملنے کے لیے آئی۔ وہ اسی طرح خاموش تھی۔ میں اور وہ ایک دوسرے کے بہت قریب تھیں، لیکن اب وہ اور طرح کی ہوگئی تھی۔ اپنی کوئی بھی بات وہ مجھ سے چھپاتی نہیں تھی، لیکن اب اس کو نہ جانے کیوں چپ لگ گئی تھی۔ اس کی ماں نے مجھے بتایا کہ اگلے ہفتے اس کی شادی ہے اور یہ الٹی سیدھی حرکتیں کرتی رہتی ہے۔

وہ ہر وقت پیپل کے اس درخت کو گھورتی رہتی جو صابن کے کارخانے میں لگا ہوا تھا۔ کبھی دوپہر کے وقت اکیلی چھت پر چلی جاتی ہے اور اتنی گرمی میں گھنٹوں اوپر ہی رہتی ہے۔ پتا نہیں میری بچی کو کیا ہوگیا ہے، نجانے کس کی نظر لگ گئی ہے۔ پروین تم شادی میں ضرور آنا۔ یہ اسی لیے مجھے یہاں لے کر آئی ہے۔ چل ناجاں اپنی سہیلی کو اپنی شادی کا کارڈ دو۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا کارڈ مجھے دے دیا اور کہنے لگی۔

”دیکھ اب میری شادی ہو رہی ہے تم ضرور آنا اور دیکھنا میرا دولہا کتنا خوب صورت ہے، آؤ گی نا۔“

میں نے کہا۔ ”تم نے اتنے پیار سے بلایا ہے آنا تو پڑے گا۔“ اس کی مہندی تھی۔ اس کی بہنوں اور دولہا کی طرف سے آئی ہوئی لڑکیوں نے خوب ڈھولک بجایا اور ڈانس کیے۔ ناجاں کو ابٹن لگایا اور پیلا جوڑا پہنایا۔ وہ چپ چاپ سب کچھ کرتی گئی۔

صبح کو بارات آنے والی تھی وہ نہا دھو کر باہر نکلی۔ سرخ کپڑے پہنے ہوئے تھے اپنے بالوں کو وہ تولیے سے صاف کرتی ہوئی صحن میں آئی، وہ صحن میں کھڑی بال سکھا رہی تھی کہ اس نے کچھ سائے آتے ہوئے دیکھے جو اسی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس وقت اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور ایک دم چیخ مار کر وہ گر کر بے ہوش ہوگئی۔ اس کا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کو اس طرح گرتے ہوئے دیکھ کر سب لوگ بھاگے ہوئے آئے، وہ بے سدھ پڑی ہوئی تھی۔ اس کو اٹھا کر اندر لے گئے اور بیڈ پر لٹا دیا۔ ڈاکٹر کو بلا کر لائے اس نے اس کو چیک کیا اور انجکشن لگایا۔ اس کی ماں نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

”اسے کیا ہوا ہے۔“ تو اس نے کہا۔ ”کوئی ایسی بات نہیں ہے، بس کمزوری سے چکر آ گیا تھا۔ میں نے انجکشن لگا دیا ہے اب فکر والی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔“ تھوڑی دیر بعد اسے ہوش آ گیا، اب وہ پہلے سے کافی بہتر لگ رہی تھی۔ اسے دلہن بنایا گیا۔ وہ اب پہلے کی نسبت زیادہ بہتر لگ رہی تھی۔ دلہن بن کے اس کے حسن کو چار چاند لگ گئے تھے۔ خوب صورت تو وہ پہلے ہی بہت تھی، لیکن اب تو وہ حور لگ رہی تھی۔ میں اس کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ اب وہ سب کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ کبھی اونچی آواز سے خود ہی ہنسنا شروع ہو جاتی۔ میں دیکھ رہی تھی کہ وہ کچھ پاگلوں جیسی حرکتیں کر رہی تھی اور ایسے بیٹھی تھی جیسے اس کی شادی نہیں ہو رہی کسی اور کی ہو رہی ہے اور یہ اس گھر میں مہمان آئی ہوئی ہے۔ میں نے پیار سے کہا۔

”ناجاں کیا کر رہی ہوں، خاموشی سے سر جھکا کر بیٹھو۔ تمہارے رشتے دار باتیں بنائیں گے۔“ وہ میری بات فوراً مان لیتی تھی اور اب کی بار بھی وہ ٹھیک ہو کر بیٹھ گئی۔ بارات آ گئی مولوی جب اس کا نکاح پڑھانے کے لیے آئے تو اس نے نکاح کے وہ الفاظ ادا کیے کہ تمہیں قبول ہے تو ہنس کے کہتی۔

”ہاں جی“ میں تو اس کو دیکھ کر حیران ہو رہی تھی کہ اس کو ہوا کیا ہے، یہ ایسی تو نہ تھی۔ مجھے کچھ گڑبڑ لگ رہی تھی، کیوں کہ وہ اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔ اس کا نکاح ہو گیا، نکاح کے بعد وہ کچھ اچھی اچھی سی تھی، پھر اس کی رخصتی ہوگئی۔ اسے جب اس کے کمرے میں لا کر بٹھایا گیا تو وہ سارے کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ تھوڑی دیر بعد دولہا بھی آ گیا۔ اس نے جب دلہن کے پاس آنے کی کوشش کی تو وہ ایک دم کھڑی ہوگئی اور کہنے لگی۔

”خبردار میرے پاس مت آنا ورنہ میں تمہیں مار ڈالوں گی۔“ دولہا اس کے بدلے ہوئے روپ کو دیکھ کر گھبرا گیا اور ایک دم سے پیچھے ہٹ گیا۔ ناجاں کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور اس کی آنکھیں انگارے برسا رہی تھیں۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ اس کی شکل اس وقت بہت بھیانک لگ رہی تھی۔ دولہا باہر چلا گیا اور اس نے اپنے گھر والوں کو بتایا۔ اس کی ماں، بہنیں اور دوسری رشتے دار عورتیں بھاگی ہوئی آئیں تو کیا دیکھتی ہیں کہ وہ اپنے بیڈ پہ آرام سے سو رہی ہے۔ انہوں نے دو تین سے کہا

کہ یہ تو سو رہی ہے اور تم ایسے ہی ڈر رہے ہو، بیچاری تھک گئی ہوگی، اسے تھوڑا آرام کرنے دو۔ وہ سب واپس چلی گئیں، اس نے دروازے کو کنڈی لگائی اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ بے سدھ پڑی سو رہی تھی، جبکہ اس کا دولہا اسے دور سے ہی دیکھ رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے جو اتنی خوف ناک لگ رہی تھی، وہ اب دنیا کی سب سے خوبصورت عورت لگ رہی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ جا کر اسے قریب سے دیکھے۔ ابھی وہ اُٹھا ہی تھا کہ وہ اُٹھ بیٹھی اور کہنے لگی۔

"میں نے تم سے کہا تھا نا کہ میرے قریب نہ آنا، اس کی آنکھیں پھر شعلے برسانے لگی تھیں۔"

دولہا سمجھ گیا کہ ضروری کوئی بات ہے، ناجاں میں ضرور کوئی جن بولتا ہے۔ اُس نے آیات قرآنی پڑھنا شروع کر دیں اور ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔ وہ پھر لیٹ گئی اور وہ وہیں بیٹھا بیٹھا سو گیا۔ صبح کو ولیمہ تھا۔ دولہا تو دلہن کے پاس تک نہ آیا تھا۔ اس نے اپنی ماں کو رات والی بات بتائی تو وہ بھی بہت پریشان ہوئی اور کہنے لگی۔

آنے دو اس کے گھر والوں کو ان سے بات کروں گی۔" جب اس کے گھر سے لوگ اس کو لینے آئے تو اس کی ماں نے کہا۔

"بہن نادرہ میں جن آئے ہوئے ہیں، وہ تو دولہے کو دیکھ کر آگ بگولہ ہو جاتی ہے۔ ساری رات بیچارہ ایک کونے میں بیٹھا رہا ہے۔ جاؤ جا کر اپنی بیٹی سے پوچھو، اس کو کیا ہوا ہے۔" ناجاں کی اماں آتے ہی یہ سب باتیں سن کر پریشان ہو گئی اور پھر اپنی بیٹی سے پوچھا۔

"تمہیں کیا ہوا تھا۔ تم کیوں رات بھر اپنے دولہا سے ناراض رہی۔" وہ کہنے لگی۔

یہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ میری جس سے شادی ہوئی ہے، مجھے وہ اچھا لگتا ہے۔ تم لوگوں نے مجھے یہاں کیوں بھیجا ہے۔ مجھے گھر واپس لے چلو، ورنہ میں بھاگ جاؤں گی۔"

اس کی ماں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔

"دیکھ پتر! تیری شادی تو ہم نے آصف سے کی ہے اور وہ تیرے ساتھ ہے اور کس کے پاس تو نے جانا تھا۔"

وہ کہنے لگی "نہیں میرا اس سے نکاح نہیں ہوا وہ تو کوئی اور ہے۔" اس کی ماں نے کہا۔

"چپ ہو جا، گھر جا کر بات کریں گے۔" دولہے کی ماں نے ناجاں کی امی سے کہا۔ "مجھے تو لگتا ہے اس پر آسیب ہے، آپ اسے کسی عامل کو دکھائیں۔" جب گھر واپس آئے تو اس کی ماں نے اس کے باپ سے کہا۔ اس کے باپ نے کہا "اچھا میں کسی سے بات کرتا ہوں۔"

میں صرف بارات پر گئی تھی ولیمے پر میں جا نہ سکی۔ صبح کے 6 بجے تھے۔ ہمارے گھر کا دروازہ کوئی زور زور سے بجائے جا رہا تھا۔

ہم سب دروازے کی دستک سے اُٹھ بیٹھے۔ بابا جان نے کہا کہ اس وقت کون ہو سکتا ہے؟ انہوں نے جلدی سے دروازہ کھولا وہاں تو ناجاں کے ابا کھڑے تھے وہ بہت پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ بابا نے پوچھا۔

"کیا بات ہے، خیر تو ہے، اتنی صبح صبح۔"

انہوں نے کہا۔ "ناجاں آپ کے گھر تو نہیں آئی، انہوں نے کہا نہیں۔" خیر تو ہے آپ اندر تو آئیں میں اور امی بھی ادھر ہی چلے آئے، میں نے کہا۔

"چچا جان کیا بات ہے آپ اتنے پریشان کیوں لگ رہے ہیں، تو کہنے لگے۔

"بیٹے میں ناجاں کا پتا کرنے آیا ہوں وہ گھر سے کہیں چلی گئی ہے۔" جب انہوں نے مجھے یہ بتایا تو میں نے پوچھا۔ "کہاں چلی گئی، گھر میں کوئی لڑائی جھگڑا تو نہیں ہوا۔" انہوں نے کہا۔

"لڑائی جھگڑا کیوں ہونا تھا بس وہ بتائے بغیر گھر سے غائب ہے۔" وہ جیسے آئے تھے ویسے ہی واپس چلے گئے۔ میں اپنی بالکونی سے باہر دیکھ رہی تھی کہ میں کیا دیکھتی ہوں۔ آگے آگے ناجاں گوٹے والے سرخ جوڑا پہنے بھاگی آ رہی تھی اور پیچھے پیچھے اس کے ابا جان تھے۔ ناجاں کے بال بکھرے ہوئے تھے اور دوپٹا اس کے گلے میں تھا نہیں اور بھاگی آ رہی تھی اس کو کسی کی بھی پروا نہیں تھی، ادھر سے اس کا چچا زاد بھائی بھی آ گیا اور اسے پکڑ لیا۔ وہ زور زور سے چلا رہی تھی۔

"مجھے چھوڑ دو۔ مجھے جانے دو، ورنہ میں تمہیں مار ڈالوں گی۔" انہوں نے اسے مضبوطی سے پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے گھر لے گئے اور گھر لے جا کر اسے رسیوں سے باندھ دیا، پھر ایک عامل کو بلا کر لائے جو بہت پہنچا ہوا تھا۔ جب عامل ان کے گھر داخل ہوا تو ناجاں نے اسے

گھور کر دیکھا اور کہنے لگی۔

''ارے بڈھے یہاں سے دفع ہو جا، ورنہ میں تمہیں پکڑ کر اوپر سے نیچے پھینک دوں گی۔'' عامل حیران رہ گیا کہ اسے کیسے پتا چلا کہ میں ایک عامل ہوں۔اس نے کہا۔

''آپ اپنے بچوں کو دوسرے کمرے میں بھیج دیں اور خود بے شک یہیں پر رہیں۔'' پھر وہ ناجاں کی طرف متوجہ ہوا اور کچھ پڑھنے لگا۔ وہ جوں جوں پڑھ پڑھ کر اس پر پھونکیں مارتا، اس کی حالت اتنی ہی بگڑتی جاتی۔ اس نے کچھ پڑھ کے اس پر پھونکا اور اس کے سر کے بال پکڑ لیے اور کہنے لگا۔

''بتا تو کون ہے اور اس کو کیوں تنگ کر رہا ہے۔ اس کی آواز ایک دم بدل گئی۔ اب کے ایک بھاری سی آواز تھی، جو کسی مرد کی تھی۔ وہ مردانہ آواز میں کہنے لگی۔

''میں اس کے نکاح میں ہوں یہ میری بیوی ہے سمجھا، تو چل اب اس کے بال چھوڑ ورنہ میں تیرا حشر کر دوں گا۔''

عامل نے کہا۔ ''میں اس کے بال نہیں چھوڑوں گا تو نکل اس کے جسم سے، تو ایک بے گناہ بچی کو تنگ کر رہا ہے۔ چل جا جلدی کر'' وہ پڑھ پڑھ کر پھونکیں مارنے لگا۔

جن کہنے لگا۔ ''اب تجھے میں بتاتا ہوں۔'' پھر اس نے عامل کو پکڑ کر دور پھینک دیا۔ اور وہ دور پڑا تڑپنے لگا اور پھر جلدی سے اُٹھا اور اس کے والدین کو کہنے لگا کہ میرا حال تو آپ نے دیکھ ہی لیا ہے۔ یہ جن بہت طاقتور ہے۔ میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ آپ کسی اور سے مدد لیں، یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ کہہ کر وہ عامل بھاگ گیا۔ اس کے ماں باپ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ سارے محلے والے ان کے گھر افسوس کرنے آتے، کوئی کچھ کہتا تو کوئی کچھ، وہی بات کہ جتنے منہ اتنی باتیں تھیں، پھر جب ناجاں کے سسرال والے آئے۔ ان کو پتا تو چل گیا تھا کہ کیا ہوا ہے تو انہوں نے کہا۔

''ہمارے ادھر ایک بہت اچھا عامل ہے، لوگ دور دور سے اس کے پاس اپنی مرادیں پانے آتے ہیں، اس کو ہم دکھاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں ٹھیک ہو جائے۔ آپ فکر نہ کریں۔''

وہ کہنے لگے۔ کسی طرح یہ اپنے سسرال چلی جائے۔ اس کی ماں نے کہا۔

''میں اس کو منانے کی کوشش کرتی ہوں۔'' وہ اس کو بہلا پھسلا کر ادھر لے گئے۔ ابھی انہیں گئے گھنٹہ بھی نہ ہوا ہوگا کہ وہ وہاں سے بھاگ نکلی اور ہمارے گھر کے قریب ہی جو دربار ہے، وہاں پر چلی گئی۔ اس کی ماں اور اس کے سسرال والے اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ ماں پاگلوں کی طرح اسے آوازیں دیتی اس کے پیچھے بھاگی چلی آ رہی۔ اس نے دربار میں داخل ہوتے ہی جہاں لوگ قرآن پڑھ رہے تھے، ادھر چل دی اور قرآن مجید اُٹھا کر پڑھنے لگی۔ نہ تو اس کے پاس دوپٹا تھا اور نہ ہی اسے وضو کرنے کا ہوش تھا۔ قرآن مجید کو جلدی جلدی کھولا اور اس پر انگلیاں پھیرنے لگی، حالاں کہ وہ قرآن پڑھی ہوئی نہیں تھی۔

مزار پر آئے ہوئے لوگ اس کو حیرانگی سے دیکھ رہے تھے، لیکن اس کو کسی کی بھی فکر نہیں تھی۔ کپڑے اس نے وہی پہنے ہوئے تھے جو شادی والے دن پہنے تھے۔ اس کی ماں آگئی اور روتے ہوئے کہنے لگی۔

''پتر قرآن تو تو پڑھی نہیں ہے پھر کیوں قرآن بغیر وضو کیے پکڑا ہوا ہے۔ چل شاباش اس کو رکھ اور آ گھر چلیں۔'' تو وہ بڑی معصومیت سے اپنی ماں کو کہنے لگی۔

''اماں تھوڑا سا رہ گیا ہے، تو بیٹھ پھر چلتے ہیں۔'' ماں وہیں پر بیٹھی روتی رہی وہ کیوں نہ روتی، جس کی جوان بیٹی پاگل ہو جائے تو اس کے لیے تو قیامت سے بڑھ کر ہی ہوگا۔

اس کے سسرال والے اب چاہتے تھے کہ وہ ٹھیک ہو جائے اور اسے واپس لے جائیں، لیکن وہ اُدھر جانے کے لیے تیار نہ تھی۔ آخر ان کے لڑکے کی زندگی کا معاملہ تھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ اب یہ ٹھیک نہیں ہوگی تو انہوں نے ناجاں کو طلاق بھیج دی۔ اس کے والدین کو اس بات کا بہت دکھ ہوا کیوں کہ ابھی تو ان کی اور بیٹیاں جوان گھر میں بیٹھی تھیں، کیا بنے گا ان کا۔ اس کی ماں نماز پڑھ کر روتی، دعا کرتی۔

''پروردگار تو ہی کرم کرنے والا ہے۔ ہم تو تیرے گناہ گار بندے ہیں۔ تو ہم پر اپنا کرم فرما، میری دوسری بیٹیوں کا کیا بنے گا۔'' انہوں نے ناجاں کو ہر جگہ دکھایا،

لیکن اس کی حالت دن بدن بگڑتی ہی گئی۔ اس کی ماں نے کوئی کسر نہ چھوڑی اس کے علاج میں، لیکن اس کو نہ ٹھیک ہونا تھا اور نہ ہوئی۔ سب گھر والے اس کی وجہ سے بہت پریشان تھے۔ ایک دن اس کے والدین نے اسے کمرے میں بند کر دیا، کیوں کہ وہ بار بار باہر کی طرف بھاگتی تھی۔ اس کے ابا کام پر چلے گئے امی اور چھوٹی بہنیں اپنے کاموں میں لگ گئیں، ناجاں نے پتا نہیں کس طرح دروازہ کھول لیا اور باہر آ گئی۔ اس کی ماں نے جب اسے دیکھا تو کہنے لگی۔

"ناجاں پتر باہر نہ جانا، دیکھ میں بوڑھی ہوں۔ تجھے کہاں دردر ڈھونڈتی پھروں گی۔" لیکن اسے کیا، کوئی کچھ کہے اس کی بلا سے وہ سیدھی بالکونی کی طرف گئی۔ ماں اور بہنیں بھی اس کے پیچھے گئیں، ابھی وہ دور ہی تھیں کہ اس نے بالکونی سے چھلانگ لگا دی۔ جب اس کی ماں نے اسے تین منزلہ عمارت سے گرتے دیکھا تو بے ہوش ہو گئی، لیکن یہ کیا وہ تو نیچے بازار میں محفوظ کھڑی تھی۔ اس کو تو کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ اس کی بہنیں زاروقطار رو رہی تھیں۔ بہن کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئیں اور اپنی امی کو ہوش میں لا کر تمام باتیں بتائیں کہ کس طرح تین منزلہ عمارت سے گر کر بھی وہ بالکل ٹھیک ہے اور کہیں بھاگ گئی ہے۔ بازار میں موجود لوگوں نے اپنی آنکھوں سے یہ حال دیکھا تھا۔ اس کی ماں ہوش میں آنے کے بعد اس کے پیچھے گئی، لیکن وہ کہیں نہ ملی، آخر تھک ہار کر وہ گھر واپس آ گئی۔ اس کے ابا گھر آئے تو یہ سب صورتحال جان کر بہت پریشان ہوئے۔ اس کے والدین نے اسے بہت تلاش کیا، اعلان کروائے، لیکن وہ تو کہیں غائب ہی ہو گئی تھی۔ آخر تمام خاندان والوں نے یہ مشورہ دیا کہ اخبارات اور ٹیلی ویژن پر اشتہار دیں، ضرور کسی کو پتا ہو گا تو مل جائے گی۔ کوئی ترس کھا کر چھوڑ جائے گا۔ انہوں نے ٹی وی اور اخبارات میں اس کی تصویر دے کر اس کی گمشدگی کا اعلان کروایا۔ ڈیڑھ مہینے بعد ایک آدمی ناجاں کو لے کر آ گیا۔ اس کے والدین اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اس آدمی کا شکریہ ادا کرنے لگے۔ اس نے کہا۔

بھائی صاحب اس میں شکریے والی کون سی بات ہے، میں خود پانچ بیٹیوں کا باپ ہوں اور میں پشاور کا رہنے والا ہوں۔ میری کپڑے کی دکان ہے، اس بچی کو میں نے بازار میں آوارہ پھرتے دیکھا تھا۔ آج سے پہلے اس بچی کو ہم نے اپنے علاقے میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سب سے پہلے میں نے اس کو اپنا پاس بلایا اور کہا۔

"بیٹے کہاں سے آئی ہو" تو یہ نہ بولی، پھر میں نے کہا۔

"تمہارے گھر والوں کہاں ہیں۔" تو یہ پھر بھی خاموش رہی۔ سب دکانداروں کی نظریں اس پر لگی ہوئی تھیں اور وہ اسے بُری نظر سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے اپنی دکان سے ایک چادر لی اور اسے کہا کہ بیٹی اسے اپنے اوپر لے لو، اور اندر آ جاؤ۔ دکان کے اندر آ کر بیٹھ جاؤ اور مجھے آرام سے بتاؤ تم کس کے ساتھ آئی ہو۔ میرے ذہن میں یہی تھا کہ کوئی اسے پنجاب سے اٹھا لایا ہے، کیوں کہ اس کا لباس پنجابیوں والا تھا اور شاید یہ اس کے چنگل سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئی ہے اور اب گھبرائی ہوئی پھر رہی ہے۔ میری بھی گھر میں جوان بیٹیاں ہیں۔

میں اسے اپنے گھر لے گیا اور اپنی بیوی کو بتایا کہ یہ بچی کچھ نہیں بولتی، شاید گھبرائی ہوئی ہے، تم اسے نہلا کر دوسرے کپڑے پہنا دو اور کھانا کھلاؤ، باقی باتیں بعد میں کریں گے۔ میں اس بچی کو بڑی مشکل سے اپنے گھر لے کر گیا، کیوں کہ یہ مان ہی نہیں رہی تھی۔ دوسرے میرے گھر میں بھی جوان بچیاں ہیں۔ میرا خیال تھا یہ کسی غلط آدمی کے ہتھے نہ چڑھ جائے میں اسے سمجھا بجھا کر گھر لے گیا، پھر ایک دن ٹی وی پر اس کی گمشدگی کا اعلان سُنا، چوں کہ آپ نے پتا بھی دیا تھا، میں اسی وقت اس کو لے کر آپ کے پاس آ گیا، ناجاں کے ابا خوشی سے نہال ہوئے جا رہے تھے۔ انہوں نے کہا، بھائی صاحب میں آپ کا جتنا شکریہ ادا کروں وہ کم ہو گا کہ آپ نے نا صرف میری بچی کا خیال رکھا، بلکہ اسے بحفاظت میرے پاس تک لے آئے۔ اس آدمی نے کہا آپ سے ایک بات پوچھنی تھی کہ آپ کی بچی پیدائش ایسی ہے۔ اتنی بات سن کر ناجاں کے ابا رونے لگے۔ وہ آدمی گھبرا گیا کہنے لگا۔

"بھائی صاحب کیا بات ہے آپ اس طرح کیوں رونے لگ گئے ہیں۔ مجھے بتائیں کیا مسئلہ ہے" تو اس کے ابا نے تمام کہانی کہہ سنائی۔ اس آدمی نے کہا۔

"مجھے آپ کی دکھ بھری روداد سن کر بے حد افسوس

ہوا ہے۔ یہ بھی جتنا عرصہ ہمارے پاس رہی ہے، اس نے کسی سے کوئی بات نہیں کی، لیکن یہ اپنے آپ سے ہر وقت باتیں کرتی رہتی ہے اور یوں باتیں کرتی تھی جیسے کوئی اس کے سامنے بیٹھا ہو۔ کبھی کبھی تو قہقہہ مار کے ہنس پڑتی تھی۔ بہر حال آپ کسی پہنچے ہوئے بزرگ سے رابطہ کریں، خدا بہتر کرے گا۔

گھر آ کر اس کی وہی پہلے والی روٹین تھیں، ہر وقت پیپل کے درخت کی طرف منہ کر کے باتیں کرنا، کبھی اشارے کرنا۔ ایک دن وہ چھت پہ کھڑی پیپل کی طرف منہ کر کے باتیں کر رہی تھی۔ اس کی ماں اس کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے چھت پر آ گئی، وہ کسی کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ اس کی ماں نے کہا۔ ”کیا بات ہے کس سے اتنی دیر سے باتیں کر رہی۔ مجھے تو کوئی دکھائی نہیں دیتا“ تو وہ کہنے لگی۔

”میں چھوں سے تو باتیں نہیں کرتی۔ وہ دیکھیں وہ سامنے وہ بیٹھا ہے۔ آپ نے ہی تو اس سے میری شادی کی تھی اور اب باتیں کرتی ہیں۔“ اس کی ماں سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

”اے خدا ہمارے کون سے گناہ کی اتنی کڑی سزا مل رہی ہے۔ پروردگار معاف کر دے ہمیں اور میری بچی کو ٹھیک کر دے۔“ وہ جس جس بزرگ کے پاس گئے، انہوں نے اپنے اپنے طریقے سے اسے ٹھیک کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے نہ ٹھیک ہونا تھا اور نہ ہوئی۔

وقت اپنی رفتار سے گزرتا گیا۔ اس کو پاگل ہوئے تین چار سال گزر گئے۔ اب انہوں نے ناجان کو اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا اور اسے بڑی بڑی زنجیروں سے اُسے باندھ کر رکھا جاتا۔ اب تو اس کا حسن ماند پڑ گیا تھا۔ ہاں ایک بات یاد آئی جب وہ پشاور سے آئی تھی تو اس کا رنگ اور نکھر آیا تھا۔ جب میں نے اسے دیکھا تھا تو وہ مجھے اس کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی تھی، جو واقعی سچ ثابت ہوئی تھی۔ اب تو سارے محلے کے بچے ایک دوسرے کو ناجاں کا نام لے کر ڈراتے تھے، کیوں کہ وہ کبھی زنجیریں توڑ کر گلی میں بھاگ جاتی تو بچے اسے دیکھ کر بھاگ جاتے۔ میں امی کے گھر آئی ہوئی تھی۔ میرے چھوٹے بہن بھائی شور مچاتے اوپر بھاگے آ رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ یہ کہہ رہے تھے کہ ناجاں پاگل آ گئی۔ بچے اس سے بہت ڈرتے تھے۔ وہ سب ڈر کے مارے چارپائی کے نیچے چھپ گئے۔ میں جلدی سے اُٹھی اور سیڑھیوں کی طرف گئی۔ وہ سیڑھیاں چڑھتی اوپر آ گئی۔ جب اس کی نظر مجھ پر پڑی تو دیکھ کر ہنس پڑی اور فوراً میرے گلے لگ گئی۔ جب وہ میرے گلے لگی تو مجھے اس سے خوف سا محسوس ہوا لیکن میں نے اپنے آپ پر قابو رکھا۔ مجھے اس کی حالت دیکھ کر رونا آ گیا۔ میرے تو خیال میں بھی نہیں تھا کہ وہ ایسی ہو جائے گی۔ کہاں وہ ہنستی بولتی ناجاں اور کہاں یہ گم صم۔ اب تو وہ چالیس پینتالیس کی عورت لگ رہی تھی۔

آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ گورا چٹا رنگ، گندمی سا لگتا تھا۔ ہونٹ سوکھے ہوئے تھے اور آنکھوں میں جو کبھی ہزاروں خواہشیں نظر آتی تھیں اب وہاں صرف ویرانی تھی۔ اس کو کیا روگ لگ گیا تھا۔ اس نے ایسی زندگی کا تو کبھی تصور بھی نہ کیا ہوگا۔ یا اللہ یہ کیا ہو گیا اس کو کس گناہ کی سزا ملی ہے۔ اس نے تو بھولے سے بھی کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا تھا پھر کیوں؟

میں انہیں سوچوں میں غرق تھی کہ میری چھوٹی بہن نے کہا۔ ”باجی ناجاں باجی کی امی انہیں لینے آئی ہیں۔ وہ نیچے کھڑی ہیں۔“ میں نے کہا۔

”ناجاں یہاں بیٹھوں میں تمہارے لیے کھانے کو کچھ لاؤں۔“ وہ بیٹھ گئی تو میں نیچے اس کی اماں کو ملنے کے لیے چلی گئی۔ خالہ جان کو میں نے سلام کیا۔ انہوں نے میرے سلام کا جواب دیا اور میری خیریت معلوم کرنے لگیں۔ میں نے کہا۔ اوپر آ جائیں تو وہ کہنے لگیں۔

”نہیں پتر مجھ سے سیڑھیاں نہیں چڑھی جائیں گی تم ایسا کرو، تمہارا تو وہ کہنا مانتی ہے۔“

تم ہی اس کو ذرا گھر لے آؤ۔ تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔ میں نے ان سے کہا۔

اس میں شکریہ والی کیا بات ہے، یہ تو میرے بچپن کی سہیلی ہے۔ آپ جائیں میں اس کو تھوڑی دیر بعد لے آؤں گی۔“ وہ چلی گئیں اور میں اوپر آ گئی۔ وہ وہیں بیٹھی تھی جہاں میں اسے بٹھا کے گئی تھی، بال بکھرے ہوئے، دوپٹا غائب۔ میں اس کے قریب گئی اور اس سے کہا۔

"ناجاں تمہیں کیا ہوگیا ہے تو تو کبھی برقع کے بغیر نہیں گھر سے نکلتی نہیں تھی۔ ہر روز نئے سے نئے کپڑے پہنتی تھی تو اب کیا ہوگیا۔ تم نے جینا کیوں چھوڑ دیا ہے۔ تمہیں دیکھ کر تو زندگی کا احساس ہوتا تھا۔" ایک پل کو اس نے میری طرف دیکھا۔ میری آنکھوں میں ہزاروں سوال تھے اس کے لیے درد تھا، مگر وہ ان سب سے بیگانہ تھی۔ میں نے اسے کھانا کھلایا۔ اس کے ساتھ باتیں کرتی رہی، لیکن اس دوران اس نے مجھ سے کوئی بات نہ کی، بس کبھی میرے منہ کی طرف دیکھنا شروع ہوجاتی تو کبھی میرا ہاتھ پکڑ لیتی تھی۔

پھر میں نے اسے بہانے سے کہا۔

تم کتنی گندی ہورہی ہو، چلو آؤ تمہارے گھر چلتے ہیں۔ تم گھر جا کر نہا دھو کر نئے کپڑے پہننا اور پھر ہم کہیں گھومنے جائیں گے۔ ٹھیک ہے۔" تو اس نے ہاں میں سر ہلایا۔ میں نے چادر لی اور اسے لے کر ان کے گھر کی طرف چل دی۔ میرے ساتھ میرے چھوٹے بہن بھائی بھی آگئے۔ ہم ان کے گھر کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ وہ آگے آگے تھی اور میں پیچھے پیچھے۔ مجھ سے پیچھے میرے بہن بھائی تھے۔ ناجاں سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ایک دم پیچھے کی طرف مڑ گئی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں اور منہ سے غرانے کی آواز آنے لگی۔ اس کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔ ایک پل کو مجھے ایسے لگا کہ وہ میرا خون پی جائے گی۔ ابھی میں گم صم سی اس کی طرف دیکھ رہی تھی کہ اس نے تڑاخ سے میرے منہ پر زور کا ایک تھپڑ مار دیا۔

یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ میں اپنے حواس کھو بیٹھی، پھر وہ کہنے لگی۔

"تو بھی ان جیسی ہی ہوگئی ہے اور چالاکی سے مجھے یہاں لے کر آئی ہے، تاکہ مجھے یہ لوگ زنجیروں سے باندھ دیں۔"

اس نے اتنی زور سے تھپڑ مارا تھا کہ میں ابھی تک سنبھل نہیں پائی تھی۔ میں نے ہمت کر کے اس کی اماں کو آواز دی۔

"خالہ جی...... خالہ جی...... ناجاں کو آ کر لے جائیں۔" ان کی امی نیچے آئیں اور بڑی مشکل سے اُسے اوپر لے گئیں۔ میری گال پر اب بھی اس کا ہاتھ تھا۔ میں سیڑھیوں سے ہی واپس آ گئی۔ جب میں گھر آئی تو سب مجھ سے پوچھنے لگے کہ تمہارے چہرے پر کیا ہوا ہے۔ میں نے کہا۔ "ناجاں نے تھپڑ مارا ہے۔" جب میں نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تو میرے گال پر اس کی انگلیوں کے نشان لگے ہوئے تھے، خوف سے میں اب بھی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ تین دن تک میرے گال سے نشان نہ گیا۔ وقت سرکتا گیا۔ ناجاں کی امی نے جلدی جلدی اپنی دوسری بیٹیوں کی شادیاں کر ڈالیں۔ وہ لوگ اب ناجاں کو زنجیروں سے باندھ کر رکھتے تھے۔ اس کی ماں ہی اسے سنبھالتی تھی۔ اب تو وہ اور زیادہ پاگلوں جیسی حرکتیں کرنے لگی تھیں۔ بھائی اس کا چھوٹا تھا، پھر اُس کا بھائی بھی خود سے باتیں کرنے لگا۔ اس کے ابا نے اس کا فوراً علاج کروایا۔ وہ تو ٹھیک ہوگیا۔ اس کے گلے میں تعویذ ڈال دیا گیا تھا اب وہ اس کو اس کی بہن کے قریب جانے نہیں دیتے تھے۔ بس اس کی ماں ہی اس کو سنبھالتی تھی۔

ناجاں کے اماں ابا اس کو بہت چاہتے تھے۔ ماں نے تو بیٹی کا اتنا غم لگایا تھا کہ دل کی مریضہ بن گئی تھی۔ وہ اکثر ہمارے گھر آجاتی اور اتنا روتی کہ اس کے غم کو دیکھتے ہوئے ہماری آنکھوں سے بھی آنسو چھلک پڑتے۔ آخر وہ ماں تھی کب تک بیٹی کا دکھ برداشت کرتی۔ ایک رات چپکے سے اس دو دنیا سے رخصت ہوگئی۔ انہوں نے اب یہ گھر چھوڑ دیا تھا اور مصری شاہ جا کر نیا گھر بنا لیا تھا۔

اب ان کے گھر میں صرف تین افراد رہ گئے تھے۔ ناجاں کے ابا اور اس کا چھوٹا بھائی۔ ناجاں کو انہوں نے ایک کمرے میں بند کر دیا تھا۔ ایک صبح اس کے ابا اسے کھانا دینے گئے جب انہوں نے اپنی لاڈلی بیٹی کو دیکھا تو اس کی آنکھیں کھلی تھیں، مگر اس کی سانسیں ختم ہوگئی تھیں۔ پھر یہ بات ہر طرف پھیل گئی کہ نادرہ عرف ناجاں اس جہاں فانی سے رخصت ہوگئی ہے۔ اس دن ہر آنکھ اشکبار تھی۔ جب وہ مری تو مجھے یہ شعر یاد آیا۔

کیا خبر تھی خزاں ہوگی مقدر اپنا
ہم نے ماحول بنایا تھا بہاروں کے لیے

☆......☆



جنوں والا باغ

محمد وقاص خان

گلاب کے باغ پر قابض بزرگ روحوں کی انوکھی داستان

میرا تعلق ویسے تو ہزارہ ڈویژن سے ہے، مگر ہم کوئٹہ میں مستقل رہائش پذیر ہیں لیکن ہم کبھی کبھی اپنے علاقے میں چھٹیاں گزارنے جاتے ہیں۔ یہ واقعہ میرے ماموں کے بیٹے ماجد بھائی کے گھر میں رونما ہوا تھا۔ جواب میں آپ کو اُن کی زبانی سناتا ہوں۔

میرے گھر کے سامنے زمین کا ایک بہت بڑا قطعہ ہے جو میری ملکیت ہے۔ مجھے پھول پودوں کا ہمیشہ سے بے حد شوق رہا ہے، میں نے اس کے گرد احاطہ کھینچ کر اسے گھر کے صحن میں تبدیل کیا اور پھر بے شمار قسم کے پودے اور بیج لے آیا۔ چند مہینوں کی محنت سے باغیچے کی شکل نظر آئی، موتیا، رات کی رانی، گلاب، سوسن کے پودے جلد پھول اور خوشبو دینے لگے۔ خصوصاً موتیا نے ایسا رنگ جمایا کہ ہمارے پڑوس کے گھر تک مہکنے لگے۔ ابھی میرا یہ چھوٹا باغ پوری طرح بڑھنے بھی نہ پایا تھا کہ میری بیوی نے مرغیاں پال لیں، جن کا کام محض یہ تھا کہ وہ میرے محنت سے بنائے ہوئے اس باغیچے میں مٹرگشت کرتی پھریں اور اپنے لیے رزق کی تلاش میں اس کی کیاریاں برباد کریں۔ کچھ دن تو میں نے برداشت کیا پھر بیوی سے الجھنے لگا۔ وہ کچھ روز کے لیے انہیں ڈربے میں قید کر دیتی تھی، مگر پھر لاپروائی سے وہی عمل دہرایا جاتا ہم دونوں میں روزانہ اسی بات پر جھگڑا ہونے لگا۔

ایک روز میں گھر آیا تو مرغیوں نے پھر سے کیاریوں پر دھاوا بول دیا تھا۔ نازک پودے ان کی جارحیت کی تاب نہ لاکر اپنی جڑوں سمیت زمین پر گرے پڑے تھے، میری بڑی بیٹی یاسمین بے چاری ان کے پیچھے بھاگی پھر رہی تھی مگر کیاریاں برباد ہو چکی تھیں۔ اس منظر سے میرا پارہ ایسا چڑھا کہ منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر میں اندر سے کلہاڑی نکال کر لے آیا اور میں نے ایک ایک پودے کو کاٹنا شروع کر دیا۔ بادام کا درخت جو تقریباً دس فٹ کا ہو چکا تھا وہ بھی میرے غصے کی زد سے نہ بچ سکا۔ میرا دل رو رہا تھا، مگر جنون میں، میں نے اپنی ڈھائی تین سال کی ساری محنت کو لمحوں میں برباد کر دیا۔ میری بیوی نے مجھے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن میں باز نہیں آیا اور اس سے کہا کہ اب تمہاری مرغیاں عیش کرتی پھریں گی۔

سارے محلے کو خبر ہو گئی کہ ماجد نے غصے میں سارا باغیچہ کاٹ دیا ہے۔ ہمارے ہاں سے لوگ خاص طور پر پھول لینے آتے تھے، انہیں بھی اس باغیچے کی بربادی کا بڑا افسوس ہوا۔ بڑی مشکل سے میرا غصہ کچھ کم ہوا تو رات کے کھانے پر آمادہ ہوا۔ میری بیوی بیچاری مجرم سی بن گئی تھی۔ سب نے خاموشی اور بددلی سے کھانا کھایا۔ میری بیٹی یاسمین نے بھی میرے ساتھ مل کر باغیچے کو سنوارنے

میں میری مدد کی تھی۔ وہ بھی خاصی اُداس تھی۔
یاسمین کا کمرہ برآمدے کے بالکل ساتھ تھا، اس میں ایک کھڑکی برآمدے کی طرف کھلتی تھی۔ کھڑکی میں گرل لگی ہوئی تھی۔ یاسمین کھڑکی کے قریب ہی پلنگ ڈال کر سوتی تھی، رات کے تقریباً دو بجے کے قریب یاسمین کی چیخوں کی آواز سے سارا گھر جاگ اُٹھا۔ وہ زور زور سے چلا رہی تھی۔
''ہمیں پھول چاہیے، ہمیں پھول دو۔'' ہم سب اس کے پاس گئے، دوسرے بچوں کی بھی آنکھ کھل گئی تھی۔ ہم سب اس کے گرد جمع ہو گئے تھے، مگر وہ ہوش میں نہیں تھی، ہم میں سے کسی کو بھی پہچان نہیں رہی تھی وہ صرف ایک ہی جملہ بار بار دہرا رہی تھی کہ (ہمیں پھول چاہیے) ہم نے سمجھا کہ اس کے ذہن پر باغیچہ کاٹے جانے کا صدمہ ہے اور شاید اس سلسلے کا کوئی بھیانک خواب اس نے دیکھ لیا ہے۔ تبھی شور مچا رہی ہے کہ پھول چاہیے ہیں۔
میرے بہنوئی تہجد گزار آدمی ہیں۔ وہ مسجد میں تہجد کی نماز پڑھنے جا رہے تھے۔ انہیں ہمارے گھر سے یاسمین کی چیخنے کی آوازیں آئیں تو انہوں نے دروازہ بجا دیا۔ میں نے دروازہ کھولا تو انہیں دیکھ کر میری جان میں جان آئی، اندر آ کر انہوں نے یاسمین کی ذہنی حالت کا کچھ دیر جائزہ لیا، پھر میں نے انہیں مختصراً پوری بات بتائی۔ انہوں نے کچھ دیر منہ میں کچھ پڑھا اس کے بعد یاسمین کے بالوں کی لٹ مضبوطی سے پکڑی، تب یاسمین غیر مانوس اور بھاری آواز میں بولی۔ ''بچی کے بال چھوڑو، ہم اللہ کی نیک روحیں ہیں، اس باغ میں خوشبو کی طلب میں آئے تھے، بلا



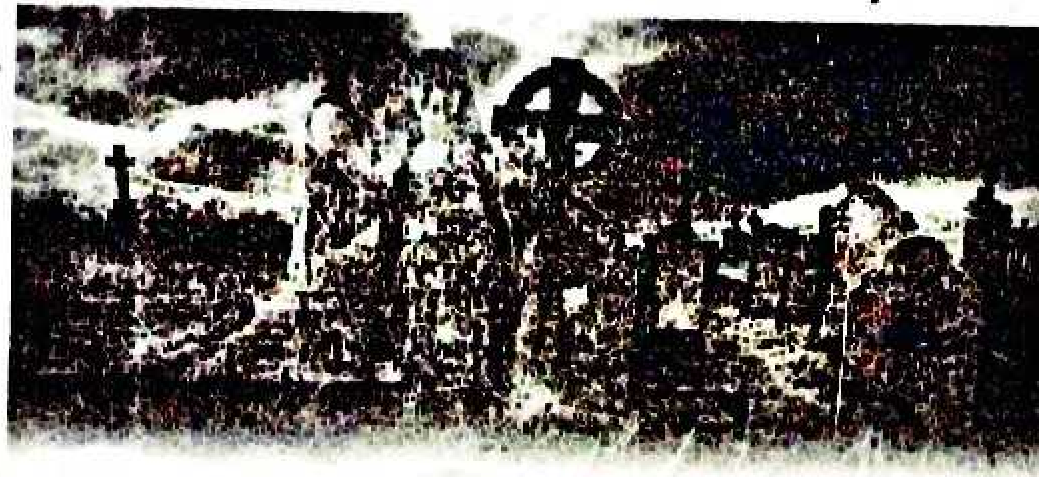
وجہ لڑکی کو اذیت مت دو۔" میرے بہنوئی نے چونک کر اس کی لٹ چھوڑ دی اور کہنے لگے، میں ابھی آتا ہوں تم لوگ یاسمین کو تنگ مت کرنا، گھر کے سارے افراد سہم سے گئے تھے، میں یاسمین کے پاس بیٹھا رہا، آدھے گھنٹے کے بعد میرے بہنوئی ایک بزرگ کو لے کر آئے۔ انہوں نے آتے ہی یاسمین کو بڑے ادب سے سلام کیا۔ یاسمین نے اسی بھاری آواز میں سلام کا جواب دیا کچھ دیر پڑھنے کے بعد بزرگ نے پوچھا آپ اپنا نام بتایئے۔ یاسمین نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

"آپ نہیں جانتے حضرت اس گھر کی ہم نے کتنی حفاظت کی محض اس وجہ سے کہ ہم لوگ رات کو محض خوشبو کی طلب میں کچھ دیر کے لیے یہاں آتے تھے۔ ہم نے پھولوں کی حفاظت کے لیے اس لڑکی کو نگہبان بنا رکھا تھا، ایک بار یہ کیاری کھود رہی تھی کہ ایک ناگ نے بل سے منہ نکال کر اسے ڈسنے کی کوشش کی۔ ہم نے اس ناگ کو وہیں ختم کر دیا تھا۔ اگر یقین نہ آئے تو گلاب کی بڑی کیاری کے دائیں طرف کھود کر دیکھ لینا وہ سانپ وہیں بے حس و حرکت پڑا ملے گا۔ ان لوگوں کا کاروبار تھا اس میں نقصان ہو رہا تھا۔ ہم نے برکت کی دعائیں دیں اور کاروبار میں ترقی ہوئی، گھر کی یہ خوشحالی ہماری دعاؤں کے طفیل تھی، مگر ان لوگوں نے ظلم کیا۔ پھول اور خوشبو ختم کر دی۔ پودوں اور درختوں پر آری پھیر دی، یہ ذمے داری ہم نے اس لڑکی کے سپرد کی تھی۔ ہم چاہتے ہیں کہ پھر سے یہ اپنی ذمے داری سنبھالے ہمیں صرف پھول اور خوشبو چاہیے۔

بزرگ نے انہیں یقین دلایا کہ خوشبو اور پھول انہیں واپس مل جائیں گے، آپ بچی کو سزا مت دیں، میں نے بڑے ادب سے معافی مانگی اور نقصان کی تلافی کا پکا عہد کیا، کچھ دیر بعد یاسمین پُرسکون ہوگئی اور سوگئی۔

اس رات کو میرے بہنوئی ہمارے ساتھ رہے۔ ہم نے صبح اُٹھ کر پہلا کام تو اس ناگ کی دریافت کا کیا۔ اس کے بعد میں نے مالی کی مدد سے سارا دن لگا کر اس باغیچے کی زندگی بحال کی۔ میں نے اسے جلد تروتازہ کرنے کے لیے نرسری سے بہترین پھول اور پودے خریدے اور آج میرا باغیچہ پہلے سے بھی کئی گنا زیادہ سرسبز و شاداب اور مہکتا ہوا ہے۔

☆......☆



خبیث روحیں

نسیم آراء

ایک مکان پر قابض خبیث روحوں کی کارستانیاں

یہ واقعہ ہماری امی کے ساتھ پیش آیا جب میں بہت چھوٹی تھی، تقریباً تین سال عمر تھی، ہم کراچی میں رہتے تھے امی اپنی سسرال میں سب کے ساتھ دادا، دادی، دو چچاؤں کے ساتھ رہتی تھیں۔ میرے والد



حیدر آباد میں کام کرتے تھے۔ ابو چاہتے تھے کہ امی کو اپنے ساتھ ہی رکھیں لیکن اپنے لیے مکان نہیں خرید سکے تھے، جب وہ مکان لینے کے لیے قابل ہو گئے تو کسی نے بتایا کہ ایک مکان ہے جو کم قیمت میں مل رہا ہے۔ تمہاری فیملی کے لیے مناسب ہے، ابو نے یہ مکان خرید لیا، اس مکان میں ایک کمرہ کچن اور باتھ روم تھا اور صحن کافی بڑا تھا۔ ہم تین افراد کے لیے کافی تھا۔ جب ہم اس گھر میں شفٹ ہوئے تو پڑوسن ملنے آئیں، انہوں نے ہی اپنا آدھا مکان ابو کو فروخت کیا تھا۔ وہ آکر کہنے لگیں کہ میں سمجھی کہ کوئی زیادہ عمر کا شادی شدہ جوڑا ہوگا۔ جو یہ مکان خرید رہا ہے تم تو بہت کم عمر کے ہو، کیوں کہ اُس وقت امی کی عمر سولہ سترہ سال تھی اور ابو بھی تیئس چوبیس سال کے تھے۔ امی نے کہا۔ ”کیوں ایسا کہہ رہی ہیں کیا یہ جگہ اچھی نہیں ہے کوئی خطرہ تو نہیں ہے“ کہنے لگیں کہ نہیں نہیں میں تو ایسے ہی کہہ رہی ہوں اور اپنی بات بدل کر چلی گئیں۔

اُس زمانے میں بجلی بھی نہیں تھی، لالٹین جلایا کرتے تھے۔ اب باقی کہانی امی کی زبانی سنیے۔

جب گھر کی صفائی وغیرہ کر کے سامان سیٹ کرنے کے بعد رات کو سونے کے لیے لیٹے تو عجیب بے چینی ہوگئی، کروٹیں بدلتے رہے لیکن نیند نہیں آرہی تھی۔ تھوڑی غنودگی ہوئی تو ایسا محسوس ہوا جیسے کمرے کی چھت پر گھوڑے دوڑ رہے ہوں۔ کافی دیر ایسا ہوتا رہا پھر لگا صحن میں کوئی چل رہا ہے۔ جب دروازہ کھول کر دیکھا تو کوئی نہیں تھا، صبح سب بھول گئی اور اس بات کو اپنا وہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ دوسری رات ابو کی ڈیوٹی تھی۔ انہوں نے کہا جب صبح دروازہ کھٹکھٹاؤں گا اور آواز دوں تو کھولنا ورنہ نہیں کھولنا، مالک مکان کے گھر جانے آنے کے لیے کمرے کے ساتھ ہی دروازہ تھا۔ جب ایک دوسرے سے کوئی کام وغیرہ ہوتا تو آواز دے کر دروازہ کھول لیتے تھے رات میں بند کر لیتے۔ جب رات کو دس بجے تمہارے والد کام پر گئے تو میں نے دروازہ بند کیا اور سونے کے لیے لیٹ گئی۔

تقریباً بارہ یا ساڑھے بارہ بجے محسوس ہوا کہ بہت تیز ہوائیں چل رہی ہیں اور باہر کا دروازہ کوئی کھٹکھٹا رہا ہے، میں نے سوچا صبح ہوگئی ہے تو تمہارے ابا آگئے ہیں۔ میں اُٹھ کر کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آئی لیکن اندھیرا تھا پھر لالٹین اُٹھا کر باہر آئی، دروازہ کھولا تو باہر کوئی نہیں تھا۔ میں نے دوبارہ دروازہ بند کیا لالٹین لے کر باتھ روم میں دیکھا کچن میں گئی لیکن وہاں کوئی نہیں تھا، میں واپس آکر لیٹ گئی۔ اس وقت مجھے تھوڑا سا خوف محسوس ہوا پھر اس بات کو اپنا وہم سمجھ کر میں سو گئی۔

صبح میری پڑوسن آئی تو اس نے پوچھا کہ اکیلے نیند آتی تھی، ڈر تو نہیں لگا میں نے کہا نہیں ڈر تو نہیں لگا۔ لیکن کچھ بے چینی میں رات گزاری ہے، یہ کہہ کر میں نے رات کا واقعہ بتایا تو کہنے لگی۔ ”ڈرنے کی بات نہیں ہے میلاد شریف قرآن خوانی وغیرہ کروالیں سب ٹھیک رہے گا، ویسے بھی تم نے نیا گھر خریدا ہے۔“

اس گھر میں آئے مہینہ ہونے کو آیا تھا اور رات کو اکثر یہی ہوتا کہ گھر میں کوئی چل رہا ہے یا ہمارے کمرے سے نکل کر باتھ روم گیا ہے۔ کبھی عورت کی ہنسنے کی آواز آتی کبھی چوڑیوں کی بجنے کی آواز ہوتی، کبھی بہت سارے لوگ عجیب سی زبان میں بات کرتے محسوس ہوتے لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ یہ سب کچھ تب ہوتا جب تمہارے ابو رات کی ڈیوٹی پر ہوتے۔ میں جب انہیں بتاتی تو بات ٹال دیتے، کہتے تم اکیلی ہوتی ہو اس لیے ایسا محسوس ہوتا ہے، مجھے کیوں نہیں محسوس ہوتا۔ یہ سن کر میں خاموش ہو جاتی۔

ایک دن ہماری رشتے دار خاتون آئیں جو میری بہنوں جیسی تھیں، انہیں میں نے سب کچھ بتایا تو کہنے لگیں، میں احمد سے کہوں گی کہ میلاد وغیرہ کروالیں، تمہارے ابو کو وہ نام لے کر مخاطب کرتی تھیں وہ انہیں چھوٹا بھائی سمجھتی تھیں آخر انہوں نے مردانہ میلاد کا پروگرام بنایا کہ جمعرات کو میلاد شریف کرواتا ہے۔

عشاء کی نماز کے بعد میلاد شروع کیا گیا۔ لوگ آنا شروع ہوئے۔ میلاد پڑھنے والے نے ابھی درود شریف پڑھنا شروع کیا ہی تھا کہ اچانک ایک ٹڈا اُڑتا ہوا آیا اور پڑھنے والے کے منہ کے گرد چکر لگانے لگا جسے اس نے ہاتھ سے پکڑ کر پھینک دیا پھر انہوں نے حمد، نعت وغیرہ پڑھنا شروع کی تو نہ جانے کہاں سے بہت سارے ٹڈے نکل نکل کر آگئے اور پڑھنے والوں کے منہ سے ٹکراتے رہے، جس سے ان کا میلاد پڑھنا دوبھر ہوگیا۔ انہوں نے جلدی جلدی میلاد ختم کیا اور جاتے ہوئے ابو سے بولے۔

"یہ تحفہ پکڑو" تمہارے ابو نے رومال ہاتھ میں پکڑ کر کھول کر دیکھا تو بہت سے ٹڈے نکل پڑے۔ میلاد پڑھنے والوں نے کہا کہ ایسا پہلی بار ہمارے ساتھ ہوا جو میلاد پڑھنے نہ دیا گیا۔ ہم لوگ میلاد پڑھتے ہوئے یہ ٹڈے بھی پکڑ پکڑ کے جمع کرتے رہے، اس وقت ہی وہ ٹڈے نظر آئے پھر غائب ہو گئے۔ سب حیران تھے کہ میلاد کے وقت کہاں سے یہ ٹڈے آ گئے تھے پھر کہاں غائب ہو گئے۔

میں جب رات کو سونے کے لیے لیٹی تو ایسا لگا کہ میرے جسم پر کسی نے بہت وزن رکھ دیا ہو۔ میری آواز بھی نہیں نکل رہی تھی، میں بولنا چاہتی تھی نہیں بول پا رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اُس کمرے میں بہت سے بچے جمع ہو رہے ہیں جن کی عمر دس بارہ سال کی ہوگی وہ سب مجھے دیکھ کر ہنس رہے ہیں، ان کے سروں پر ہندوؤں والی چوٹی بندھی ہوئی تھی۔ کالے کالے بچے ننگے صرف لنگوٹی باندھے ہوئے، تالیاں مار مار کر ایک دوسرے سے کہہ رہے ہیں۔ کیسا تنگ کیا تھا ہم نے؟ پڑھنے ہی نہیں دیا کیا بھگایا سب کو، وہ ہم ہی تھے جو ٹڈے بن کر آئے تھے۔ اب تم کو بھی ایسے ہی بھگائیں گے تم کو جانا ہی ہوگا ورنہ نقصان اُٹھاؤ گے، پھر ایک عورت آئی ہندوؤں والی بندیا لگائے، گھاگرہ پہنے، وہ بھی مجھے آنکھیں دکھاتی ہوئی چلی گئی۔ صبح میں نے تمہارے ابو کو یہ بات بتائی وہ نہیں مانے وہم یا خواب کہہ کر خاموش کر دیا۔

ایک دن میں دسترخوان لگا رہی تھی تو مجھے لگا دیوار پر دو آنکھیں اُگ آئی ہوں جو مجھے گھور رہی ہوں، میں نے تمہارے ابو سے کہا مجھے ایسا لگ رہا ہے تو کہنے لگے تمہیں تو وہم ہو گیا ہے، میں نے کہا آپ اپنے پیچھے دیوار پر دیکھیں دو آنکھیں نظر آ رہی ہیں۔ انہوں نے پیچھے دیکھا کہنے لگے۔ "کہاں ہے؟ یہاں تو کوئی نہیں۔" میں نے کہا۔ "دیکھیں اتنی بڑی بڑی آنکھیں آپ کو نظر نہیں آ رہی ہیں، مجھے صاف نظر آ رہی ہیں۔" اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ وہ تھوڑا ڈرے ہوں گے۔

دوسرے دن تمہارے ابو کمرے میں تھے اور میں کچن میں کام کر رہی تھی، کام ختم کر کے کمرے میں داخل ہوئی تو دیکھا تمہارے ابو کے پیچھے ایک کالا لمبا چوڑا لنگوٹی باندھے آدمی کھڑا ہے۔ میں ڈر کر پیچھے ہوئی اور چیخ کے بولی۔ "دیکھو وہ کھڑا ہے۔" اس وقت وہ بھی ڈر گئے پیچھے مڑ کے دیکھا انہیں کوئی نظر نہیں آیا۔ کہنے لگے یہاں تو کوئی نہیں، لیکن وہ مجھے اب بھی نظر آ رہا تھا جو بڑی بڑی آنکھیں نکال کر گھور رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں وہ غائب ہو گیا۔ رات کو غنودگی میں مجھے ایسا لگا کہ کوئی زمین کھود رہا ہے، مجھے نظر آیا کہ ایک کالا آدمی ہے وہ کدال لیے زمین کھود رہا ہے میں نے کہا "یہ کیا کر رہے ہو تو بولا، تیری قبر کھود رہا ہوں میں خوف زدہ ہو گئی اور اس سے کہنے لگی۔ ایسا کیوں کر رہے ہو تو اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور زمین کھودتا رہا۔ کچھ دنوں تک ایسا ہی ہوتا رہا پھر اچانک میری طبیعت خراب ہو گئی۔ مجھے کسی دوا سے فائدہ نہیں ہو رہا تھا اور دن بہ دن کمزوری ہوتی جا رہی تھی۔ یہ نہیں پتا چل رہا تھا کہ مجھے تکلیف کیا ہے، سوچ رہی تھی کہ کراچی جاؤں اور دادا میاں سے ملوں، وہی ہمارے مسائل حل کرتے تھے۔ دادا میاں کے متعلق میں آپ کو بتاتی چلوں کہ وہ ہمارے پڑوس میں ہی رہتے تھے، ہمارے بزرگ کہتے تھے کہ جب وہ بچے تھے تب سے دادا میاں کو اسی حال میں دیکھ رہے ہیں کچھ نہیں پتا کہ وہ کون تھے اور کہاں سے آئے تھے، کسی کو یہ بھی خبر نہیں تھی کہ ان کی گزر اوقات کیسے ہوتی ہے؟ کیوں کہ ان کے گھر میں کمانے والا بھی کوئی نہیں تھا اور نہ ہی ان کے گھر کسی کو آتے جاتے دیکھا تھا۔ محلے میں لوگوں کو کچھ پوچھنا ہوتا وہ سب ہی ان سے مشورہ ضرور کرتے۔

ایک مہینے بعد ہمارا کراچی جانا ہوا تو سب لوگ ہم سے ملنے آئے اور خیریت پوچھی۔ میری حالت بہت خراب تھی، مرجھایا چہرہ، کمزور جسم رنگ بھی کم ہو گیا تھا۔ جب یہاں سے گئی تھی اُس وقت سرخ سفید رنگ، بھرے بھرے جسم کی صحت مند عورت تھی۔ سب میرا حال دیکھ کر چپ سے ہو گئے تھے، میں تو خاص طور سے دادا میاں سے ملنے آئی تھی ان سے سب کچھ پوچھنا تھا، شام کے وقت میں اپنی پھوپھو کے ساتھ دادا میاں کے گھر گئی، انہوں نے مجھے اپنے پاس بلایا اور کہنے لگے۔ مجھے معلوم ہے کیا پوچھنا ہے، وہ گھر چھوڑ دو تو بہتر ہوگا ورنہ نقصان ہوگا۔ ہم نے کہا اتنی جلدی کیسے ممکن ہے، آپ کچھ کریں، اُس زمانے میں، میں قرآن پاک بھی نہیں پڑھی ہوئی تھی جو کہ بعد میں پڑھا، کہنے لگے جب بھی کچھ نظر

آئے درود شریف پڑھ لیا کرو ہم بھی دیکھیں گے۔

میں نے گھر واپس آ کر سب کو یہ واقعہ بتایا یہ بھی بتایا کہ دادا میاں کہہ رہے تھے کہ تم لوگ واپس آ جاؤ، سب لوگ یہ سن کر بہت پریشان ہو رہے تھے، اور اس بات پر حیران بھی تھے کہ دادا میاں کو سب باتوں کی خبر کیسے تھی۔ کچھ روز وہاں گزارنے کے بعد مجبوراً ہمیں واپس آنا پڑا کیوں کہ روزگار وہاں تھا، لیکن اب میں اپنے گھر ڈرتی نہیں تھی، اتنی باتیں سننے کے بعد بھی کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا تھا جب کچھ نظر آتا یا کوئی آہٹ ہوتی تو پورے گھر میں لالٹین لے کر ضرور دیکھتی کہ کون ہے، پھر واپس آ کر لیٹ جاتی۔

کراچی سے آنے کے بعد میں سونے لیٹی تو کمرے میں ایک موٹی سی چھپکلی آ گئی اور اتنی تیز تیز آواز نکالنے لگی کہ میرے سر میں درد ہونے لگا۔ اُس کو بھگانے کی بہت کوششیں کیں، مگر وہ گئی نہیں پھر میں نے درود شریف پڑھنا شروع کر دیا تو اس کی آواز بند ہو گئی۔ دوسرے دن غنودگی سی طاری ہونے لگی تو مجھے لگا کہ میرے اوپر ایک کتا حملہ کر رہا ہے، میں خوف سے دور بھاگتی ہوئی درود شریف پڑھنے لگتی ہوں تو وہ کتا ایک مرغا بن جاتا ہے۔ اچانک ایک بزرگ آ جاتے ہیں تو مرغا یا کتا بھاگ جاتے ہیں۔ بزرگ مجھے دیکھ کر مسکرانے لگتے ہیں پھر وہ بھی چلے جاتے ہیں۔ اب کبھی بھی مجھے اس طرح کی کوئی چیز نظر آتی تو اچانک ہی وہ بزرگ بھی آ جاتے، انہیں دیکھتے ہی وہ عجیب الخلقت لوگ فرار ہو جاتے۔ وہ بزرگ مجھے گلاب کا پھول دیتے اور مسکراتے ہوئے کہتے ہیں کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس طرح دو مہینے ہو گئے۔

دوبارہ کراچی جانے کا ہوا تو میں پھوپھو کے ہمراہ دادا میاں سے ملاقات کے لیے گئی اور انہیں بتایا کہ اب بھی وہ لوگ مجھے تنگ کرتے ہیں لیکن ایک بزرگ کی آمد پر وہ بھاگ جاتے ہیں، یہ سن کر وہ مسکرانے لگے، کہنے لگے۔ ہمارے ہوتے ہوئے وہ کچھ نہیں کریں گے لیکن تمہیں مکان چھوڑنا ہوگا، کیوں کہ یہ مکان ان کا بہت پرانا ٹھکانہ ہے، وہ اپنی جگہ چھوڑنا نہیں چاہتے ہیں اور جب ہم چاہتے ہیں، وہ بھاگ جاتے ہیں ہمارے ہاتھ نہیں آتے جو ہم کچھ کر سکیں اور اب تمہیں ایک خوشی ملنے والی ہے، تمہارے ابو بھی پاس ہی بیٹھے تھے۔ اُن سے کہنے لگے۔ تمہارے ہاں فرزند آنے والا ہے۔ وہ خوش ہو گئے تمہارے ابو نے پوچھا نام کیا رکھیں، آپ ہی نام تجویز کریں تو انہوں نے کہا حامد نام رکھنا۔ ہم واپس حیدرآباد آ گئے۔

میں خوش بھی تھی کہ اب بیٹا ہوگا کیوں کہ تمہارے بعد دو بیٹیاں اور ہوئی تھیں جو انتقال کر گئی تھیں اب بیٹے کی خبر سن کر سب خوش تھے۔ تین بیٹیوں بعد بیٹا آنے والا تھا۔ اب مکان بھی تبدیل کرنا تھا۔ مکان بیچنے کے بعد دوسرا مکان خریدنا آسان نہیں تھا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا مکان نہیں مل رہا تھا۔ میری پڑوسن بھی تسلیاں دیتی رہتی تھی گھبرانا نہیں، ہم ہیں کوئی تکلیف ہو تو فوراً بلا لینا اب ساتواں مہینہ ختم پر تھا کہ ایک رات خواب میں کوئی عورت آئی جو مجھ سے کہتی ہے اپنا قمیص کا دامن پھیلا مجھے کچھ دینا ہے۔ میں اُس سے کہتی ہوں کیا دینا ہے۔ وہ کہتی لے پکڑ اپنے ہاتھ میری جھولی میں ڈالتی ہے۔ کہتی ہے خوش ہو جا لیکن یہ چیز تین مہینے کے لیے ہے، واپس لے لوں گی۔ صبح میں اسی سوچ میں رہی کہ تین مہینے کے لیے کیا چیز دی ہے جو واپس چلی جائے گی، وہ عورت اکثر نظر آتی تھی، کھا کر وہ پہنے، بند یا لگائے ایسا لگتا تھا کہ ان لوگوں کی پوری فیملی ہے۔ کالا بھجنگ آدمی وہ عورت اور بچے اکثر نظر آتے تھے۔ یہ بات بھی ذہن سے جھٹک دی۔

آخر وہ دن بھی قریب آ گیا جب بیٹے کی خوشی ملنے والی تھی۔ ہم نے اپنی دوست کو بھی بلا لیا تھا اور برابر والی بھی تھیں اُن کی ساس دائی تھیں، جب بیٹے کی ولادت ہوئی بیٹے کی رونے کی آواز سن کر میں خوش ہوئی کہ خیریت سے ولادت ہو گئی، دائی اماں بھی خوش تھیں، تھوڑی دیر بعد کہنے لگیں کہ سب کچھ ٹھیک اللہ کا شکر ہے مگر بچہ ایسا لگ رہا ہے جیسے خون نہیں ہے۔ خون کی کمی تو مجھے بھی بتا رہی تھیں۔ بانو آپا جو میری دوست تھیں کہنے لگیں اچھی خوراک فروٹ وغیرہ کھا کر یہ تو ٹھیک ہو جائے گی لیکن بچے کا کیا کریں کیسے کریں۔ اُس وقت زیادہ ڈاکٹر تھے بھی نہیں نہ لوگ جاتے تھے، ٹونے ٹوٹکے سے یا حکیم سے علاج کرواتے تھے، یہی سوچ کر کہ حکیم صاحب کو دکھاتے ہیں، دوسرے تیسرے دن پر کام ٹال دیا گیا۔ زچگی میں، میں جا نہیں سکتی تھی، چوتھے دن ہم دونوں میاں بیوی بیٹے کو لے کر نکل گئے۔ کسی نے حکیم کا پتا بتایا تھا وہ ہمیں نہیں مل رہا تھا ہم بہت تھک

چکے تھے۔ مجھ سے کمزوری کی وجہ سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا ایک جگہ رُک گئے۔ میں تکلیف سے رو رہی تھی۔ بچہ گود میں تھا سامنے نظر پڑی ایک چھوٹی سی دکان نظر آئی، دکان میں چھوٹی سی میز رکھی ہوئی تھی اور سامنے ایک کرسی تھی۔ ایک کرسی پر کوئی بزرگ بیٹھے تھے۔ ہم ان کے پاس گئے اور اُن سے حکیم کے بارے میں پوچھا۔ وہ کہنے لگے یہاں بیٹھ جاؤ، میں بیٹھ گئی، انہوں نے بچے کو دیکھا اور کچھ لکھنے لگے۔ کہنے لگے تمہیں باہر نہیں نکلنا چاہیے تھا زچگی میں ہوا وغیرہ لگ جاتی ہے، گھر میں بیٹھو۔ اب تم چالیس دن تک میرے پاس مت آنا، اپنے میاں کو بھیجنا، میں تمہیں تعویذ دوں گا ابھی کچا تعویذ دوں گا چالیس دن کے بعد پکا تعویذ دوں گا لیکن آج نہیں کل صبح اپنے میاں کو بھیجنا ہے۔ ہم لوگ واپس گھر آ گئے۔ صبح تمہارے ابو جانے لگے مجھ سے کہنے لگے۔ میں بابا کے پاس جا رہا ہوں تم آرام کرو۔ میں اٹھنے لگی تو مجھ سے اٹھا نہیں جا رہا تھا۔ وہ چلے گئے۔ اب مجھ سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا اور نہ اُٹھا جا رہا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں ایک بوجھ تلے دب گئی ہوں اور میرا گلا جکڑ لیا ہے۔ جس کی وجہ سے آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ آنکھیں کھلی تھیں سب دیکھ رہی تھی اور محسوس کر رہی تھی مگر کچھ کر نہیں سکتی تھی۔ تھوڑی دیر میں میری پڑوسن کچھ لینے آئی وہ کوئی چیز مانگ رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا کہ یہ کچھ بول نہیں رہی ہیں اور ٹکر ٹکر دیکھ رہی ہے تو وہ بھی گھبرا کر چلی گئی۔ جب تمہارے ابو تعویذ لے کر گھر آئے تو ایک تعویذ گھر کے دروازے پر ایک لٹکایا اور ایک بچے کے بازو پر باندھ دیا اور ایک میرے بازو پر باندھا تو میرا جسم ہلکا ہو گیا اور ایسا لگا جیسے مجھے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ میں نے فوراً اٹھ کر گھر کا کام وغیرہ کرنا شروع کیا اور اپنی حالت تمہارے ابو کو بتائی تو کہنے لگے اچھا ہوا میں چلا گیا تھا تمہاری حالت دیکھ کر نہیں جاتا تو یہ کام رُک جاتا۔ پڑوسن بھی آ گئی تھی، کہنے لگی ابھی تو تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اتنی جلدی کیسے ٹھیک ہو گئی میں نے اس کو کچھ نہیں بتایا۔ رات کو جب سونے لیٹی تو خواب میں ایک عورت نظر آئی۔ وہ بہت بیمار لگ رہی تھی اور مجھ سے کہہ رہی تھی۔ میں نے تمہیں کچھ نہیں کہا پھر مجھے کیوں تکلیف دی ہے۔ میں اُسے دیکھتی رہی تو وہ بھی یہ کہہ کر چلی گئی کہ اب میں کچھ نہیں کروں گی شاید یہ تعویذ کا اثر تھا۔ اب بچہ بھی کچھ بہتر لگ رہا تھا، کیوں کہ جب اس کی پیدائش ہوئی تھی وہ بے سُدھ پڑا رہتا تھا، نہ روتا تھا نہ کچھ پیتا تھا۔ اب ہلنے جھلنے لگا تو کچھ اطمینان ہوا۔ تھوڑے دن سکون سے گزرے تھے کہ اچانک اُس کی طبیعت خراب ہو گئی ہم لوگ اسپتال لے کر بھاگے۔ ڈاکٹر نے ٹیسٹ وغیرہ کیے تو پتا چلا کہ اس کو سرسام ہو گیا ہے، میں اس کی حالت دیکھ کر رونے لگی تو مجھے یاد آیا کہ مجھے اُس عورت نے کہا تھا کہ ایک چیز دے رہی ہوں جو تین مہینے میں واپس لے لوں گی۔ یہ خیال آتے ہی مجھے اور رونا آ رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ اب یہ نہیں بچے گا۔ سوچ رہی تھی کاش یہ گھر ہم چھوڑ ہی دیتے، دوبارہ دادا میاں سے ملے تھے تب بھی انہوں نے یہ گھر چھوڑنے کے لیے کہا تھا۔ تین بیٹیوں کے بعد یہ بیٹا اللہ نے دیا تھا، اس سے زیادہ میرے لیے کچھ نہیں تھا۔ اب ہم نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا، تمہارے ابو دوبارہ اُن بزرگ کے پاس گئے جس جگہ پر وہ ملے تھے انہیں وہ جگہ تو مل گئی تھی لیکن وہ کوٹھری نہیں مل رہی تھی۔ لوگوں سے پوچھا وہ بھی نہیں بتا سکے۔ کہنے لگے، ہم کافی عرصے سے یہاں ہیں ہم نے تو یہاں کوئی بزرگ نہیں دیکھا تمہارے ابا تھک ہار کر واپس آ گئے۔

اس وقت ڈاکٹروں نے بتایا کہ بچے کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ سوا مہینا بھی ہو چکا تھا اور بچہ بھی صحیح ہو گیا تھا اسپتال میں ہم لوگ فیصلہ کر چکے تھے کہ اب گھر نہیں جائیں گے، واپس کراچی چلے جائیں گے، ہم کراچی آ گئے وہ گھر بھی چھوڑا اور کراچی میں اپنا کاروبار شروع کیا دونوں دیور بھی کاروبار میں شامل ہو گئے اور سب کے اپنے اپنے گھر اور کاروبار میں مصروف ہو گئے۔

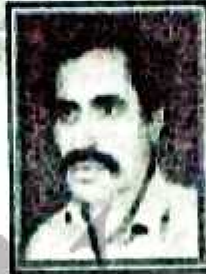
اب میرے پانچ بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں جو اپنے اپنے گھر آباد ہیں۔

حیدرآباد کے اس علاقے میں فلیٹ بن گئے ہیں۔ سب کہتے تھے پاکستان بنا تھا تو اس جگہ پر ہندوؤں کا مرگھٹ تھا۔ پاکستان بننے کے بعد یہاں گورنمنٹ نے کوارٹر بنا دیے تھے اس لیے وہ جگہ خبیث روحوں کا مسکن تھی جو یہ جگہ چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھیں۔ اب کیا حال ہے وہاں کا نہیں معلوم؟ کسی کو پتا ہو تو ضرور بتائیں۔

☆......☆



سفید آنکھیں



ریاض حسین شاہد

ایک بدروح کی پراسرار کہانی جس کو دیکھتے ہی آنکھیں سفید ہو جاتی تھیں

وہ ماہ مئی کی ایک آگ برساتی دوپہر تھی، ہیڈ ورکس سے آنے والی بڑی نہر کے کنارے کھڑے اونچے شیشم اور بڑے گھنے پیڑوں کے سائے اپنے پیروں پر سمٹ کر رہ گئے تھے۔ پٹڑی پر ایک بائیک مدھم رفتار سے ادھر بڑھ رہی تھی جس طرف پانی کا بہاؤ تھا۔ بائیک ایک خوش پوش لمبے قد اور مضبوط اعصاب کا گورا چٹا نوجوان چلا رہا تھا، جس کے ساتھ بڑی سی پھول دار چادر اوڑھے اٹھارہ برس کی دوشیزہ اجل ایک طرف پاؤں کیے ساحر سے لگ کر بیٹھی تھی۔ اس کے کمر تک بکھرے دراز گیسو شانوں سے ذرا اوپر سرخ ربن سے بندھے تھے۔ گول کتابی چہرہ جیسے میدے میں ذرا سا سیندور ملا ہو، دراز پلکوں کے سائے میں چھپی باتیں کرتی آنکھیں، کانوں میں ٹاپس اور کلائی میں کنگن جو صرف اس نے ساحر کے بے حد اصرار پر آج کے دن کے لیے پہنا تھا، دراصل ساحر آج اجل کو اپنے ایک دوست کے ہاں دوپہر کے کھانے پر لے کر جا رہا تھا۔ کالج سے چھٹی کی تھی، اجل نے گھر سے کالج جانے کا ہی بہانہ تراشا تھا اور کالج یونیفارم میں ہی گھر سے نکلی تھی۔ ساحر بائیک لے کر پہلے سے ہی اس کا منتظر تھا۔ پہلے وہ اسے ایک ریسٹورنٹ لے کر گیا۔ اور وہاں آئس کریم پردے کے پیچھے کیبن میں بیٹھ کر کھائی وہ دونوں بہت خوش تھے۔

"یار اجل آج بہت مزہ آئے گا۔ شہر کے کنارے کھڑے درختوں کے سائے میں پانچ میل کا سفر اور پھر نہر کنارے ڈاک بنگلے میں بیٹھ کر کھانا کھانے کا لطف ہی نرالا ہوگا۔" ساحر کہہ رہا تھا۔

"ہاں ساحر مجھے خود بہت اشتیاق ہو رہا ہے کہ میں ڈاک بنگلے کو اندر سے دیکھوں جس کا ذکر میں کہانیوں پڑھتی رہی ہوں۔"

پھر انہوں نے اپنے دوست کے بیوی بچوں کے لیے سویٹ گفٹ خریدا اور بنگلے کی راہ لی۔ گرمی کی شدت کو دیکھتے ہوئے یخ ڈرنک کی دو بوتلیں بھی شاپر بیگ میں ڈال کر بائیک کے ہینڈل سے لٹکا لیں۔ جب تک پختہ سڑک کا سفر رہا۔ وہ قدرے تیز رفتاری اور خاموشی میں رہے۔ نہر کا پل پار کر کے جب کچی سڑک پر مڑے تو اڑتی دھول کو دیکھ کر اجل نے ساحر کو آرام سے چلنے کی تلقین کی، اجل کے چہرے پر سجا سیاہ چشمہ اس کے حسن کو دوبالا کر رہا تھا۔ ساحر نے بھی خوب صورت فریم کا قدرے سبز شیشوں والا چشمہ آنکھوں پر سجا رکھا تھا۔

"بہت شدید گرمی ہے آج ساحر!" اجل بار بار چادر کے پلو سے چہرہ پونچھتی، بائیک کا انجن ان کی ٹانگوں

کومزید حرارت پہنچا رہا تھا۔

"بس ذرا صبر کرو یار، زیادہ فاصلہ نہیں ہے، تم درختوں کے سائے اور نہر کے پانیوں کی طرف دھیان رکھو۔" کئی جگہ درختوں کے نیچے مویشی بندھے تھے۔ نہر کے قریب ایک چھوٹی سی بستی آئی، چند عورتیں نہر کے کنارے بیٹھی کپڑے دھو رہی تھیں اور ایک دیہاتی عورت پانی میں اُتر کر ایک ہاتھ سے کنارے پر بچھی گھاس کو مٹھی میں جکڑے ہوئے تھی اور دوسرے ہاتھ سے اپنی ناک کو انگلی اور انگوٹھے سے پکڑ کر پانی میں ڈبکی لگا کر نہا رہی تھی، پاس ہی دو عورتیں کپڑے دھو رہی تھیں۔

"اوئی اللہ اسے پانی سے ڈر نہیں لگ رہا؟" اجل نے پوچھا۔

"ڈر لگ رہا ہے اس لیے تو ایک ہاتھ سے گھاس پکڑ رکھی ہے۔" ساحر نے قہقہہ لگا کر جواب دیا تو اجل بھی کھلکھلا کر ہنس پڑی پھر اچانک ساحر کو محسوس ہوا، جیسے بائیک لڑکھڑانے لگی ہے۔ اس نے چونک کر بائیک کا جائزہ لیا۔ گاڑی وزنی سی ہوتی جا رہی تھی اور دائیں بائیں ہلکورے لے رہی تھی۔

"کیا ہوا ساحر؟" اجل نے چونک کر پوچھا۔ ساحر نے بائیک ایک شیشم کے درخت کی چھاؤں میں روکی اور نیچے جھانکا پچھلا ٹائر پنکچر ہو چکا تھا۔

"او تیرا ناس جائے، تجھے آج ہی اور اس جگہ آ کر پنکچر ہونا تھا۔" ساحر بڑبڑایا۔ اور پریشانی کی حالت میں اجل کی طرف دیکھا۔ جس کے ماتھے پر پسینے کے ہلکے ہلکے قطرے جھلملا رہے تھے۔

"اب کیا ہوگا ساحر، یہاں تو کوئی پنکچر والا بھی نہ ہوگا۔" اجل نے نیچے اُتر کر چادر کو سنبھالتے ہوئے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔ ساحر نے کافی مایوسی کی حالت میں اپنے اطراف کا جائزہ لیا۔ ابھی کوئی دو میل کی مسافت باقی تھی۔ رستہ دُور تک سنسان اور کہیں کوئی ذی روح دکھائی نہ پڑتا تھا۔ آبادی بھی پیچھے رہ گئی تھی۔ جنوبی طرف کوئی دو سو گز کے فاصلے پر ایک دربار کا گنبد نظر آ رہا تھا، جو چار سو درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ ساحر نے بائیک ایک طرف کھڑی کی اور ایک اونچی جگہ کھڑے ہو کر دربار



کی طرف نگاہ ڈال کر وہاں کا مشاہدہ کرنے لگا۔

"اوہ یہ تو قبرستان ہے اور وہ کسی بزرگ کا مزار ہے۔ وہاں کچھ لوگ ضرور موجود ہوں گے۔ کیا خیال ہے ان سے کچھ مدد مانگی جائے، کیوں کہ اس حالت میں بائیک کو گھسیٹ کر کہیں لے جانا خاصا مشکل کام ہے اور پھر...... اس گرمی میں۔ اُف توبہ......" پھر ساحر نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے پریشانی کی حالت میں احتل سے کہا۔

"ساحر کچھ کرو، ہمیں دو بجے واپس گھر پہنچنا ہے پلیز۔ احتل تلملا کر بولی اور شاپر سے بوتل نکال کر کھڑے کھڑے کئی گھونٹ حلق میں اُتار لیے، پھر بوتل ساحر کی طرف بڑھا دی، اُس نے بھی چند گھونٹ لے کر خود کو تازہ دم کیا۔ اُس کا دماغ تیزی سے سوچ رہا تھا، مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ رہا تھا۔ قیمتی لمحات ہاتھ سے نکلے جا رہے تھے، آخر دونوں میں طے ہوا کہ احتل یہاں ٹھہرو کے پاس ٹھہرو، میں وہاں جاتا ہوں۔ کوئی مزدور ہی لے آؤں گا جو بائیک کو دکان پر لے جائے گا۔"

"مگر ساحر میں یہاں اکیلی کیسے کھڑی رہ پاؤں گی، ہر سو اُجاڑ ہے، مجھے تو ویسے ہی یہاں بہت گھٹن ہو رہی ہے۔" احتل نے بے چینی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"ریلیکس یار کیا ہو گیا۔ مسئلہ بنا ہے تو اس کا کوئی حل تو نکالنا پڑے گا نا۔ میں زیادہ دیر نہیں لگاؤں گا۔ تم بھی پیچھے سے مجھے دیکھتی رہنا، میں بھی پلٹ پلٹ کر تمہیں دیکھتا جاؤں گا، اب بائیک یہاں تنہا چھوڑ کر تمہیں ساتھ بھی تو نہیں لے جا سکتا نا اور پھر اس گرمی میں جانا۔ بس پندرہ بیس منٹ کی بات ہے، ٹھیک ہے نا؟"

ساحر نے اسے ڈھارس دے کر ٹھہر جانے کو کہا تو احتل نے اقرار میں ہلکی سی گردن ہلا کر اسے جانے کی اجازت دے دی۔

"تھینکس ڈیئر۔" ساحر نے اسے پیار سے کہا اور نہر کی اونچی پٹڑی سے نیچے اُترتا چلا گیا۔ نہر کے ساتھ ساتھ جانے والی کچی سڑک جو بھاری ٹریفک کے لیے استعمال میں رہتی تھی۔ اس کو بمشکل پار کیا کیوں کہ اس پر دھول اتنی جمی تھی کہ پنڈلیوں تک اس میں دھنس جانا پڑتا تھا۔ چھلانگیں لگا کر ساحر نے سڑک پار کی۔ پلٹ کر احتل کو دیکھا جو چھاتی پر ہاتھ باندھے اسے دیکھ رہی تھی۔ احتل نے ہاتھ ہلا کر اسے مسکراتے ہوئے رخصت کیا۔ وہ تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا۔ سڑک کے اس پار قبرستان کی حد شروع ہو جاتی تھی۔ اس حصے میں کافی پرانی قبریں واقع تھیں۔ جن پر باریک باریک کھردرے ذرات، گھڑے کی ٹوٹی کرچیاں بکھری تھیں۔ وہ قبروں کے بیچ چکراتا دربار کی سیدھ میں جا رہا تھا۔ پلٹ پلٹ احتل کو ہاتھ ہلا حوصلہ بھی دیتا، جو متواتر اس پر نگاہیں جمائے کھڑی تھی پھر وہ درختوں کی اوٹ میں کہیں چھپ گئی، ساحر بھی اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

چار سو قبروں کے بیچ چار کنال کے حصے میں اس درگاہ کو تعمیر کیا گیا تھا، جو ایک اونچے چبوترے پر واقع تھی۔ مشرقی جانب دو کچے کمرے تھے۔ ایک ٹوٹا پھوٹا چھپر تھا، شہتوت کے پیڑ کی گھنی چھاؤں میں تین چار پائیاں بے ترتیبی کی حالت میں بچھی تھیں اور تین چار مرد حقہ گڑگڑاتے ہوئے باتوں میں مگن تھے۔ دو اینٹیں جوڑ کر ایک ادھیڑ عمر عورت دیگچی میں چائے بنا رہی تھی۔ دو بچے ایک دوسرے پیڑ کے نیچے مٹی کے کھلونوں سے کھیل رہے تھے۔ ساحر کو قریب آتا دیکھ کر سبھی ادھر متوجہ ہو گئے ساحر نے اپنی پریشانی کا بتا کر مدد چاہی تو اسے بتایا گیا کہ تین میل مشرق میں خرتاج بستی ہے وہاں پنکچر لگانے کی سہولت موجود ہے یا پھر پانچ میل مغرب میں نہر کی جھال پر ایک پنکچر کی دکان ہے۔ ہم آپ کی یہاں کیا مدد کر سکتے ہیں۔ بائیک کو تو ہر حال میں دکان پر لے جانا پڑے گا۔" ادھیڑ عمر شخص نے ساحر کو بتا کر سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"دیکھیں میرے ساتھ ایک خاتون ہے۔ اگر آپ ہماری بائیک کسی قریبی دکان پر پہنچا دیں، تو ہم آپ کو اس کا معاوضہ دیں گے۔" ساحر نے انہیں پیشکش کی تو وہ سبھی چونک سے گئے۔

"سو کا نوٹ لیں گے۔ بائیک پہنچ جائے گی تمہاری دکان تک۔" سترہ برس کی عمر کے چھوکرے نے ڈیمانڈ کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے مجھے منظور ہے تم آؤ میرے ساتھ۔" ساحر نے خوش ہو کر اس سے کہا۔

بابو جانا کہاں تھا آپ لوگوں نے؟" ادھیڑ عمر نے

ساحر سے پوچھا۔
"دراصل ہم شہر سے آرہے ہیں اور بنگلہ ماچھی سنگھ جارہے تھے، کہ بائیک پنکچر ہوگئی۔"
"وہ بنگلہ تو یہاں سے قریب ہے، مگر پنکچر تو ادھر نہیں لگ سکے گا۔" ادھیڑ عمر نے کہا اور حقہ گڑگڑانے لگا۔
"دھیان سے جانا قوبے، چادر بھی لے لے بہت گرمی ہے، حشر ہوجائے گا جاتے تک۔"
"کچھ نہیں ہوتا بابا، میں چلا جاؤں گا۔" لڑکے کا نام شاید یعقوب تھا جو اسے قوبے کے نام سے پکارا جارہا تھا۔ اس نے چارپائی کے نیچے سے اپنا پرانا سا جوتا نکالا، ملگجا سا صافہ سر پر اوڑھا اور اسے اپنے تعاقب میں آنے کا اشارہ دیا۔
وہ درگاہ سے نکل کر قبرستان میں چکراتی ایک راہگور پر شہر کی جانب بڑھ رہے تھے، کوئی دس بجے کا وقت ہوگا، مگر لگتا تھا سورج سر پر آپہنچا ہے اور تندور کی طرح جل رہا ہے۔ ساحر قوبے کے تعاقب میں تھا کہ وہ دونوں پرندوں کی چہکار پر چونک کر متوجہ ہوئے اور شمال مغربی حصے کی طرف دیکھا تو عجیب منظر دکھائی دیا۔
اونچے لمبے قد کی ایک عورت تھی، جس نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ سر کے کھلے بال اس کی پیٹھ تک پہنچ رہے تھے اور وہ سر جھکائے ننھے ننھے قدم اُٹھاتی مشرق کی طرف قبروں کے بیچ و بیچ بڑھ رہی تھی اور آٹھ دس لالیاں (مینائیں) چلاتی ہوئی اس کے سر کے اوپر اُڑتی چلی آرہی تھیں۔
قوبے کے قدم جام ہوگئے، ساحر بھی ٹھہر کر سحر زدہ نگاہوں سے وہ پراسرار منظر دیکھنے لگا۔ لالیاں کسی سانپ کو دیکھ کر چلاتی ہیں، یا کسی پراسرار چیز کو دیکھ کر واویلا کرتی ہیں۔
"بابو چڑیل دیکھی ہے تم نے کبھی۔" قوبے نے دھیمی آواز میں ساحر سے پوچھا تھا۔
"ن۔ ن۔ نن...... نہیں تو۔" ساحر نے ہکلا کر جواب دیا۔
"تو پھر سامنے دیکھ لو، بلکہ آؤ اس جھاڑی کی آڑ میں بیٹھ جائیں، یہ چڑیل بہت عرصے سے اس قبرستان میں رہتی ہے۔ بہت کم ظاہری شکل میں آتی ہے، اب شدید

انمول موتی

☆ طالب علم میں شرم مناسب نہیں کیوں کہ جہالت شرم سے بدتر ہے۔ (افلاطون)
☆ کوئی سفارش نامہ حسن سے زیادہ انسان کے واسطے نہیں ہے۔ (ارسطو)
☆ جب تو دیکھے کہ کوئی کتا اپنے مالک کو چھوڑ کر تیرے پیچھے چلا آرہا ہے تو بھاری پتھروں کے ساتھ اسے اپنے پیچھے سے لوٹا دے کہ کسی روز وہ تجھ کو بھی چھوڑ کر دوسرے کے پیچھے روانہ ہوجائے گا۔ (دیو جانس کلبی)

مرسلہ: تحسین جونیجو، بورڑی

دوپہر کا وقت ہے نا۔ اس تنہائی میں اس روپ میں نکلی ہے، اس سے پہلے میں نے ایک دن شام کو اسے جھاڑیوں کی اوٹ سے دیکھا تھا، یا پھر آج صاف دیکھ رہا ہوں۔" وہ دونوں جھاڑی کی آڑ میں ادھر جھانک رہے تھے، دونوں کے حلق خشک ہورہے تھے اور سارا جسم پسینے میں شرابور ہورہا تھا۔ ساحر کا تو گلا ہی خشک ہوگیا تھا، کوئی پانچ دس قدم آگے جا کر وہ رکی، گردن اُٹھا کر جنوب مغربی کونے سے لے کر جنوب مشرقی کونے تک کا جائزہ لیا۔ چہرے پر بکھرے بالوں میں چھپا اس کا چہرہ زردی مائل تھا اور آنکھیں جیسے دن میں جگنوؤں کی چمک کا گمان گزرتا ہو، پھر اس کی نگاہ سیدھی اس جگہ آکر ٹھہر گئی، جہاں یہ دونوں چھپے تھے۔
"ادھر دیکھ رہی ہے سر جھکالو۔" قوبے کی آواز میں تھرتھراہٹ تھی، وہ بھی خوف سے ادھ موا ہورہا تھا، لالیاں چلانے کی آواز بدستور سکوت میں ڈوبی فضا میں ارتعاش پیدا کررہی تھی۔ بڑے جانگسل لمحات تھے، ساحر اصل کی وجہ سے بہت پریشان ہورہا تھا پھر انہوں نے چوری نگاہوں سے ادھر جھانکا تو اس کی پشت نظر آئی۔ وہ شہر کی جانب جارہی تھی اور پھر اسی لمحے وہ کسی چھلاوے کی طرح غائب ہوگئی۔
کچھ لمحے سکوت میں گزر گئے تو دونوں ایک ساتھ اُٹھے، لالیاں اس کے روپوش ہوجانے کے بعد بھی چند لمحوں تک بلند آواز میں چلاتی رہیں، پھر شہر کے درختوں

کی طرف اُڑ گئیں، فضا میں سناٹا چھا گیا۔

''اُف میرے خدا، بڑی ظالم ہوتی ہے چڑیل، جس سے چمٹ جائے پھر اس کی جان نہیں چھوڑتی، توبے نے آگے بڑھتے ہوئے ساحر کو بتایا، ساحر اس کی بات بھی سن رہا تھا، مگر اس کی زیادہ توجہ ادھر تھی جہاں اس کی احل اس کا انتظار کر رہی تھی، مگر اب وہ اسے دکھائی نہ دے رہی تھی، وہ ایڑیاں اُٹھا اُٹھا کر جھاڑیوں اور درختوں کی اوٹ سے احل کو جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے حواس پر چڑیل کا خوف چھایا تھا۔ وہ بار بار ادھر ہی پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ جہاں ذرا دیر پہلے چڑیل کو چلتے ہوئے دیکھا تھا۔ کتنا پُر اسرار چہرہ تھا اس کا اور چلنے کا انداز...... لگتا جیسے ریموٹ پر کوئی انسانی مجسمہ حرکت کر رہا ہو۔

ذرا دیر بعد ہی وہ نہر کے دہانے آ پہنچے۔ احل کہیں دکھائی نہ دے رہی تھی، جانے کیوں ساحر کی چھٹی حس بار بار پھڑک کر اسے کسی خطرناک حادثے کی اطلاع دے رہی تھی، وہ بار بار گلا تر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی شرٹ پسینے سے تر بہ تر ہو چکی تھی اور چہرے سے پسینہ بوندیں بن کر ٹپک رہا تھا۔ حلق میں پیاس سے کانٹے چبھ رہے تھے، اس کے بوٹ اور پتلون کا نچلا حصہ خاک میں لتھڑ چکا تھا۔ اس کی متجسس نگاہیں نہر پر کھڑے درختوں کے بیچ کسی کو بے قراری سے ڈھونڈ رہی تھیں۔ شاید کہیں تھک کر بیٹھ گئی ہو، اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس کی اس پر ہول صورت حال سے جان لبوں تک آ پہنچی تھی۔ وہ چلا اُٹھا۔

''احل !!'' مگر اس کی آواز گلے میں ہی کہیں رندھ گئی، توبے نے پلٹ کر اسے حیرت سے دیکھا۔

''کیا ہوا بابو؟'' مگر وہ اسے جواب دینے کی بجائے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو لبوں کے ارد گرد پھیلا کر زور سے چلایا۔ ''احل کہاں ہو؟'' اب اس کی آواز سامنے کھڑے پیڑوں تک ضرور پہنچ گئی تھی، مگر ادھر گہری خاموشی اور روح فرسا سناٹا تھا۔ توبے نے اس کا بازو پکڑا۔ وہ بُری طرح لڑکھڑا رہا تھا اور اس کی سانس بُری طرح پھول رہی تھی۔ وہ گرنے کو تھا، توبے نے اسے دونوں ہاتھوں سے اپنی بانہوں کے دائرے میں لیا۔ کچی سڑک پر خاک کا دریا بمشکل پار کرایا۔ اب وہ نہر کی پٹڑی پر چڑھ رہے تھے۔ وہ توبے کی بانہوں میں ہانپتا ہوا بمشکل پٹڑی پر پہنچا۔ کوئی بیس گز کے فاصلے پر اسے اپنی بائیک نظر آئی۔

''وہ رہی احل۔ توبے نے اسے ڈھارس دی۔''

احل خاک پر پاؤں پھیلائے شیشم کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کا سر بُری طرح نیچے جھکا ہوا تھا۔ ساحر نے توبے کو پرے دھکا دیا اور لڑکھڑاتے قدموں سے احل کی طرف بھاگ پڑا۔

''احل احل کیا ہوا تمہیں۔'' وہ اسے صدائیں دیتا ہوا آ رہا تھا، مگر احل کا وجود ساکن تھا۔ جس میں ذرہ بھر بھی جنبش نہ ہوئی۔ توبا بھی تیزی سے وہاں تک پہنچا۔ ساحر گھٹنوں کے بل احل کے قریب پہنچ کر گر سا گیا اور دونوں ہاتھوں سے اُس کا چہرہ تھام کر اوپر اٹھایا اور دھونکنی کی طرح اپنی پھولتی سانسوں سے پوچھا۔

''کیا ہوا احل۔ ہوش کرو پلیز، میں آ گیا ہوں، اس کی آواز پر احل نے اپنی بند پلکیں اُٹھائیں تو ساحر کی دبی دبی سی چیخ نکل گئی، کیوں کہ احل کی آنکھیں مکمل سفید تھیں اور دونوں دیدے اندرونی کونے میں سمٹ کر رہ گئے تھے اور آنکھوں سے پر اسرار دہشت ٹپک رہی تھی، دونوں لب سختی سے بند تھے اور جبڑوں کی ہڈیاں گلابی گالوں سے اُبھر کر نمایاں ہو رہی تھیں۔ ساحر دہشت سے خوف زدہ ہو کر اس کا چہرہ چھوڑ کر پیچھے کمر کے بل خاک پر گر گیا۔ توبے نے آگے بڑھ کر جھکتے ہوئے احل کے چہرے کو جھانکا، تو وہ بھی سہم کر پیچھے ہو گیا۔ ایسے میں احل کی گردن پھر سے بے جان ہو کر نیچے ڈھلک گئی۔

''ق...... توبے اس کو کیا ہو گیا ہے۔ خدا کے لیے ہمیں بچالو، مجھے بہت خوف آ رہا ہے۔'' ساحر کہہ رہا تھا۔

ایسے میں ایک بار ان کے قریب آ رکی جس پر دو شخص سوار تھے، ایک نوعمر لڑکا جو بائیک چلا رہا تھا اور دوسرا ایک پچاس سالہ بارعب شخص تھا جو باریش تھا۔ توبے نے بڑھ کر انہیں صورتحال سے آگاہ کیا۔ ادھیڑ عمر شخص نے احل کا قریب پہنچ کر جائزہ لیا، اس کی کلائیاں پکڑ کر نبض دیکھی، پھر بڑی ہمت کر کے احل کا چہرہ اوپر اٹھایا، مگر احل کی آنکھیں بند رہیں۔

"ہوں۔ یہ زندہ ہے، لیکن اس وقت یہ کسی آسیبی قوت کے شکنجے میں ہے۔ آپ اسے کسی عامل کے پاس لے جائیں۔"

"ن...... نہیں، یہ نہیں ہو سکتا یہ اجالا ہے، گریجویٹ ہے، سمجھ دار ہے، آسیب اس کے پاس کیسے آ گیا...... یہ ناممکن بات ہے۔ میں اسے یہاں تنہا چھوڑ گیا تھا۔ یہ ڈر گئی ہے۔" ساحر احتجاج بھرے انداز میں کہہ رہا تھا۔

"یہ بات نہیں ہے برخوردار۔ اس قبرستان میں عرصہ دراز سے ایک آسیبی قوت قیام پذیر ہے۔ اس وقت شدید دوپہر کا وقت ہے، آپ نے اسے یہاں تنہا چھوڑ دیا۔ لڑکی بہت حسین ہے، ضرور وہی آسیبی قوت اس پر فریفتہ ہو گئی ہے۔ ادھیڑ عمر نے ساحر کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں۔ وہ چڑیل تو ذرا دیر پہلے ہم نے قبرستان میں اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔" توبا اور ساحر یک زبان ہو کر بولے۔ اسی لمحے اجالا نے چہرہ اُٹھایا اور اپنی سفید آنکھیں کھول کر ان کی طرف گھور گھور کر دیکھنے لگی۔ اسے اپنی طرف متوجہ پا کر دونوں کی چیخیں نکل گئیں۔ دونوں ہاتھ باندھ کر اس سے شاید معافی مانگنے لگے۔ تب اس نے پھر گردن جھکا لی۔

"بابا جی۔ اب ہم کیا کریں، خدا کے لیے میری مدد کرو، میری بائیک پنکچر ہے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی، میرا دماغ پھٹ رہا ہے۔ اُف اللہ جی میں کیا کروں۔"

ساحر دیوانہ وار بولے جا رہا تھا اور ان کی منتیں کر رہا تھا۔

"اچھا تم ایسا کرو، میرا بیٹا تمہیں روڈ تک پہنچا دیتا ہے، مگر پھر تمہاری بائیک کا کیا ہو گا۔"

"وہ میں انہیں خرناج بستی تک پہنچا دیتا ہوں، وہاں سے پنکچر لگوا لیں گے۔" توبے نے کہا۔ ہاں ٹھیک ہے۔

"تم ان کی بائیک لے کر خرناج پہنچو، یہ اجالا کو لے کر وہاں جائیں گے، پھر وہاں سے گھر جانا ان کو آسان ہو جائے گا۔" اس بزرگ صفت انسان نے ان کی معاونت کرتے ہوئے کہا۔

پھر توبے اور ساحر نے اجالا کو بائیک پر سوار کیا۔ لڑکے نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی، ساحر نے پیچھے بیٹھ کر اجالا کو بانہوں میں بھرا، اس کی گردن بدستور آگے جھکی رہی اور اس نے کوئی احتجاج نہیں کیا، بلکہ بے جان مورتی کی طرح پڑی رہی، بائیک آگے بڑھی، توبہ ساحر کی بائیک لیے چل دیا۔ اور وہ بزرگ شخص وہاں پیڑ کے سائے میں اپنے بیٹے کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ نہر کے پل پر پہنچ کر خرناج بستی جو مخالف سمت دو فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ وہاں ایک حکیم صاحب کی دکان پر اجالا کو اندر چارپائی پر لٹایا گیا۔ اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے گئے، اسے پانی پلانے کی کوشش کی گئی، مگر پانی اس کے لبوں سے ہی نیچے بہہ گیا۔ وہ مکمل بے ہوش تھی، حکیم صاحب نے مریض کا جائزہ لیا۔ نبضیں دیکھیں۔ کنپٹی کی شریانوں کو زور سے دبا کر ہوش میں لانے کی کوشش کی گئی، لیکن کوئی کوشش بار آور ثابت نہ ہوئی، تب حکیم صاحب نے وضو کیا اور سورۃ فلق اور سورۃ ناس کی تلاوت کی۔ اکیس بار دونوں سورتیں پڑھ کر پانی پر پھونک ماری اور اس پانی کے چھینٹے اجالا کے چہرے اور سارے جسم پر مارے گئے، اچانک اجالا نے آنکھیں کھولیں، اپنے چار سو کا جائزہ لیا اور اچھل کر بیٹھ گئی۔

"مجھے کیا ہوا ہے ساحر؟ یہ ہم کہاں ہیں؟" وہ پریشانی سے پوچھ رہی تھی اور اس کے ہوش میں آ جانے پر جیسے ساحر کے مردہ وجود میں نئی جان آ گئی تھی۔

"تم بے ہوش ہو گئی تھیں اجالا، اس وقت ہم ایک حکیم کی دکان پر ہیں۔"

"ہیں۔ مگر ہم تو کہیں جا رہے تھے۔ ہماری بائیک پنکچر ہو گئی تھی، تم دربار پر گئے تھے۔ میں تمہیں دیکھ رہی تھی اور اب تم مجھے یہاں لے کر آ گئے ہو۔" اجالا غنودگی کی سی حالت میں بات کر رہی تھی۔

"اُف، میرا سارا بدن کسی پھوڑے کی طرح درد کر رہا ہے، پلیز مجھے پانی دو۔" ساحر نے اسے جوس کا ڈبا پیش کیا، جو اس نے گھونٹ گھونٹ پی لیا، پھر جب اس کی کچھ حالت سنبھلی تو انہوں نے واپسی کی راہ لی، کیوں کہ کھانے کی دعوت میں جانے کا تو اب سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ ایک تو وقت بہت گزر چکا تھا اور دوسرا اجالا کی حالت کچھ بہتر نہ تھی۔ اب بھی وہ نڈھال سی ہو کر ساحر کو بانہوں کے دائرے میں لیے بائیک پر سوار تھی۔ ساحر نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا کہ قبرستان میں ہم نے چڑیل دیکھی ہے اور وہی تم پہ قابض ہوئی اور ممکن ہے اب بھی

تمہارے ساتھ ہی سفر کر رہی ہو، کیوں کہ توبے نے بتایا تھا کہ یہ چڑیل جس کو ایک بار چمٹ جائے، پھر اس کی جان نہیں چھوڑتی۔ ساحر نفسیاتی طور پر اس وقت اجتل سے خوف کھا رہا تھا اور وہ اسے یہ ساری باتیں بتا کر خوف زدہ نہیں کرنا چاہتا تھا، جب کہ اجتل بھی اس سے کوئی بات نہیں کر رہی تھی، بس نیم مدہوشی کی حالت میں اس کا ساتھ دے رہی تھی۔

اجتل ساحر کی خالہ زاد کزن بھی تھی اور وہ دونوں ایک دوسرے سے بے حد محبت بھی کرتے تھے، مگر ان کی شادی کا معاملہ اس لیے کھٹائی میں چلا آ رہا تھا کہ اجتل کے ابو اپنے بھائی کے بیٹے سے اجتل کو بیاہنا چاہتے تھے اور سفیان بھی اجتل کو پسند کرتا تھا، پھر بھی اجتل نے ساحر سے کہہ رکھا تھا کہ میں سفیان سے کبھی بھی شادی نہیں کروں گی خواہ مجھے آپ کے ساتھ کورٹ میرج ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ ساحر کا اجتل کے گھر آنا جانا تھا، کیوں کہ وہ اس کی خالہ کا گھر تھا، مگر اجتل کے گھر والے اس بات سے ناآشنا تھے کہ اجتل اور ساحر ایک دوسرے کو نہ صرف پسند کرتے ہیں، بلکہ ایک دوسرے کی چاہت میں بہت آگے نکل چکے ہیں۔

☆......☆

گھر پہنچ کر اجتل خود بھی اتر کر دروازے سے اپنے کمرے تک پہنچی، اس نے ساحر سے کوئی بات نہیں کی۔ بہت سنجیدہ چہرے کے ساتھ چپ چاپ اندر چلی گئی۔

ساحر نے اس کے گھر والوں کو بتایا کہ اجتل کالج میں بے ہوش ہو گئی تھی، اسے اسپتال کے ایمر جنسی وارڈ میں لایا گیا۔ ہوش میں آ جانے کے بعد اسے میڈیکل وارڈ میں ڈرپ لگائی گئی۔ میں ایک دوست کے والد کی تیمارداری کے لیے وہاں پہنچا تو اجتل کو دیکھا، پھر اسی کے پاس رہا اور اب اس کی طبیعت کچھ سنبھلی تو گھر لے آیا۔

ساحر نے قطعی فرضی کہانی گھڑ کر سنائی تھی، جو کارآمد ثابت ہوئی اور اجتل کے سب گھر والے اس کے بے پناہ شکر گزار ہوئے، اب سبھی اجتل سے اس کی خیریت دریافت کر رہے تھے، مگر وہ پلکیں موندے نڈھال سی خاموش پڑی تھی۔

ساحر گھر لوٹ گیا، اور اپنی ماں کو بھی اجتل کی وہی کہانی سنائی جو اجتل کے گھر والوں کو سنا کر آیا تھا، اس کی والدہ نے صبح اجتل کے گھر جا کر اس کی تیمارداری کرنے کا کہا اور ساحر نے اسے اپنے ساتھ لے جانے کا وعدہ کیا۔

☆......☆

ساحر ذہنی طور پر ابھی تک خوف زدہ تھا۔ اس کے حواس پر ابھی تک اس چڑیل کا انجانا سا خوف سوار تھا اور اس کی نگاہوں کے سامنے قبرستان کا وہ منظر جوں کا توں کھڑا تھا۔ رات بھر اسے مختلف وسوسے چاروں طرف سے گھیرے رہے کہ نہ جانے اجتل کی حالت اب کیسی ہوگی، کہیں وہ بے خیالی میں سب کو اصل واقعات کی تفصیل نہ بتا دے، کہیں وہ غیبی قوت جو اس کے حواس پر قابض ہو گئی تھی۔ یہ انکشاف نہ کر دے کہ اجتل کل دوپہر کو قبرستان گئی تھی، اگر ایسی کوئی بھی بات ہو گئی تو معاملہ خاصا سنجیدہ ہو جائے گا، جو اجتل اور میری رسوائی کا باعث بھی ہوگا اور ہماری دوری کا سبب بھی بنے گا۔ یہ خیال اسے بہت اذیت دے رہا تھا۔

☆......☆

شام کا اندھیرا پھیلنے تک اجتل اسی طرح نیم بے ہوش کی حالت میں پڑی رہی۔ نہ اس نے کچھ کھایا پیا نہ کسی سے بات کی۔ سب گھر والے پریشان تھے، شام کو اس کے ابو ایک ڈاکٹر صاحب کو گھر لے آئے، ڈاکٹر نے معائنہ کے بعد بتایا کہ بس کمزوری ہے، وٹامن کی کمی ہو رہی ہے۔ اُبلا ہوا انڈہ، سیب اور دودھ کا گلاس دو، اسے میڈیسن کی ضرورت نہیں، صرف اچھی خوراک کی ضرورت ہے، جو اس کی گرتی صحت کو سنبھال سکے گی، پھر جب تمام چیزیں اسے پیش کی گئیں اور اسے سہارا دے کر بٹھایا گیا۔ اس کی بہن شائستہ نے اجتل کے دونوں شانے جھنجوڑ کر اسے پوری طرح بیدار کرنے اور کچھ کھانے پر مجبور کیا۔ اچانک اجتل نے چہرہ اٹھا کر دھیرے دھیرے گردن گھماتے ہوئے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ اس کی آنکھیں مکمل سفید تھیں اور رخساروں کی ہڈیاں نمایاں ہو رہی تھیں۔

''باجی خدا کے لیے ہوش کرو، کچھ کھالو، آخر تم کو ہوا کیا ہے۔''

شائستہ اسے جھنجوڑتے ہوئے کہہ رہی تھی، ایسے میں اجتل نے آنکھیں کھول کر اپنے چار سو جھانکا، تو سب

اس کی سفید آنکھیں دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے۔ ایسے میں احتل کا دایاں ہاتھ اُٹھا اور ایک زناٹے دار تھپڑ کی صورت میں شاتل کے رخسار پر ہتھوڑا بن کر برسا۔ تھپڑ اتنا وزنی تھا کہ چٹاخ کی آواز پورے کمرے میں گونج گئی، شاتل کی چیخ بھی نہ نکلی، بس ایک ہلکی سی آہ کے ساتھ اس کی گردن بائیں جانب جھکتی گئی اور وہ بیڈ سے نیچے فرش پر دھم سے آ گری۔ اس کے امی، ابو، بھیا، بھابی بھی پاس کھڑے تھے، سبھی کی چیخیں نکل گئیں اور سبھی بھاگ کر کمرے سے باہر آ گئے۔ احتل کی امی اور احتل کی بھابی لرزتی ہوئی آواز میں چیخ پکار کر رہی تھیں۔ اڑوس، پڑوس کے لوگ بھاگ کر ان کے گھر پہنچے، کمرے کے اندر سے مختلف آوازیں آتی رہیں، جیسے فرنیچر اور برتن گرائے گئے ہوں، پھر گہری خاموشی چھا گئی تھی۔

احتل پر آسیب آ گیا ہے۔ اس کی آنکھیں سفید ہو گئی ہیں، شاتل کو اس نے تھپڑ مار کر بے ہوش کر دیا ہے۔ دو تین لڑکے ہمت کر کے اندر کمرے میں داخل ہوئے۔ اندر کا منظر عجیب ہو رہا تھا۔ میز الٹی پڑی تھی۔ صوفہ، بیڈ اوندھے منہ گرا تھا۔ کرسیاں نیچے اوپر ایک دوسری سے اُلجھی پڑی تھیں۔ احتل کے لیے جو کھانے کی چیزیں اسے دی گئی تھیں، فرش پر بکھری پڑی تھیں، الماری کا شیشہ ٹوٹا ہوا اور برتن فرش اور بیڈ پر بکھرے ہوئے تھے۔ ہر چیز کمرے کی الٹ پلٹ کر دی گئی تھی اور شاتل فرش پر اوندھے منہ لیٹی تھی اور اس پر پیڈسٹل فین اس شکل میں گرا تھا کہ اس کا پروں والا جنگلا اس کی کمر پر گر چکا تھا اور احتل ایک کونے میں پاؤں پھیلائے بازو گود میں رکھے گردن نیچے جھکائے بے حس و حرکت بیٹھی تھی، بڑا سنسنی خیز منظر تھا۔ لڑکوں نے شاتل کو پنکھے کے نیچے سے نکالا اور باہر لے آئے اور اُسے بمشکل ہوش میں لایا گیا۔

بستی میں تعویذ گنڈا کرنے والے ایک عامل بابا کا بڑا چرچا تھا، فوراً اُسے بلا کر ساری صورت حال سے آگاہ کیا گیا۔ سائیں بابا نے دعویٰ کیا کہ ابھی اپنے عمل سے آسیبی قوت پر قابو پا لوں گا، ہمارا تو روز مرہ کا کام ہے۔"

سائیں نے فوراً اگر بتیاں لانے کو کہا۔ مٹی کا چراغ جلایا۔ ماچس لی، کھلے منہ کے برتن میں پانی رکھوایا۔ تیز دھار چھری لی اور اندر پہنچ کر سب چیزوں کو درست حالت میں رکھوایا۔ اگر بتیاں جلائیں، کچھ دیر تک کھڑے ہو کر پڑھائی کی، پھر احتل کے گرد چھری سے حصار بنایا اور چھری ہاتھ میں لہراتے ہوئے احتل پر دم جھاڑ کرنے لگا، ساتھ ساتھ چھری سے احتل کے سارے وجود پر دائرہ بناتے پڑھائی کرنے کے ساتھ ساتھ پانی کے چھینٹے اس کے جسم پر پھینکتا، سارا گھر مردوں اور عورتوں سے بھر گیا تھا۔ سب بڑے تجسس سے یہ منظر دیکھ رہے تھے، کمرے میں سائیں بابا اکیلا احتل کے پاس تھا، باقی دروازے میں تماشائی بن کر کھڑے تھے۔ عورتیں اور گھر کے سبھی فرد اندر جانے کی ہمت نہیں رکھتے تھے، مگر وہ بڑی بے تابی سے نتیجے کا انتظار کر رہے تھے، کوئی دس منٹ کا عرصہ گزرا ہوگا کہ اچانک کچن کی چھت سے ایک سیاہ رنگ کی قد آور بلی نے نیچے چھلانگ لگائی، سب ادھر متوجہ ہوئے، بلی نے اپنے جسم کے سارے بال سیدھے کھڑے کیے اور اتنے خوف ناک انداز میں چنگھاڑ بھری کہ سب لرز گئے۔ اس نے جست بھری اور سیدھی اس کمرے کی طرف لپکی جس میں احتل موجود تھی اور دروازے میں بہت سے لوگ کھڑے تھے۔

بلی نے چنگھاڑ کر ان کو للکارا۔ سبھی ڈر کر پیچھے آنگن میں لپکے اور بلی چھلانگ کر اندر پہنچی اور دروازے سے جو چھلانگ لی اور سیدھی سائیں بابا کی گردن سے جا لپٹی، اگلے پاؤں سے اس نے سائیں بابا کی گردن دبوچ لی، اور پچھلے پاؤں تیزی سے اس کی چھاتی پر بجلی کی سی تیزی سے چلانے لگی، نوکیلے ناخن تھے، پل بھر میں اس نے سائیں بابا کے کپڑے پھاڑ کر اس کی چھاتی لہولہان کر دی، اس اچانک افتاد پر سائیں بابا کو سدھ ہی نہ رہی۔ چھری اس کے ہاتھ سے گر گئی، وہ چیخا ضرور تھا، مگر پھر اس کی گردن کو اتنا سختی سے دبوچا گیا کہ اس کی آواز گلے میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔ وہ کمرے کے بل فرش پر گرا، اور ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے بلی کو دونوں ہاتھوں سے دبوچ کر خود سے الگ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے گلے سے خرخراہٹ کی آوازیں نکل رہی تھیں اور وہ فرش پر لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا، بلی غراتے ہوئے اس پر حملہ آور تھی اور لگتا تھا کہ اس کی جان لے کر چھوڑے گی۔ بالآخر شہباز نامی

بیس سالہ نوجوان نے ہمت کی اور کلہاڑی لے کر اندر پہنچا اور اندھا دھند بلی پر حملہ کرتے ہوئے کلہاڑی کے دستے سے اس کی کمر پر ضربیں لگانے لگا، بلی نے دو تین ڈنڈے کھا کر سائیں بابا کو چھوڑا اور شہباز پر حملہ آور ہونے کی کوشش کی، مگر شہباز نے اس کے تیور دیکھ کر کلہاڑی کا بھرپور وار کیا۔ کلہاڑی سیدھی بلی کے سر پر پڑی اور خون کا فوارہ اُبل پڑا۔ بلی دہشت ناک آواز میں چیخی اور نیچے گر گئی، تب تک اس پر دوسری ضرب جو اس کی اگلی ٹانگوں پر پڑی تھی، پھر بھی اس نے جست بھری اور اچھل کر شہباز پر حملہ کیا۔ وہ تیزی سے ایک طرف ہٹا اور بلی دروازے میں جا گری، شہباز نے پلٹ کر تیسری بار اس پر کلہاڑی چلائی، مگر وہ نیچے گرتے ہی آنگن کی طرف لڑکھڑاتے ہوئے بھاگ پڑی، شہباز پیچھے بھاگا۔ بلی حویلی کے دروازے کی طرف بھاگی تھی۔ شہباز نے اس کا تعاقب کیا، مگر ابھی دو قدم ہی اُٹھائے کہ منہ کے بل زمین پر گر گیا اور گرتے ہی سکتے میں چلا گیا۔ سب بھاگ کر اس کے قریب پہنچے، اوندھے منہ سے اُسے سیدھے رُخ پر کیا گیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں کھلے منہ سے وہ لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا، بہت پُر اسرار لگ رہی تھیں۔

اودھر اجل دروازے میں نڈھال سی حالت میں آ کر کھڑی حیرت سے باہر کا منظر دیکھ رہی تھی، کبھی وہ خود دیکھتی، کبھی گھر کے عجیب و غریب ماحول کو دیکھتی، اسے بے پناہ نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔ سر کے بال، چہرے اور شانوں پر بے ترتیبی کی حالت میں بکھر چکے تھے، وہ نارمل حالت میں تھی پھر اس نے امی کہہ کر آواز دی تو سبھی اُدھر متوجہ ہوئے اور خوف زدہ نظروں سے اجل کو دیکھنے لگے، پھر جب وہ لڑکھڑائی حالت میں کمرے سے نکل کر واش روم کی طرف جانے لگی اور دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے پر بکھرے بال سمیٹ کر اپنی پشت پر باندھنے لگی، سب نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تب تک واش روم میں پہنچ کر اجل نے دروازہ بند کر دیا، اب نارمل حالت میں ہے، لگتا ہے سائیں بابا نے آسیبی قوت کو مار بھگایا ہے۔ تب سب کو سائیں بابا کا خیال آیا، بھاگ کر اندر پہنچے، سائیں بابا زخموں سے چور لہولہان حالت میں پڑا کراہ رہا تھا اور پانی مانگ رہا تھا، اسے پانی دے کر چارپائی پر لٹایا گیا، شہباز کو بھی بے ہوشی کی حالت میں چارپائی پر لٹایا گیا اور ذرا دیر بعد دونوں کو وین اسپتال لے کر جا رہی تھی، گھر میں عجیب سنسنی پھیلی تھی۔

ذرا دیر میں کتنے لرزہ خیز واقعات بیت چکے تھے۔ شامل کو تھپڑ مار کر بے ہوش کیا گیا، سائیں بابا کا عمل پڑھنا اور پُراسرار بلی کا آ کر اس پر حملہ کر کے اسے شدید زخمی کرنا، کمرے کی ہر چیز کا بکھرنا، شہباز کا بلی پر حملہ کر کے بے ہوش ہونا، ہر واقعہ پہلے سے بڑھ کر ہوا تھا، کوئی پون گھنٹے بعد واش روم کا دروازہ کھلا، سبھی پریشان ہو رہے تھے، مگر کسی میں ہمت نہ ہو رہی تھی کہ اجل کو آواز دیتے یا دروازہ کھٹکھٹاتے، شب دوسرے پہر میں داخل ہو چکی تھی۔ سب حیرت و پریشانی اور تجسس میں گھرے ایک دوسرے کو بے بسی سے دیکھ رہے تھے اجل کا والد زخمی سائیں بابا کے ساتھ اسپتال جا چکا تھا۔ گھر میں اجل کی ماں، چھوٹی بہن شامل، بڑی بھابی، بھیا ناصر اور چھوٹا عرفان جو ابھی چار سال کا تھا، خوف سے سہمے ہوئے لیٹا تھا۔ دروازہ کھلا تو سبھی ادھر متوجہ ہوئے، اجل اندر سے برآمد ہوئی، مگر یہ کیا، اس کے سارے بال چہرے کو ڈھانپ کر اگلے حصے کی طرف بکھرے ہوئے تھے۔ گردن آگے کو اس قدر جھکی ہوئی تھی کہ اس کی ٹھوڑی چھاتی پہ لگی تھی اور وہ بڑے پراسرار انداز میں ننھے ننھے قدم بڑھاتی باہر آ رہی تھی۔

کسی میں اتنی ہمت نہ ہو رہی تھی کہ اس سے کوئی بات پوچھیں، سبھی ہراساں نظروں سے اسے دیکھے جا رہے تھے۔ جھکے ہوئے سر کے ساتھ بڑھتے ہوئے وہ آنگن میں بچھی چارپائی سے ٹکرائی۔ تو اس نے نہایت غصے کی حالت میں چارپائی کو پاؤں سے کک لگائی اور اچھی خاصی وزنی چارپائی کوئی سات فٹ کی بلندی پر فضا میں اُڑی اور پھر کافی پرے جا گری۔ سبھی اہل خانہ کی دبی دبی چیخیں نکل گئیں اور پھر سبھی نے بھاگ کر کمرے میں پناہ لی۔

"یا اللہ تو ہماری اجل پر رحم کر۔ یا اللہ تو ہم کو بچا لے۔" اجل کی ماں روتے ہوئے دعائیں مانگ رہی تھی، پھر انہیں اجل کے رونے کی آواز آئی، ماں کی تڑپتی ممتا دیکھ کر ناصر کمرے سے باہر آیا، آنگن خالی پڑا تھا۔ رونے کی آواز اجل کے کمرے سے آ رہی تھی،

ناصر دبے قدموں کمرے کے دروازے تک پہنچا۔ دروازہ کھلا پڑا تھا۔ اندر بتی روشن تھی اور اندر سے اسحل کے مدھم سی رونے کی آواز ابھر رہی تھی، چند ثانیے ناصر چوکھٹ میں کھڑا رہا، پھر ذرا ہمت کر کے اندر جھانکا، اسحل نیچے فرش پر پاؤں پسارے بیڈ سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی، چہرہ بدستور نیچے جھکا تھا اور مدھم سی آواز میں وہ جیسے بین کرتے ہوئے رو رہی ہو۔ ناصر فوراً واپس پلٹا اور ماں کو ساری صورتحال سے آگاہ کیا اور تسلی دی کہ صبح ہم اسحل کو کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس لے کر جائیں گے۔"

تو ماں نے کہا۔ "یہ ڈاکٹر کے بس کا روگ نہیں ہے بیٹا۔ یہ آسیب کا معاملہ ہے، کسی کامل پیر فقیر کے پاس جانا ہوگا، جو روحانی علاج سے آسیب کو قابو میں لائے گا۔"

تب سب نے ماں کی بات پر اتفاق کیا اور رات کا بقیہ حصہ اسی بے چینی اور اضطراب میں جاگ کر بسر کیا۔

☆......☆

اُدھر ساحر نے بھی رات جاگتی آنکھوں سے بسر کی تھی۔ صبح ناشتے کو بھی دل نہ چاہا پھر وہ بائیک پر اپنی ماں کو لیے اسحل کے گھر پہنچا، مختلف قیاس اور وسوسے اس کے دماغ میں ہلچل پیدا کر رہے تھے۔

شاہل نے اُن کے لیے دروازہ کھولا اور رات بھر پیش آنے والے واقعات کی تفصیل بتا کر کہا کہ ابھی ذرا دیر پہلے اسحل کو امی جان بھیا اور بھابی کسی پیر صاحب کے پاس لے کر گئے ہیں، ساحر اور اس کی والدہ بہت پریشان ہوئے پھر ساحر اپنی ماں کو وہیں چھوڑ کر بائیک لیے اسحل کے پاس چل دیا۔ وہ بہت مضطرب اور پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

اسحل کو ایک معروف عامل بابا کے ڈیرے پر لایا گیا۔ جہاں اس کے پاس بہت سے مرد اور عورتیں بطور سائل جمع تھیں۔ ناصر نے عامل بابا سے درخواست کی کہ ہمارے مریض کی حالت بہت تشویشناک ہے۔ اس پر آسیب ہے اور بہت تکلیف دے رہا ہے، لہٰذا آپ پہلے اُسے دیکھ لیں، لہٰذا اسحل کو ایک علیحدہ کمرے میں ناصر اور اس کی بیوی بازوؤں سے پکڑ کر لے آئے اور چارپائی پر لٹا دیا، پھر جیسے ہی عامل بابا اندر آئے اسحل تیزی سے چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گئی، پاؤں سمیٹ کر ان کو بانہوں کے دائرے میں لے لیا اور چھپاک سے آنکھیں کھول کر ایک ایک چہرے کو بغور دیکھا۔

عامل بابا نے کچھ پڑھتے ہوئے اسحل کی کلائی سختی سے پکڑی اور اس کے چہرے پر جھکتے ہوئے پھونک ماری، ادھر وہ پھونک مار رہا تھا اور ادھر چٹاخ کی آواز سے اسحل کا تھپڑ عامل بابا کے بائیں گال پر اس طرح پڑا کہ لمحے بھر کو سب پر سکتہ طاری ہو گیا۔ عامل بابا بھی تھپڑ کھا کر لڑکھڑا سے گئے، مگر فوری اپنی بوکھلاہٹ پر قابو پا کر اس نے جوابی طور پر جھٹکے سے اسحل کے بالوں کو سختی سے مٹھی میں جکڑا اور دوسرے ہاتھ سے انتقامی طور پر اسحل کے چہرے پر تھپڑ دے مارا۔ جو کوئی اتنا وزنی تو نہ تھا، کیوں کہ الٹے ہاتھ سے مارا گیا تھا پھر بھی تھپڑ کی آواز سب کو سنائی دے گئی تھی۔

"کمینی چڑیل، میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔ تو مجھے ڈرا رہی تھی نا۔ اب بول کیا حشر کروں تمہارا۔" وہ نہایت غصے کی حالت میں بول رہا تھا اور ساتھ ساتھ مٹھی بھینچ کر اسحل کے سر اور چہرے پر ہلکی ہلکی ضربیں لگا رہا تھا۔

"منشی سنگلی لے آؤ۔ باندھ دو اس حرافہ کو، ابھی دیکھتا ہوں کتنی ہستی کے مالک ہے۔" اس نے آواز دے کر کہا۔

فوراً اس کے دو ملازم لڑکے بھاگتے ہوئے آئے، لمبی سی زنجیری ان کے پاس تھی۔ لڑکے بھاگتے ہوئے آئے، لمبی سی زنجیری ان کے پاس تھی، اسحل کو چارپائی پر لٹایا گیا۔ عامل بابا نے اس کے بال جوں کے توں اپنی مٹھی میں جکڑے رکھے، پھر سر سے پاؤں تک اسحل کا سارا جسم زنجیر سے چارپائی کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ وہ پلکیں موندے ہلکی ہلکی کسمساتی رہی۔ عامل نے چھری سے اس کے گرد احصار کھینچا اور زور زور سے کچھ پڑھنے لگا۔ اسحل کی ماں، بھابی اور بھیا ناصر سہمے ہوئے پیچھے کھڑے تھے، عامل بابا کی آواز لحظہ بہ لحظہ بلند ہوتی گئی، اس کا چہرہ سرخی مائل ہونے لگا۔ اب اس کی آواز باہر برآمدے تک پہنچ رہی تھی۔ وہاں موجود سبھی مرد و زن جان چکے تھے کہ اندر موجود لڑکی کو کسی آسیبی طاقت نے اپنی گرفت میں لے رکھا ہے اور عامل بابا اب اس آسیب کو اپنی پڑھائی کے اثر سے دور کر رہے ہیں۔ عامل بابا کا جلال عروج پر

تھا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے جھلملا رہے تھے۔

اچانک اس نے چھری والا ہاتھ فضا میں بلند کیا اور سیدھی چھری کی نوک اصل کی چھاتی پر برسائی، مگر ابھی اس کا ہاتھ فضا میں ہی تھا کہ اصل کے منہ سے ایک دلدوز چیخ نکلی اور اس کے سارے وجود میں ایک لرزہ سا پیدا ہوا، اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ دوسری اور پھر تیسری بار جو حرکت کی تو زنجیر تڑاخ تڑاخ کی آواز سے ٹوٹتی گئی، پھر جس لوہے کی چارپائی پر وہ لیٹی تھی، اس چارپائی کے دائیں اور بائیں دونوں بازو درمیان سے ایسے کٹ کر نیچے گرے جیسے ان کو کسی آرے سے کاٹ دیا گیا ہو اور یہ سب کچھ پلک جھپکنے میں واقع ہو گیا تھا۔ تیسرے جھٹکے سے زنجیر اور چارپائی توڑ کر اصل بجلی کی سی تیزی سے اٹھی۔

اس اچانک اور غیر متوقع صورت حال سے عامل بابا بری طرح بوکھلا گیا اور ابھی آنکھیں پھاڑے وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ اصل کیا کرنے لگی ہے، تب تک اصل نے کھڑے ہو کر عامل کے چہرے پر لگاتار چٹاخ چٹاخ چھ سات طمانچے برسا دیے، وہ چکرا کر دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے تیزی سے باہر لپکا۔ تب اس کی کمر پر اتنے زور سے گھونسہ پڑا کہ وہ چلا کر منہ کے بل چوکھٹ کے پار برآمدے کے فرش پر جا گرا۔ اصل کے قدم بھی دروازے کی جانب اٹھے۔ عامل منہ کے بل فرش پر گرتے ہی پھرتی سے اٹھا اور برآمدے میں آگے بھاگ پڑا۔ عامل کو بھاگتے اور اصل کو اس کے تعاقب میں آتے دیکھ کر وہاں موجود بھی مرد و زن چیخ اٹھے، کچھ باہر بھاگ گئے کچھ دوسرے کمرے میں گھس گئے۔

عامل بابا بھی اپنے کمرے میں پہنچا تو اس کے مددگار لڑکوں نے دروازہ بند کر کے اسے محفوظ کر لیا۔ ہر طرف سنسنی پھیل گئی تھی اور قیامت کا منظر تھا۔ اصل راہ میں پڑے موہڑے اور کرسیوں کو پاؤں کی ٹھوکر سے برآمدے کی چھت تک اڑاتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی، پھر وہ ٹہلنے کے انداز میں بیرونی دروازے سے نکل کر گلی کی جانب مشرق بڑھنے لگی، اس کی ماں، بھابی اور بھیا بھی خوف زدہ حالت میں کوئی دس قدم کے فاصلے پر اس کے تعاقب میں آ رہے تھے۔

وہ سر جھکائے بند آنکھوں سے گلی میں چل رہی تھی، نہ جانے وہ کیسے چل رہی تھی، کیوں کہ اس کی آنکھیں مکمل بند تھیں اور چہرہ چھاتی سے لگا تھا۔ مگر وہ ایسے آگے بڑھ رہی تھی، جیسے سب کچھ دیکھتے ہوئے چل رہی ہو، گلی سے نکل کر اب وہ ٹریفک سے بھرے روڈ کے فٹ پاتھ پر سفر کرنے لگی۔ اس کے گھر والے اس کا تعاقب کرتے ہوئے سخت پریشان تھے کہ اب ہم کیا کریں۔ ان کی بے بسی یہ تھی کہ نہ تو وہ خود اصل کو اپنی گرفت میں لینے کی ہمت رکھتے تھے اور نہ کسی سے مدد مانگ سکتے تھے۔

کوئی بیس گز کا فاصلہ طے کر کے اصل لمبے بھر کو رکی اور پھر اسی حالت میں روڈ پار کرنے کے لیے تیز رفتار ٹریفک کے بہتے سیلاب میں اتر گئی۔ گاڑیوں کے ایمرجنسی بریکوں کی آواز سے فضا لرز اٹھی، پیچھے آنے والی کئی گاڑیاں ایک دوسری سے دھماکوں کی صورت میں ٹکرا گئیں، دو بائیک والے بمشکل اصل کو دائیں اور بائیں سے گزر گئے۔ ایک کار کا بمپر اصل کی کمر کو بھی چھو گیا۔ سڑک کا دوسرا کنارہ مختلف سمت کی ٹریفک کا تھا۔ اصل وہاں پہنچی تو ایک رکشے نے اسے اپنی سائیڈ کی ٹکر ماری اور ساتھ ہی رکشا الٹ کر دور تک چھت کے بل گھسٹتا چلا گیا، مگر اصل کا وجود ذرا بھر بھی نہیں ڈگمگایا۔ ایک کار والا گاڑی کو نہ سنبھال سکا اور اس کی گاڑی فٹ پاتھ سے ٹکرا کر ترچھے رخ پر چند قدم آگے جا رکی، فٹ پاتھ پر سفر کرتے لوگ یہ منظر دیکھ کر ایک فروٹ والے ٹھیلا فروش سے ٹکرائے اور ٹھیلا فٹ پاتھ سے سڑک پر لڑھک گیا اور تمام فروٹ فٹ پاتھ اور سڑک پر دور تک بکھر گئے۔ سڑک پر چند لمحوں کے لیے قیامت برپا ہوئی تھی، اب اصل روڈ پار کر کے دوسرے فٹ پاتھ پر مخالف سمت کی طرف جا رہی تھی، کچھ لوگ اصل کی طرف غصے کی حالت میں بھاگے تھے، کہ اس سے اس طرح لاپروائی سے سڑک پار کرنے کی باز پرس کریں، مگر جب اس کے قریب پہنچے تو اس کا آنکھیں موند کر سر جھکائے اپنی مستی میں سب سے بیگانہ ہو کر آگے بڑھتا دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔ ایک انجانا سا خوف سب پر سوار ہو گیا اور اسے ایک مجنوں سمجھ کر چھوڑ دیا گیا۔

"یہ تو کوئی پاگل اور مست عورت ہے۔" سڑک پر ٹریفک کچھ دیر کے لیے جام ہو گئی تھی۔ ناصر اپنی ماں اور

بیوی کا بازو پکڑے سڑک پار کر کے ایک بار پھر احمل کے تعاقب میں بڑھ رہے تھے۔ ماں کی حالت غیر ہو رہی تھی، ناصر بمشکل اسے سنبھالے ہوئے تھا۔

"میرا دل بیٹھ رہا ہے بیٹا، مجھے ذرا سا پانی دو۔" احمل کی ماں نے ایک طرف فٹ پاتھ پر بیٹھتے ہوئے کہا اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے سسکیاں لینے لگی، ناصر نے اپنی بیوی صائمہ کو ماں کے پاس چھوڑا اور ایک ٹھیلے والے کی طرف پانی لینے بھاگا، احمل بدستور آگے جا رہی تھی، پانی کا گلاس لے کر واپس پہنچا تو احمل کافی آگے نکل چکی تھی۔

"تم امی کو سنبھالو صائمہ، بلکہ انہیں رکشے میں لے کر گھر پہنچو، میں احمل کے تعاقب میں جاتا ہوں، کہیں وہ ہم سے کھو نہ جائے۔" ناصر نے اپنی بیوی سے کہا اور فٹ پاتھ پر بھاگ پڑا، مگر احمل اسے دور دور تک دکھائی نہ دے رہی تھی، اس کی پریشانی اور بڑھ گئی اور وہ باقاعدہ اب بھاگ پڑا تھا۔

سڑک کے کنارے لمبی سی دیوار شروع ہو چکی تھی، کوئی سو گز کا فاصلہ طے کیا تو گیٹ نظر آیا، جس کے ساتھ ساتھ پھولوں اور چادروں کی دکانیں بنی تھیں۔ یہ قبرستان کا گیٹ تھا، ناصر کو اندازہ ہو گیا کہ احمل گیٹ سے اندر چلی گئی ہے وہ بھی اندر داخل ہو گیا، چند گنتی کے لوگ قبرستان داخل ہو رہے تھے۔ کچھ واپس لوٹ رہے تھے، دور تک پھیلا ہوا قبرستان تھا۔ اس نے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ چند اکا دکا لوگ دور تک قبروں کے بیچ دکھائی دیے، مگر احمل کہیں نظر نہ آ رہی تھی، چند مقبرہ ٹائپ قبروں کی آڑ بنی تھی اور کئی قبروں کے اونچے کتبے احمل کو جھانکنے کی راہ میں حائل ہو رہے تھے۔ ناصر دائیں جانب مڑا اور قبروں کے بیچ چکراتا کافی دور تک آگے بڑھ گیا، پھر بائیں ہاتھ کا اوپری چکر لگا کر مایوس سا واپس گیٹ کی طرف لوٹ رہا تھا۔ اس حصے میں خاصی پرانی قبریں تھیں۔ کچھ قبروں کے نشانات معدوم ہو چکے تھے۔ ناصر تھکے ہوئے قدموں سے اردگرد کا بغور جائزہ لیتا ہوا بہت سست رفتاری میں آگے بڑھ رہا تھا، پھر اچانک اسے کوئی دس بارہ قبریں چھوڑ کر دائیں جانب ایک جنگلی خاردار ببول کے پیڑ تلے ایک عورت بیٹھی دکھائی دی۔ اس کی پشت اس جانب تھی۔ وہ چونک کر ادھر بڑھا۔ قبرستان کا یہ ویران سا علاقہ تھا۔ تمام قبروں کی حالت خستہ تھی۔ کچی قبریں مسمار ڈھیریاں بس علامت کے طور پر ظاہر ہو رہی تھیں اور پختہ قبروں کی اینٹیں بھی بمشکل اپنا وجود لیے کھڑی تھیں، کچھ خاردار جھاڑیاں تھیں۔ وہ ایک ببول کا پیڑ تھا جس کی چھاؤں بھی کوئی اتنی گھنی نہ تھی۔ ناصر اور قریب پہنچا تو اسے احمل کو پہچان لینے میں کوئی دقت پیش نہ آئی، اس کا چہرہ دوسری جانب تھا۔ ناصر اس کے عقب میں ایک قبر کے خستہ اونچے کتبے کی آڑ لے کر کھڑا ہو گیا۔

ایک انجان سا خوف اس پر مسلط ہو رہا تھا۔ وہاں کا سارا ماحول بہت پر اسرار اور سنسنی پھیلا دینے والا تھا، ناصر کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا، اسے کچھ سمجھ میں نا آ رہا تھا کہ وہ اس موقع پر کیا کرے۔ احمل کے پاس جانے کا اس میں حوصلہ نہیں ہو رہا تھا اور وہ اسے اس حال میں یہاں تنہا چھوڑ کر جا بھی تو نہیں سکتا تھا۔ اس کا گلا خشک ہو رہا تھا اور معدے میں متلی سی ہو رہی تھی، تھک ہار کر اس نے احمل کو آواز دی۔

"ا۔ ا۔ احمل!" ناصر کی آواز بمشکل ہونٹوں سے ادا ہو پائی، مگر بے اثر۔ ادھر کچھ بھی نہ ہوا۔ ناصر نے پھر ہمت کی۔

"ا...... احمل، م۔ م میں ناصر ہوں تمہارا بھائی۔" مگر ادھر وہی خاموشی، ناصر کی کے پیر کپکپا رہے تھے اور آواز تھرتھرا رہی تھی۔

مجھے گیٹ سے کسی کو اپنے ساتھ لانا چاہیے، اکیلے احمل کا سامنا کرنا حماقت ہے، ناصر نے سوچا اور واپس پلٹ گیا، مگر اب وہ کس سے کہے اور کیا کہے؟ کون ہوگا جو اس کی مدد کے لیے ایک آسیب زدہ مریض کے گلے پڑے۔ اسے کوئی بھی ایسا چہرہ دکھائی نہ دے رہا تھا، جس پر اعتماد کیا جا سکتا۔

وہ باہر فٹ پاتھ پر آیا، پھولوں والی ایک دکان پر پانی کا مٹکا موجود تھا۔ اس نے دو پیالے پانی پیا، اس کی کچھ حالت بہتر ہوئی، اب وہ باہر فٹ پاتھ پر کھڑا پریشانی کے عالم میں کسی فیصلے پر نہ پہنچ رہا تھا۔ کافی دیر گزر گئی تھی۔

☆......☆

ادھر ساحر صبح سے ان لوگوں کی تلاش میں مارا مارا

پھرتا تھا، اسپتال اور پھر کئی پرائیویٹ ڈاکٹروں کے کلینک، عاملوں کے ٹھکانے، ہر جگہ وہ اصل کو ڈھونڈ چکا تھا۔ اسے زنجیروں سے باندھا گیا، مگر وہ زنجیریں توڑ کر عامل بابا کے چہرے پر تھپڑ رسا کر یہاں سے چلی گئی۔

"ساحر اور بھی پریشان ہو گیا، پھر اسے روڈ پر اصل کی ماں اور ناصر کی بیوی فٹ پاتھ پر مل گئے، وہ انہیں لے کر گھر پہنچا اور اب ناصر اور اصل کی تلاش میں قبرستان کی طرف آیا، تو ناصر اسے گیٹ پر ہی مل گیا۔ ناصر اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور ساری تفصیل بتا کر پوچھا کہ اب ہم کیا کریں، اصل اندر قبرستان کے ایک ویران حصے میں موجود ہے۔"

"دیکھو ناصر بھائی یہ تو بات واضح ہو چکی ہے کہ اصل پر کسی آسیب کا سایا ہے جو کسی عامل کی گرفت میں بھی نہیں آ رہا، بستی انوپ پور میں ایک سید صاحب رہتے ہیں، جو اللہ کے بہت کامل ولی ہیں۔ اگر کسی طرح ہم اصل کو وہاں لے کر پہنچ جائیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ ہر قسم کے آسیب کو دور کر دیں گے۔" ساحر نے اپنی رائے پیش کی۔

"ہاں ان کا نام تو میں نے بھی سن رکھا ہے، سفر بھی کوئی زیادہ دور کا نہیں، یہی کوئی پندرہ بیس میل کا مسافت ہوگی، مگر سوال یہ ہے کہ اصل کو وہاں تک لے کر پہنچا کیسے جائیں؟" ناصر نے ساحر کی بات کا جواب دے کر پریشانی سے کہا۔

"ظاہر ہے ٹیکسی لینا پڑے گی۔"

"مگر ٹیکسی قبرستان کے اندر تو نہیں جا سکتی۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" ساحر نے بھی مایوسی ظاہر کی، دونوں الجھ سے گئے۔

"ہاں ایک ترکیب آئی ہے میرے ذہن میں۔ تم یہاں ٹھہرو میں ٹیکسی لے آؤں۔" ساحر نے ناصر سے کہا اور ہانپتے ہوئے ٹیکسی اسٹینڈ چل دیا۔

ایسے میں ایک سیاہ رنگ کی بڑی قیمتی گاڑی وہاں آ کر رکی۔ جس سے ایک بزرگ برآمد ہوئے، پچھلی سیٹ پر شاید ان کے مریدین بیٹھے تھے، جو گاڑی رکتے ہی تیزی سے برآمد ہوئے اور فرنٹ پر موجود بزرگ ہستی کے لیے گاڑی کی کھڑکی کھولی وہاں موجود تمام لوگ اس بزرگ ہستی سے جھک کر بڑے ادب سے سلام کرنے لگے۔ ناصر نے بھی بابا جی کو مؤدبانہ آداب پیش کیا اور بے اختیار ان کے ہمراہ قبرستان کے اندر چل دیا۔ ان کا کوئی مرید انہیں یہاں لے کر آیا تھا، جس کا کوئی عزیز یہاں دفن تھا اور اس کی قبر پر فاتحہ خوانی کرنا تھی۔ ناصر تمام عرصہ ان کے ساتھ رہا، مطلوبہ قبر پر فاتحہ کے بعد پھول رکھے گئے، پھر سارے قبرستان والوں کی بخشش کے لیے دعا کی گئی۔

جب وہ لوگ واپس پلٹنے لگے تو ناصر نے آگے بڑھ کر بابا جی سے بڑی عاجزی کے ساتھ درخواست پیش کی کہ حضور میری جواں سال بہن ہے، کل سے اس پر کسی آسیب کا سایا آ پڑا ہے اور اس وقت وہ سامنے قبرستان میں بیٹھی ہے۔ ہم سب گھر والے رات سے پریشان ہیں، بابا جی خدا کے لیے کوئی دم کر دیجیے، میری بہن ٹھیک ہو جائے۔" ناصر کی فریاد سن کر بابا جی نے فرمایا۔

"ہاں ایسا کرو کہ کسی بوتل وغیرہ میں پانی لے آؤ، میں دم کر دیتا ہوں، اس کے چہرے پر چھڑک دینا۔" آسیب جاتا رہے گا، پھر اسے ہمارے آستانے پر لے آنا، کل تو نہیں، پرسوں آ جانا، کیوں کہ کل تو ہم آپ کو نہیں ملیں گے۔" انشاء اللہ آپ کی بہن ٹھیک ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ہے بابا حضور" ناصر نے سعادت مندی سے کہا۔ اور گیٹ پر پہنچ کر پانی کی بوتل پر دم کرایا۔

"بابا جی چلے گئے اور اسی عرصے میں ساحر گاڑی لیے وہاں آ پہنچا۔

ناصر نے اسے بتایا کہ یہاں تمہارے بعد ایک بابا جی نزدیکی درگاہ سے آئے تھے، میں نے اصل کے لیے پانی دم کرایا ہے۔ دیکھ لینا اب اصل ضرور ٹھیک ہو جائے گی، بابا جی نے کہہ دیا ہے کہ اب وہ ہوش میں آ جائے گی پرسوں اسے دوبارہ ہمارے پاس لے آنا، انشاء اللہ وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔"

ساحر بھی اس کی بات سن کر بہت خوش ہوا۔ اب وہ دونوں ایک ساتھ تیزی سے ادھر بڑھ رہے تھے۔ جہاں کچھ دیر پہلے ناصر اصل کو چھوڑ کر آیا تھا، پھر وہ انہیں دور سے ہی وہاں بیٹھی ہوئی دکھائی دینے لگی۔ ان کی طرف اس کی پشت تھی، اس کے قریب جانے سے ان کے دل بھی دہل رہے تھے، دو قبروں کا فاصلہ چھوڑ کر وہ رکے، بے بسی

سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر ساحر کے دماغ میں ایک خیال بجلی بن کر کوندا۔ اس نے ناصر سے پانی کی بوتل پکڑ کر اس کا ڈھکن اتارا اور آہستگی سے آگے بڑھ کر زور سے پانی اجل کی پشت پر اچھال دیا اور ساتھ ہی تیزی سے پیچھے پلٹا، مگر اس ہڑبڑاہٹ میں پلٹتے ہوئے وہ گر گیا۔ وہ دردسے کرلیا اور سنبھل کر تیزی سے اُٹھا۔

ادھر پانی کا کچھ حصہ اجل کی پشت پر جیسے ہی گرا، اس نے چونک کر گردن گھمائی، اُف۔ اس کے ہونٹ اس کی ٹھوڑی اور منہ کا پورا حصہ تازہ تازہ خون سے سرخ ہو رہا تھا اور خون کے قطرے ٹھوڑی سے نیچے ٹپک رہے تھے۔ بائیں کلائی سے قمیص کا بازو والا حصہ پھٹ کر نیچے لٹک رہا تھا اور کلائی کی بڑی شریان سے ایسے لہو ٹپک رہا تھا جیسے اسے تیز دھار آلے سے کاٹ دیا گیا ہو۔ جب اجل نے گردن گھما کر پیچھے جھانکا تھا، تب اس کے لبوں سے درد بھری چند آہیں نکلی تھیں اور وہ کمر کے بل پیچھے گھر کر بے سدھ ہوگئی تھی، اس کے بائیں ہاتھ کا پنجہ دائیں ہاتھ کی گرفت میں تھا۔

ناصر اور ساحر چند ثانیے یہ دلخراش منظر دیکھتے رہے پھر ساحر نے ہمت کی اور ذرا قریب پہنچ کر بوتل کا پانی اجل کے چہرے اور جسم پر اُچھال دیا۔ اجل کے کراہنے کی آواز اس کے نتھنوں سے برآمد ہو رہی تھی۔

"لگتا ہے پانی نے کام کر دکھایا۔" ساحر نے خوشی بھرے لہجے میں کہا تو ناصر کو بھی حوصلہ ہوا۔ وہ دونوں ایک ساتھ آگے بڑھے۔

اجل کا بازو زخمی ہو چکا تھا اور کلائی پر دانتوں کے نشان واضح تھے۔

"اوہو۔ یہ تو اجل کا خون پی رہی تھی۔" یہ بات جلد ہی اُن کی سمجھ میں آ گئی، پھٹی ہوئی قمیص کا بازو والا حصہ پھاڑ کر کلائی پر پٹی باندھی گئی، اجل پلکیں موندے نڈھال سی پڑی اونگھ رہی تھی، دونوں نے اسے اٹھا کر اس کا ایک ایک بازو اپنے کندھے پر لیا اور کمر میں ہاتھ ڈال کر چلنے لگے۔ وہ چلتے ہوئے قدم کو اٹھا رہی تھی، مگر ان پر وزن نہیں ڈال رہی تھی۔

"میں اسے کندھے پر اٹھاتا ہوں۔" ساحر نے کہا اور جھک کر اجل کو کندھے پر لاد لیا۔ گیٹ تک آتے آتے وہ ہانپ سا گیا، پھر ناصر نے اسے سہارا دیا اور اجل کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹانے میں مدد کی، پانی کی بوتل ساتھ لے لی گئی، اپنی بائیک وہ ایک دوست کے پاس چھوڑ آیا تھا۔

"تم اجل کے پاس پیچھے بیٹھ جاؤ۔" ساحر نے اجل کے بھائی ناصر سے کہا۔

"نہیں یار تم ادھر بیٹھو میں فرنٹ پہ بیٹھوں گا۔" ناصر کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ اجل سے خوف زدہ ہے، نہ جانے کس لمحے کیا ہو جائے۔ خوف تو ساحر کے دل میں بھی تھا، مگر اجل کی محبت اسے ہر خوف سے بے خوف کر رہی تھی، لہٰذا اس نے پچھلی سیٹ پر اجل کا سر اپنی گود میں رکھا۔ اس کا خون آلود چہرہ کپڑے سے صاف کیا، گاڑی نے سفر کا آغاز کیا اور ساحر اجل کے الجھے ہوئے ریشمی بالوں کو سنوار کر اس کی معصوم سی صورت میں کھویا رہا۔

☆......☆

شاہ صاحب کے پاس جانے کے لیے انہیں نہر کی پٹڑی پر سفر کرنا تھا اور یہ بھی نہر تھی، جس پر سفر کرتے ہوئے اجل اور ساحر کو اس آفت سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے سفر کر رہا تھا۔ اب وہ جگہ قریب آ رہی تھی جہاں قبرستان تھا اور ساحر نے اپنی آنکھوں سے چڑیل کو دیکھا تھا۔ اس کے بدن میں ایک جھرجھری سی ابھری جو کمر کی ہڈی میں سرایت کر گئی۔

پھر جیسے ہی قبرستان کی حد شروع ہوئی، ساحر کی نگاہیں شیشے کے اس پار قبرستان میں کھوئی گئیں۔ اجل کا سر اس کی گود میں تھا اور بایاں بازو اس کے کندھے پر رکھا تھا، مگر اس لمحے ساحر اس قدر قبرستان کی طرف متوجہ ہو چکا تھا کہ اسے خبر ہی نہ ہوئی کہ کب اجل کے اندر سمائی اس غیبی قوت نے اس کا بازو پکڑا، ساحر تو اس لمحے درد سے بلبلا کر چونکا۔ جب اس کی کلائی سے قمیص پھاڑ کر اجل نے اپنے دانت تیز دھار خنجر کی طرح اس کی کلائی میں پیوست کر دیے اور اس کی خون والی موٹی شریان کاٹ کر گرم گرم لہو کو پینے لگی۔ ساحر کا بازو اس نے اتنی قوت سے دبوچ رکھا تھا کہ ساحر کو ہاتھ چھڑانا مشکل ہو گیا۔ اجل سیٹ سے نیچے گر کر سجدے کی حالت میں ساحر کے بازو پر جھکی تھی، ساحر درد کی شدت سے چلا رہا

تھا۔اس اچانک افتاد پر ناصر اور ڈرائیور بیک وقت متوجہ ہوئے اور زوردار بریک لگا کر گاڑی کو روکا گیا۔ ناصر کے تو ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ ڈرائیور نے ہمت کی اور اصل کی گرفت سے ساحر کا ہاتھ چھڑانے میں بھرپور تگ و دو کی، مگر اس کا ہر حربہ ناکام رہا۔ ساحر کے چہرے پر پسینے کے قطرے بوندوں کی طرح ٹپک رہے تھے اور وہ نہایت تکلیف محسوس کرتے ہوئے اچھل کود بھی کر رہا تھا اور خود کو اصل کی گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔

ڈرائیور نے اپنی سی کوشش کر کے دیکھ لیا، پھر اس نے اصل کی دونوں ہاتھوں سے گردن دبوچ لی اور پوری قوت سے اس کے گلے پر شکنجہ ڈال دیا۔ تب اصل نے ساحر کا بازو چھوڑا اور دم گھٹنے کے انداز میں کھانستے ہوئے خوفناک آواز میں ناک سے سانسیں نکالنے لگی۔ ساحر نے بھی اپنا ہاتھ آزاد ہوتے ہی اپنی زخمی کلائی کو دوسرے ہاتھ کے پنجے میں دبوچا، خون ابھی تک کلائی سے رستے ہوئے ان کے کپڑے رنگین کر رہا تھا، ڈرائیور نے اصل کی گردن پر گرفت ڈھیلی کی تو اصل نے تیزی سے کروٹ بدلی اور ڈرائیور کے چہرے پر چانٹا رسید کر دیا۔ ڈرائیور کھلی کھڑکی سے اُچھل کر باہر نکلا، دوسری کھڑکی سے ساحر بھی نہایت عجلت میں برآمد ہوا، پھر دونوں کھڑکیاں بند کر دی گئیں۔ ساحر پر بے حد نقاہت چھا رہی تھی۔ وہ ذرا پرے قدموں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔ ناصر حواس باختہ ہو کر کبھی ساحر کو دیر یج دیتا کبھی گاڑی کے اندر جھانک کر اصل کی طرف دیکھتا۔

اچانک زور کا دھماکہ ہوا اور گاڑی کی کھڑکی پوری کی پوری باڈی سے الگ ہو کر اچھلتی ہوئی شہر کی پٹڑی پر جا گری، شیشے کے ذرات ہر سو بکھر گئے۔ اصل گاڑی سے برآمد ہوئی اور گردن تھوڑی سے لگائے آگے بڑھی۔ وہ تینوں خوف سے بھاگتے ہوئے پٹڑی سے نیچے کود گئے۔ ناصر کا پاؤں پھسلا اور وہ گر کر لڑکھڑاتا ہوا دس فٹ کی ڈھلوان سے نیچے جا گرا۔ ساحر بھی اپنا زخمی بازو ہاتھ میں پکڑے ڈگمگاتا ہوا بمشکل پٹڑی سے نیچے پہنچا اور ڈرائیور نہر کے پانی والے حصے کی طرف بھاگا اور پھر کنارے پر گھاس والے حصے پر دور تک بھاگتا چلا گیا۔

اصل نے گاڑی سے اُتر کر چند قدم تک کا فاصلہ مغرب کی سمت طے کیا، پھر پٹڑی سے نیچے اُتر کر سڑک پار کرتے ہی قبرستان میں داخل ہو گئی، اب وہ تینوں گاڑی کے پاس پہنچ کر نہایت بے بسی کی حالت میں اصل کو دیکھ رہے تھے جو گردن جھکائے بند آنکھوں سے قبرستان کے بیچ جنوب مشرقی حصے کی طرف جا رہی تھی۔ جہاں اس روز ساحر اور توبے نے چڑیل کو دیکھا تھا۔ قبرستان کے اس حصے میں گھنے درختوں کا جھنڈ تھا۔ وہ بہت مدہم رفتار سے چلتی ہوئی اس گھنے جھنڈ میں جا کر سب کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

”اب ہمیں اس کا تعاقب کرنے کی حماقت نہیں کرنا چاہیے، بلکہ شاہ صاحب کو یہاں لایا جائے، وہ خود ہی اصل کو آزاد کرا سکتے ہیں، کیوں کہ اب یہ اپنے مسکن پر آ پہنچی ہے اور یہاں سے اصل کو آزاد کرانا کسی اور کے بس کی بات نہیں۔“ ساحر نے کہا۔

”ہاں ہاں تمہارا بازو بھی کافی زخمی ہے اس پر فوراً مرہم پٹی ہونا چاہیے۔“ ناصر نے اس کے خیال کی تائید کی۔ گاڑی کو اسٹارٹ کیا گیا۔ اس کے انجن سے ایسی آواز اُبھری جیسے پنکھے کا پر کسی حصے سے رگڑ کھا کر آواز دے رہا ہو۔ بونٹ کھول کر دیکھا تو ایک پر ترچھا سا ہو رہا تھا۔ اسے ہاتھ سے ہی سیدھا کیا گیا۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور تیزی سے بھاگنے لگی، تب ساحر نے کہا۔

”ناصر بھائی ہم اصل کو یہاں تنہا چھوڑ کر حماقت کا مظاہرہ کر کے جا رہے ہیں، ہم میں سے کسی ایک کو یہاں رہنا چاہیے تھا، جو شاہ صاحب کے آنے تک اصل کی نگرانی رکھتا۔“

”کچھ نہیں ہوتا یار، اب وہ اپنے ٹھکانے پر لے آئی ہے۔ یہاں سے اور وہ کہاں جائے گی۔ تم حوصلہ رکھو، ہم جلد ہی واپس آ جائیں گے۔ تم زخمی ہو اور میں کسی صورت یہاں اکیلا قبرستان میں نہیں ٹھہر سکتا۔ تم نہیں جانتے میری کیا حالت ہو رہی ہے۔“ ناصر نے اسے خاموش کر دیا، مگر ساحر بس پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

پانچ میل کا سفر طے کیا، تو ایک پل پر سے پختہ سڑک گزرتی تھی اور یہاں بس اسٹاپ اور چند دکانیں بھی موجود تھیں۔ ایک چھوٹا سا میڈیکل اسٹور بھی تھا، جہاں سے ساحر کے بازو پر پٹی کرائی گئی اور اسے انجکشن دیا گیا۔

پھر وہ سیدھے شاہ صاحب کے ڈیرے پر پہنچے۔
کافی لوگ وہاں جمع تھے، مگر پتا چلا کہ شاہ صاحب شہر تک گئے ہیں، جہاں سے شام کو لوٹ کر آئیں گے۔
یہ جان کر ناصر اور ساحر کے چہرے بجھ سے گئے۔
ابھی دوپہر کا وقت تھا۔ کب شام ہوگی، کب وہ آئیں گے۔
"وہ شہر میں کہاں ملیں گے۔ ہم ان سے فوری ملنا چاہتے ہیں۔ ہمارا ایک آسیبی مریض سخت تکلیف میں ہے۔" ساحر نے شاہ صاحب کے ڈیرے پر موجود نگراں منشی جی سے پوچھا۔
"ان کو دو تین سرکاری دفاتر میں جانا ہے، پھر اپنے ایک مرید کے پاس کچھ وقت کے لیے ٹھہریں گے، فورٹ ایریا میں نئی کالونی ہے جہاں امتیاز صاحب کا گھر ہے۔"
"ٹھیک ہے ہمارا اپنا شہر ہے ہم ڈھونڈ لیں گے۔"
وہ فوراً واپس پلٹے۔
پچھلی کھڑکی کے بغیر گاڑی کو ہر نگاہ تجسس سے دیکھتی اور کئی تمسخر اڑانے لگتے۔
واپسی پر جب اس جگہ پہنچے جہاں امتل گاڑی سے اُتر کر گئی تھی، تو ساحر نے کہا کہ آپ مجھے یہاں اُتار دیں اور خود شاہ صاحب کو لینے جائیں۔
ناصر نے چند ثانیے کچھ سوچا، پھر ساحر کو اُتر جانے کا اشارہ دیا۔ ساحر اُترا، گاڑی ہلکے ہلکے دھول کے بادل اڑاتی آگے بڑھ گئی اور ساحر قبرستان میں داخل ہو کر ادھر بڑھنے لگا، جہاں درگاہ شریف تھی اور اس دن اس نے قوبے کو یہاں سے اپنے ساتھ ملایا تھا۔
قبرستان میں ہر سو ویرانی اور گہرا سناٹا چھایا تھا۔ وہ بار بار ادھر گھنے جھنڈ کی طرف دیکھتا، مگر وہاں بھی گہری ویرانی اور سناٹے کا راج دکھائی دیا۔ امتل کا کہیں نام تک نہ تھا۔
قوبے نے ساحر کو دور سے ہی پہچان لیا اور بھاگ کر اس کے پاس آیا۔
"بابو جی آپ اپنی بیوی کو یہاں اکیلا چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے، وہ بیچاری اکیلی زخمی حالت میں نڈھال سی اس گھنے جھنڈ کے پرلے کنارے پر ایک پیڑ کے نیچے ہمیں ملی۔ پہلے تو ہم ڈر گئے کہ وہ چڑیل ہے، مگر میں نے اسے پہچان لیا کہ یہ تو وہی لڑکی ہے جو اس روز آپ کے ساتھ سفر کر رہی تھی۔ آپ کی بائیک پنکچر ہو گئی تھی اور میں نے اسے آپ کے ساتھ دوسری بائیک پر سوار کرایا تھا۔"
"اور امتل کہاں ہے؟" ساحر نے چونک کر بے تابی سے پوچھا۔
"ہمارے پاس ہے گھبراؤ نہیں۔ ہم نے اس پر درگاہ کا دم کیا ہوا پانی چھڑکا ہے۔ وہ ہوش میں آ گئی ہے، ہم سے پانی اور کھانے کو مانگا، مگر ابھی وہ ہمیں کچھ بتا نہیں رہی کہ وہ یہاں کیسے پہنچی۔ کوئی گاڑی آئی تھی، جو قبر پر کھڑی رہی، ایک دھماکے کی آواز بھی آئی تھی۔"
قوبا اسے تفصیل بتا رہا تھا اور ساحر تیز قدموں سے اس کی جھونپڑی کی طرف بڑھ رہا تھا، جہاں امتل کی موجودگی کا اسے اشارے سے قوبے نے بتایا تھا، وہ اندر پہنچا امتل سامنے چارپائی پر بے سدھ اور نیم بے ہوشی کی حالت میں موجود تھی اور دو عورتیں اس کے پاس کھڑی تھیں۔
"امتل۔" ساحر نے دیوانہ وار کہا اور اس کے پاس جا پہنچا۔
"لو بھئی تمہارے وارث آ پہنچے۔" ادھیڑ عمر عورت نے امتل کو متوجہ کیا۔
تب امتل نے دھیرے سے پلکیں کھولیں اور ساحر کو بغور دیکھا تو شدید درد سے اس کی آنکھیں اشکوں سے بھر آئیں اور اشک گالوں کو بھگو گئے۔
"ساحر تم آ گئے۔" اس نے کرب بھری آواز میں پوچھا۔
"ہاں امتل میں آ گیا ہوں۔" ساحر نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے تھپتھپائے، ساحر بھی آبدیدہ سا ہو گیا۔ "تم ٹھیک ہو نا، تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہو رہی، تمہیں کیا محسوس ہو رہا ہے۔" ساحر پوچھ رہا تھا۔
"میرا سارا بدن پھوڑے کی طرح دکھ رہا ہے۔ یہ ہم کہاں ہیں، امی، ابو اور بھیا کہاں ہیں۔ مجھے بہت جلن اور عجیب سا درد ہو رہا ہے۔ میں آرام کرنا چاہتی ہوں، تم مجھے گھر لے چلو۔ یہاں مجھے گھٹن ہو رہی ہے۔"
"حوصلہ رکھو امتل، ہم ابھی گھر چلتے ہیں۔ ناصر بھائی گاڑی لینے گئے ہیں، ابھی آتے ہوں گے۔"
"تمہیں بھوک لگ رہی ہے تو بتاؤ۔" ساحر اُسے بہلاتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔
"میرے گلے اور رگوں میں کچے خون کا ذائقہ بھرا

ہے بار بار ابکائی آ رہی ہے۔"

"اچھا۔ میں پانی لاتا ہوں۔ تم غرارہ کرلو، منہ ہاتھ دھولو۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔" ساحر نے کہا۔ اور پانی کی بالٹی لا کر اسے برائے نام غسل خانے کے پردے میں جانے کو کہا۔ اجل ساحر کے کندھے کا سہارا لے کر غسل خانے میں گئی اور ذرا دیر بعد چہرہ دھو کر بال سنوار کر رِبن میں باندھے برآمد ہوئی۔ اس عرصے میں ساحر نے توبے کو نہر پر کسی گاڑی کے آنے کی نگرانی پر معمور کردیا تھا۔

کوئی دو گھنٹے بعد ناصر ایک نئی ٹیکسی میں شاہ صاحب کو لیے وہاں پہنچا۔ توبے نے وہاں پہنچ کر ان کو اجل اور ناصر کے بارے میں اطلاع دی کہ وہ ہمارے پاس درگاہ پر موجود ہیں۔ اجل ہوش میں آ چکی ہے۔

ناصر شاہ صاحب کو لیے وہاں پہنچا...... اجل اندر جھونپڑی میں چارپائی پر لیٹی تھی۔

شاہ صاحب کو اجل کی چارپائی کے قریب موہڑا ڈال کر دیا گیا۔ پھر شاہ صاحب اجل کو سیدھا لٹا کر اپنا دایاں ہاتھ اس کے وجود پر چھتری کی طرح تان کر کچھ پڑھا تو اجل کے پورے وجود میں ایک زوردار انگڑائی نمودار ہوئی اور وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ غیبی قوت اس میں حاضر ہوگئی۔

"کون ہے تُو؟ اور کیوں اس معصوم سی لڑکی کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے؟" شاہ صاحب نے حاکمانہ انداز میں پوچھا۔ ناصر، ساحر، توبہ بھی پاس کھڑے تھے۔ عورتیں اور بچے باہر بھیج دیے گئے۔

اجل پاؤں سمیٹ کر سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔

"میں پوچھتا ہوں۔ کون ہے تو؟ بولتی کیوں نہیں ہو۔" شاہ صاحب نے زور دے کر پوچھا تب اجل نے سر اٹھایا اور روزنی سی آواز میں بولنے لگی۔

"میں کوریہ ہوں۔ اسی قبرستان میں رہتی ہوں، یہ تپتی دوپہر میں خود چل کر میری حد میں آ کر تنہا بیٹھی تھی۔ مجھے اچھی لگی اور میں نے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔"

"بکواس کرتی ہو تم۔ وہ تو نہر کی پٹڑی پر بیٹھی تھی۔ وہ قبرستان میں تو نہیں آئی تھی اور پھر وہ ایک انسان ہے، تم ایک آسیبی قوت ہو۔ تمہارا اس سے کیا میل جول ہے؟"

شاہ صاحب نے تکرار کرتے ہوئے پوچھا تو وہ پھر خاموش ہوگئی۔

"بولو جواب دو کوریہ؟ کیوں اتنی تکلیفیں دیں تم نے اسے۔ تم نے اس کا لہو پیا، سب گھر والوں کو خوف زدہ کر کے پریشان کیا۔ کیوں کیا یہ سب تم نے، آخر کیوں؟"

"بس یہ مجھے اچھی لگی ہے، میں اسے چھوڑنا نہیں چاہتی۔" اجل کی زبانی کوریہ نے جواب دیا۔

"کیسے نہیں چھوڑو گی تم۔ زندہ رہو گی تو نہیں چھوڑو گی نا اسے۔ میں تمہیں خاکستر کردوں گا۔"

"نہیں۔ تم مجھے نہیں مارو گے بابا جی۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ اب میں اسے کوئی تکلیف نہیں دوں گی۔" کوریہ نے کہا تو شاہ صاحب جلال میں آ گئے اور کھڑے ہو کر اس کے سر پر ہتھیلی کا سایا کیا۔

تب وہ زور سے چیخی اور ہاتھوں کے بل زمیں پر جھکی اور شاہ صاحب کے پاؤں پکڑ لیے۔

"میں چلی جاتی ہوں۔ ایشور کے لیے مجھے جلاؤ مت، مجھے معاف کردو۔

شاہ صاحب نے جھک کر اس کے دونوں شانے مضبوطی سے پکڑے اور اوپر اٹھایا تو یہ دیکھ کر وہاں موجود سبھی کی چیخیں نکل گئیں کہ اجل کی زبان اس کی ٹھوڑی سے نیچے تک لٹک آئی ہے اور سانپ کی طرح اِدھر اُدھر لہرا رہی ہے۔ پھٹی پھٹی آنکھیں سفیدی میں بدل چکی تھیں۔ شاہ صاحب نے زوردار جھٹکے سے اجل کے وجود کو چارپائی پر پٹخا۔ وہ چارپائی پر چت ہو کر گری۔ شاہ صاحب نے پھر اس پر ہتھیلی تانی، تو وہ چلّانے کے انداز میں بڑبڑانے لگی۔

"میں جارہی ہوں۔ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ میں پھر کبھی نہیں آؤں گی۔" اجل کا سارا وجود کلبلاتے ہوئے نہایت اذیت سے گزر رہا تھا۔ شاہ صاحب بدستور اس پر ہاتھ تانے کچھ پڑھتے رہے۔ وہ لحات بڑے جاں گسل تھے اور سب پر قیامت بن کر گزر رہے تھے، پھر دھیرے دھیرے اس کی آواز بھی ڈوبتی چلی گئی اور سارا جسم بھی ساکن ہوتا چلا گیا۔ زبان اپنی اصل حالت میں لوٹ گئی اور پلکیں موند گئیں، پھر سارا بدن ساکت ہوگیا۔ تب اجل نے دھیرے سے پلکیں کھولیں، اپنے اردگرد کا جائزہ لیا اور جھینپ کر تیزی سے اُٹھ کر بیٹھی اپنی چادر کو سمیٹ کر سر پر اوڑھنے لگی۔ سب نے

اسے ہوش میں دیکھ کر سکھ کا سانس لیا۔ شاہ صاحب نے پانی دم کر کے اسے پلایا، ساحر نے ہی اسے پانی دیا۔

"اجل اب تم کیسی ہو؟" ساحر نے پوچھا۔ اجل نے گردن کو اقرار میں ہلکی سی جنبش دے کر دھیرے سے کہا۔

"ہاں۔ میں ٹھیک ہوں۔"

"اب یہ ٹھیک ہو گئی ہے، سارا معاملہ رفع دفع ہو گیا، پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" شاہ صاحب نے سب کو تسلی دی۔

"تب ہم اسے گھر لے جا سکتے ہیں۔" ناصر نے پوچھا۔

"ہاں۔ آپ اسے گھر لے جائیں، اب اسے کچھ نہیں ہوگا، لیکن زندگی بھر کے لیے ایک احتیاط کرنا ضروری ہوگا۔" شاہ صاحب نے کہا تو سب اچھل کر رہ گئے اور بڑے تجسس سے پوچھا۔

"وہ کیا ہے شاہ جی۔"

"میری بات غور سے سن لو۔ یہ جو کچھ بھی ہوا۔ آپ اسے یوں بھول جائیں کہ کبھی کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ اگر آپ میں سے یہاں موجود جو لوگ بھی ہیں، اس واقعے کا آپس میں ذکر کیا، یا کسی اور سے تذکرہ کیا تو پھر اجل کے ساتھ بھی کچھ ہو سکتا ہے اور اس ذکر کرنے والے کے ساتھ بھی کوئی آسیبی حادثہ گزر سکتا ہے۔" اجل کے گھر والے اور ہر وہ شخص جو اس واقعے کی بابت کچھ جان چکا ہے، وہ اس بات کا ذکر زبان تک بھی نہ لائے، یہ بات ہے مشکل مگر اس پر عمل کرنا آپ سب کے لیے بہتر ہوگا۔" شاہ صاحب نے بڑے پراسرار انداز میں کہا تو ایک انجانا سا خوف سب کے چہروں پر عیاں ہونے لگا۔

اجل سے دور رہ کر بھی نہیں؟ ساحر نے پوچھا۔

"آپ دنیا کے کسی کونے میں بھی اجل اور کوریہ کی بات کریں گے۔ تو آپ اس قوت کے نشانے پر ہوں گے اور ایسا کرنے سے جو معمولی سا حادثہ ذکر کرنے والے کے ساتھ پیش آئے گا، وہ یہ ہوگا کہ اس کی آنکھیں سفید ہو جائیں گی اور وہ زندگی بھر کسی کے سامنے کھلی آنکھوں سے بات نہیں کر سکے گا۔" شاہ صاحب نے کہا تو سب پر ایک برق سی گر گئی اور سب کے چہرے دہشت زدہ ہو گئے۔

"کیا وہ آنکھوں سے اندھا ہو جائے گا۔" ساحر نے ہمت کر کے پوچھ ڈالا۔

"نہیں وہ اندھا تو نہیں ہوگا، مگر اس کی سفید آنکھوں کی کوئی تاب نہیں لا سکے گا اور اس سے دور بھاگے گا، ایک انجانا سا خوف دیکھنے والوں پر اثر کرے گا کیوں کہ اس غیبی قوت کی آنے والی نسل بھی کوریہ کی بو پا کر جہاں جہاں سفید آنکھوں کا ذکر چھڑے گا، وہاں وہاں یہ اپنا انتقامی اثر ظاہر کریں گی۔ یہ بھی کچھ ضروری نہیں کہ ہر جگہ یہ اپنا اثر چھوڑ جائیں، پھر بھی احتیاط سے کام لینا ضروری ہوگا۔" شاہ صاحب کہہ رہے تھے اور ان کی یہ بات اجل بھی سن رہی تھی، مگر اس وقت اس کا ذہن پوری طرح بیدار نہ تھا۔ وہ غنودگی کی سی کیفیت میں بیٹھی تھی اور سب کچھ سن رہی تھی، پھر اسے گاڑی تک لایا گیا، وہ خود چل کر آئی۔

☆......☆

گھر پہنچ کر بھی شام تک کا وقت اس نے سو کر گزارا، مگر اگلے چند دنوں میں ہی اس کی صحت بحال ہونے لگی اور کوئی ناخوشگوار واقعہ بھی پیش نہ آیا۔ ساحر ہر روز اس کی تیمارداری کرنے آتا۔

ساحر نے اجل کی اس پراسرار بیماری اور خطرناک واقعات میں جس طرح اس کی نگہداشت اور ہر مقام پر مدد کی تھی۔ اجل کے گھر والے اس کے بہت شکرگزار تھے، پھر ساحر نے اپنی ماں کو اجل کا رشتہ مانگنے بھیجا جو کسی پس و پیش کے قبول کر لیا گیا، مگر شرط یہ رکھی گئی کہ اجل بی اے کا امتحان پاس کر لے، پھر رخصتی کریں گے، مگر چوں کہ شاہ

خلیل جبران نے کہا

☆ عورت درخت کے اس پتے کی مانند ہے جو ہوا کے لطیف جھونکے سے ہی ہل جاتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ ایسی چٹان ہے جو بڑے بڑے طوفانوں کے سامنے سینہ سپر ہو جاتی ہے۔

☆ تو شبنم کے قطرے پر غور کر تجھے سمندر کا راز معلوم ہو جائے گا۔

☆ کانٹوں سے ڈرنے والی انگلیاں، پھولوں کی نرمی محسوس نہیں کر سکتیں۔

مرسلہ: شرجیل اقدس۔ حیدرآباد

صاحب نے فرمایا تھا کہ اجالا کی جلد ہی شادی کردی جائے۔ اس بات کو ملحوظ رکھتے ہوئے مجبوراً فیصلہ کیا گیا کہ نکاح کی رسم ادا کردیتے ہیں، رخصتی بعد میں کریں گے۔ سب نے اس بات پر اکتفا کیا اور پندرہ دن بعد اجالا کا ساحر سے نکاح کردیا گیا، اجالا بھی بے حد خوش تھی۔ وہ ساحر کے دل و جان سے چاہتی تھی، ساحر بھی اسے پانے کے لیے ہر خطرے سے گزر چکا تھا۔

کوئی چھ ماہ بعد جب اجالا کے پیپرز ختم ہوگئے تو اسے سرخ جوڑے میں ساحر کے سنگ روانہ کردیا گیا۔ اس تمام عرصے میں اجالا کے ساتھ بظاہر تو کوئی حادثہ پیش نہ آیا، مگر کئی بار رات کو اسے اپنی چھاتی پر وزن سا محسوس ہوتا یا پھر کچھ دیر کے لیے وہ خاموش ہوجاتی۔ جو کچھ اس کے ساتھ بیت چکا تھا، کسی فرد نے ان واقعات کا ذکر تک نہ کیا تھا، بلکہ کوریہ کے تصور سے بھی کانپ سے جاتے تھے۔

پھر جب حجلۂ عروسی میں ساحر اجالا کا گھونگھٹ اٹھانے جارہا تھا تو اسے جانے کیوں اجالا کے روپ میں کوریہ بیٹھی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے سر کو جھٹک کر تیزی سے اس خیال کو دماغ سے نکال کر پرے پھینکنے کی کوشش کی اور عین اسی لمحے اجالا کے دماغ میں یہ خیال تیزی سے ابھر رہا تھا کہ آج میں ساحر سے پوچھوں گی کہ جب میں اس آسیبی قوت کے ہاتھوں میں تھی، تو میری کیا کیفیت ہوئی تھی، ساتھ میں پیر صاحب کی ہدایت بھی اسے روک رہی تھی کہ اس بات کو خیال میں بھی نہیں آنے دینا۔ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ بیک وقت خوف، تجسس اور وصال کے لمحوں سے آشنا ہونے کی کیفیت سے گزر رہے تھے، پھر جب ساحر نے اجالا کا گھونگھٹ اُٹھایا۔ اجالا نے شرماتے اور مسکراتے انداز میں اپنی لمبی جھالر سی پلکیں اُٹھائیں تو ساحر پر آسمانی بجلی سی گر گئی، کیوں کہ اجالا اپنی سفید آنکھیں کھولے اسے دیکھ رہی تھی۔ ساحر اُچھل کر رہ گیا، اس نے اپنی اضطرابی کیفیت کو سنبھالتے ہوئے اجالا سے پوچھا۔

''اسامہ اجالا آپ مجھے دیکھ رہی ہیں؟''

''ہاں ساحر جی، مگر یہ بات آپ کیوں پوچھ رہے ہیں۔'' اجالا نے حیرت سے پوچھا۔ اس کی نارمل آواز سن کر ساحر نے خود کو سنبھالا۔ لمحے بھر میں اس پر قیامت ہی تو گزر گئی تھی، سہاگ کے وہ یادگار لمحے حادثاتی پل بن کر رہ گئے تھے پورے وجود میں تناؤ سا آگیا تھا، مگر وہ اس بات کا ذکر تک نہیں کرسکتا تھا۔ اُف کس قدر مجبور اور بے بس ہو کر رہ گیا تھا وہ، پھر بھی اس نے اپنے حواس اپنی گرفت میں رکھتے ہوئے اجالا کو بڑھ کر کندھے سے لگالیا۔

صبح آئینہ دیکھتے ہوئے اجالا نے جب عکس آئینہ میں خود کو جھانکا تو دبی دبی سسکاریاں لیتے ہوئے اپنا چہرہ گھٹنوں میں چھپالیا...... پھر ساحر نے ہی اسے ڈھارس دی اور اسے یقین دلایا کہ تم میری زندگی ہو، تمہاری بصارت بظاہر تو کھو چکی ہے دیکھنے والے تجھے خوف اور تجسس بھری نظروں سے دیکھیں گے، مگر میں تمہیں کبھی اس کی کا احساس تک نہیں ہونے دوں گا۔ تم سیاہ چشمہ لگائے رکھنا جو تمہارے حسن کو اور بھی دوبالا رکھے گا۔''

ساحر نے مسکراتے ہوئے اجالا سے کہا تو اجالا کی ڈبڈبائی آنکھوں سے دو قطرے نیچے ڈھلکے اور مسکراتے لبوں کی رنگت کو اور نکھار گئے۔

☆......☆

پھر جب وہ امید سے ہوئی، الٹراساؤنڈ سے پتا چلا کہ جڑواں بچے ہیں، ڈلیوری آپریشن سے ہوگی، ساحر ہر ماہ پابندی سے اجالا کو چیک اپ کے لیے اسپیشل لیڈی ڈاکٹر فوزیہ کے پاس لے کر جاتا رہا، پھر وہ دن بھی آن پہنچا جس روز اجالا کا آپریشن تھا۔ اسے اسٹریچر پر ڈال آپریشن تھیٹر لے جایا گیا۔ ڈاکٹر فوزیہ نے آپریٹ کرنا تھا، ساحل اپنی والدہ اور سسر کے ساتھ برآمدے میں بے چینی سے آپریشن تھیٹر کے دروازہ کھلنے کا انتظار کررہا تھا۔ پندرہ، بیس، تیس اور پینتیس منٹ گزر گئے۔ انتظار کا ایک ایک لمحہ اذیت ناک کیفیت میں گزر رہا تھا۔

پھر دروازہ کھلا پہلے نرس چہرے پر سبز نقاب ڈالے برآمد ہوئی پھر ڈاکٹر فوزیہ، ساحر بھاگ کر اندر جانے کو لپکا تو ڈاکٹر فوزیہ نے اسے روک لیا۔

''مسٹر ساحر۔ پلیز ادھر آیئے۔'' ساحر پریشانی کی حالت میں ڈاکٹر فوزیہ کے ساتھ اس کے آفس میں پہنچا۔

ڈاکٹر نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ساحر پر قیامت گزر رہی تھی۔

"جی ڈاکٹر صاحبہ پلیز جلدی بتایئے کیا ہوا۔ آپریشن ٹھیک ہو گیا نا؟"

"ہاں ہاں۔ ریلیکس مسٹر ساحر، جڑواں بچے پیدا ہوئے ہیں، مگر......؟"

"مگر کیا؟" ساحر کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"اصل کی حالت اچھی نہیں ہے، اسے انتہائی نگہداشت وارڈ میں پہنچا دیا گیا ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ بچوں کی شکل وصورت انسانوں جیسی نہیں ہے۔" ڈاکٹر فوزیہ نے رک رک کر بات مکمل کی۔

"کیہ۔ کک۔ کیا مطلب؟" ساحر کی سانس پھول رہی تھی۔

"آپ کی مسز کو آسیب وغیرہ کا مرض تو نہیں رہا؟" ڈاکٹر فوزیہ نے پوچھا۔

"نن۔ ن۔ نن نہیں تو۔؟" ساحر نے جھوٹ بولا۔

"میں نہیں مانتی کہ وہ آسیب کی مریضہ نہ رہی ہو، اس کی سفید آنکھیں اس سے جنم لینے والے بچے، جن کے چہرے بندر سے مشابہہ ہیں اور جسم پر بال ہیں، ناخن بھی انسانوں جیسے نہیں، ان دونوں بچوں کو آکسیجن دی جا رہی ہے۔ دعا کرو، مریضہ اور بچے جانبر ہو سکیں۔"

ڈاکٹر فوزیہ نے رجسٹر پر لکھتے ہوئے کہا تو ساحر کا دماغ چکرا سا گیا اور اسے سارا کمرہ گھومتا ہوا نظر آنے لگا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر کرسی پر گرتا چلا گیا۔ ڈاکٹر فوزیہ نے بیل دے کر باہر والے کو بلایا۔

اور پھر اسٹریچر پر بے ہوش ساحر کو ایمرجنسی وارڈ میں لے جایا جا رہا تھا۔

ڈاکٹر فوزیہ نے اپنا لکھنے کا کام مکمل کیا تو اسے اپنی آنکھوں میں چبھن سی ہونے لگی۔ اس نے بڑی احتیاط سے ٹشو پیپر آنکھوں پر رکھا کہ زور زور سے دبائیں، پھر آنکھیں جھپکاتے ہوئے سامنے دیکھا۔ ایسے میں نرس انہیں بلانے آئی۔ ڈاکٹر فوزیہ نے اسٹیتھسکوپ سنبھالا اور نرس سے کہا۔ "ذرا میری آنکھوں میں دیکھو، یہ سرخ تو نہیں ہو گئیں، مجھے چبھن ہو رہی ہے۔"

نرس نے قریب پہنچ کر فوزیہ کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ اپنے دونوں ہاتھ چھاتی سے لگائے چیخ پڑی اور کانپنے لگی

"کیا ہوا سسٹر۔" ڈاکٹر فوزیہ نے حیرت سے پوچھا۔

"ڈ۔ ڈ۔ ڈاکٹر صاحبہ آپ کی آنکھیں سفید ہو چکی ہیں، تمہاری بینائی جاتی رہی ہے۔"

"کیا بکواس کر رہی ہو تم۔ میں دیکھ رہی ہوں سب کچھ اور تم کہہ رہی ہو میری بینائی چلی گئی۔ میں تو سب کچھ دیکھ رہی ہوں۔"

"نن۔ نن نہیں ڈاکٹر صاحبہ، کسی سے بھی پوچھ لو، تمہاری آنکھیں سفید ہو چکی ہیں۔"

اور پھر اُسے یقین کر لینا پڑا کہ اس کی آنکھیں سفید ہو چکی ہیں۔

☆......☆

شام کو ہسپتال سے جو ایمبولینس نکل رہی تھی۔ اس سے اصل کی ڈیڈ باڈی، دو معصوم بندر نما بچوں کے لاشے سفید چادر سے ڈھکے تھے۔ ایمرجنسی وارڈ میں ساحر غنودگی کی حالت میں پڑا تھا۔ ڈرپ کے قطرے اسے نئی توانائی دے رہے تھے اور ڈاکٹر فوزیہ آنکھوں کے اسپیشلسٹ ڈاکٹر سے چیک اپ کے بعد پوچھ رہی تھی۔

"کیا میری ظاہری بینائی واپس لوٹ آئے گی۔"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا ڈاکٹر فوزیہ، کیوں کہ ایسا کیس میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا کہ سفید آنکھیں بھی دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ یہ تو کوئی آسیبی قوت کی علامت ہے، لگتا جس مریضہ کا آج تم نے آپریٹ کیا ہے وہ آسیب زدہ ہو۔"

"ہاں ہاں یاد آیا وہ آسیب زدہ تھی، اس کی آنکھیں سفید تھیں۔" ڈاکٹر فوزیہ نے بتایا۔

"تو بس پھر اسی قوت نے اب تمہیں اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔" ڈاکٹر احسان نے ڈاکٹر فوزیہ سے کہا تو فوزیہ شدت غم سے سر تھام کر چیخ پڑی اور کرسی پر بے ہوش ہو کر لڑھک گئی......اور ڈاکٹر احسان بار بار اپنی آنکھوں کو مسل رہے تھے، کیوں کہ ڈاکٹر احسان کی بھی دونوں آنکھیں سفید ہو چکی تھیں۔

☆......☆

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خُدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خُدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو ان وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہرحال محدود ہے۔ ان ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ ان صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کردیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات تو کین منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اس رقم میں اضافہ کرسکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)......مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو مخفا فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)......منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3)......اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' 110، آدم آرکیڈ، شہید ملت روڈ۔ کراچی

□ ہما علیم۔ کراچی

○ انتہائی محترم بابا جی! اللہ پاک سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دراز کرے اور آپ ہماری پریشانیوں کا مداوا کرتے رہیں۔ بابا جی میں اس سے پہلے بھی آپ کو خط لکھ چکی ہوں۔ میں وہی ہوں جس کی شادی اپنی بڑی بہن کے دیور سے ہوئی شادی کے پہلے ہی ہفتے میرا زیور اور سامان بک گیا اور باقی سامان فرنیچر وغیرہ مالک مکان نے رکھ لیا، کیوں کہ ان سے بھی ان دونوں بھائیوں نے پیسے اُدھار لیے تھے اور کرایہ بھی نہیں دیا تھا اور میری بہن کا سامان بھی رکھ لیا تھا۔ پہلے خط میں آپ نے سورۂ واقعہ عشاء کے بعد بتائی، دوسرے خط کے جواب میں آپ نے سورۂ توبہ اور چڑیا کو دانہ پانی کا بتایا تھا۔ تیسرے اور چوتھے خط میں آپ نے کہا تھا مستقل مزاجی سے عمل کرو انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جی بابا جی بہت فرق پڑتا ہے لیکن پھر پتا نہیں ایسا کیا ہوتا ہے کہ سب کچھ پریشانیوں میں گھر جاتا ہے اور مجھ سے آپ کا بتایا ہوا عمل چھوٹ جاتا ہے۔ میرا حال صرف میرا اللہ ہی جانتا ہے میں پریشانیوں سے کبھی نہیں گھبرائی کوئی نہ کوئی حل نکال لیتی تھی لیکن اب تو پریشانیوں سے تنگ آ گئی ہوں، کیوں کہ انہوں نے اور میرے جیٹھ (جو بہنوئی بھی ہیں) دونوں نے مل کر لوگوں سے قرضہ لیا اور یہ لوگ دیکھیں بھی ادھر کی ادھر اور اُدھر کی اِدھر کرتے رہے ہیں یہ لوگ اِک دم ان چکروں میں گھر گئے، پھر پکوائی کے جو ایڈوانس لیے تھے۔ وہ بھی بہت سے لوگوں سے ایک ایک مہینے کے لے کر پنجاب بھاگ گئے کیوں کہ قرض دار پیچھے پڑ گئے تھے یعنی پرچون والے، گوشت والے، دیگیں والے۔ یہ لوگ جب یہاں سے گئے تو ان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ کرایہ بھی مانگ کر لے کر بھاگے تھے اور جانے سے پہلے ان دونوں کا سود بھی چلتا رہتا تھا مجھے لگتا ہے کہ کہ ہم خدا کی پکڑ سے ابھی تک نہیں نکلے ہیں۔ جب کوئی پریشانی ہوتی ہے جیسے کرایہ کے پیسے چڑھ جاتے ہیں تو یہ مجھے لے کر بھاگے بھاگے پھرتے ہیں رشتے داروں کے گھر کہ کہیں سے کچھ پیسے ہو جائیں تو اپنی پریشانی ختم ہو۔ ایسا بابا جی کوئی 6 یا 8 سال سے ہو رہا ہے اور اب تو رشتے دار تو کیا اپنے بہن بھائی بھی بہت برا مانتے ہیں۔ کوئی عزت نہیں کرتا نہ ہمارے گھر کوئی آتا جاتا ہے۔ میرے چھ بچے ہیں سب سے بڑی بیٹی 8 سال، پھر 7 سال کا بیٹا پھر 6 سال کا بیٹا پھر جڑواں بیٹیاں 2 سال کی اور سب سے چھوٹی بیٹی 9 مہینے کی ہے۔ بابا جی کچھ ایسی دعا بتائیں کہ اللہ ہمیں معاف کر دے اور ہم یہ مانگ تانگ چھوڑ دیں، بچوں نے اب اسکول جانا شروع کیا ہے تو فیس دو مہینے کی ہو گئی ہیں، تین بچے جا رہے ہیں اسکول، یعنی کرائے کی پریشانی، کام کی پریشانی اور اب جو گھر لیا ہے اس میں پانی نہیں۔ بابا جی موت کی دعا مانگتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے کہ بچوں کا کیا ہوگا۔ بابا جی ہمارے لیے خصوصی دعا کروائیں اور آپ بھی دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہم پر اپنی رحمت برسا دے، اپنا کرم کر دے اور ہمارے گناہوں کو معاف کر دے۔ بابا جی حساب بھی لگا کر بتایئے کہ یہ ہمارے گناہوں کی سزا ہی ہے نا یا کسی نے کچھ ایسا تو نہیں کروا دیا کیوں کہ دونوں بھائی عادتاً ایسے نہیں ہیں، یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کیا ہوا۔ بابا جی اس کا جواب آپ جولائی، اگست تک ضرور دیجیے گا اور آسان سا وظیفہ بھی بتایئے گا۔ بس بابا جی میں بہت تھک گئی ہوں اب......

دعاؤں کی طلب گار۔

☆ بیٹی ہما! تمہیں پابندی سے وظیفہ کرنا ہوگا اگر اس طرح ترک کرتی رہو گی تو حالات اچھے نہ ہوں گے۔ دل میں وہم مت لاؤ۔ کوئی جادو نہیں ہے بس غلط فیصلے ہیں۔ اللہ سب بہتر کرے گا مجھے ایک ماہ بعد حالات سے آگاہ کرو۔

□ نسیمہ۔ کراچی

☆ بیٹی نسیمہ! اللہ تمہیں اولاد کی خوشیاں دکھائے، یہ تو میری بھی خواہش ہوگی کہ تمہارا بیٹا واپس نہ آئے بلکہ وہیں بہت اچھے سے سیٹ ہو جائے۔ یقیناً امریکہ میں پاکستان سے بہت زیادہ مواقع ہیں پھر تمہارے گھر کا ماحول بھی بیٹے کے لیے مزید پریشانیاں ہی پیدا کرے گا۔ بہر حال تعویذ تم لے چکی ہو "سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم" کا بہت ورد کرو۔ خوب صدقہ خیرات کرو۔ بچوں کا نام لے کر اللہ کی راہ میں دیا کرو۔ چھوٹی بیٹی کے لیے کہوں گا کہ اس کے پیٹ کے لیے مجھ سے دوا منگوا لو، طریقہ کار سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے پوچھ سکتی ہو۔ انشاء اللہ مکمل شفا نصیب ہوگی۔ دیکھو بیٹی اگر پیٹ ٹھیک نہیں ہوگا تو

صحت کا درست ہونا ناممکن ہے اور پیٹ کا معاملہ ایسا ہوتا ہے کہ جتنا وقت گزرتا ہے تکلیف بڑھتی اور پرانی ہو جاتی ہے پھر علاج بھی بہت مشکل ہو جاتا ہے، اولاد کے سلسلے میں تمہاری بیٹی کو مجھ سے رابطہ کرنا چاہیے میں علاج جاری رکھنے کا مشورہ دوں گا۔ تمہاری خواہش پر تمہیں شمارے میں بھی جواب دے رہا ہوں، اور براہ راست بھی۔

□ ش۔م۔ کلر سیداں!

☆ بیٹی! تمہاری خواہش پر مسئلہ شائع نہیں کیا جا رہا۔ شریعت کی رو سے اگر تمہارا بہنوئی تمہاری بہن کو طلاق دے دے تب دوسری شادی کی جا سکتی ہے۔ شوہر جیل میں ہو تب شادی ختم نہیں ہوتی۔ میں تم لوگوں کو نصیحت کروں گا کہ معاملات اللہ کے سپرد کر دو۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ نماز عشاء کے بعد ایک بار سورۂ توبہ پڑھو اور دعا کرو۔ اس کے علاوہ ہر روز جمعہ ایک بار سورۂ یٰسین ترجمہ کے ساتھ پڑھو، مدت ایک ماہ ہے۔

□ شبانہ۔ کراچی

☆ بیٹی شبانہ! تم جانتی ہو میں صرف خط کے ذریعے جواب دیتا ہوں ادارہ بھی کہانیاں میرے خطوط جو تم لوگ لکھتے ہو مجھے بھجواتا ہے اور میرے جواب تم لوگوں تک۔ بس اس کے علاوہ رابطے کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔ میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ سورۂ واقعہ روز ترجمہ کے ساتھ پڑھو اور خوب دعائیں کرو ضرور کرم ہوگا۔

□ شاہ بی بی۔ میرپور خاص

☆ بیٹی! تم نے یہ خود محسوس کیا ہے کہ رقم آتی ہے مگر بے جا خرچ ہو جاتی ہے یعنی برکت نہیں ہے۔ عام طور سے ہم لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے گھبراتے ہیں یا اپنے تمام معاملات نمٹا کر پھر دیتے ہیں جو کہ غلط ہے اس بار ایسا کرنا کہ جیسے ہی رقم آئے اس میں سے کچھ حصہ الگ کر کے رکھ لینا اللہ کی راہ میں دینے کے لیے پھر تم خود محسوس کرو گی کہ مہینہ ختم ہو جائے گا مگر رقم نہیں، اس عمل کو ہمیشہ جاری رکھنا اور ہمیشہ جائز لوگوں کی مدد کرنا۔ ہمارے ارد گرد ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جو مانگ نہیں سکتے، خاموشی سے ان کی امداد کرنے والے کو بہت اجر ملتا ہے۔ نماز فجر کے بعد ایک بار سورۂ رحمٰن ترجمہ کے ساتھ ضرور پڑھو، مدت ایک ماہ ہے۔

□ یاسمین۔ حیدر آباد

☆ بیٹی یاسمین! تمہیں بھی وہی نصیحت کروں گا جو شاہ بی بی میرپور خاص کو کی ہے۔ تمہارے حالات بھی کم و بیش ویسے ہی ہیں۔ اولاد کی نافرمانی، لڑائی جھگڑے، مقدمے بازیاں، رزق میں تنگی یہ سب وہاں ہوتا ہے جہاں جائز ضرورت مندوں کی مدد نہیں کی جاتی۔ بڑے بڑے اداروں کو تو رقم کی ترسیل بڑے پیمانے پر ہوتی ہے مگر سفید پوش لوگ ہاتھ پھیلا کر یا چہرہ دکھا کر نہیں مانگ سکتے لہٰذا جو چپکے سے ان کی مدد کرتا ہے اللہ بھی بڑی آسانی سے تمام مشکلات دور فرماتا ہے۔ تمہارے آس پاس اگر ایسے لوگ نہ ہوں تو میرے ذریعے بھی مدد کر سکتی ہو۔ نماز کی پابند رہو بہت خوش نصیبی کی بات ہے، جو پڑھ رہی ہو جاری رکھو بس "یا غنی یا مغنی" کا بہت ورد کیا کرو کرم ہوگا۔

□ علیشہ۔ خان پور کٹورا

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! بابا جی! میں بہت پریشان ہوں، میرے سسرال والوں نے مجھے بہت زیادہ پریشان کیا ہوا ہے۔ بابا جی! میں نے اس سے پہلے اپنی امی کے لیے آپ سے وظیفہ لیا تھا۔ میرا اس دنیا میں سوائے ماں کے کوئی نہیں۔ میری امی میرے ساتھ رہتی تھیں مگر میرے سسرال والوں نے انہیں گھر میں رکھنے سے انکار کر دیا کیونکہ میری امی ذہنی مریضہ ہیں۔ بابا جی! میری نندیں اور سسر ہر وقت مجھے ڈانٹتے رہتے ہیں۔ چھوٹی نند تک میری عزت نہیں کرتی۔ شادی شدہ نند بھی آتی ہے تو مجھے برا بھلا کہتی ہے۔ بابا جی! میں نے اپنے شوہر سے کہا کہ سسر اور نندوں کو سمجھائیں۔ انہوں نے کوشش کی تو میرے سسر نے پھر انہیں بھی برا کہنا شروع کر دیا اور کہنے لگے "نکل جاؤ گھر سے۔" میرے شوہر کہتے ہیں کہ میں الگ نہیں ہوں گا تمہیں طلاق لینی ہے تو لے لو۔ میرے سسر اور نندوں کے کہنے پر انہوں نے مجھے مارا بھی ہے۔ بابا جی! میرا دل چاہتا ہے کہ میں مر جاؤں۔ بابا جی! میرا ایک ڈیڑھ سال کا بچہ بھی ہے صرف اس کی وجہ سے میں سب برداشت کرتی رہتی ہوں۔ بابا جی! اللہ کے واسطے مجھے ایسا تعویذ یا وظیفہ دے دیں پڑھنے کے لیے کہ میرا شوہر الگ ہو جائے۔ میں بھی سکون سے رہ سکوں۔ میری نند کہتی ہے کہ میرا بھائی کبھی الگ نہیں ہوگا۔

وہ اپنی بیوی کو چھوڑے گا۔ بابا جی! کہیں میری نند اور سسر نے میرے شوہر پر تعویذ وغیرہ تو نہیں کروایا؟ بابا جی! پلیز، میری مدد کریں۔ اللہ آپ کو اجر دے گا۔

☆بیٹی علیشبہ! اللہ تمہارے شوہر کو عقلِ سلیم عطا فرمائے اور وہ اپنے گھر والوں میں اور بیوی بچے میں توازن رکھ سکے۔ مرد کو عورت سے زیادہ طاقتور بھی اسی لیے کہا گیا ہے کہ وہ بیک وقت کئی طرح کی ذمے داریاں سنبھالتا ہے مگر افسوس کہ آج کل مرد صرف ہاتھ اٹھا کر گالی گلوچ کر کے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ بیٹی! تم صبر اور ہمت سے کام لو۔ زیادتی کرنے والوں کا معاملہ اللہ کے سپرد کر دو۔ اللہ تمہاری والدہ کو مکمل صحت عطا فرمائے۔ تمہارا بچہ بہت چھوٹا ہے، اس لیے بہت سہل ورد بتا رہا ہوں، پابندی کے ساتھ کرو۔ کرم ہوگا۔ چلتے پھرتے یَامَالِکَ الْمُلْکِ کثرت سے پڑھا کرو۔ معاملات میں بالکل خاموشی رکھو۔ اللہ سب خیر کرے گا۔ مجھے 41 دن بعد حالات سے مطلع کرو۔

□ ثریا شیخ۔ لاہور

o پیارے بابا جی! السلام علیکم! میری بہن جس کی عمر 40 سال ہے، وہ شادی شدہ ہے، کچھ عرصے سے اس کی کمر، ہاتھ کی انگلیاں، پیر کی انگلیاں ان سب حصوں میں بہت سخت درد رہتا ہے۔ رات میں سو کر جب صبح اٹھتی ہے تو بستر سے اٹھا نہیں جاتا۔ اُس کا وزن زیادہ ہے اور روز بہ روز بڑھتا جا رہا ہے۔ پیٹ اور کولہے کا حصہ بہت زیادہ موٹا ہے۔ میری بہن بے چاری بہت پریشان ہے۔ اُس نے مجھ سے کہا ہے کہ میں آپ کو لکھ کر بھیجوں، آپ کی دوا سے ضرور فائدہ ہوگا۔ اُس کے جسم میں چربی بہت ہے۔ میری بہن کی ساس بھی بہت زیادہ بیمار ہیں، اپنے لیے تو وہ مر چکی ہیں، لوگوں کے لیے زندہ ہیں۔ میری بہن اپنی ساس کی بہت دیکھ بھال کرتی ہے لیکن میری بہن اپنی جسمانی بیماری کی وجہ سے بہت مشکل محسوس کر رہی ہے۔ بابا جی! آپ میری بہن کے لیے دُعا کریں اور دوا بھی ضرور بتائیں تاکہ میری بہن کو شفا ہو جائے۔

☆بیٹی ثریا! اللہ تمہیں مکمل صحت عطا فرمائے۔ جسم میں درد وزن بڑھنے کی وجہ سے ہے۔ کوئی عزیز کراچی میں رہتا ہو تو مناسب ہوگا مجھ سے وزن کم کرنے کی دوا سچی کہانیاں کے آفس سے دستی منگوا لو۔ انشاء اللہ مکمل افاقہ ہوگا۔ آئندہ خط جوابی لفافے کے ہمراہ لکھنا تاکہ تفصیل بتائی جا سکے۔

□ زینب۔ اوکاڑہ

o بابا جی! السلام علیکم! گزارش ہے کہ میں نے آپ کو تین خط لکھے لیکن آپ نے ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔ بابا جی! آپ نے مجھے سورۂ احزاب رشتے کے لیے پڑھنے کو دی (41) دن تک فجر کی نماز کے بعد اللہ تعالیٰ کی مہربانی، آپ کی دُعا سے ایک اچھا رشتہ آیا ہے۔ تقریباً بات پکی ہے۔ ہمارے سب گھر والوں کو رشتہ بہت پسند آیا ہے لیکن میرے دو بھائی اور دو بھابیاں ناراض ہیں۔ میری والدہ چاہتی ہیں کہ یہ بھی ناراضگی ختم کر دیں۔ بابا جی! جب سے میرا رشتہ آیا ہے، محلے والے پتا نہیں کیوں جل رہے ہیں؟ آپ سے والدہ کی گزارش ہے کہ ایسا وظیفہ دیں کہ میرے والد بقر عید والے مہینے میں نکاح کر دیں یا ایسا کچھ دیں کہ لڑکے والے کسی کے بہکانے میں نہیں آئیں۔ میری والدہ کو ڈر ہے کہ محلے والے لڑکے والوں کو بہکا دیں گے اس لیے والدہ چاہتی ہیں کہ ایسا وظیفہ دیں کہ شادی ہونے تک کوئی مسئلہ نہ ہو۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی اور ہاں، میں نے وظیفہ ابھی جاری رکھا ہوا ہے۔ آپ کے اور اللہ کے سوا کوئی ہمارا نہیں۔ آپ کی مہربانی ہوگی۔

☆بیٹی زینب! اللہ تمہیں بے شمار خوشیاں عطا فرمائے۔ وظیفہ ترک کر دو۔ نماز کی پابندی رکھو اور سب سے پہلے شکرانے کے دو نفل ضرور ادا کرو۔ بندے کو چاہیے کہ جب وہ مشکل میں اللہ سے مدد مانگے اور اللہ اُس کی دُعا قبول فرما لے تو سب سے پہلے اُس پاک ذات کا شکر ادا کرے کیونکہ اس کی مرضی کے بغیر تو پتا بھی نہیں ہل سکتا۔ جہاں تک بھائیوں کی ناراضگی کا تعلق ہے تو والدہ سے کہو کہ اُن دونوں کو بلائیں اور محبت سے سمجھائیں کہ خوشی کے موقع پر ناراضگی اچھی بات نہیں۔ بیٹی! تم سُبحَانَ اللّٰہ کا بکثرت ورد کرو اور صدقہ خیرات ضرور نکالتی رہنا۔ اللہ سب خیر کرے گا۔

□ اشرف۔ حضرو

o بابا جی! السلام علیکم! کے بعد عرض ہے کہ آپ اللہ کے فضل و کرم سے خیریت سے ہوں گے۔ میرے بہت

سے مسائل ہیں جو میں بیان نہیں کر سکتا' لیکن اِن میں دو بہت اہم مسائل ہیں جو آپ سے بیان کر رہا ہوں۔ اِن کا جواب علیحدہ علیحدہ دیجیے گا۔ پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ میں اللہ کے فضل و کرم سے حافظِ قرآن ہوں لیکن میں صحیح روانی کے ساتھ نہیں پڑھ سکتا۔ بابا جی! بات یہ ہے کہ ہمارے محلے کے چند لوگوں نے مجھے بدنام کر دیا ہے۔ جس کی وجہ سے میں پچھلے رمضان میں بھی قرآن پاک نہیں سنا سکا۔ اَب میرا ارادہ ہے کہ اگر مجھے قرآن پاک سنانے کے لیے جگہ نہیں ملی تو میں رمضان میں چالیس دن کے لیے جماعت پر چلا جاؤں گا۔ بابا جی! آپ مجھے ایسا کوئی وظیفہ بتائیں کہ جس کے کرنے سے مجھے جگہ مل جائے اور آپ میرے لیے دُعا کریں کہ اللہ غیب سے کوئی بندوبست فرما دیں۔ میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میں چاہتا ہوں' میرے باپ اور میرے چچا حج کے لیے چلے جائیں۔ پیسے کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ اِس کے لیے بھی کوئی وظیفہ بتا دیں۔ آپ استخارہ کر کے بتائیں کہ میرے لیے جگہ کا بندوبست ہو جائے گا کہ نہیں؟ میں آپ کے جواب کا انتظار کروں گا۔

☆ بیٹے اشرف! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ نماز کی پابندی کے ساتھ روزانہ سورۂ یٰسین کی باآوازِ بلند تلاوت کیا کرو۔ والد سے کہو' اللہ سے دُعا کیا کریں کہ وہ اپنے گھر ضرور بلائے۔

□ عائشہ۔ ملتان

○ محترم و مکرم بابا جی! السلام علیکم! اللہ تعالیٰ آپ کا سایہ صحت تندرستی کے ساتھ تادیر قائم رکھے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم لوگ ایک سال پہلے گھر شفٹ کر کے نئے علاقے میں آئے ہیں' سارا محلہ اچھا ہے' سامنے والے گھر سے زیادہ آنا جانا رہا۔ شروع میں تو احساس نہ ہوا لیکن آہستہ آہستہ اُن کی شر انگیزیاں سامنے آنے لگیں۔ انہوں نے ہمارے لیے کافی مشکلات پیدا کی ہیں۔ اس وقت آنا جانا بند ہے۔ ایک دوسرے کی شکل سے نفرت پیدا ہو چکی ہے۔ میں اُن کے شر سے محفوظ رہنے کے لیے کوئی وظیفہ چاہتی ہوں۔ وہ لوگ یا تو گھر چھوڑ کر جائیں یا پھر ہمارے گھر کی اچھی قیمت لگ جائے۔ اس وقت جو صورت ہے' اس میں بہتری یہی ہے کہ دونوں میں سے ایک فیملی چلی جائے ورنہ گا ہے بگاہے تُو تُو میں میں ہوتی رہے گی۔ آپ اس مسئلے کا بہترین حل بتایئے۔ ان کے گھر میں 5 افراد ہیں۔ صاحب' اُن کی بیگم اور 3 لڑکے۔

☆ بیٹی عائشہ! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ بے شک اچھا ہمسایہ بھی نعمت ہے اور برے ہمسایوں سے بڑی مشکل کوئی نہیں۔ بہرحال میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ جلد از جلد مجھ سے تعویذ منگوا لو اور طریقہ کار کے لیے جوابی لفافہ ارسال کرو۔

□ حاتم خان۔ گوادر

○ پیارے بابا جان! السلام علیکم! کے بعد عرض ہے کہ میرا نام حاتم ہے اور میرا شہر گوادر ہے۔ بابا جان! عرصۂ دراز سے میں ایک لڑکی سے محبت کرتا ہوں لیکن بابا جان! وہ میری کسی بات کا جواب نہیں دیتی۔ جب بھی بولتا ہوں تو گھر کے اندر بھاگ جاتی ہے۔ بابا جان! "سچی کہانیاں" میں آپ کا کالم پڑھا تو سوچا کہ اس سلسلے میں آپ سے رہنمائی حاصل کی جائے۔ بابا جان! پلیز' میری مدد فرمائیں اور استخارہ کر کے مجھے بتائیں کہ یہ کام میرے لیے نقصان دہ ہے یا فائدہ مند؟ اُس کے بعد میں آپ کی ہدایت پر عمل کروں گا اور بابا جان......! اللہ آپ کو اپنی حفظ و اَمان میں رکھے اور آپ اِسی طرح لوگوں کے مسئلے حل کرتے رہیں۔ بابا جان......! آج اِس بات کو تین سال ہو گئے ہیں لیکن کوئی کام بنتا نظر نہیں آتا۔ پلیز' میری مدد فرمائیں۔

☆ بیٹے حاتم......! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ بیٹے......! اگر تم واقعی بچی سے مخلص ہو تو اپنے والدین کو اس کے گھر بھیج دو' یہی سب سے بہتر طریقہ ہے۔

□ س۔ صادق آباد

○ بابا جی! السلام علیکم! میرا نام "س" سے شروع ہوتا ہے۔ میری والدہ کا نام "ح" ہے اور میری عمر 18 سال ہے۔ بابا جی! دو سال ہوئے' مجھے نزلے کی شکایت ہے۔ میں نے ناک کی ہڈی کا آپریشن بھی کروایا اور اَب ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ الرجی ہو گئی ہے اور نزلہ کبھی ٹھیک نہیں ہوگا۔ بابا جی! مہربانی فرما کر مجھے حل بتایئے' میں بہت پریشان ہوں۔ بابا جی! میں نے نزلے کی وجہ سے پڑھائی بھی چھوڑ دی ہے اور صرف قرآن پاک ابھی پڑھ رہی ہوں۔ پلیز بابا جی! مجھے

اگست کے شمارے میں جواب دیں۔

☆ بیٹی......! اللہ تمہیں مکمل شفا دے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ روزانہ رات کو سونے سے قبل ایک بڑے برتن میں کھولتا ہوا پانی لو اور اُس میں خوب سارا نمک ملا کر بھاپ لو۔ یہ عمل 8-7 منٹ روز کرو۔ نہار منہ ادرک کے لمبے لمبے ٹکڑے نمک کے ساتھ توے پر بھون لو اور یہ 4-3 ٹکڑے بسم اللہ پڑھ کر کھالو۔ انشاء اللہ افاقہ ہوگا۔ مجھے ایک ماہ بعد مطلع کرو۔

□ مست علی۔ شہداد پور

○ بابا جی! السلام علیکم! امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ میرا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے وہ یہ کہ میری بس ایک بیٹی کے سوا کوئی اولاد نہیں۔ میں پڑھا لکھا نہیں ہوں اور یہ خط میں کسی دوسرے سے لکھوا رہا ہوں جب سنا کہ آپ "سچی کہانیاں" میں لوگوں کے مسئلے حل کرتے ہیں تو سوچا' میں بھی اپنا مسئلہ آپ کو بتا دوں۔ میری شادی کو بہت عرصہ ہو چکا ہے۔ آپ ہم پر احسان کرکے تعویذ دیں کہ بیٹا ہو جائے اور ہم کو یہ بھی بتائیں کہ آپ سے تعویذ کیسے حاصل کریں؟ ہم کو تو آپ کا ایڈریس بھی معلوم نہیں۔ بس آپ اپنے کرم سے ہمیں کوئی آسان وظیفہ بتائیں اور ایک تعویذ بھی دیں کہ ہمارا مسئلہ حل ہو جائے' بس آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ میں آپ کو ہمیشہ دُعائیں دیتا رہوں گا۔

☆ بیٹے علی......! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ تم مجھے جوابی لفافے پر واضح پتا لکھ کر خط ارسال کرو تاکہ میں تمہیں تعویذ لینے کا طریقہ بتا سکوں۔ خط میں اپنا نام مع والدہ اور بیوی کا بھی مکمل نام لکھو۔

□ شہزادی۔ کراچی

○ پیارے بابا جی! اللہ تعالیٰ آپ کو صحت اور زندگی دے۔ بابا جی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے پتے میں پتھری ہے۔ ہومیو پیتھک علاج کروا رہی ہوں۔ میں آپریشن نہیں کروانا چاہتی۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ آپ کوئی ایسا ورد یا وظیفہ دیں جس کو پڑھنے سے بغیر آپریشن کے پتھری ریزہ ریزہ ہو کر پتے سے نکل جائے۔ وظیفہ وغیرہ کتنے دن پڑھنا ہے اور کتنی مرتبہ' سارا تفصیل سے لکھ دیں۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔ بابا جی! میری بڑی بہن کا بھی یہی مسئلہ ہے۔ وہ بھی آپریشن کروانا نہیں چاہتی۔ اُس کے لیے بھی کوئی وظیفہ بتا دیں کہ بغیر آپریشن کے پتے سے پتھری نکل جائے۔ ساری عمر آپ کو دُعائیں دیں گے۔

☆ بیٹی شہزادی! اللہ تمہیں مکمل شفا عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ دن میں جس وقت سہولت ہو' ہزار بار یَا شَافِیُ پڑھ کر پانی کی بڑی بوتل پر دَم کرو اور پھر یہ پانی دن بھر پیتی رہو۔ دن بھر میں تمہارے کم از کم دس گلاس پانی کے ہونا چاہئیں۔ یہ عمل 14 دن کرو پھر مجھے حالات سے مطلع کرو۔ بہن سے کہو وہ بھی یہی عمل کرے۔

□ سلطان بخش۔ سعودی عرب

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! بعد آداب و تسلیمات کے عرض ہے کہ میں سعودی عرب میں گزشتہ 4 سال سے کام کر رہا ہوں۔ میری پریشانی یہ ہے کہ میں جب آدمی کو دیکھتا ہوں تو غصہ آتا ہے۔ دماغ بھی کبھی کبھی بہت خراب رہتا ہے۔ دل بہت بے چین رہتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ آپ پر تعویذ کیے گئے ہیں' کوئی کچھ کہتا ہے' میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ میری بیماری کیا ہے؟

☆ بیٹے سلطان! میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ ماہِ رمضان المبارک میں مجھ سے تعویذ منگوا کر رکھ لو۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ چلتے پھرتے سورۃ الناس ورد میں رکھا کرو۔ کرم ہوگا۔

□ ارجمند کھوسہ۔ کوئٹہ

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! میں نے آپ کا بہت نام سنا ہے۔ بابا جی! جس طرح آپ انسانیت کی خدمت کرتے ہیں' اِس کا اجر اللہ آپ کو دونوں جہاں میں دے۔ بابا جی! ہم بھی آج ایک مسئلہ لے کر حاضر ہوئے ہیں۔ وہ مسئلہ میرے کزن کا ہے۔ بابا جی! کچھ عرصے پہلے اُس نے کاروبار شروع کیا جو بہت اچھا چل رہا تھا مگر اَب بالکل نہیں چل رہا۔ وہ بہت پریشان ہے کیونکہ اُس کا سارا سرمایہ اِس کاروبار میں لگا ہوا ہے۔ بابا جی! آپ ہمیں ایسا وظیفہ دیں جس کے کرنے سے کاروبار بہت ترقی کرے۔ ہم آپ کو تمام عمر دُعائیں دیں گے اور بابا جی! وہ بہت بڑی ہے۔ اُس کی جگہ وہ وظیفہ میں کرنا

چاہتی ہوں۔ وظیفہ کرنے کی اجازت دیں اور بابا جی! آپ نے حیدرآباد والی ایک بہن کو جو وظیفہ دیا تھا میں وہ وظیفہ کرنا چاہتی ہوں۔ وہ وظیفہ کرنے کی بھی اجازت دیں۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی اور میرے خط کا جواب جولائی یا اگست میں دیں۔ شکریہ۔ اللہ حافظ! اگر کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معاف فرمائیں۔

☆بیٹی ارجمند......! وظیفے کی اجازت ہے' بس خیال رہے' نماز قضا نہ ہو۔ وظیفہ مکمل ہونے پر کچھ رقم ضرور خیرات کر دینا۔

□ عندلیب ظہور۔ کوٹری

○ پیارے بابا جی! السلام علیکم! اللہ پاک آپ کو صحت عطا کرے۔ (آمین!) بابا جی! آپ کا جواب موصول ہوا تھا۔ میری بیماری کے سلسلے میں آپ نے جو سورۃ البقرہ کی آیت 44 ہر نماز کے بعد پڑھنے کو دی تھی تو وہ میں ہر نماز کے بعد پڑھتی ہوں مگر کتنی بار؟ یہ آپ نے نہیں بتایا ہے۔ پلیز' تعداد بتا دیجیے تاکہ میں اس آیت کو ہمیشہ پڑھتی رہوں۔ بابا جی! اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ آج کل ریڑھ کی ہڈی میں شدید درد اٹھا ہوا ہے۔ اٹھنا' بیٹھنا اور جھکنا مشکل ہوا ہوا ہے۔ بس اپنے اللہ پاک پر بھروسا ہے کہ وہ دوبارہ کبھی اس مرض کا شکار نہیں کرے گا۔ انشاء اللہ! اب رہا میری بچی کا مسئلہ تو بابا جی! میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میری بیٹی کی بات آج سے دو سال پہلے میں نے اپنے بھانجے سے طے کر دی تھی مگر اب جب شادی میں تھوڑا وقت رہ گیا تھا تو بھانجا یہ شادی نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے یہ بات آپ کو بتائی تھی تو آپ نے جواب میں مجھے ابھی خاموش رہنے کی ہدایت کی تھی مگر اب جو بات سامنے آئی ہے' وہ یہ ہے کہ بھانجا ایک لڑکی کے چکر میں ہے۔ جس کو وہ ٹیوشن پڑھاتا ہے۔ اس لڑکی کا نام جویریہ ہے اور اُس کی ماں کا نام انجم ہے جو میرے بہنوئی کے آفس میں کام بھی کرتی ہے۔ جب میری بیٹی نے بھانجے سے بات کی تو اس نے بتایا کہ ہاں' جویریہ میرے ٹائپ کی لڑکی ہے' میں اُس کو پسند کرتا ہوں۔ تم تو کبھی فون تک نہیں کرتی ہو جبکہ وہ ہر وقت مجھ سے موبائل پر بات کرتی رہتی ہے۔ میں اپنے ماں باپ کے کہنے پر تم سے شادی تو کرلوں گا مگر اُس کو بھی نہیں چھوڑوں گا کیونکہ وہ اب میری پسند ہے۔ بابا جی! اب یہ بتائیے کہ ان حالات میں' میں اپنی بیٹی کی زندگی کیسے برباد کرلوں؟ میں نے آپ سے استخارے کے لیے بھی کہا تھا۔ پلیز' بتا دیجیے گا کہ استخارے میں کیا جواب آیا ہے؟ اور اب آپ کا کیا مشورہ ہے؟ میں اور میرے شوہر ہم دونوں ہی بہت پریشان ہیں۔ جب یہ بات سارے خاندان کو پتا چلے گی تو کتنی شرمندگی ہوگی۔ میری ہنستی مسکراتی سی بیٹی بھی خاموش سی ہو کر رہ گئی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟ یہ مسئلے مجھ کو پاگل کر دیں گے۔ اللہ آپ کو ان نیک کاموں کا اجر دے۔ (آمین!)

☆بیٹی عندلیب! استخارہ حق میں نہیں ہے۔ میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ اب معاملات میں خاموشی رکھنا مناسب نہیں۔ لڑکے کو بلا کر واضح بات کرو' یہی مناسب ہے۔

□ بخت ناز۔ ڈنگہ

○ بابا جی! آداب! بابا جی! میں اپنے دیور کی شادی اپنی بہن سے کرنا چاہتی ہوں۔ استخارہ کر کے بتائیں کہ یہ رشتہ کیسا رہے گا اور اُن کی ازدواجی زندگی کیسی گزرے گی اور اُن کی شادی کا میری زندگی پر کوئی منفی اثر تو نہیں پڑے گا؟ اگست کے شمارے میں لازمی جواب دیں۔

☆بیٹی بخت......! استخارہ حق میں ہے۔ تمہاری زندگی پر کوئی منفی اثر نہیں پڑے گا۔ جب تک تم یہ نہیں سوچو گی کہ تم نے اپنی بہن پر احسان کیا ہے اور اُس کو اُس کا بدلہ دینا چاہیے۔ کسی سے کوئی امید مت رکھنا۔ سب خیر رہے گی۔

□ نور مہر شاہ۔ پشاور

○ بابا جی! میں آپ کا بہت پرانا مرید ہوں۔ میرے گھر والوں نے ہمیشہ ہر مسئلے کے لیے آپ سے ہی رابطہ کیا اور اللہ کے فضل سے مسئلہ حل بھی ہوا۔ بابا جی! آج میں آپ کو جو مسئلہ بتا رہا ہوں' وہ شاید پڑھنے میں اتنی شدید نوعیت کا نہ لگے مگر میرے لیے بہت تکلیف دہ ہے۔ بابا جی! میری شادی تین سال قبل میری پسند سے ہوئی۔ میری بیوی بہت اچھی اور سمجھ دار ہے مگر میرے ماں باپ کو بالکل برداشت نہیں کرتی۔ اصل میں بابا جی! میری ماں نے کچھ زیادتیاں کی ہیں جس کے بعد اُس کا دل بالکل صاف نہیں ہو رہا۔ وہ کوشش بہت کرتی ہے مگر

پرانی باتیں یاد کر کے بہت روتی ہے۔ باباجی! میں جانتا ہوں' میری والدہ نے بہت زیادتی کی ہے مگر ماں باپ سے کٹ کر رہنا بھی ممکن نہیں۔ میں اچھا کماتا کھاتا ہوں اور چاہتا ہوں' والدین کو اپنے ساتھ رکھ کر اُن کی خدمت کرسکوں۔ میں والدین کو بھی سمجھاتا ہوں نہ وہ بات سمجھتے ہیں اور نہ بیوی۔ آپ اس سلسلے میں میری مدد فرمائیں تاکہ یہ مسئلہ حل ہوسکے۔

☆ بیٹے نورا بڑوں کو سمجھنا چاہیے کہ جب تک چھوٹوں کو وہ محبت کا راستہ نہیں دکھائیں گے' چھوٹے کیسے اُن کی عزت کریں گے؟ اچھائی کا انجام اچھائی ہے اور برائی کا انجام برائی ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر وقت چھوٹے ہی غلط ہوں۔ تم اپنا رویہ متوازن رکھو' بیوی پر بہت بوجھ مت ڈالو۔ ہاں' تم خود اپنے والدین کا خیال رکھو' رفتہ رفتہ حالات ٹھیک ہوں گے۔

□ رقیہ عمر۔ ٹنڈو آدم

○ محترم باباجی! السلام علیکم! اسدا خوش رہیں! میرا مسئلہ یہ ہے کہ تقریباً ایک سال پہلے میری شادی ہوئی تھی لیکن شوہر پتا نہیں کس مزاج کا ہے کہ میں اُسے سمجھ نہیں سکی۔ میں تو اُس سے ٹوٹ کر محبت کرتی ہوں اور وہ مجھ میں ذرا بھی دلچسپی نہیں لیتا' نہ ہی خود سے کوئی بات کرتا ہے۔ میں کروں تو جواب دے گا ورنہ نہیں۔ جیب خرچ کے نام پر ایک روپیہ نہیں دیتا۔ میری ضرورت میری امی پوری کرتی ہیں۔ میں چاہتی ہوں، یہ بھی مجھ سے محبت کرے' میری ہر بات مانے اور میرے بغیر ایک منٹ نہ رہے۔ اَب میں پانچ مہینے سے اپنے میکے میں ہوں لیکن یہ فون تک نہیں کرتا۔ ملنا تو بہت دور کی بات ہے' بہن طعنے دیتی ہے کہ پتا نہیں' کب اپنے گھر جائے گی؟ باباجی! میں بہت بے زار ہوں' خودکشی حرام نہ ہوتی تو اَب تک کر چکی ہوتی۔ پیارے باباجی! کوئی ایسا عمل بتائیں کہ یہ میرے بغیر رہ نہ سکے اور اپنی غلطی تسلیم کر کے مجھے لے جائے۔

☆ بیٹی رقیہ...... اللہ تمہیں خوش اور آباد رکھے۔ نماز کی پابندی رکھو اور ہر نماز کے بعد 3 تسبیح سورۃ الناس کی پڑھ کر اپنے اوپر دَم کرلیا کرو۔ شوہر سے ضرورت کے تحت بات کرو مگر اپنے فرائض خوش اسلوبی سے پورے کرو۔ تمہیں خود اپنے سُسرال چلے جانا چاہیے۔ اپنے شوہر کو بلوالو اور اپنے گھر چلی جاؤ۔ ساتھ رہوگی' خیال کروگی تو سب ٹھیک ہوجائے گا ورنہ شوہر کو تمہارے بغیر رہنے کی عادت ہوجائے گی۔ بیٹی......! سمجھداری سے چلو' گھر بنانا بہت مشکل ہے اور ٹوٹنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگتا۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔

□ عذرا بتول۔ چونگی

○ باباجی! میں آپ کو بہت امید سے خط لکھ رہی ہوں۔ میری شادی بھی آپ سے وظیفہ لینے کے بعد ہوئی تھی اور اَب اولاد کا مسئلہ ہے۔ شادی کے تین سال بعد بھی کوئی امید نہیں ہوئی۔ پہلے تو میرے شوہر کچھ نہیں کہتے تھے مگر اَب تھوڑے چڑچڑے سے ہورہے ہیں۔ باباجی! میں اِس صورتِ حال سے بہت پریشان ہوں۔ ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ کوئی خرابی نہیں۔ اللہ کی طرف سے دیر ہے۔ باقی کوئی مسئلہ نہیں۔ باباجی! میں آپ سے ہاتھ جوڑ کر گزارش کرتی ہوں کہ میرا یہ مسئلہ حل کردیں۔ مجھے بھی تعویذ عنایت فرمائیں۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے غصہ بہت آتا ہے۔ پہلے تو کبھی کبھی آتا تھا مگر باباجی! اَب مجھ سے ذرا سی بھی بات برداشت نہیں ہوتی۔ ہر وقت سر میں درد رہتا ہے۔ میں اپنی اس کیفیت سے خود بہت پریشان ہوں۔ میرے لیے خصوصی دُعا بھی فرمادیں۔

☆ بیٹی عذرا! تم شدید قسم کی بدنظر کا شکار ہو۔ میں تمہارے لیے تعویذ تیار کردوں گا۔ مختصر سا وظیفہ بھی بتاؤں گا۔ انشاء اللہ' ضرور کرم ہوگا۔ بیٹی! خوب صدقہ خیرات کرو۔ مجھے جوابی لفافے کے ساتھ خط لکھو تاکہ تفصیل سے جواب دیا جاسکے۔

□ امینہ گل۔ جعفرآباد

○ باباجی! بہت عرصے سے آپ کا کالم پڑھ رہی ہوں مگر خط لکھنے کی جسارت پہلی بار کررہی ہوں۔ باباجی! مسئلہ ہی کچھ بہت سنگین ہے۔ میں نے آج تک کوئی بھی اچھا کام نہیں کیا۔ دنیا کا ہر قبیح اور گناہ کا کام کیا۔ اس وقت میری عمر 45 سال ہے۔ تین مہینے قبل میرے جسم پر جگہ جگہ پھوڑے بننا شروع ہوگئے جن میں سے پیپ رستی رہتی ہے۔ میں نے جہاں جہاں ممکن ہوا، بھمبیں، کراچی کے بھی تمام ڈاکٹروں کو دکھادیا مگر کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔ علاج کروانے سے تکلیف 100 گنا بڑھ

جاتی ہے۔ باباجی! میں جانتی ہوں' یہ میرے اعمال کا صلہ ہے' مجھے دنیا کے لیے عبرت بنا دیا گیا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ میرے گناہ بہت بڑے ہیں مگر باباجی! میں دل سے شرمندہ ہوں اور تائب ہونا چاہتی ہوں۔ لوگ مجھ سے کتراتے ہیں' بچے مجھے دیکھ کر ڈر جاتے ہیں۔ میرے کھانے پینے کے برتن الگ کر دیے گئے ہیں۔ گھر سے باہر کچا کمرا بنا کر دے دیا ہے' جس میں' میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہی ہوں۔ آپ اللہ کے نیک بندے ہیں' میری مدد کریں۔ کسی طرح اللہ مجھے معاف کر دے' مجھے لوگوں کی' اُن کے رویوں کی کوئی پروا نہیں' بس میری سزا معاف ہو جائے۔

☆ بیٹی امینہ! اللہ تعالیٰ بندے کو بہت موقع دیتا ہے مگر بندہ بہت نافرمان ہے۔ تمہارے گناہ بہت بڑے ہیں' انسان ہونے کے ناتے میں تمہیں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ توبہ کرتی رہو' شاید وہ پاک ذات معاف کر دے۔ تمہارے پھوڑوں میں جو کیڑے پڑ گئے ہیں' اُن سے گھن مت کھاؤ۔ وہ عذابِ الٰہی ہے۔ کاش بیٹی......! تم نے اپنے برائی کی طرف بڑھتے ہوئے قدم روک لیے ہوتے۔ کاش......! یہ جان لیا ہوتا کہ یہ زندگی بہت مختصر ہے۔ اصل زندگی تو بعد میں شروع ہوگی۔ بہرحال میں تمہارے لیے صرف یہی دُعا کر سکتا ہوں کہ اللہ تم پر اپنا رحم فرمائے۔

□ ارم۔ ابوظہبی

○ باباجی! آپ کی دُعاؤں کی برکت سے 3 ماہ قبل میری شادی ہوگئی۔ تمام معاملات بخیر و خوبی طے پا گئے۔ باباجی! اَب میں چاہتی ہوں کہ دوبارہ سے کوئی اچھی سی جاب کر لوں۔ میں کسی پرائیویٹ کمپنی کو جوائن کرنا چاہتی ہوں۔ میرے ابوظہبی آنے کے بعد سے گھر میں کافی مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ ابا نے شادی پر جو قرض لیا تھا' وہ بھی میری ہی ذمے داری ہے۔ اِس کے علاوہ باباجی! میرے لیے خصوصی دُعا کریں کہ میں ایک کامیاب زندگی گزاروں۔

☆ بیٹی ارم! اللہ تمہیں مزید خوشیاں عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور بکثرت پہلا کلمہ پڑھو۔ بعد نمازِ فجر 700 بار سورۃ البقرہ آیت 7 پڑھو اول و آخر دُرود شریف 7-7 بار پھر حاجت بیان کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ رابعہ۔ خانیوال

○ باباجان! میرا مسئلہ حل کر دیں' میں آپ کی بہت شکرگزار رہوں گی۔ میری شادی کو 8 سال ہو چکے ہیں اور اَب تک اولاد سے محروم ہوں۔ لوگوں کے رویے اَب مجھے بہت دکھ دیتے ہیں۔ آپ نے میری جیٹھانی کو تعویذ دیا تھا' اُن کے ہاں بیٹے کی ولادت ہوئی۔ اَب پھر انہوں نے آپ سے تعویذ منگوایا۔ باباجی! پلیز' مجھے بھی تعویذ تیار کر دیں تاکہ میری بھی اولاد ہو سکے۔ یہ آپ کا مجھ پر احسان ہوگا۔ مجھے طریقے کا رسب پتا ہے مگر میری جیٹھانی نے کہا' آپ ہر ایک کو تعویذ نہیں دیتے لہٰذا پہلے اجازت لے لو۔ باباجی! میں بھی آپ کی بیٹی ہوں' میری بھی مشکل حل کر دیں تاکہ میں اپنے سسرال میں خوش و خرم رہ سکوں۔

☆ بیٹی رابعہ! اللہ سے مدد مانگو وہ ضرور تمہاری دُعا قبول فرمائے گا۔ میں تعویذ تیار کر دوں گا' بس خیال رکھنا' تعویذ استعمال کرنے کا بھی خاص طریقہ ہے۔ اِس پر عمل لازمی ہے۔ انشاء اللہ' کلامِ الٰہی کی برکت سے ضرور کرم ہوگا۔ خط میں مکمل کوائف اِرسال کرنا۔

□ نصرت احمد۔ چکوال

○ باباجی! میں بہت بدنصیب عورت ہوں۔ پہلی شادی بھی اپنی مرضی سے کی اور ایک بچے کے بعد طلاق ہوگئی۔ گھر میں بھائی بھاوج کا رویہ بہت خراب تھا اِس لیے میں نے دوبارہ اپنی مرضی سے دوسری شادی کر لی۔ میرے دوسرے شوہر کے پہلے سے دو بچے تھے اور اُن کی پہلی بیوی اُن کی کزن بھی تھیں۔ شروع میں تو سب ٹھیک رہا لیکن اَب اُن کا رویہ مجھ سے بہت خراب ہو رہا ہے۔ میرے بیٹے کو تو بالکل بھی برداشت نہیں کرتے۔ میرے دو بچے اُن سے بھی ہیں' اُن کو بھی وہ پیار نہیں ملتا جو اُن کا حق ہے۔ ساری توجہ پہلی اولاد کی طرف ہے۔ میں کچھ بولتی ہوں تو لڑنے مرنے لگتے ہیں' بہت برا بھلا کہتے ہیں۔ باباجی! میں بہت غریب گھر سے ہوں' پلٹ کر واپس بھی نہیں جا سکتی۔ اَب تو تین بچوں کا ساتھ ہے۔ باباجی! میں چاہتی ہوں' میرے شوہر ہم لوگوں سے محبت کریں اور کم از کم ایک گھر میرے نام کر دیں۔ وہ بہت پیسے والے ہیں' مجھے کم از کم ایک آسرا ہی ہو جائے۔

بابا جی! آپ نے بہت سے لوگوں کے مسائل حل کیے ہیں میرا مسئلہ بھی حل کردیں، میں اور میرے بچے بھی آپ کو دُعائیں دیں گے۔

☆ بیٹی نصرت! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بعض اوقات انسان ایک کے بعد ایک غلطی کرتا چلا جاتا ہے۔ بہرحال جو ہوا سو ہوا، اب تم نماز فجر کے بعد ایک بار سورۂ یٰسین پڑھو اور دُعا کرو۔ سورۂ "نجم" پڑھو پھر دُعا کرو۔ معاملات میں خاموشی رکھو۔ اللہ سب بہتر کرے گا۔ مجھے 41 دن بعد مطلع کرو۔

□ محمد عالم۔ شیخوپورہ

o بابا جان! مجھے میرے ایک دوست نے آپ کا پتا دیا۔ U.K. والی یاسینہ باجی نے اُس کی بہت مدد کی اور اَب وہ اپنا چھوٹا سا کاروبار کررہا ہے۔ بابا جان! کیا یاسینہ باجی میرے لیے کچھ نہیں کرسکتیں؟ میں بھی بہت پریشان ہوں، ایسا نہیں ہے کہ محنت نہیں کرتا، محنت بہت کرتا ہوں مگر بابا جان! آپ جانتے ہیں کہ مہنگائی نے کمر توڑ دی ہے پھر حق دار کو حق بھی نہیں ملتا۔ انتہائی غریب گھر کا ہوں لہٰذا کہیں کوئی سنوائی نہیں۔ میری عمر اِس وقت 35 سال ہے۔ 3 بہنیں ہیں اور بوڑھی والدہ۔ مجھ سے چھوٹے بھائی کا پچھلے دنوں انتقال ہوگیا۔ دکھ اِس بات کا ہے کہ لاش بھی نہیں ملی۔ میری ماں اِس غم میں رورو کر اندھی ہوگئی۔ بابا جان! کوئی ایسا وظیفہ دیں کہ ہمارے حالات اِس قابل تو ہوں کہ پیٹ بھر کر کھاسکیں، تن ڈھانپ سکیں۔ اللہ آپ کو اِس کا اَجر دے گا۔

☆ بیٹے عالم! اللہ تم کو حوصلہ دے۔ بے شک دنیا میں بہت اچھے اچھے لوگ بھی ہیں اور انہی کے دَم سے دنیا چل بھی رہی ہے۔ میری یہ بیٹی بھی ہمیشہ سب کے کام آئی ہے۔ دُعا کرو کہ وہ خود خیریت سے ہو کیونکہ بہت عرصے سے اُس سے میرا رابطہ بھی نہیں ہے۔ بیٹے......! بہنوں سے کہو بعد نماز فجر کے بعد ایک بار سورۂ آلِ عمران ضرور پڑھیں۔ اللہ سے دُعا کریں، وہ ضرور غیب سے کوئی سبب پیدا کرے گا۔ مدت 41 دن ہے۔

☆......☆



میں تم کو بھولنا چاہوں!

میں تم کو بھولنا چاہوں
مگر! ممکن نہیں لگتا

کیوں کہ! یہ رشتہ جڑ گیا ایسے
جیسے! پھول سے خوشبو کا
تتلی کا گلوں سے
مچھلی کا پانی سے
دھرتی کا امبر سے
بتا دے تُو ہی اب مجھ کو
کہ!
کیا میں بھول سکتی ہوں؟
میں تم کو بھولنا چاہوں
مگر ممکن نہیں لگتا

(شاعرہ: شازیہ گل، مانسہرہ۔ بھیر کنڈ)

میں خود سے بچھڑ گئی

وہ جو اک پل کے لیے
مجھ کو دور نہ کرتا تھا خود سے

وہ میرے سپرد
اب ایک تنہائی کر گیا!
وہ جو ہوا رخصت تو
میں خود سے بچھڑ کر رہ گئی

(شاعرہ: عصمت پروین عظیمی، کراچی)

غزل

شب بھر تنہائی میں ستارے رہ گئے
اس کے لوٹ آنے کے اشارے رہ گئے
دوست سبھی چھوڑ کر دور جا بسے
دشمن جو تھے قریب ہمارے رہ گئے
مدت سے کی تھی آباد دل کی بستی
وقت ملا دیکھنے کا نظارے رہ گئے
وفاؤں میں تو تھے سبھی ہمارے ساتھ
تنہا ہوئے تو فقط شرارے رہ گئے
ہم نے جن کے لیے چھوڑی تھی دنیا
آج انہی کے سنگ سہارے رہ گئے
مشکل حالات میں چھوڑا سبھی نے ساتھ
حسن جیسے تنہا دوست پیارے رہ گئے

(شاعر: ایم حسن نظامی، قبولہ شریف)

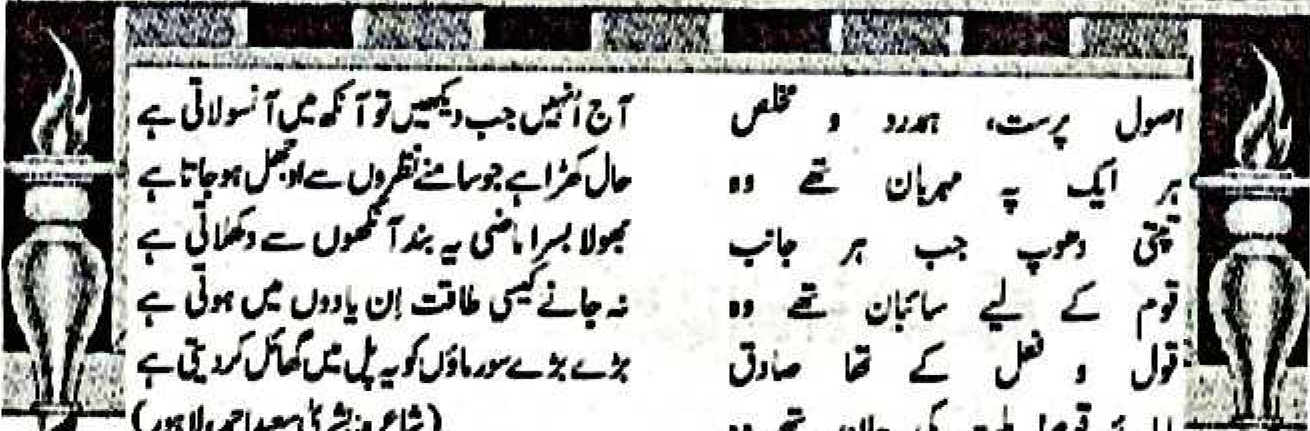
عید کا تحفہ

اے جاناں! سوچا اس عید کے موقع پر
کوئی ایسا تحفہ تمہاری نذر کروں
جسے تم عمر بھر یاد رکھو
چاہتے ہوئے بھی بھلا نہ سکو
پھر ایک لمحے کی سوچ نے میرے ہاتھ بلند کیے
کچھ لفظوں کے پھول دعاؤں کی مانند
جو تمہاری زندگی میں خوشیوں کی بہار بھر دیں
کبھی کوئی دُکھ و غم تمہیں چھو نہ سکے
تمہاری زندگی ہمیشہ پھولوں کی طرح مسکراتی رہے
یہ دعاؤں کا تحفہ تمہارا ہے

(شاعر: مور شاہد حسین قمر شہداد کوٹ)

بابائے ملت

سچے اور بہادر انسان تھے وہ
ہمت و جرأت کا نشان تھے وہ



اصول پرست، ہمدرد و مخلص
ہر ایک پہ مہربان تھے وہ
تپتی دھوپ جب ہر جانب
قوم کے لیے سائبان تھے وہ
قول و فعل کے تھا صادق
بابائے قوم! ملت کی جان تھے وہ
جس چمن کے ہیں ہم پھول ساحلؔ
اس چمن کے باغبان تھے وہ
(شاعر: ساحل ابڑو، ڈیرہ اللہ یار)

غزل

ہیں بارشیں اور مکاں شکستہ
پناہ ڈھونڈے کہاں شکستہ
بھٹک نہ جاؤں مثال جنوں
ہے چاہتوں کا جہاں شکستہ
قفس میں قسمت پہ رو، نہ بلبل!
ہیں پَر شکستہ، اُڑاں شکستہ
اثر دکھائیں یہ تیر کیسے؟
ہیں ہاتھ شل اور کماں شکستہ
مسافروں کی ہو خیر یارب
ہوا ہے تُند، بادباں شکستہ
عدالتِ عشق میں تُم آ کر!
سنبھال رکھنا زباں شکستہ
پلٹ نہ آئیں دعائیں فائقؔ
ہے دل کی آہ و فغاں شکستہ
(شاعر: عمران فائق، کامل پور موسیٰ)

غزل

بن بُلائے مہمان کی طرح جب یاد کسی کی آتی ہے
روم روم سلگ اُٹھتا ہے ایسی آگ لگاتی ہے
دل کرتا ہے پڑھ ڈالیں سارے خط پُرانے وہ
زنگ آلودہ بند تالے سارے یہ کھلواتی ہے
برسوں پہلے ہنستے ہنستے کھینچی تھی جو تصویریں
آج انھیں جب دیکھیں تو آنکھ میں آنسو لاتی ہے
حال کھڑا ہے جو سامنے نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے
بھولا بسرا ماضی یہ بند آنکھوں سے دکھلاتی ہے
نہ جانے کیسی طاقت اِن یادوں میں ہوتی ہے
بڑے بڑے سورماؤں کو یہ پل میں گھائل کر دیتی ہے
(شاعرہ: بشریٰ سعید احمد، لاہور)

ہائیکو

روح کے دریچوں میں
دل کے ساتھ بیٹھو
پھر کسی سے پیار کرو
(شاعر: صادق شمیم چوہدری، گوجرانوالہ)

غزل

بھیگے بھیگے موسم میں ٹھنڈی سرد ہواؤں میں
تجھ سے کوسوں دور رہوں جاناں شہر میں تُو گاؤں میں
مسکراتا چاند ہو جیسے زلفوں کی گھٹاؤں میں
لال گلابی ڈورے مچلیں تیری مست نگاہوں میں
تُو بولے تو بج اُٹھتے ہیں جلترنگ فضاؤں میں
تُو ہنسے تو کھِل اُٹھتے ہیں گُل تیری اَداؤں میں
بن کر تیرے پاس رہوں میں کنگن تیری بانہوں میں
چھن چھن کرتی اچھی لاگے جھانجھر تیرے پاؤں میں
جی چاہتا ہے اُڑ کر پہنچوں بھرلوں تجھ کو بانہوں میں
شامل رکھنا تُم جی آ کو اپنی نیک دعاؤں میں
(شاعر: عبدالعزیز جی آ، چکوال)

میرے نام کے آنسو

میرے نام کے آنسو
تمہاری خوب صورت آنکھوں سے
نکل کر
تمہارے ملیح گالوں پے
پھسل کر
تمہارے ستواں ناک کا
طواف کرتے ہوئے



تمہارے نایاب ہونٹوں تک
آ پہنچے ہیں
ذرا ٹھہرو
انہیں ہاتھ سے مت پونچھو
کہ ان پہ میرا حق ہے
میرے نام کے ان آنسوؤں کو
مجھے اپنے ہونٹوں سے
چھڑا لینے دو
ذرا ٹھہر! ذرا ٹھہرو
(شاعر: شاہد فراز، حیدر آباد)

کون

ٹوٹا ہوا ستارہ، ٹوٹا ہوا لہجہ، ٹوٹی ہوئی چوڑی
ہر استعارہ، میرے ارمان جیسا تھا
شاہراہ حیات پہ کیسے ملتا وہ بام
اس کا پیار، میرے گمان جیسا تھا
ملنا، بچھڑنا، تڑپنا، بہکنا
ہر انداز اس کا، میرے فرضی امکان جیسا تھا
لب خاموش رہتے تھے، آنکھیں بولتی تھیں
انسانوں کی بھیڑ میں وہ شناسا انجان جیسا تھا
کس قدر معصوم ہو؟ کیسی باتیں کرتے ہو؟
اگرچہ سب کچھ فرضی تھا فسانے میں
مگر وہ شخص
میرے پیار کی پہچان جیسا تھا......؟
(شاعرہ: حافظہ موں شاہ، سرگودھا)

اور دریا بہتا رہا

اس نے اپنا
دل کھول کے
اپنا درد پہاڑوں کو سنایا
پھولوں کو سنایا
تو کئی چٹان جھڑنے لگیں
اس کی آہ کا اثر اتنا ہوا
کہ
آبشار متحرک ہو گئے
پھول پانی میں بکھر گئے
اور
دریا بہتا رہا
اے کہ
کاش وقت تھم جائے
اس کا
درد
اس صدی کے لامتناہی سلسلے
میں اک حرف بن جائے
(شاعرہ: نگہت اکرم، لاہور)

دہشت گردی

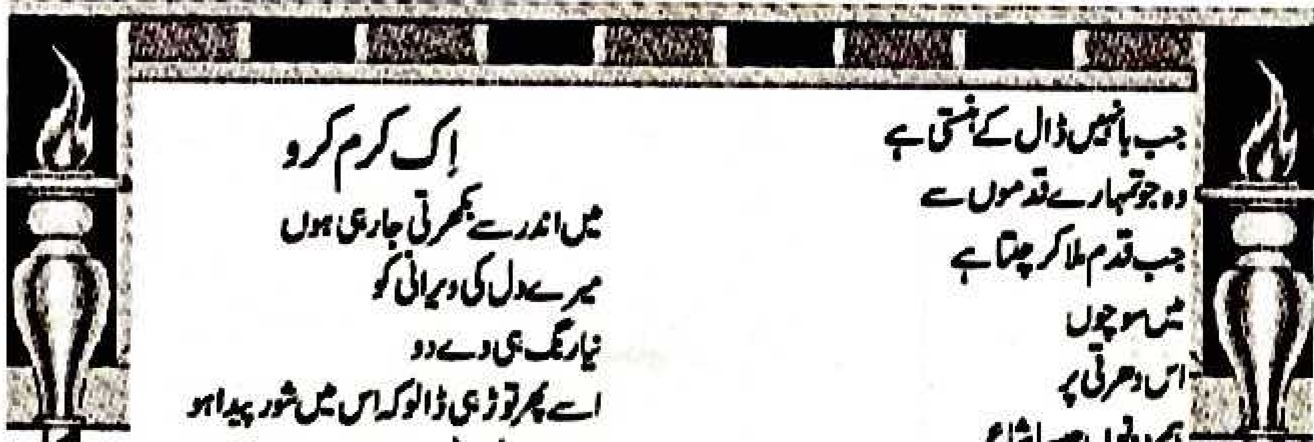
مکیں مارے گئے ہیں جن گھروں کے
وہ بام و در اُجڑ کر رہ گئے ہیں
کیسی خون کی ہولی ہے جاری
گھروں کے گھر اُجڑ کر رہ گئے ہیں
(شاعر: راؤ تہذیب حسین تہذیب، رحیم یار خان)

تھوڑی سی وفا

بہت سی باتیں......
بہت سی عادتیں
سیکھی ہیں اس نے ہم سے
کاش تھوڑی سی
وفا بھی سیکھ لیتا
(شاعرہ: ثانیہ بھٹی، سیالکوٹ)

شاعر

وہ نظم!
جو میں نے تم پہ لکھی
وہ شعر جو میں نے پلکوں سے
دل کے کاغذ پر تحریر کیا
وہ ہماری بانہوں میں



جب بانہیں ڈال کے ہنستی ہے
وہ جو تمہارے قدموں سے
جب قدم ملا کر چلتا ہے
میں سوچوں
اس دھرتی پر
ہم دونوں جیسا شاعر
کوئی اور نہیں
(شاعر: دستگیر شہزاد، ٹوبہ ٹیک سنگھ)

بہت یاد آتا ہے

بہت ہی یاد آتا ہے میرے دل کو تڑپاتا ہے
وہ تیرا پاس نہ ہونا بہت مجھ کو رُلاتا ہے
وہ میرا تیری آنکھوں کے سمندر میں اُتر جانا
اور تیری مسکراہٹ کے بھنور میں ڈوبتے جانا
تیری آواز کے سحر سے نہ نکل پانا
تجھ کو دیکھنا اور بے خودی سے دیکھتے جانا
بہت چاہا اِن گزرے ہوئے لمحوں کو نہ سوچوں
بھلادوں ساری یادوں کو کہ جن سے دل تڑپتا ہے
مگر جب رات آتی ہے تو تیری یاد آتی ہے
(شاعرہ: کنول عمران خان، کراچی)

غزل

شکوہ نہیں ہے گلہ بھی نہیں ہے
محبت کا رستہ ملا بھی نہیں ہے
بہت کی ہے کوشش مگر یہ ہوا ہے
چمن آرزو کا کھلا بھی نہیں ہے
تکن میں بہت دور تک ہم گئے ہیں
تکن کا کوئی بھی صلہ ہی نہیں ہے
کسی کی تمنا کو کب ہم نے روندا
کچھ ایسا تو ہم نے کیا بھی نہیں ہے
قسم سے وہ ہر وقت رہتے خفا ہیں
کبھی نام اُن کا لیا بھی نہیں ہے
(شاعرہ: مہر تسیم، گلبرگ لاہور)

اِک کرم کرو

میں اندر سے بکھرتی جارہی ہوں
میرے دل کی ویرانی کو
نیا رنگ ہی دے دو
اسے پھر توڑ ہی ڈالو کہ اس میں شور پیدا ہو
جمود ہجر تو ٹوٹے
میں، اندھے، بے بسی کے جنگلوں سے
لوٹ تو آؤں
چلو مسکان مت بھیجو
کوئی آنسو ہی دے جاؤ
کہ میں بھی رو سکوں کھل کر
لبوں سے آہ تو نکلے
مجھے ایسا تو کر جاؤ
کہ جیسے لوگ ہوتے ہیں
زندہ لوگ ہوتے ہیں
(شاعرہ: تسیم سکینہ صدف، ڈسکہ سیالکوٹ)

منزل

یوں تو اُس کو میں نے چاہا تھا بہت
پر جاتے سے اس کے پاس تھے بہانے بہت
گردش حالات نے مجھے پتھر بنا دیا ایسا
اب میں بگوار ہوں میرے پجاری بہت
تم اپنا درد چپ چاپ سہہ جاؤ تو اچھا
زخم پھر سے کھلے گا تو درد بڑھے گا بہت
کشتی مضبوط نہ سہی پر ڈرنا کیا طوفان سے
پا ہی لیں گے منزل اپنی خدا پہ ہے مان بہت
(شاعرہ: عنبرین نعیم۔ کراچی)

عید

لوگ کہتے ہیں عید آئی ہے
مگر تیری دید نہ ہو تو
میری عید کہاں......I Miss you
(شاعر: غلام رسول گل، جیکب آباد)

اس ماہ کی خاص کہانی

فیضِ عشق

امجد جاوید

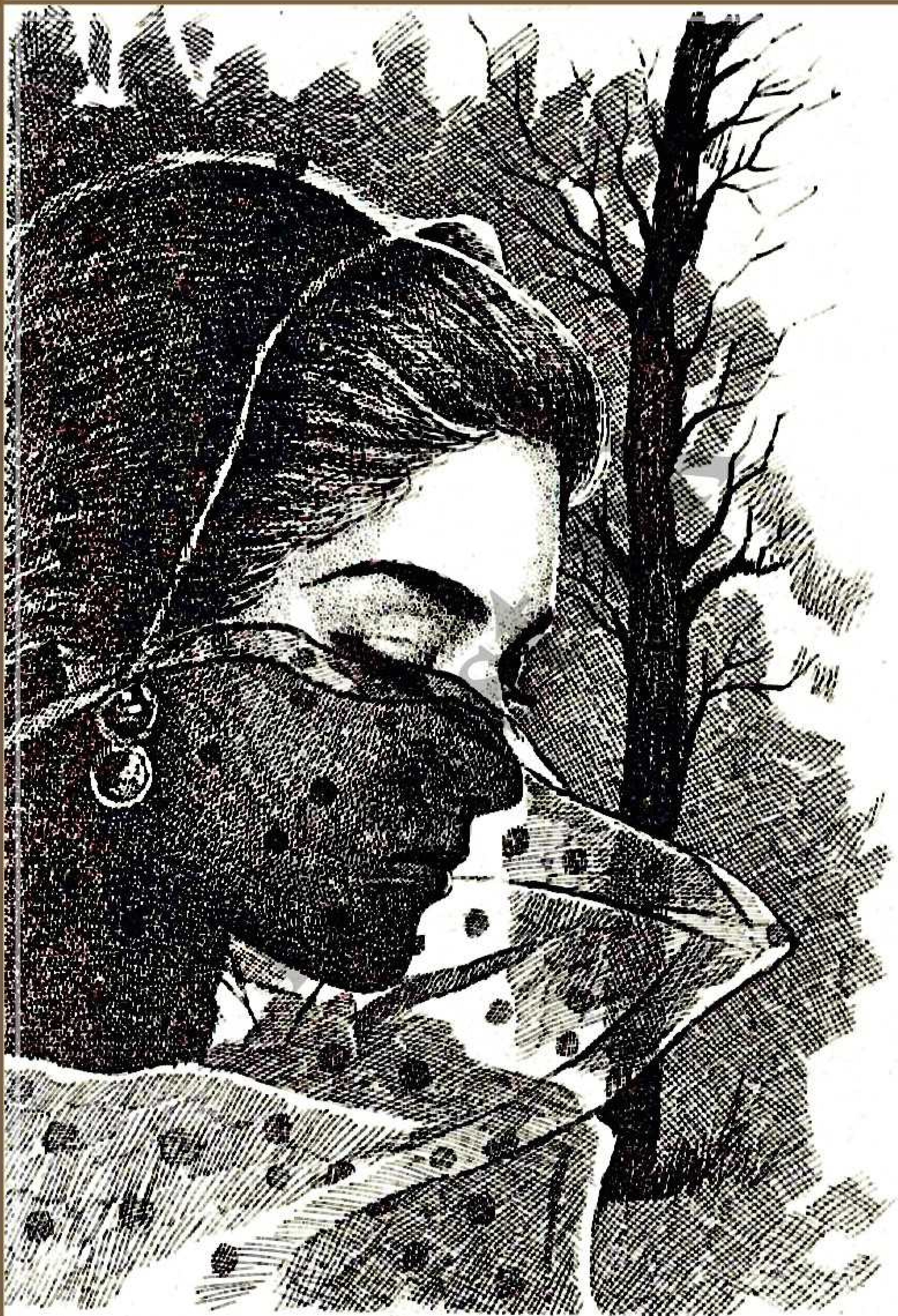
عشق کے متوالوں کے لیے عشق میں ڈوبی ایک خاص الخاص کہانی

قسط نمبر 2

نادی بڑے اضطراب میں دن گزار رہی تھی۔ جیسے تپتے صحرا میں کوئی آبلہ پا اور تشنہ لب مسافر اچانک نخلستان دیکھ لے اور پھر جیسے ہی نخلستان کے قریب پہنچے تو یہ معلوم ہو کہ یہ تو سراب تھا۔ اس حقیقت کا ادراک ہوتے ہی اس تشنہ لب و آبلہ پا مسافر کی کیفیت کیا ہو گی؟ نادی بھی ان دنوں ایسی ہی کیفیت سے گزر رہی تھی۔ اسے شعیب کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ نجانے اسے کیا ہو گیا تھا؟ وہ تو ایسا سوچ رہی تھی کہ جیسے دو چلتے ہوئے مسافر بہت خوشگوار ماحول میں جا رہے ہوں تو اچانک ایک مسافر بنا کوئی وجہ بتائے بے دلی سے اپنا راستہ بدل لے۔ شعیب کے بے مروت ہو جانے کی وجہ اس کی سمجھ میں آ جاتی تو شاید اسے سکون آ جاتا، مگر نہ تو وہ کوئی وجہ بتاتا تھا اور نہ ہی کوئی بات کرتا تھا۔ اسے بات کرنا تو نہیں کہتے نا کہ ذرا سی گفتگو جو فقط حال احوال تک محدود ہو۔ کہاں گھنٹوں انجان جزیروں کی سیر کرتے رہنا اور کہاں محض آمنے سامنے آ کر ایک دوسرے کو دیکھ کر راستہ بدل لینا۔ وہ تو اس کے لہجے اور آواز کی اس قدر عادی ہو چکی تھی کہ اب کہیں سکون ہی نہیں ملتا تھا۔ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ لفظ کتنی اہمیت رکھتے ہیں اور پھر ایسے لفظ جو خوبصورت آواز کے ریشمی لہجے میں لپٹے ہوئے ہوں۔ اس کے سیل فون میں فقط ایک شعیب ہی کا نمبر تھا اور وہ کئی دنوں سے اجنبی بن گیا تھا۔ وہ ایک بار اس کی شاعری کے مجموعے بارے بات کر کے بہت پچھتائی تھی۔ شاید وہ تجویز اسے اتنی بری لگی تھی کہ اس کا رویہ ہی بدل گیا تھا۔ وہ اس کچے دھاگے جیسے تعلق کو برقرار رکھنا چاہتی تھی۔ کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتی تھی کہ جس سے یہ نازک سا تعلق ٹوٹ جائے۔ بے مروتی والا ہی سہی، تعلق تو ہے نا؟ شعیب نے تو یہی کہا تھا کہ اسے نوکری مل گئی ہے اور اب وہ مصروف ہو گیا ہے۔ ان کے درمیان یہی مختصری گفتگو ہوا کرتی تھی اور وہ اسی پر قناعت کر چکی تھی۔ چند منٹ کی گفتگو کے لیے وہ پورا دن انتظار کیا کرتی تھی، لیکن ایک بے چینی تھی جو مسلسل اس کے ساتھ لپٹی ہوئی تھی۔ جس کی اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اور پھر اس دن اسے سمجھ آ گئی جب دادی اماں سے باتیں کرتے ہوئے اسے معلوم ہوا کہ ظہیر شاہ دو ہفتوں کے لیے پاکستان آ رہا ہے۔

☆......☆

”تو کیا پیر سائیں اپنی بات منوانے کے لیے ظہیر شاہ کو پاکستان بلوا رہے ہیں یا مجھے سزا دینے کے لیے؟“ نادی نے حیران ہوتے ہوئے اپنی دادی سے سوال



کیا، جس کے جواب میں وہ انتہائی دکھ سے بولیں۔

"اس نے کیا اپنی بات منوائی ہے یا تجھے سزا دی ہے۔ وہ تو جو کچھ کر رہا ہے، اپنے لیے کر رہا ہے۔ اس کی تو بس یہی خواہش ہے کہ ہر انسان اس کی مرضی کے مطابق چلے......"

"دادی اماں۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ ہر کوئی ان کی مرضی سے کیسے زندگی گزار سکتا ہے۔ میں اگر ان کی بات ماننے سے انکار کردوں تو پھر کیا ہوگا؟" وہ جذبات میں آ کر اپنی رو میں کہہ گئی تو دادی اماں چونک گئیں۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو، وہ تمہیں جیتے جی مار دے گا۔ تمہاری آواز تک نہیں نکلے گی......" وہ خوف زدہ لہجے میں بولیں۔

"پہلے ہی ہمارا شمار زندوں میں کہاں ہوتا ہے، ہم تو ان کے لیے کٹھ پتلیاں ہیں۔ روایات کی ڈور سے وہ ہمیں اپنی مرضی سے حرکت کرنے پر مجبور کیے ہوئے ہے۔ میں اگر اپنی زندگی ختم کرلوں، تو پھر وہ کیا کریں گے۔" نادی نے غصے میں کہا تو دادی نے پھر سے چونک کر دیکھا، پھر نرم لہجے میں بولیں۔

"ہم اپنی قسمت کا لکھا ہوا بھگت رہے ہیں نادی......اور......"

"نہیں۔۔ نہیں دادی اماں...... میں کم از کم اسے قسمت کا لکھا ہوا نہیں مانتی۔ یہ تو ظلم ہے سراسر ظلم۔" اس کی آواز میں بغاوت کی مہک تھی۔ تب دادی اماں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"دیکھو بچی۔ اس حویلی کی چاردیواری سے باہر کی جو دنیا ہے نا۔ وہ بھی کوئی اتنی حسین نہیں ہے۔ چونکہ تمہیں اس کا تجربہ نہیں ہے۔ اس لیے وہ تمہیں حسین لگتی ہے۔ اس چاردیواری میں کم از کم تحفظ کا احساس تو ہے نا۔ سمجھ لو کہ ہماری دنیا فقط حویلی کی چاردیواری تک محدود ہے۔ اب تم اسے قسمت سمجھو یا نہ سمجھو، یہ تو تمہارا اختیار ہے نا......"

"پنجرہ چاہے سونے کا بھی ہو نا دادی اماں، اس میں رکھا گیا پرندہ قیدی ہی ہوتا ہے۔ کھلی فضاؤں میں اڑنے کی لذت، قید میں پڑا پرندہ کیا جانے۔" اس نے دلیل دی۔

"تمہیں اس حقیقت کا احساس نہیں ہے نادی کہ آزادی کی قیمت بہرحال ادا کرنی پڑتی ہے۔ یہ کبھی مفت میں ہاتھ نہیں آتی۔ کھلی فضاؤں میں اڑنے والے پرندے کی اڑان بڑی پرکشش ہوتی ہے، لیکن گھونسلا ہوا میں نہیں بنایا جاسکتا۔ کھلی فضا کے خطرات کیا ہیں، تم ان کے بارے میں کیا جانتی ہو۔ ہمارے معاشرے میں عورت کی قسمت یہی ہے کہ وہ گھر کی چاردیواری میں قید ہو کر رہے۔ اسے یہاں کی آزاد فضا میں راس نہیں آتیں۔ باہر کی دنیا میں ان گنت شکاری ہیں۔ اگر وہی پر کاٹ کر قید کر لیں تو......؟ آزادی تو پھر بھی نصیب نہ ہوئی؟" دادی اماں نے اسے پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"تو پھر کیا یہ دنیا ہمارے لیے اتنی ہی تنگ ہے، کہیں بھی اماں نہیں۔" اس نے پرسوچ لہجے میں کہا۔

"ہاں شاید ان کے لیے نہیں، جن کے سہارے بہت مضبوط ہوتے ہیں۔ یہاں کم از کم اتنا تحفظ تو ہے نا کہ کوئی ہے جو ہمارا محافظ ہے۔ اگر باہر آزادی کی قیمت چکانا پڑتی ہے تو یہاں تحفظ کے عوض بھی تو کچھ دینا پڑتا ہے اور! میرے خیال میں یہ سودا مہنگا نہیں ہے۔" دادی اماں نے اپنی دانست میں حویلی کی وکالت کرتے ہوئے کہا تو نادی سوچ میں پڑ گئی۔ دادی اماں نے بھی اس طرح کی بات نہیں کی تھی۔ کیا وہ ظہیر شاہ سے شادی کے لیے مجھے ذہنی طور پر تیار کر رہی ہے؟ کیا اب اسے اپنے فیصلے خود ہی کرنا پڑیں گے۔ یا پھر حالات کے آگے سر جھکاتے چلے جانا چاہیے؟ کیا زندگی اتنی ہی تلخ ہے کہ قدم قدم پر اس کی قیمت چکانا پڑتی ہے؟ نادی کی سوچ کا محور بدل گیا۔ جیسے جیسے ظہیر شاہ کی آمد والا دن قریب آ رہا تھا، اسے حویلی کی فضا سے خوف آنے لگا تھا۔ وہ تو اس سے شادی کا بندھن باندھ کر چلا جائے گا اور پھر وہ اسی چاردیواری میں یونہی پڑی رہے گی، جیسے پہلے تھی۔ نکاح کے چند بولوں کے عوض وہ اپنی زندگی ظہیر شاہ کے ہاتھوں ہار دے گی۔ اس کے من میں غبار بڑھتا ہی چلا گیا اور اس غبار کی واحد نکاسی کا راستہ آنسو ہیں، جو وہ بہا دیا کرتی تھی۔

اس رات اختر نے فون کیا تو اس کا دل شدت سے چاہا کہ اپنی ہر بات اس سے شیئر کر لے۔ اسے اپنے بارے میں ایک ایک بات بتا دے لیکن وہ اپنا دکھ ہونٹوں

پر لاتے لاتے ایک دم سے خاموش ہو گئی۔ نجانے اس کا رویہ کیا ہو؟ وہ جو اپنے دکھ اس کے سامنے لے کر بیٹھ جائے گی، وہ خود تو دکھی ہے ہی، اسے خوامخواہ کیوں پریشان کرے۔ ایسا کرتے ہوئے اپنا آپ بارے بھی بتانا پڑے گا کہ وہ کون ہے؟ ممکن ہے وہ یہ سوچے کہ پہلے کیوں جھوٹ بولا تھا؟ یا پھر اب وہ جھوٹ بول رہی ہے؟ یہ تو حقیقت ہے نا کہ اس نے اپنے بارے سچ نہیں بتایا تھا۔ سچ سامنے آنے پر ہو سکتا ہے وہ متنفر ہو جائے۔ اگر وہ متنفر نہ بھی ہوا تو اس کا اعتبار نہیں رہے گا۔ تعلق تو فقط اک آواز ہی کا ہے نا، جو کچھ وہ کہہ چکی ہے اب اسی پر قائم رہنا ہو گا۔

"کیا بات ہے نادیہ آج تم بڑی مایوس سی لگ رہی ہو، تمہارا لہجہ وہ پہلے والا نہیں ہے۔" اختر نے یونہی عام سے لہجے میں پوچھا تو وہ خود پر قابو پوتے ہوئے بولی۔

"ایسا کچھ نہیں ہے، آج یونہی دل اداس سا ہے۔"

"میں نہیں مان سکتا۔ کیونکہ میری باتوں پر تمہاری توجہ بالکل نہیں ہے۔ میرے خیال میں تمہیں نیند آ رہی ہے۔ اب تمہیں سو جانا چاہئے۔" اختر نے اس کی حالت کے بارے میں تجزیہ کرتے ہوئے مشورہ دیا۔

"سچ پوچھیں نا، تو میں آج واقعی بہت ڈسٹرب ہوں۔" اس نے متشکر لہجے میں کہا۔

"بات کیا ہے۔" وہ تجسس سے بولا

"بس یونہی، آج سوچ رہی تھی کہ یہ کتابوں، رسالوں، قصے کہانیوں کی جو دنیا ہے نا، یہ بالکل الگ تھلگ سی کیوں ہے۔ ایسا ہماری دنیا میں کیوں نہیں ہوتا۔ یہ فرق کیوں ہے؟ حقیقی زندگی کیا ہے؟" وہ شکست خوردہ لہجے میں بولی۔

"میں تمہیں بتاؤں، دنیا سرے سے حقیقت ہے ہی نہیں۔ زندگی جیسے دکھائی دیتی ہے نا، ویسی ہے ہی نہیں۔ افلاطون و سقراط سے لے کر آج تک کے دانشوروں نے اس دنیا کے بارے میں نجانے کیا کچھ کہا ہے، لیکن کوئی بھی اصل حقیقت تک نہیں پہنچ سکا، کیوں کہ سب میں اختلاف ہے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"تو پھر اصل حقیقت کیا ہے؟" نادی الجھتے ہوئے بولی۔

"تمہارا اپنا پن۔ تم اپنے اندر سے کیا ہو۔ جیسی تم ہو گی۔ یہ دنیا بھی ویسی ہی بنتی چلی جائے گی۔ تم اندر سے بدل جاؤ گی تو یہ دنیا بھی بدل جائے گی۔ تمہیں فقط اپنا آپ دیکھنا ہو گا۔" وہ پرسکون انداز میں بولا۔

"اختر۔! مجھے تمہاری باتیں سمجھ میں نہیں آ رہیں۔ اور نہ ہی میں ان میں الجھنا چاہتی ہوں۔ میں تو فقط اتنا چاہتی ہوں کہ آپ کے حالات ہی آپ کی دنیا ہے۔ جس سے لڑتے لڑتے ہمیں ختم ہو جانا ہے۔ یہی زندگی ہے اور یہی اس کی حقیقت......" اس نے بھیگتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں تمہاری سوچ اور نکتۂ نگاہ سے اختلاف نہیں کروں گا۔ میں یہ مانتا ہوں کہ حالات سے نبرد آزمائی زندگی کی مختلف طرح سے سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے، مگر ہم اتنی بھاری باتوں میں کیوں الجھ گئے۔ جس کا کوئی نتیجہ ہمارے ہاتھ نہیں آنے والا......" اس نے کافی حد تک چہکتے ہوئے کہا تو نادی سب کچھ بھول کر اس کی باتوں میں کھو گئی۔ اس رات وہ بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ یونہی زندگی کے رنگوں کی باتیں، نادی کو یوں لگا جیسے وہ بہت دنوں کے بعد آسمانوں کی سیر کے لیے نکلی ہو۔ رات گئے فون بند ہوا تو سارے خیالوں کو ذہن سے نکال کر اختر کی باتوں کی بارش میں بھیگتی رہی اور پھر نجانے کب سو گئی۔ اس رات نادی نے خوابوں میں وہ کچھ دیکھا جو کبھی وہ کھلی آنکھوں سے سوچتی رہتی تھی۔ اسے لگا زندگی خوبصورت بھی ہو سکتی ہے۔

☆......☆

شعیب کو سلامت نگر آئے ہوئے دوسرا دن تھا۔ اسے وہ تمام سہولیات مل گئی تھیں جو شہر کے بڑے انتظامی آفیسر کو مل جایا کرتی ہیں۔ یہ سہولیات تو گویا اس کے انتظار میں تھیں لیکن یہاں آ کر اسے شدت کے ساتھ تنہائی کے احساس نے گھیر لیا۔ اگرچہ یہ دونوں ہی دن شہر کے لوگوں اور ماتحت عملے سے تعارف کرتے ہی گزرا تھا تاہم رات کے سناٹے نے اسے بہت ڈسٹرب کیا۔ اس نے آتے ہی کام کی نوعیت کو دیکھا سمجھا اور پرکھا بھی۔ مصروفیات میں دن ختم ہونے کا پتا بھی نہیں چلا تھا، مگر رات ہوتے ہی اکیلا پن بھی اتر آیا۔ پہلی رات اسے جب اپنی امی یاد آئیں تو اس نے جھٹ فون کر

لیا۔ سارے دن کی روداد سنائی۔ امی نے بہت حوصلہ دیا۔ تب اسے محسوس ہوا کہ اس کی ممتا اس کے ساتھ ہی ہے۔ پھر نادیہ بہت یاد آئی، اس کی کومل اور نرم باتیں ایک ایک کر کے یاد آتی چلی گئیں، مگر یہ ساری یادیں، اس کی آواز کا نعم البدل نہ بن سکیں۔ کروٹوں میں گذری ہوئی رات تو اپنا اثر دن میں ہی دکھاتی ہے۔ اگلا دن بھی یونہی مصروفیت میں ختم ہوتے پتا ہی نہ چلا۔ کب دن ڈھلا اور رات سر پر آ گئی۔ اس کے لئے تو یہ کٹھن لمحات تھے جو گذارے نہیں گذر رہے تھے۔ فطری طور پر تو اسے آرام کرنا چاہیے تھا، مگر وہ مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ اس کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہیں تھا۔ نیند اور محبت میں بھلا کب بنی ہے، اسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے کسی بندے کو بھوک تو لگی ہو مگر کچھ بھی کھانے کو جی نہ چاہے۔ ایسا کن حالات میں ہوتا ہے، یہی اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اسے بار بار نادیہ ہی کی یاد آ رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اگر میں نے فون کر لیا تو پھر میں اس کے بغیر نہیں رہ پاؤں گا۔ وہ میری عادت بن جائے گی۔ کیا کروں، رابطہ کر لوں اور پھر اسے نبھاؤں یا پھر خود پر جبر کر لوں۔ وہ رات بھی یونہی بیت گئی اور وہ کشمکش ہی میں رہا۔ اسے فون تو نہ کر سکا لیکن الجھن تھی کہ بڑھ گئی تھی۔

نادیہ کو فون نہ کرنے کے لیے اسے خود سے لڑنا پڑ رہا تھا۔ کیا نادیہ اس کی مجبوری بن گئی ہے؟ یہی سوال اسے سارا دن تنگ کرتا رہا۔ دن بھر کا وہی معمول اور رات کا وہی سناٹا اپنے ہمراہ کشمکش بھی لے آیا۔ اس وقت وہ دالان میں بیٹھا ہوا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا نے خوشگواریت کا احساس دے دیا ہوا تھا۔ ایسے میں نادیہ کی یاد نے انتہائی شدت سے مجبور کر دیا کہ وہ اسے کال کرے۔ اس نے سیل فون اپنے ہاتھوں میں لیا اور کتنی دیر تک سوچتا رہا کہ اسے فون کرے یا نہیں، پھر اس نے فون کر دیا جو فوراً ہی ریسو کر لیا جیسے کوئی اسی کے فون کا منتظر ہو۔

"کیسے ہیں آپ......؟" نادیہ نے یوں پوچھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔" اس نے بھی اختصار سے جواب دیا۔

"کوئی کام ملا۔" نادیہ نے سوال کیا تو ایک دم سے شعیب نے اپنی پوزیشن کے بارے میں بتا دینا چاہا۔ لفظ لبوں تک آئے بھی مگر یہ سوچ کر خاموش رہا کہ وہ کیا سوچے گی، کیا میں اب تک اس سے جھوٹ بولتا رہا ہوں۔ کیا وہ پھر مجھ پر اعتماد کرے گی؟ اور پھر میں نے اسے بتانا ہی کیوں ہے؟ "میں نے کیا پوچھا ہے؟" نادیہ نے پوچھا تو ایک دم سے چونک گیا اور بولا۔

"نہیں۔"

"ابھی تک اسی ورکشاپ میں کام کر رہے ہو؟"

"ظاہر ہے، جب تک کوئی ڈھنگ کا کام نہیں مل جاتا۔ یہ تو چلے گا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"کوئی بات نہیں، مل جائے گا کام، موڈ خوشگوار کریں۔" نادیہ نے ہنستے ہوئے کہا تو ان میں باتوں کا سلسلہ چل نکلا، جو دراز ہوتا چلا گیا۔ وہ رات میٹھی باتوں میں گذر گئی۔ اسے لگا جیسے تنہائی کا بہت ہی پر خلوص ساتھی مل گیا ہو۔ جس کا ساتھ ہو تو وقت گذرنے کا احساس تک نہیں ہوتا۔

اس صبح جب وہ بیدار ہوا تو بہت ہی خوشگوار موڈ میں تھا۔ اس دن آفس میں دوپہر سے ذرا قبل اس کے ایک ماتحت نے نہایت پرتکلف چائے کا اہتمام کیا۔ خوشگوار ماحول میں چائے پینے کے بعد اس نے خاصے رازدارانہ انداز میں کہا۔

"سر۔! یہ ایک فائل ہے میرے پاس۔ مگر یہ آپ کو پیش کرنے سے پہلے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔"

"جی بولیں۔ ایسی کیا بات ہے؟" شعیب نے انتہائی تحمل سے کہا۔

"یہ فائل یہاں کے سب سے بااثر معتبر شخصیت کی ہے، ان کا شمار بڑے زمینداروں میں ہوتا ہے۔ سیاسی لحاظ سے اتنے سرگرم نہیں لیکن ووٹ بینک کی وجہ سے سیاست میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مریدین کا ایک وسیع حلقہ رکھتے ہیں۔ نام ان کا دلاور شاہ المعروف پیر سائیں ہے۔"

"آپ کیا چاہتے ہیں؟" اس نے اس تحمل سے پوچھا تو ماتحت اہلکار نے گڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"میں نے جو اتنا تعارف کروایا ہے، اس سے آپ نہیں سمجھے کہ ان کا کام ہمیں بہرحال کرنا پڑتا ہے۔ جس آفیسر نے بھی ان کے ساتھ بنا کر رکھی ہے۔ انہوں نے

بڑا پرسکون وقت گزارا ہے اور جب گئے ہیں تو بہت خوش گئے ہیں۔ ایک طرح سے ان کو تحفظ مل جاتا ہے۔ اس کے بعد آپ جو چاہیں اس علاقے میں کر سکتے ہیں۔"

"ہونہہ۔!" شعیب نے ہنکارا بھرا تو وہ بولا

"میں نے ان کے بارے میں آپ کو معلومات دے دی ہیں اور اس کے ساتھ ایک مشورہ بھی دینا چاہتا ہوں۔"

"کیسا مشورہ؟" اس نے سکون سے پوچھا۔

"اس فائل میں ان کا ایک چھوٹا سا کام ہے۔ آپ یہ فائل لے کر ان کے پاس حویلی چلے جائیں۔ تعارف بھی ہو جائے گا اور......" ماتحت نے کہنا چاہا مگر اس نے بات قطع کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھیں، ماضی میں اگر ایسا ہوتا رہا ہے تو مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں، مگر شاید اب ایسا نہ ہو۔ کم از کم میں یہاں جب تک ہوں۔ آپ پھر مجھے کبھی ایسا مشورہ مت دیجیے گا۔ ان کا اگر کوئی جائز کام ہے تو وہ کرنے کے لیے ہی ہم یہاں ہیں۔ عام آدمی کے کام کی طرح ان کا کام بھی ہو گا۔ ناجائز کام کی فائل میرے سامنے مت رکھیے گا۔ مجھے ان کی حویلی میں نہیں جانا۔ چاہیے وہ جتنے بڑے آدمی ہیں، یا وہ جتنا زیادہ اثر رکھتے ہیں۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔" اس نے بڑے آرام سے اپنے ماتحت کو سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ ماتحت حیران رہ گیا۔ وہ چند لمحے اسی حیرت میں رہا، پھر بولا۔

"سر۔! بہت مشکل ہو جائے گی۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ......"

"مجھے اندازہ کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی، وہ اپنا آپ خود مجھے دکھا دے گا۔ مجھے ایک مجبور اور بے بس انسان کا کام کر کے زیادہ خوشی ہو گی۔ اب آپ جا سکتے ہیں۔ چائے کا بل مجھے بھجوا دیں۔" شعیب کا تحمل وہی رہا تھا۔ تب ماتحت وہاں بیٹھا نہیں رہا بلکہ فائل سمیت وہاں سے چلا گیا۔

شعیب ان تین دنوں میں اندازہ کر چکا تھا کہ اسے کس سے اور کیسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ جس کے لیے وہ ذہنی طور پر پوری طرح تیار ہو گیا تھا۔ وہ دفتری اوقات کے آخری لمحے تک بیٹھتا اور پھر اپنی سرکاری رہائش گاہ چلا جاتا۔ سہ پہر کے وقت وہ فون پر اپنی والدہ سے بات کرتا اور یہ تاثر دیتا کہ وہ یہاں آ کر بہت خوش ہے۔ اگرچہ یہاں کوئی مسئلہ نہیں پھر بھی وہ جلد از جلد تبادلہ کروانے کی کوشش کروں گا۔ پھر دفتر سے لایا ہوا کام دیکھتا، وہ اپنی تنہائی اسی طرح ختم کر سکتا تھا۔ رات ہوتے ہی جب وہ بیڈ پر آتا تو نادیہ کی یاد بھی خوشبو کی مانند مہک اٹھتی۔ تب وہ شعیب سے اختر رومانوی بن جاتا۔ نادیہ سے گفتگو کرتا جو طویل ہو جاتی۔ تنہائی دور کرنے کی غرض سے کی گئی گفتگو اسے خود بہت اچھی لگی تھی، یوں چند دن آگے سرک گئے۔

اس شام وہ پرانے طرز کی اسی سرکاری رہائش کے دالان میں کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ آسمان پر سرمئی بادل چھا گئے ہوئے تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ موسم بھیگ جائے گا، پھر وہی ہوا، ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ اسے نادیہ بہت یاد آنے لگی۔ اس کا من چاہنے لگا کہ اسے فون کرے۔ ایسے میں نادیہ کی فون کال آ گئی۔

"ڈسٹرب تو نہیں کیا میں نے؟" اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"یہ پوچھو کہ ڈسٹرب ہونے سے کس حد تک بچایا۔" اس نے شوخی سے کہا۔

"کیا مطلب۔؟" وہ حیران ہوتے ہوئے بولی

"مطلب کہ میں اس وقت خاصا بور ہو رہا تھا اور کچھ کچھ تھکن بھی محسوس کر رہا تھا۔" اس نے اپنی حالت کا اظہار کر دیا۔

"اوہ۔!" اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا، پھر وہ بھی شوخ لہجے میں بولی۔ "اس طرح کے حال میں ہو آپ۔ ویسے میں تو بوریت کی وجہ سے ڈسٹرب ہو رہی تھی۔ اس لیے سوچا آپ کو تنگ کروں۔ ممکن ہے میری گفتگو سے کوئی شعر ہی نازل ہو جائے۔"

"ممکن ہے، ایسا ہو جائے۔ ویسے میرا بھی جی چاہ رہا تھا باتیں کرنے کے لیے۔" اس نے صاف انداز میں کہہ دیا۔

"کیا میری ایسی باتیں ہوتی ہیں کہ ان سے کسی شعر کے لیے بنیاد مل جائے؟" وہ حیرت سے بولی۔

"ہاں! یہ جو لفظ ہوتے ہیں نا، ان کی ایک روح ہوتی ہے، پھر جس طرح کے جذبے میں بھیگ کر یہ لفظ

زبان سے ادا ہوتے ہیں تو اپنا تاثر ویسا ہی رکھتے ہیں۔ جذبوں میں بھیگے ہوئے لفظ جب مخاطب پر اثر انداز ہوتے ہیں، تب پھر ردعمل تو ہوتا ہی ہے نا۔" اس کا لہجہ کافی حد تک خمار آلود ہو گیا تھا۔

"یہ تو ہے، جس طرح آپ کے لفظ مجھے یوں محسوس ہوتے ہیں۔ جیسے صحرا میں اچانک بارش ہو جائے۔ یقین جانیں میری بے رنگ زندگی میں رنگ بھر جاتے ہیں۔ تتلیوں کے جیسے لفظ پکڑتے پکڑتے مجھے ہوش ہی نہیں رہتا کہ میں کانٹوں بھری راہگذر پر ہوں۔ بہت حوصلہ دیتے ہیں مجھے آپ کے لفظ۔" وہ جذب میں کہتی چلی گئی۔

"اب دیکھو نا، تم بھی شاعری کرنے لگی ہو۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"اب دیکھیں۔ یہ کتنی غیر شاعرانہ سی بات ہو گئی کہ اگر میں یہ کہوں کہ خربوزہ، خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے۔" اس نے یہ کہہ کر قہقہہ لگا دیا تو وہ ایک دم سے چونک گیا۔ پہلی بار اس نے نادیہ کا قہقہہ سنا تھا۔ کیسا جلترنگ کے جیسا قہقہہ تھا اس کا۔

"ہیلو، آپ خاموش کیوں ہو گئے۔ بری لگی میری بات......؟" اس کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔

"ارے نہیں۔ میں تو تمہارے قہقہے میں کھو گیا تھا، پہلی بار سنا ہے نا۔" اس نے واضح لفظوں میں اپنی کیفیت کہہ دی تو دونوں میں کتنی ہی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ تبھی نادیہ نے آہستگی سے کہا۔

"اچھا، رات کو بات کریں گے۔"

"ہاں، تب سکون ہو گا۔" وہ بولا تو نادیہ نے فون آف کر دیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے فون رکھا اور موسم کی خوبصورتی میں کھو گیا۔ بہت عرصے بعد یوں پرسکون انداز میں موسم سے لطف اندوز تو ہوا ہی تھا، تاہم نادیہ سے باتوں کا خمار عجیب سی کیفیت بیدار کر چکا تھا۔ اس دن اسے احساس ہوا کہ بارش میں مور کیوں ناچتا ہے۔

اگلے دن جب وہ آفس آیا تو فریش تھا، فائلیں آ، جا رہی تھیں۔ وہ پوری تندہی سے کام میں مصروف رہا۔ اسے احساس ہو گیا کہ عملے کے رویے میں بہت حد تک تبدیلی آ چکی ہے۔ یوں اچانک جیسے سارے حیران اور خاموش ہوں۔ اس نے توجہ تو دی لیکن کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ایمانداری کی اپنی ایک قوت ہے جو بلاشبہ اپنا آپ منوا کر رہتی ہے۔ دوپہر سے کچھ پہلے وہ کام ہی میں مصروف تھا کہ دفتر میں ہلچل سی ہوئی۔ اس کا وہی ماتحت تیزی سے اس کے پاس آیا اور تیز سانسوں کے درمیان عجلت سے بولا۔

"سر۔! وہ پیر سائیں کے دیوان آرہے ہیں۔ آپ پلیز۔! یہ وہی ہیں جو پیر سائیں کے معاملات دیکھتے ہیں۔"

"آنے دو۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا تو وہ مزید کوئی بات کیے بغیر پلٹ گیا۔ اگلے چند لمحوں میں پیر سائیں کا دیوان اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ قیمتی بوسکی کا کھلا کرتا، سفید لٹھے کی گھیرے دار شلوار، سر پر سفید عمامہ نما پگڑی، گندمی رنگ پر تیکھے نقوش، چھوٹی چھوٹی خشخشی داڑھی اور بھاری مونچھیں۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں مختلف رنگوں کے نگینے جڑے ہوئے انگوٹھیاں تھیں۔ اس کی آمد کے ساتھ ہی تیز خوشبو کا جھونکا اس کے نتھنوں سے ٹکرایا جو کمرے میں پھیل گیا تھا۔ وہ اس کے سامنے آ کر ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔

"میرا تعارف تو ہو ہی گیا ہو گا آپ سے۔ دیوان بدرالدین نام ہے میرا۔"

"دیوان ہیں پیر سائیں کے، تشریف رکھیں۔" اس نے بیٹھے بیٹھے ہی مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ تب وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔

"یہ ٹھیک ہے کہ آپ یہاں کے بڑے انتظامی آفیسر ہو لیکن عمر میں مجھ سے بہت ہی چھوٹے ہو۔ میل ملاقات میں اگر احترام ہو تو تعلق خوشگوار رہتا ہے۔" اس نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے پرسکون لہجے میں کہا تو وہ سمجھ گیا کہ اسے، اس کا بیٹھا رہنا اچھا نہیں لگا۔ تبھی وہ زیرِلب مسکراتے ہوئے بولا۔

"جی فرمایئے۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"

"میں یہاں کوئی خدمت کروانے نہیں آیا۔ بس آپ کو دیکھنے آیا تھا۔ سنا تھا کہ ایک نوجوان اپنی سرکاری نوکری کی پہلی پوسٹنگ پر یہاں آیا ہے۔ سوچا، چند کام کی باتیں بتا آؤں، جو آگے چل کر نوکری کرنے میں بڑی کام آئیں گی۔" اس نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے لفظ چبا چبا کر پرسکون انداز میں کہا۔ (جاری ہے)

☆......☆